

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# تفہیم اسلام

”دو اسلام کا محققانہ جواب“

مصنف  
مسعود احمد بی بیسی

[www.sirat-e-mustaqeem.net](http://www.sirat-e-mustaqeem.net)

جامعۃ المدینہ (رجسٹرڈ)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

کتابت \_\_\_\_\_ خالد فاروق خوشنویس

\_\_\_\_\_ مطبع

اشاعت \_\_\_\_\_ ثالث

تعداد \_\_\_\_\_ ایک ہزار

سال طباعت \_\_\_\_\_ ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء

قیمت \_\_\_\_\_ ۷۰ روپے

جملہ حقوق بحق جماعت المسلمین رجسٹرڈ (رجسٹریشن نمبر ۳۶۶/۱۹۸۵)

محفوظ ہیں



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## مقدمہ طبع ثانی

تمام تعریفیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہیں اور لاکھ لاکھ شکر و احسان اسی مالک ذوالجلال والاکرام کا ہے جس نے جماعت المسلمین کو تفہیم اسلام کی طبع ثانی کی توفیق عطا فرمائی۔

۲۔ الحمد للہ تفہیم اسلام کی اشاعت اول قلیل عرصہ میں ختم ہو گئی، ہر طبقہ کے لوگوں نے اسے پسند کیا اور اپنے قیمتی تبصروں سے ہماری ہمت افزائی فرمائی چند تبصروں کے علاوہ یہ تمام تبصرے زبانی دئے گئے تھے۔ ان زبانی تبصروں کو ہم نے تحریری صورت میں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ان تبصروں کی اشاعت کو ضروری سمجھا اس لئے کہ یہ کتاب تبصروں کی محتاج نہیں۔

۳۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ڈاکٹر غلام جیلانی برقی صاحب کو بھی بھیجا گیا تھا اور انہوں نے اس پر ایک تبصرہ بھی تحریر فرما کر بذریعہ ڈاک ہم کو روانہ کیا تھا لیکن افسوس کہ وہ تبصرہ ہم تک نہ پہنچ سکا اور ڈاکٹر صاحب عید الفرجی کی وجہ سے دوبارہ تبصرہ نہ لکھ سکے۔

۴۔ کتاب دو اسلام کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کے چند خطوط بھی موصول ہوئے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ خطوط بھی اس کتاب کے ساتھ شائع کر دئے جائیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے ان خطوط کی اشاعت کی اجازت طلب کی تھی لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ لہذا ہم بغیر ان خطوط کے ہی کتاب ہذا کو شائع کر رہے ہیں۔

۵۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور منزل

مقصود تک پہنچائے ، اللہ تعالیٰ جماعت المسلمین کو ترقی دے اور نصرت  
دین اسلام کی مزید توفیق عطا فرمائے ۔ آمین

شعبہ نشر و اشاعت  
جماعت المسلمین

نوٹ

برق صاحب کے خطوط کتاب کے آخر میں

ملاحظہ فرمائیے۔

# فہرست مندرجات کتاب تفہیم اسلام

نوٹ: ابواب کے عنوانات وہی ہیں جو برق صاحب کی کتاب ”دو اسلام“ میں ہیں

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
	تمہید	
۱	ملا کی اصطلاحی تعریف	۱۸
۲	عالم کی تعریف	۱۸
۳	جماعت حقہ کا تعارف	۱۹
۴	(دنیامردار ہے) پر برق صاحب کا اعتراض اور غلط فہمیوں کا آغاز	۲۰
۵	قول مذکور پر اعتراض کا جواب کہ یہ حدیث نہیں ہے ؟	۲۰
	(ا) حق و باطل کا غلط معیار۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے اصحاب کی زبوں حالی	۲۰
	(ب) دنیا کی مذمت اور قرآن مجید	۱۱۲
	(ج) دنیا کی دینی اصطلاحی تعریف	۱۸
	(د) روایت زیر بحث کا صحیح مطلب	۲۲
۶	برق صاحب کے دیگر متفرق اعتراضات اور ان کے جوابات	۳۵
۷	حدیث کے وحی ہونے کے دلائل	۳۶
	(ا) انبیاء سابقین پر کتاب الہی کے علاوہ نزول وحی	۳۶
	(ب) حدیث اگر حجت ہے تو اس کا وحی ہونا ضروری ہے	۲۰
	(ج) حدیث کے حجت شرعیہ ہونے کے دلائل	۲۰
	(د) حدیث کے وحی ہونے کا ثبوت قرآن مجید سے	۲۸
۸	برق صاحب کے متفرق اعتراضات کا خلاصہ اور ان کا جواب	۵۳



# باب

## ”حدیث میں تحریف کے اسباب

۵۶	۹	احادیث صحیحہ کا وجود برق صاحب کا اعتراف
۵۷	۱۰	حدیث کی حفاظت
۵۷	۱۱	فہم حدیث کا کمال - صحیح اور وضعی احادیث میں غلط امتیاز
۵۹	۱۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احادیث کی حفاظت و کتابت
۶۵	۱۳	صحابہ کرامؓ کا حدیث کی حفاظت کرنا
۶۵		(ا) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی کتب احادیث
۶۸		(ب) حضرت عمرؓ کی طرف سے حدیث کی حفاظت اور تعلیم کا انتظام
۶۸		(ج) حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی کتب احادیث
۷۰		(د) متعدد صحابہ کرامؓ کی کتب احادیث کا تذکرہ
۷۲		(۷) صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد احادیث تحریر کرتی تھی
۸۸	۱۴	حدیث قرطاس اور برق صاحب کی غلط فہمی
۸۵		(۱) ”حسبنا کتاب اللہ“ کا صحیح مطلب اور حضرت عمرؓ کا حدیث کو حجت سمجھنا
۸۵		(ب) حدیث قرطاس کا صحیح مفہوم
۸۸		(ج) کتاب اللہ کا اطلاق حدیث پر بھی ہوتا ہے
۸۹	۱۵	کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا؟
۹۰	۱۶	برق صاحب کی حیرت انگیز غلط فہمی اور اس کا ازالہ
۹۱	۱۷	تندوین حدیث پر شبہات اور ان کا ازالہ
۱۰۲	۱۸	امام بخاریؒ سے پہلے بے شمار کتب احادیث لکھی جا چکی تھیں
۱۱۰	۱۹	عبد اللہ بن مسعودؓ کا حدیث کو کتاب اللہ کہنا
۱۲۷	۲۰	معمولی نیکی سے بے شمار گناہوں کی معافی کی وجہ
۱۲۹		(۱) قرآن مجید اور گناہوں کی معافی
۱۳۰		(ب) کون سے گناہ معاف ہوتے ہیں
۱۳۲		(ج) گناہوں کی مغفرت عقل کی کسوٹی پر
۱۳۳		(د) قرآن مجید اور نیکی بدی کا اٹل قانون

۱۳۵	حدیث کے متعلق بعض ائمہ کی طرف منسوب کردہ غلط اقوال	۲۱
۱۴۰	باب اول کا خلاصہ	۲۲
	<b>باب ۲</b>	
	”تدوین حدیث“	
۱۴۱	کیا صحابہ جمع حدیث کے غلات تھے؟	۲۳
۱۴۱	جمع احادیث پر شبہات اور ان کا ازالہ	۲۴
۱۴۲	حضرت انسؓ پر برق صاحب کا شبہ	۲۵
۱۴۲	برق صاحب کا اعتراض حق	۲۶
۱۴۶	کلمہ گو کی بخشش کا صحیح مفہوم	۲۷
۱۴۸	شرح صدر کی حدیث پر عقلی اعتراض اور اس کا جواب	۲۸
۱۵۳	ائمہ دین کی طرف منسوب کردہ غلط اقوال	۲۹
	<b>باب ۳</b>	
	”چند عجیب راوی اور صحابہؓ“	
۱۵۶	بعض کذابین کا دعویٰ صحابیت اور برق صاحب کی غلط فہمی	۳۰
۱۵۹	باب سوم کا خلاصہ	۳۱
	<b>باب ۴</b>	
	”کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق“	
۱۶۰	حضرت انسؓ اور حضرت ابوسعیدؓ کے متعلق برق صاحب کا شبہ	۳۲
۱۶۱	کذب کے معنی	۳۳
۱۶۲	صحابہؓ کا آپس میں ایک دوسرے پر اعتراض کرنا	۳۴
	حدیث ”میت پر نوحہ کرنے سے میت پر عذاب ہوتا ہے“ پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۵
۱۶۲		



۱۶۷	کیا صحابہؓ کے زمانہ میں احادیث کا چشمہ مکدر ہو گیا تھا	۳۶
۱۶۸	حدیث میں قحطانی بادشاہ کے متعلق پیشین گوئی اور برق صاحب کی غلط فہمی	۳۷
۱۶۹	برق صاحب کی حیرت انگیز غلط فہمی کہ صحابہ کرامؓ حدیث میں تخریب کرتے تھے۔	۳۸
۱۷۰	ائمہ کے آپس میں ایک دوسرے کے متعلق قابل اعتراض اقوال اور ان کی حقیقت	۳۹

## باب

### ”حدیث پر ایک مکالمہ“

۱۷۹	احادیث لکھنے کی ممانعت اور ان کو مٹانے کی روایتوں کی حقیقت	۴۰
۱۸۱	قرآن و حدیث علیحدہ کیوں رکھے گئے	۴۱
۱۸۱	دو قسم کی وحی نازل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت	۴۲
۱۸۲	حدیث کی حفاظت کا وعدہ الہی	۴۳
۱۸۳	علم حدیث کے متعلق غیر مسلم محققین کی رائے	۴۴
۱۸۴	حدیث کا ذکر قرآن مجید میں	۴۵
۱۸۸	اقوال رسولؐ کا جزو ایمان ہونا۔ برق صاحب کا اعتراض	۴۶
۱۹۴	صحیح احادیث کہاں ملیں گی؟	۴۷
۱۹۴	اقوال رسولؐ کا من جانب اللہ تشریح قرآن ہونا	۴۸
۱۹۵	کیا صحیح احادیث کا سراغ نہیں ملتا؟	۴۹
۱۹۵	رسولؐ کی دائمی اطاعت پر برق صاحب کے اعتراض کا جواب	۵۰
۱۹۶	رسولؐ کو چھٹی رساں سمجھنا۔ برق صاحب کی حیرت انگیز غلط فہمی	۵۱
۱۹۸	کیا صحابہؓ احکام رسولؐ کی تعمیل ضروری نہیں سمجھتے تھے؟	۵۲
۱۹۸	احادیث رسولؐ کو وحی ماننے پر اعتراضات	۵۳
۲۰۰	رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے افعال اللہ تعالیٰ کے منظور کردہ ہیں	۵۴
۲۰۱	ظاہری اعمال اور امتیازات کی اہمیت	۵۵
۲۰۸	رسول اور چھٹی رساں کا فرق	۵۶
۲۰۹	روایت بالمعنی اور روایت بالالفاظ	۵۷
۲۱۰	وحی بغیر الفاظ کی حقیقت	۵۸

۲۱۳	۵۹	رسول اور فلسفی میں فرق
۲۱۵	۶۰	وحی خفی سے تنقیص رسول ہونا صحیح نہیں
۲۱۵	۶۱	قرآن، حدیث کا محتاج ہے، اس کا صحیح مفہوم

## باب

### ”تخریف احادیث کے اسباب“

۲۱۷	۶۲	تخریف کے خود ساختہ اسباب اور ان کا جواب
۲۲۰	۶۳	گتاپالنے کی حدیث پر اعتراض
۲۲۱	۶۴	کیا قائلانِ حسین محدث تھے ؟
۲۲۳	۶۵	صحیح مفہوم کے اعتبار سے اکثر احادیث کا قرآن مجید کے مثل ہونا
۲۲۴	۶۶	عملی توانر کی حقیقت
۲۲۵	۶۷	کیا حدیث انسانی تصنیف ہے ؟
۲۲۶	۶۸	کیا قرآن مجید ہر لحاظ سے مکمل ہے ؟
۲۳۱	۶۹	کیا احادیث ڈھائی سو سال بعد تحریر میں آئیں ؟
۲۳۲	۷۰	قرآن مجید کا اسلام مشکل ہے یا حدیث کا ؟
۲۳۲	۷۱	برقی صائب کا چند موضوع احادیث پر اعتراض
۲۳۳	۷۲	صحیح احادیث قرآن مجید کے نمناف نہیں
۲۳۴	۷۳	حدیث قرآن مجید کی تشریح کرتی ہے
۲۳۵	۷۴	کیا ہر اچھی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا جائز ہے ؟
۲۳۶	۷۵	کیا حدیث ”طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم“ موضوع ہے ؟
۲۳۷	۷۶	حدیث کے جانچنے کا معیار

## باب

### موطا پر ایک نظر

۲۴۰	۷۷	موطا امام مالکؒ کی صحت پر شبہ اور اس کا ازالہ
۲۴۱	۷۸	نیز سے بھاگنے کے بعد وضو کرنا - دو حدیثوں میں تعارض اور اس کا جواب



۲۴۲	بوسہ لینے سے وضو نہ ٹوٹنا۔ احادیث میں تعارض اور اس کا جواب	۷۹
۲۴۳	جماع بغیر انزال کے بعد غسل۔ احادیث میں تعارض اور اس کا جواب	۸۰
۲۴۴	حضرت عائشہ صدیقہؓ سے عربیوں سوال پوچھنے پر اعتراض اور اس کا جواب	۸۱
۲۴۵	توہین رسول کا شاخسانہ اور اس کا جواب قرآن مجید کی روشنی میں	۸۲
۲۴۸	ہر سال یلۃ القدر کی آمد پر اعتراض اور اس کا جواب	۸۳
۲۴۹	آیہ زحم کے متعلق غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۸۴
۲۵۰	زنا کی منرا کا تاریخی پس منظر	۸۵
۲۵۱	حدیث کا وحی ہونا	۸۶
۲۵۲	نسخ آیات کا ثبوت قرآن مجید سے	۸۷
۲۵۵	اسناد حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب	۸۸
۲۵۷	صحیح مسلم کی صحت پر اجماع	۸۹
۲۵۷	گوشت خوری۔ کے متعلق حضرت عمرؓ کے قول پر اعتراض اور اس کا جواب	۹۰

## باب

### ”صحیح بخاری پر ایک نظر“

۲۵۹	صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی صحت پر اجماع	۹۱
۲۶۰	کیا صحیح بخاری کی احادیث قرآن مجید سے متصادم ہیں؟	۹۲
۲۶۱	حدیث اور تارنخ کا فرق	۹۳
۲۶۱	ایک پیشین گوئی پر اعتراض اور اس کا جواب	۹۴
	حدیث ”مسجد حرام اور بیت المقدس کی تعمیر میں ۴۰ سال کا وقفہ“ پر اعتراض اور	۹۵
۲۶۵	اس کا جواب	
۲۶۲	حضرت انسؓ کے بیان پر اعتراض اور اس کا جواب	۹۶
	توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت۔ برق صاحب کا اعتراض اور	۹۷
۲۶۳	اس کا جواب	
۲۶۴	برق صاحب کا تاریخی شہادت تسلیم کرنے سے انکار	۹۸
۲۶۵	توریت اور انجیل میں تحریف کا ثبوت	۹۹



۲۷۹	اہل کتاب کے حق ہونے پر عجیب و غریب دلیل اور اس کا جواب	۱۰۰
۲۸۶	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اہل کتاب پر بھی ضروری ہے	۱۰۱
۲۸۹	اہل کتاب کو ایمان بالقرآن کی دعوت	۱۰۲
۲۹۳	توریت کے محرف ہونے پر توریت کی اندرونی شہادت	۱۰۳
۲۹۵	کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا جانتے تھے؟ حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۰۴
	<b>باب ۹</b>	
	<b>”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر حدیث میں“</b>	
۲۹۶	روزہ میں مباشرت اور برقی صاحب کا اعتراض	۱۰۵
۲۹۶	مباشرت کے صحیح معنی	۱۰۶
۳۰۱	اہانت رسول کا شاخسانہ اور قرآن مجید	۱۰۷
۳۰۳	مباشرت کے صحیح معنی سے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی لاعلمی	۱۰۸
۳۰۳	برقی صاحب کی غلط فہمی اور کتاب ”دو اسلام“ کی تالیف کا محرک	
	برقی صاحب کا اعتراف کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل امت کے لیے واجب	۱۰۹
۳۰۴	الاتباع ہے۔	
۳۱۰	”ایام ماہوارمی“ کے دوران ”مباشرت“ کا صحیح مطلب	۱۱۰
۳۱۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اہلیہ کا ایک برتن سے نہانا	۱۱۱
۳۱۲	برقی صاحب کی غلط فہمی اور اس کا جواب	
۳۱۴	حضرت عائشہ کا غسل۔ برقی صاحب کی عجیب غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۱۱۲
۳۱۶	برقی صاحب کا عربی ترجمہ کرنا اور پھر اعتراض کرنا	۱۱۳
۳۱۷	حضرت صفیہ سے نکاح اور برقی صاحب کی غلط فہمی	۱۱۴
۳۱۸	برقی صاحب کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورہ کرنے پر اعتراض	۱۱۵
۳۱۹	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی قوت پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۱۶
۳۲۰	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں تضاد کا شاخسانہ اور اس کا جواب	۱۱۷
۳۲۱	عجیب و غریب غلط فہمی	۱۱۸
۳۲۲	پال برٹن کا نخراج عقیدت	۱۱۹

- ۱۲۰ حضرت عائشہؓ کی بوقت نکاح کم سنی پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۱۲۱ منہ کے منسوخ ہونے پر اعتراض  
 ۱۲۲ صحابہ کے متعلق برق صاحب کی تضاد بیانی

## باب

### ”حدیث میں نماز کی صورت“

- ۱۲۳ حدیث معراج اور برق صاحب کی غلط فہمی  
 ۱۲۴ چند احادیث پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۱۲۵ رفع یدین پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۱۲۶ نماز ظہر و عصر جمع کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۱۲۷ برق صاحب کا ترجمہ غلط کرنا  
 ۱۲۸ برق صاحب کا ایک تفسیر کو قرآنی آیت سمجھنا، حالانکہ وہ قرآن مجید میں نہیں ہے  
 ۱۲۹ احادیث میں تضاد کی مثالیں اور ان کا صحیح حل  
 ۱۳۰ نماز عصر جلدی پڑھنے پر اعتراض

## باب

### ”بہترین عمل“

- ۱۳۱ بعض احادیث میں جہاد کا ذکر نہ ہونے پر برق صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب  
 ۱۳۲ برق صاحب کا غلط ترجمہ کرنا۔ اعتراض اور اس کا جواب  
 ۱۳۳ جہاد افضل ہے یا حج؟ برق صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب  
 ۱۳۴ ذکر اللہ کی فضیلت پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۱۳۵ متقی کی تعریف :

(۱) برق صاحب کے الفاظ میں

(۲) قرآن مجید کے الفاظ میں



## باب ۱۲

### ”اللہ کی عادت“

۱۵۹	۱۳۶	کیا ”ملا“ اور حدیثی اسلام مسلمانوں کی بُری حالت کے ذمہ دار ہیں؟
۲۶۰	۱۳۷	جہاد مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے
۲۶۱	۱۳۸	جہاد کے متعلق بعض غیر مسلمین کی غلط رائے
۲۶۲	۱۳۹	برقی صاحب کے چند اعتراضات اور ان کا جواب
۲۶۳	۱۴۰	کیا صرف کلمہ پڑھنے سے جنت مل جاتی ہے؟
۳۶۴	۱۴۱	سزا اور جزا کی حقیقت

## باب ۱۳

### ”لفظ مغفرت کی تحقیق“

۲۶۱	۱۴۲	مغفرت کا معنی
۲۶۲	۱۴۳	مغفرت ذنوب پر قرآن مجید کی صراحت
۲۶۴	۱۴۴	کیا ہر گناہ کی سزا ملنی ضروری ہے
۳۶۴	۱۴۵	کون سے گناہ معاف ہو سکتے ہیں؟
۳۶۵	۱۴۶	گزشتہ اور آئندہ ملنے والی سزائوں کا فرق
۳۶۶	۱۴۷	مغفرت ذنوب کا صحیح مفہوم

## باب ۱۴

### ”مسئلہ شفاعت“

۲۸۱	۱۴۸	حدیث شفاعت پر اعتراض اور اس کا جواب
۳۸۷	۱۴۹	حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ”جھوٹ“
۲۸۸	۱۵۰	یوسف علیہ السلام اکرم الناس ہونے کے باوجود شفاعت کبریٰ کے مستحق کیوں نہیں
۳۹۰	۱۵۱	مسئلہ شفاعت پر عقلی اعتراض اور اس کا جواب

## باب ۱۵

### ”قرآن سے متضادم احادیث“

۲۶۲	۱۵۲	کیا حدیث میں اسلام لانے پر مجبور کرنے کی اجازت ہے؟
-----	-----	----------------------------------------------------

۲۹۲	زیر بحث حدیث کا صحیح مفہوم اور اس کی مطابقت	۱۵۳
۲۹۴	ازنداد کی سزا پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۵۴
۲۹۷	ازنداد کی سزا کا پس منظر	۱۵۵
۲۹۸	ازنداد کی سزا دین و عقل کی روشنی میں	۱۵۶
۳۹۹	ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۱۵۷
۴۰۰	ایمان بالرسول کا تقاضا	۱۵۸

## باب ۱۶

### ”غلامی اور اسلام“

۲۰۱	کیا قرآن لونڈی غلام کے مسائل سے خاموش ہے؟	۱۵۹
۱۰۵	قرآن مجید سے لونڈی غلاموں کے مسائل کی فہرست	۱۶۰
۱۰۶	کیا مسلم کافر کا غلام بن سکتا ہے؟	۱۶۱
۲۰۷	قرآن مجید سے مسلمین کے قیدی بن جانے کا ثبوت	۱۶۲
۲۱۱	غلامی کے متعلق حدیث اور برقی صاحب کی غلط فہمی	۱۶۳
۲۱۲	اسلام میں غلاموں کے قابل رشک حقوق	۱۶۴
۲۱۳	مومن کے غلام کی قابل رشک زندگی	۱۶۵
۲۱۵	غلامی کا مکمل انسداد کیوں نہیں کیا گیا؟	۱۶۶
۲۱۷	غلامی کی رہائی کے لیے اسلام نے کیا کیا؟	۱۶۷
۲۱۸	برقی صاحب کا تحقیق نہ کرنا	۱۶۸

## باب ۱۷

### ”تقدیر“

۲۱۹	تقدیر کا تخیل قرآن اور حدیث میں	۱۶۹
۲۲۲	تقدیر کا فائدہ	۱۷۰

## باب ۱۸

### ”متضاد احادیث“

۲۲۴	جہنم میں عورتوں کی کثرت پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۷۱
۲۲۷	جنگ بنو نضیر میں درخت کاٹنے پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۷۲
۲۲۸	ڈاکوؤں اور ظالموں کی عبرت ناک سزاؤں پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۷۳



۲۳۱	نخوست کے متعلق غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۱۷۴
۲۳۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھول پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۷۵
۲۳۶	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر میں دیر سے اٹھنا۔ برق صاحب کی غلط فہمی	۱۷۶
۲۳۷	قبلہ کی طرف منہ کر کے قضائے حاجت کرنا۔ تعارض احادیث کا جواب	۱۷۷
۲۳۸	حالت احرام میں شکار۔ احادیث میں تعارض کا جواب	۱۷۸
۲۴۰	حالت احرام میں خوشبو لگانا۔ دو حدیثوں میں تعارض کی حقیقت	۱۷۹
	کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ دو حدیثوں میں تعارض کی حقیقت کی تحقیق	۱۸۰
۲۴۱	شہد نہ کھانے کا عہد۔ برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۱۸۱
۲۴۲	معراج کی حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۸۲
۲۴۶	”غیر النساء“ کے متعلق برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۱۸۳
	<b>باب ۱۹</b>	
	<b>”چند دلچسپ احادیث“</b>	
۲۴۹	سورج کے سجدہ کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۸۴
۲۵۲	سورج کا شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع ہونا	۱۸۵
۲۵۲	مکھی کے ایک پر میں شفا ہونا	۱۸۶
۲۵۶	اولاد کی ماں باپ سے مشابہت کے اسباب	۱۸۷
۲۵۹	مرغ کا فرشتہ کو دیکھنا۔ برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۱۸۸
۲۶۰	تین سلام کرنے اور کسی بات کو تین دفعہ دہرانے پر اعتراض اور اس کا ازالہ	۱۸۹
۲۶۲	عرش الہی کا ہلنا اور اس پر اعتراض	۱۹۰
۲۶۲	قرآن مجید کا سات قرأتوں میں نزول۔ برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۱۹۱
۲۶۵	برق صاحب کا خلافت حقیقت بیان	۱۹۲
۲۶۵	کھجور کے تنے کا رونا۔ برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۱۹۳
۲۶۶	معجزہ کا ثبوت قرآن کریم سے	۱۹۴
۲۶۸	مسلمین کو معجزہ دکھانے پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۹۵
۲۶۹	فروق کی بنیاد تقلیدی اختلاف سے قائم ہوئی ہے	۱۹۶

۲۷۰	چھپکلی کو قتل کرنے میں حکمت	۱۹۷
۲۷۱	برق صاحب کی عجیب و غریب غلط فہمی	۱۹۸
۲۷۱	حضرت جبریلؑ کے پروں پر اعتراض	۱۹۹
۱۰۳	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ختنہ پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۰۰
۲۰۵	حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیویوں کے پاس دورہ کرنا	۲۰۱
۲۷۷	بعض احادیث کے متعلق برق صاحب کی غلط فہمی	۲۰۲
	<b>باب ۲</b>	
	”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“	
۱۸۱	تدوین احادیث کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ	۲۰۳
۱۸۳	برق صاحب کا پسے اور جھوٹے کی روایت کو مساوی درجہ دینا	۲۰۴
۲۸۲	بہر صحیح بات کو حدیث ماننے کا نظریہ اور اس کی خرابی	۲۰۵
۲۸۵	اسناد ضروری کیوں ہیں ؟	۲۰۶
۲۸۶	حدیث کا وحی ہونا	۲۰۷
۲۹۱	کیا دینی مسائل مشورہ سے طے کیے گئے ؟	۲۰۸
۲۹۳	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کی شرعی حیثیت	۲۰۹
۲۹۷	قرآن مجید کے علاوہ وحی کا نزول	۲۱۰
	صحت احادیث کے لئے برق صاحب کے تجویز کردہ معیاروں کا جائزہ قرآن کریم	۲۱۱
۵۰۰	کی روشنی میں	
۵۲۶	نعمیمہ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و اطاعت کے متعلق قرآنی آیات	۲۱۲



گر وہ ایک جو یا تھا علمِ نبی کا      لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا  
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذبِ نفی کا      کیا فانیہ تنگ ہر مدعی کا

کئے جرح و تعدیل کے وضع قانون

نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو      اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو

سنا خازنِ علمِ دین جس بشر کو      لیا اُس سے جا کر خبر اور اثر کو

پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پر رکھ کر

دیا اور کو خود مزا اس کا چکھ کر

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا      مناقب کو چھانا مثالب کوتایا

مشائخ میں جو بُخ نکلا جبتایا      ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا

طلسمِ ورع ہر مقتدر کا توڑا

نہ ملا کو چھوڑا، نہ صوفی کو چھوڑا

( حالی )

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## تمہید

چند روز ہوئے ڈاکٹر غلام جیلانی برقی صاحب کی کتاب ”دو اسلام“ دیکھنے میں آئی، پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر ہو کر اس قسم کی باتیں! ڈاکٹریٹ کی ڈگری وسیع مطالعہ اور گہرے علم و تحقیقات کے بعد ملا کرتی ہے، وسیع مطالعہ سے ذہن صاف ہو جاتا ہے اور غور و فکر کی عادت پیدا ہوتی ہے، ایسا آدمی جب کسی بات کو سنتا ہے تو بغیر تحقیق کے اس کو قبول نہیں کرتا اور بغیر غور و فکر کے اس کو رد نہیں کرتا، لیکن تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے صرف حدیث ہی کا نہیں بلکہ قرآن مجید کا مطالعہ بھی سرسری کیا، اس وجہ سے اُن کو بہت سی غلط فہمیاں ہو گئیں، کتاب ”دو اسلام“ ان کی غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے اور ہماری یہ کتاب اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی غلط فہمیوں کو دور فرمائے۔ آمین۔  
برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”ملا سے مراد متعصب، تنگ نظر، کم علم اور کوتاہ اندیش واعظ اور امام مسجد ہے نہ کہ صحیح النظر عالم“ (دو اسلام حاشیہ ص ۲۷)

ہم بھی اس کتاب میں لفظ ”ملا“ کو انہی معنوں میں استعمال کریں گے جن معنوں میں ڈاکٹر صاحب نے استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم درحقیقت وہ ہے جو صحیح النظر ہو، قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کو راسخ فی العلم کہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب ایک اور جگہ رقم طراز ہیں

”بحمد اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گزرے تھے جنہوں نے ایسے تمام واقعات

پر سخت تنقید کی، فجز اھم اللہ احسن الجزاء“ (دو اسلام ص ۹)

ہم بھی اس کتاب میں جہاں کہیں عالم کا لفظ استعمال کریں گے تو انہی معنوں میں استعمال کریں گے جن معنوں میں ڈاکٹر صاحب نے استعمال کیا ہے۔



**جماعت حقہ یعنی جماعت المسلمین** | ڈاکٹر صاحب شاید ناواقف نہ ہوں کہ اس امت میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہی جو تمام خرافات، بدعات، موضوعات، مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم سے اسی طرح بیزار تھی جس طرح خود ڈاکٹر صاحب بیزار ہیں اور الحمد للہ ایسی جماعت اب بھی موجود ہے۔ ایک بات اور ذہن نشین کر لیجیے، یہ جماعت فرقہ کی حیثیت سے کبھی نمودار نہیں ہوئی، نہ اس نے اپنا کوئی فرقہ دارانہ امام بنایا جس کی وہ تقلید کرتی ہو، نہ فرقہ دارانہ کتابیں تصنیف کیں جو دوسرے فرقوں کے لیے ناقابل حجت ہوں، اس جماعت کا اصول وہی ہے جو صحابہ کرام کا تھا، یعنی ”قرآن و حدیث“ پر عمل کرنا یا دوسرے نغظوں میں ”اتباع رسول“، یہ جماعت انہی احادیث کو واجب العمل سمجھتی ہے جن کے متعلق برق صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ :-

”اس طرح کی ہزار ہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔“  
(دو اسلام ص ۳۴۲)

”یہ تمام تفصیل احادیث میں ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں۔“ (دو اسلام ص ۳۴۳)

”اس میں کلام نہیں کہ حضور کے ان اوصاف جمیلہ کا چرچا صرف احادیث کی بدولت ہوا اور ہم حدیث کے اس گراں بہا ذخیرے پر ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔“ (دو اسلام ص ۱۹۹)

برق صاحب! یہ جماعت خود ساختہ اسلام کو اتنا ہی بُرا سمجھتی ہے جتنا آپ گھڑی ہوئی احادیث سے اتنا ہی بیزار ہے جتنا آپ، لہذا آپ یہ نہ سمجھیے کہ اس معاملہ میں آپ تنہا ہیں، بلکہ یہ پوری جماعت بھی آپ کے ساتھ ہے، ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض صحیح احادیث کے متعلق آپ کو غلط فہمی ہو گئی جس کے ازالہ کے لئے یہ کتاب لکھی جا رہی ہے۔

**آغاز ازالہ** | اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم ڈاکٹر صاحب کی غلط فہمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ڈاکٹر صاحب ”دو اسلام“ کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

”یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے، میں قبلہ والد صاحب کے ہمراہ امرتسر گیا، میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا، جہاں نہ بلند عمارات، نہ مصفا سڑکیں، نہ کاریں، نہ بجلی کے قلمتے اور نہ اس وضع کی دکانیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ لاکھوں کے سامان سے سچی ہوئی دکانیں اور بورڈ پر کہیں رام بھیجا سنت رام لکھا ہے، کہیں دنی چند اگر وال .... ہال بازار کے اس سرے سے اُس سرے تک کسی مسلمان کی کوئی دکان نظر نہیں آئی۔



ہاں مسلمان ضرور نظر آئے، کوئی بوجھ اٹھا رہا تھا، کوئی گدھے لاد رہا تھا۔ غیبِ مسلم  
کاروں اور فتنوں پر جارہے تھے اور مسلمان اڑھائی من بوجھ کے نیچے دبا ہوا مشکل  
سے قدم اٹھا رہا تھا۔۔۔ (دو اسلام ص ۳۱)

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ہندوؤں کے پاس مال و دولت کی فراوانی اور مسلمانوں کو مفلوک الحال  
دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کو حیرت ہوئی کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا  
سبب یہ حدیث ہے ”الدُّنْيَا جُفُفَةٌ وَحُلَّةٌ بَهَا كَلَاهُ بٌ“ یہ دنیا ایک مردار ہے، اور اس کے  
مٹلاشی کتے ہیں (دو اسلام ص ۱۵) برقی صاحب نے اس حدیث کا مطلب بھی بعض ملاؤں سے  
دریافت کیا، لیکن تسلی نہیں ہوئی، اور اس طرح احادیث کے متعلق ان کی غلط فہمیوں کا آغاز ہوا۔  
غلط فہمی سے برقی صاحب کا سب سے زیادہ اعتراض اسی روایت پر ہے، لہذا اس غلط فہمی کا ازالہ  
تفصیل کے ساتھ درج ذیل ہے۔

**جملہ مقررہ** برقی صاحب نے صرف امرتسری کو دیکھا، اگر وہ کہیں دہلی، بمبئی، کلکتہ، حیدرآباد،  
دیگر مشہور شہر دیکھتے تو انہیں ہندوؤں کے دوش بدوش اور ان کے ہم پلہ مسلمانوں  
کی بھی دکانیں نظر آتیں، بلکہ اگر وہ اس وقت پاکستان کے کسی بھی چھوٹے یا بڑے شہر کو دیکھیں تو مسلمانوں  
کی لاتعداد پر رونق دکانیں جگمگاتی نظر آئیں گی، حالانکہ ان مسلمانوں کا اسلام وہی اسلام ہے جو امرتسر  
کے ان مسلمانوں کا تھا، جن کا ذکر برقی صاحب نے کیا ہے۔

**انتباہ** برقی صاحب کو بڑی غلط فہمی ہوئی۔ ایسی کوئی حدیث نہیں جس کے یہ الفاظ ہوں۔ یہ کسی  
اور شخص کا قول ہے جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے قرآن و حدیث کی ترجمانی کرتا ہے۔

**حق و باطل کا غلط معیار** قبل اس کے کہ ہم قول مذکور کے صحیح مطلب کی وضاحت کریں یہ  
یہتر ہوگا کہ امرتسر میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہم اس  
سلسلہ میں انہیں قرآن مجید کی چند آیات کی سیر کریں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

۱۔ فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ  
قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ  
الدُّنْيَا لَمِيتٌ لَّنَا مَثَلُ مَا أُوتِيَ  
قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ

ایک دن قارون اپنے ساز و سامان اور  
کروفر کے ساتھ نکلا، تو ان لوگوں نے  
جو دنیا کے طالب تھے، کہا اے کاش  
جو مال و اسباب قارون کو دیا گیا ہے  
ہمیں بھی ملتا۔ واقعی یہ بڑا خوش قسمت

(القصاص ۹، ۱۰)

ہے۔



۲۔ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ  
وَيَلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ  
أَمِنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا  
يُلْقِيهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ •

(القصص - ۸۰)

اور جو اہل علم تھے، انہوں نے کہا، تم پر  
افسوس ہے، جس شخص نے ایمان قبول کیا،  
اور نیک عمل کئے اس کے لیے تو اللہ کا ثواب  
بہتر ہے اور یہ چیز ان ہی کو ملتی ہے جو  
صابر ہیں۔

نتیجہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کا ذکر بُرائی کے ساتھ کیا، جو دنیا کے طالب تھے اور اُن لوگوں  
کو کہ علماء کا خطاب دیا جن لوگوں نے اس کی طرف توجہ بھی نہیں کی بلکہ وہ صرف ایمان اور  
عمل صالح کے ثواب کے خواہاں رہے، آیت ۷۷ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ثواب ان ہی  
کے لوگوں کے پیش نظر ہوتا ہے جو صابر و قانع ہوتے ہیں اور دنیا کے حریص نہیں ہوتے۔ بہر حال  
آیات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ دنیا اچھی چیز نہیں اور اس کے طالب بھی اچھے نہیں۔

اس کے آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

۳۔ فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ

(القصص - ۸۱)

پھر ہم نے قارون کو مع اس کے محل کے  
زمین میں دھسا دیا۔

پھر کل جو لوگ قارون کے مثل بنے  
کی تمنا کرتے تھے، صبح کو کہنے لگے،  
افسوس یہ رزق تو اللہ اپنے جس بندے  
کو چاہتا ہے فراخی سے دیتا ہے، اگر  
اللہ کا احسان نہ ہوتا تو ہم بھی دھسا دیے  
جاتے، افسوس کہ کافروں کے لئے فلاح  
نہیں ہے۔

۴۔ وَأَمْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ  
بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيَكُنَّ  
اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ  
يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَوْ لَا  
أَرَأَيْتُمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَيْنَا لَخَسَفَ  
بِنَا وَيَكُنَّ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ

(القصص - ۸۲)

نتیجہ دنیاوی مال و دولت کے حریص کا انجام اچھا نہیں ہوتا، دنیاوی مال و دولت اگر کسی کے  
پاس زیادہ ہو اور مومنین کے پاس اس کی قلت ہو، تو یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اس  
مالدار سے خوش ہے اور فقراء مومنین سے ناراض ہے، قارون بہت مالدار تھا اور موسیٰ علیہ  
السلام اور ان کے اصحاب اس کے مقابلہ میں تنگ حال تھے اور اللہ ان تنگ حال مسکین ہی سے  
خوش تھا، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ضرور کوئی نہ کوئی خامی تھی جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام  
اور ان کے اصحاب تنگ حال تھے، کیا کوئی حدیث اسلام تھا جس نے انہیں اس درجہ پر پہنچا یا تھا،  
برقی صاحب امر سر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مختلف حالات میں دیکھ کر آپ متعجب نہ ہوں، موسیٰ



علیہ السلام اور قارون بھی ایسے ہی مختلف حالات میں تھے، اس میں حیرت و استعجاب کا کون سا مقام ہے۔

برق صاحب اب ذرا اوپر چلئے۔ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے صحابہ کرام کی حالت ملاحظہ فرمائیے۔

۵۔ تَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا  
مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا  
بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ  
اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا  
بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَى لَكُمْ  
عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ  
كَاذِبِينَ ۝

کافروں کے سرداروں نے نوح علیہ الصلوٰۃ  
والسلام سے کہا، ہم تو تم کو اپنے ہی جیسا  
آدمی سمجھتے ہیں، اور ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ  
تمہارے تابعین صرف وہی لوگ ہیں جو  
ہم میں سب سے زیادہ رذیل اور کم عقل  
ہیں اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تم کو ہم پر کسی  
قسم کی فوقیت حاصل نہیں، بس ہم تو یہی  
خیال کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نتیجہ | برق صاحب مسلمانوں کی زبانوں میں کو دیکھ کر جو نتیجہ آپ نے نکالا ہے، بالکل وہی نتیجہ نوح  
علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے نکالا تھا، یہ کافر سردار تھے، صاحب فضل تھے اور نوح  
علیہ السلام کے صحابہ کرام فاقہ کش اور کافروں کی نگاہ میں بے عقل سمجھے جاتے تھے، لہذا کافروں نے ان کو  
گمراہ سمجھا اور اپنے کو حق پر۔

غیر الامم کی حالت | برق صاحب اب ان مسلمین کی حالت ملاحظہ فرمائیے، جو خلاصہ اہم تھے،  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۶) وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ  
لِيَتَحِمَلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا  
أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَ  
أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ  
حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا  
يُنْفِقُونَ ۝

(اے رسول) جہاد میں نہ جانے کا انہ  
لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جو آپ کے پاس  
آتے ہیں کہ آپ ان کو سواری دیں تو آپ  
کہہ دیتے ہیں، کہ میرے پاس تو کچھ نہیں  
جس پر میں تمہیں سوار کر سکوں، وہ لوگ  
واپس ہو جاتے ہیں اور اس غم سے کہ ان  
کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں، ان کی  
آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

گناہ تو ان لوگوں پر ہے جو باوجود مالدار

الترتبه

۹۲۰

وَمَا إِلَيْنَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ



لَيْسَتْ اَذُنُكَ وَهْمًا غِيَاوًا عُرَا  
بِاَنْ يَّكُونَا مَعَ الْخَرَالِفِ وَطَبَعَ  
اللّٰهُ عَلٰى ذُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا  
يَعْلَمُوْنَ ۝

(التوبة)

ہونے کے جہاد پر نہ جانے کی اجازت  
مانگتے ہیں، یہ اس پر راضی ہیں، کہ زنان  
پس ماندہ کے ساتھ بیٹھے رہیں، اللہ تعالیٰ  
نے ان کے قلوب پر مہر لگا دی ہے وہ  
کچھ نہیں سمجھتے۔

**نتیجہ** | نہ صحابہ کرام کے پاس خروج کرنے کو مال تھا نہ اللہ کی زمین پر قائم ہونے والی سب سے بہتر  
حکومت کے پاس کچھ تھا کہ مسلمین کے لئے سامان جہاد مہیا کرتی، دنیا کی آنکھوں نے جس سے  
بہتر انسان نہ دیکھا ہو، وہ انسان، وہ مقدس ترین اللہ کا رسول اور مومن کامل یہ کہہ رہا ہے کہ میرے  
پاس کچھ نہیں، یہ کون سا اسلام تھا جس کے باعث وہ مقدس ترین انسان تنگ حال تھا، آج کل کے  
مسلمین تو حدیثی اسلام کی وجہ سے تنگ حال ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے متعلق  
کیا کہا جائے۔ پورا عرب نتج ہو چکا ہے لیکن تنگ حالی موجود ہے، برخلاف اس کے منافق مالدار تھے  
اور جہاد سے گریز کرتے تھے نتیجہ ظاہر ہے کہ دنیاوی عیش و راحت کی فراوانی سے حق و باطل میں امتیاز  
نہیں ہوتا۔

**ہر رسول کے زمانہ میں کافر خوش حال تھے** | مندرجہ ذیل آیات کو ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ  
فرماتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ  
إِلَّا قَالُوا مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلُونَ  
بِهِ كَافِرُونَ ۝

(سبا: ۳۲)

ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا تو اس  
بستی کے خوشحال لوگوں نے کہا، کہ ہم تو  
اس چیز کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم کو  
بھیجا گیا ہے۔

وَقَالُوا نَحْنُ أَحْضَرُوْا مَوَالِدًا  
وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝

(سبا: ۳۵)

اور کہا، کہ ہمارے پاس مال و اولاد کی  
کثرت ہے اور ہم کو عذاب نہیں دیا  
جائے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ  
يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَكِنَّ اَكْثَر النَّاسِ  
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(سبا: ۳۶)

اے رسول کہہ دیجئے کہ میرا رب جس کے  
لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے  
اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا  
ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔



**ایک شبہ اور اس کا ازالہ** | یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں مسلمین کی جو حالت بیان کی گئی ہے وہ ابتدائی دور کی ہے، لیکن جب انہوں نے اللہ کے راستہ میں قدم رکھا اور صبر و استقامت کو ملحوظ رکھا، تو پھر مالدار ہو گئے، یہ شبہ حقیقت پر مبنی نہیں، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مسلمین کو مال و دولت کی فراوانی بخشی گئی، پھر بھی یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ موسے علیہ السلام اور ان کے اصحاب میں سے ہر شخص کو اتنا ہی مال مل گیا تھا جتنا قارون کو، بلکہ مومن ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب میں سے ہر شخص اتنا ہی مالدار ہو گیا تھا، جتنا اس زمانے کے یہودی تھے یا اسلامی حکومت اسی جاہ و شہرت کی مالک ہو گئی تھی، جو سلاطین روم اور ایران کے ہاں تھی، اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ مومن کی آخرت بھی اچھی اور اسی نسبت سے دنیا بھی اچھی، تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا تمام انسانوں کے مقابلہ میں اچھی ہونی چاہیے تھی اور آپ کے پاس عیش و راحت، ساز و سامان کی اتنی فراوانی ہونی چاہیے تھی کہ کسی انسان کو اتنی فراوانی میسر نہ ہوتی، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسرت کا جو نقشہ آیت بالا میں کھینچا گیا ہے، یہ ابتدا کی بات نہیں ہے بلکہ اس زمانہ کی بات ہے جب پورا عرب فتح ہو چکا تھا اور اسلامی فوجیں حدود عرب کو عبور کر کے تبوک پر یلغار کر رہی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں سے صرف پُر سال باقی رہ گیا تھا، اب اگر کوئی شخص اس معیار پر کہ مسلمین کے پاس دنیاوی سامان کی کمی ہے، مسلمین کو گمراہ سمجھ بیٹھتا اور عہد رسالت ہی میں اس کا انتقال ہو جاتا تو بتائیے کیا آپ کہہ سکتے تھے کہ اس کا معیار حق و باطل صحیح تھا، ہرگز نہیں، نوح علیہ السلام کی قوم کی گمراہی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے اُن کی گمراہی کا اصل سبب یہی معیار تھا لیکن کیا وہ قوم اس معاملہ میں حق بجانب تھی؟ ہر زمانہ میں مسلمین کی اکثریت کافروں کی طرح مالدار نہ ہو سکی، نہ یہ حدیث کو مانتے کا نتیجہ اُس وقت تھا نہ اب ہے۔

**دنیا کی مذمت اور قرآن** | کیونکہ برق صاحب کی غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ یہی غلط معیار دنیا کی مذمت اور قرآن ہے لہذا ہم بھی اس پر قدرے تفصیلی روشنی ڈال رہے ہیں آیات بالا سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ دنیا ایک بے حقیقت شے ہے، انبیاء علیہم السلام کے پاس نہ ابتدائی دور میں اس کی فراوانی ہوئی نہ آخری دور میں۔

قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کے طالبین کو اہل علم میں شمار نہیں کیا، بلکہ دنیا کو حقیر سمجھنے والوں کے لیے اہل علم کا لقب استعمال کیا، اس سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوا کہ دنیا اچھی چیز نہیں، اس کی مزید برائی کے لیے چند اور آیات ملاحظہ فرمائیں۔

۸۔ لَا يَغْنَىٰ لَكَ تِلْكَ تَفَلُّهُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا شَرُّوْنَ فِي كَافِرُوْنَ كِي اَمْدُوْنَ زَمَنًا



فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ  
مَا لَهُمْ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ

(ال عمران - ۱۶۶)

آپ دھوکہ میں نہ آجائیں یہ ساز و سامان  
بہت تھوڑا ہے، پھر ان کا ٹھکانہ جہنم  
ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے :-

۸ - وَلَا تَعْجَبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَ  
أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ  
أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا  
وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ

(التوبة - ۸۵)

اور کافروں کے اموال اور کافروں کی  
اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالے۔ ان کے  
ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیاوی عذاب  
دینا چاہتا ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ ان  
کی جانیں ایسی حالت میں نکلیں کہ وہ  
کافر ہوں۔

نتیجہ | شہروں میں کافروں کا تجارت کی غرض سے آنا جانا اور ان کی تاجرانہ چہل پہل، ان کی فوجوں  
کا شہر و شہر مظاہرہ و جلوس، مال اور اولاد کی کثرت، ایک بے حقیقت شے ہے اس سے  
دھوکہ نہ کھانا چاہیے حتیٰ اور یہی چیز ہے جس کا معیار اس دنیا کی زیب و زینت نہیں۔

۹ - وَلَا تَمْدَدْ عَيْنُكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا  
بِهِمْ أَنْزَلْنَا مِنْهُمْ مَرْهَةً  
الْحَبْوَةَ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ  
وَرَبُّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَى ه  
طه

کافروں کو جو مال ہم نے دے رکھا ہے  
اس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو، یہ محض  
دنیاوی جاہ و شہمت ہے، تاکہ ہم اس میں  
ان کی آزمائش کریں اور تمہارے  
رب کا رزق بہتر ہے اور زیادہ باقی  
رہنے والا ہے۔

۱۳۱

نتیجہ | آیت سے ظاہر ہے کہ دنیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا بھی اللہ تعالیٰ کو پسند  
نہیں، اگر یہ دنیا اچھی چیز ہوتی، تو اللہ تعالیٰ اس کی طمع سے کیوں روکتا اور مسلم کیوں  
کافروں کے مقابلہ میں دنیا سے محروم ہوتے، جب صحابہ کرام جن کی ایمانی قوت کی مناسبت سے  
ان کی دنیا بھی اتنی اچھی ہوتی چاہیے تھی، کافروں کے مقابلہ میں پسماندہ تھے تو آج پسماندگی کا سبب  
حدیث کو قرار دینا کہاں تک صحیح ہے، اگر کوئی یہ کہہ دے کہ صحابہ کرام کی محرومی کا سبب قرآن تھا،  
جس نے دنیا کی طرف نظر اٹھانے کی بھی ممانعت کر رکھی تھی تو آخر اس الزام کا کیا جواب ہوگا، کیا  
آپ انصاف سے کہہ سکتے ہیں کہ جو جواب قرآن مجید کی طرف سے دیا جائے گا، وہی جواب حدیث کی  
طرف سے نہیں دیا جاسکتا۔



جنگ احد میں مسلمان کی عارضی شکست کے اسباب بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ تم دنیا کی طرف مائل ہو گئے۔  
ارشاد باری ہے :-

۱۰۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحْسَبُونَهُمْ بِأَذْنِهِ حَتَّى إِذَا فَتِلْتَمَ وَتَنَاءَ عَنَّمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِمَّا بَعْدَ مَا أَرَاكُمْ مَا تَحْبَبُونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَّفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ

اللہ نے تو اپنا وعدہ سچا کر دکھایا کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قلع تھم کر رہے تھے، اسی اثناء میں تم نے بُز دلی کا مظاہرہ کیا اور حکم کی تعمیل میں اختلاف کیا اور حسب دلخواہ فتح آجانے کے بعد نافرمانی کی، بات یہ ہے کہ تم میں سے بعض دنیا کے طالب ہیں اور بعض آخرت کے طالب ہیں، پھر اللہ نے تم کو کافروں سے روک لیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔

دال عمران - ۱۵۲

فَاثَابَكُمْ غَنًّا بِغَيْرِ دَالِ عَمْرٍ ۱۵۳

**نتیجہ** آیت بالا میں دنیا کے طالبین کی کتنی سخت مذمت ہے، کیا اب بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی طلب اچھی چیز ہے۔

ازواج مطہرات کے متعلق ارشاد باری ہے :-

لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ

اے نبی کی بیویو، کوئی عورت بھی تمہارے مثل نہیں (یعنی ہر عورت سے تمہارا مرتبہ

بالا ہے۔)

(الاحزاب - ۳۲)

یہ آیت ازواج مطہرات کی فضیلت کے لیے نص قاطع ہے، مگر یہ فضیلت ہے کس سبب سے؟ دینی شغل اور انہماک، تقویٰ اور پاکیزگی کی وجہ سے، اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسی نسبت سے ان کی دنیا بھی بہتر ہوتی، لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ان کو دنیا ملنا تو کجا، دنیا کی طلب سے بھی روکا جاتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

۱۱۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قَدْ لَازَ وَاجِدَكَ إِنَّ كُنْتُمْ تَرُدُّنَ الْهَبْرَةَ الدُّنْيَا وَنَرِيْنَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَ

اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی ہمار کی طالب ہو تو آؤ میں تم کو مال و متاع دے



أَسْرَحَكَ سَرَّاحًا جَبِلًا ۝ (الاحزاب ۲۸)  
 ۱۲- وَإِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ وَمُرْسُولَهُ  
 وَالْدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ  
 لِلْمُحْسِنِينَ مَنَاجِدَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝  
 (الاحزاب ۲۹)

کراچی طرح سے رخصت کر دوں۔  
 اور اگر تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول  
 اور دارِ آخرت مطلوب ہے، تو پھر تم میں  
 سے نیک کرداروں کے لئے اللہ نے اجر  
 عظیم تیار کر رکھا ہے۔

**نتیجہ** | دنیا اگر اچھی چیز ہوتی تو ازواجِ مطہرات کو اس سے کیوں روکا جاتا، ظاہر ہے کہ دنیا میں کچھ نہ  
 کچھ خرابی ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو ازواجِ مطہرات کے لئے ناپسند فرماتا ہے اور ان  
 سے صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ یا تو دنیا لے لو اور رسول سے علیحدہ ہو جاؤ یا اللہ، رسول اور آخرت لے  
 لو اور دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔

برقی صاحب حدیث ہی کو الزام نہ دیکھیے، قرآن مجید کو غور سے پڑھیے، جو بات وہاں ہے  
 وہی یہاں ہے، کیا یہ آیت اس بات کی ترجمانی نہیں کرتی کہ مسلمان کے لئے آخرت اور کافروں کے لئے  
 دنیا، مسلمان کو آخرت کی طرف نظر رکھنی چاہیے اور دنیا کی طلب سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے، اللہ والوں  
 کے لئے یہ جگہ عیش و راحت کی جگہ نہیں۔

۱۳- مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَ  
 زِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا  
 وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۚ أُولَٰئِكَ  
 الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ  
 إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا  
 فِيهَا وَبُطِلَ كَمَّا كَانُوا  
 يَعْمَلُونَ ۝

جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کی زیب و  
 زینت کا طالب ہو تو ایسے لوگوں کو ہم  
 ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا  
 دے دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں  
 کوئی کمی نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کے لئے  
 آخرت میں کچھ نہیں سوائے آگ کے، جو  
 کچھ عمل انہوں نے دنیا میں کئے تھے وہ  
 سب ضائع ہو گئے اور جو کچھ وہ کرتے  
 تھے، سب باطل تھا۔

(ہود: ۱۵-۱۶)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم  
 اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور  
 جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو، ہم اس کو  
 اس میں سے دے دیں گے لیکن آخرت  
 میں اس کا کچھ بھی حصہ نہیں ہوگا۔

۱۴- مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ  
 لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ  
 حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا  
 لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ ۝  
 (الشورى ۲۷)



**نتیجہ** آیات بالا سے ثابت ہوا کہ ہر شخص کے لئے دنیا کی طلب مذموم ہے، برخلاف اس کے آخرت کی طلب محمود ہے، طالب دنیا کے لئے سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں، پھر بھی اگر دنیا مردار نہیں تو اور کیا ہے، اور اس کا طالب کتنا نہیں تو پھر کیا ہے کہ آخرت میں اس کے لئے سوائے آگ کے کچھ نہیں، ایسا شخص تو کتے سے بھی بدتر ہے کہ دنیا کی طلب میں لگا ہوا ہے جس کا نتیجہ سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں، کیا یہ آیتیں قول زیر بحث کی تائید نہیں کرتیں؟ کیا مسلمان کی زبوں حالی کی ذمہ داریہ آیتیں تو نہیں؟ برقی صاحب انصاف کیجیے۔ **هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ**۔

**دنیا کسے کہتے ہیں** اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دنیاوی عیش و راحت کے سامان مومن کے لئے پیدا ہی نہیں کئے گئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان دنیاوی نعمتوں کا احسان کیوں بتایا ہے اور مال و دولت کو اپنا فضل کیوں قرار دیا ہے۔

یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے دنیا کی صرف ایک قسم سمجھ رکھی ہے حالانکہ دنیا کی دو قسمیں ہیں، مومن کی دنیا اور کافر کی دنیا۔ جہاں کہیں قرآن و حدیث میں دنیا کا لفظ آیا ہے اس سے کافر کی دنیا مراد ہے، قرآن مجید نے کافر کی دنیا کی چند خصوصیات بیان کی ہیں جو مندرجہ ذیل آیات مبارکات میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) **وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمُ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ** (المجاشیرہ-۳۲)

کافر کہتے ہیں، اس دنیا کی زندگی کے علاوہ اور کوئی زندگی نہیں، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو صرف زمانہ کی گردش سے موت آتی ہے اس کے متعلق ان کے پاس کوئی علم نہیں وہ محض گمان کرتے ہیں۔

**نتیجہ** منکر قیامت کی دنیا، حساب و کتاب سے بے خونی کی دنیا ہے اور جب حساب و کتاب نہیں تو پھر ڈر ہی کس بات کا، خوب مزے اڑاؤ، ایسے آدمی کی دنیا اس مصرع کا مصداق ہوتی ہے

”بابر بہ عیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست“

(۲) **وَوَيْلٌ لِلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ۝ الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ ۝ (ابراہیم-۳۲)**

ان منکروں کے لئے بڑا سخت عذاب ہے جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی سے محبت کرتے ہیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

بَلْ تُوْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝

بلکہ تم دنیا کی زندگی کو تزئین دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی



(الاعلیٰ - ۱۴۶)

رہنے والی۔

اور کافر مرے اڑا رہے ہیں اور اس طرح  
کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے  
ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

(۳) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَيَتَمَتَّعُونَ وَ  
يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ  
وَالنَّارُ مَشْثُورَةٌ لَهُمْ ○ (محمد)

نتیجہ جانور ہر جگہ منہ مارتے ہیں، ان کو حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی، نہ حساب و کتاب کا خوف  
ہوتا ہے، بالکل یہی حالت کافر کی ہے کہ وہ حلال و حرام میں کوئی تمیز نہیں کرتا، جو کچھ مل جائے  
اور جس طرح مل جائے سب ہضم کر لیتا ہے، آخرت سے بالکل بے خوف ہوتا ہے۔

دنیا کی زندگی کچھ نہیں سوائے لہو و لعب  
کے اور آخرت تو انہی کے لئے ہے جو  
پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں، کیا اتنی  
سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟  
جان لو کہ دنیاوی زندگی لہو و لعب، زینت  
زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر  
فخر کرنا اور مال و اولاد میں کثرت کی خواہش  
کا نام ہے، اس دنیا کی مثال ایسی ہے  
جیسے پانی برسا، فصل اچھی ہوئی اور کسان  
اس کو دیکھ کر خوش ہوئے، لیکن پھر تم  
دیکھو گے کہ خشک ہو کر زرد ہو گئی اور پھر  
ریزہ ریزہ ہو گئی اور آخرت میں سخت  
عذاب بھی ہے اور اللہ کی طرف سے  
مغفرت اور رضوان بھی اور دنیا کی زندگی  
تو محض دھوکے کا سراپا ہے۔

(۴) وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَ  
لَهُمْ وَاللَّذَّاءُ الْأَخِرَةُ خَيْرٌ  
لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○  
(الاعلیٰ - ۳۲)

(۵) إِنَّمَا مَوَدَّةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لَعِبٌ  
وَلَهُمْ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ  
وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ  
غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ  
يَهْبِطُ فَتَذَرُوهُ كُفْرًا ثُمَّ  
يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ  
شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ  
وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَيَاةُ  
الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ○  
(الحديد - ۲۰)

زیادتی کی خواہش نے تم کو غافل کر دیا،  
یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔  
ہر عیب بیان کرنے والے اور غیبت  
کرنے والے کی خرابی ہے جس نے مال  
جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا، وہ یہ سمجھتا

(۶) أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّىٰ زُرْتُمُ  
الْمَقَابِرَ ○ (التكاثر - ۲۱)  
(۷) وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ○  
الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ○  
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ○ كَلَّا



لَيَنْبِذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝

(الہمزۃ ۱-۲)

ہے کہ یہ مال اُسے حیاتِ جاوداں بخشنے  
گا، ہرگز نہیں، بلکہ (ایک وقت آنے والا  
ہے جب) وہ دوزخ میں پھینک دیا  
جائے گا۔

اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ رکھے  
رکھو جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت  
کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کے طالب  
ہیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دنیاوی زندگی  
کی زینت کے طلب گار بن جاؤ اور اُن سے  
کنارہ کشی کر لو۔

(۸) وَاصْبِرْ لَفُتْسَادِ مَعَ الَّذِينَ

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ

وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ

وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ

تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

(الكهف - ۲۸)

**خلاصہ** | مندرجہ بالا آیات سے واضح ہوا کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں دنیا یہ ہے؛ ہوو لعب، نام  
نمود، فخر و ریاء، تکبر اور اترانا، مال و دولت کی حرص، مال جمع کرنا اور ننانوے کے پھیر  
میں رہنا، مال کو اس طرح ہڑپ کر جانا جس طرح جانور ہڑپ کر جاتے ہیں، دنیا کی زندگی کو آخرت  
پر ترجیح دینا، آخرت اور حساب و کتاب کا انکار کرنا، حلال و حرام کی تمیز کا اٹھ جانا، مال و دولت  
کے حصول میں اس قدر انہماک ہونا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے غفلت ہو جائے، اللہ والوں  
کو چھوڑ کر مال اور مالداروں کی طرف رغبت کرنا، فرائض کو ترک کرنا وغیرہ وغیرہ، اگر یہ دنیا مردار نہیں  
تو اور کیا ہے اور اس کے طالب کتے نہیں تو اور کیا ہیں؟ یہی وہ دنیا ہے جس کو مردار کہا گیا ہے اور  
اس کے طالب کو کتا، کاش برقی صاحب دنیا کے اصطلاحی معنوں پر جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئے  
ہیں غور کرتے تو کبھی غلط فہمی نہ پیدا ہوتی، اس مشہور مصرع میں کس خوبی سے ان اصطلاحی معنوں کو  
ادا کیا گیا ہے۔

”چھست دنیا بہ ازالہ غافل بدن“

یعنی دنیا کیا چیز ہے؟ دنیا نام ہے اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا، اور اگر اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو  
تو پھر یہ دنیا مؤمن کی دنیا ہے اور یہ اصطلاحی دنیا سے علیحدہ ایک چیز ہے، اللہ تعالیٰ مسلمین کو اس  
اصطلاحی دنیا سے علیحدہ رہنے کی بار بار تاکید فرماتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ

أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ

اے ایمان والو، تمہارے مال اور تمہاری

اولاد، تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرے



جو ایسا کرے گا تو ایسے ہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھائیں گے۔

ذِكْرُ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ  
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

(المنا فقون - ۹)

اے ایمان والو، تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش کی چیزیں ہیں، اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ  
وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

(التغابن - ۱۵)

یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ مال و اولاد کی محبت میں تم اللہ تعالیٰ کو بھول جاؤ اور اجر عظیم سے محروم ہو جاؤ

پھر فرمایا

اور جو شخص نفسانی حرص و طمع سے محفوظ رہا تو ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

وَمَنْ يَتَّقِ شَيْءَ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ  
الْمُفْلِحُونَ ۝ (التغابن - ۱۶)

الغرض مومن کی دنیا یہ ہے کہ نہ دنیا کی فراوانی اور اس کے حصول میں انہماک اس کو اللہ تعالیٰ سے غافل کرتا ہے اور نہ وہ اس کی حرص میں مبتلا ہوتا ہے، بلکہ وہ دنیاوی ساز و سامان کو آزمائش کی چیزیں سمجھتا ہے اور ان کو اس ہی طریقہ سے استعمال کرتا ہے جس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے استعمال کرنے کا حکم دیا ہے، ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد باری ہے۔

یہ ایسے لوگ ہیں، کہ تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ کے ذکر اور نماز ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔

وَجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ  
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَرَقَامِ الصَّلَاةِ وَآيَاتِهِ  
الرَّكَوۃِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ  
الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ۝

(النور - ۲۴)

مندرجہ بالا آیات بینات سے یہ بات واضح ہو گئی، کہ دنیا کا لفظ جہاں کہیں قرآن و حدیث میں آتا ہے وہاں اس سے مراد وہ دنیا ہوتی ہے جس میں مہینس کر انسان اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا، کہ ایسی دنیا یقیناً مراد ہے اور اس کے طالب کا ٹھکانہ سولے آگ کے اور کہیں نہیں، اب ہم اس آیت کو پیش کرتے ہیں، جو قول زیر بحث کے بالکل موافق اور لفظاً مطابق ہے، اور گویا قول زیر بحث اس ہی آیت کی تفسیر ہے،

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۹) وَآتِلْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ

(اے رسول، ان لوگوں کو اس شخص کا حال



اَيَاتِنَا فَاسْلَخْ مِنْهَا فَاتَّبِعْهُ  
الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝  
وَكُوْشِنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ  
اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ  
فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ  
تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ  
تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ

(الاعراف - ۱۷۵)

سنائیے، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں تھیں،  
لیکن اس نے ان سے روگردانی کی، پھر  
شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ اور وہ گمراہوں  
کی جماعت میں داخل ہو گیا، اور اگر ہم چاہتے  
تو ان آیات کی بدولت اس کا مرتبہ بلند کر  
دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا،  
اور اپنی خواہش کی پیروی کی، پس اس کی  
مثال کتے کے مانند ہے کہ اگر اس پر بوجھ  
رکھا جائے تو بائپے اور اگر چھوڑ دیا جائے  
تو بھی بائپے۔

کتابہر حال میں پاپنا رہتا ہے، خواہ راحت ہو یا تکلیف، اور کہیں کوئی کھانے کی چیز مل  
جائے تو پھر دوسرے کتے کی شرکت اس کو گوارا نہیں ہوتی، اپنے ہم جنس کو دیکھ کر بھونکنے اور  
بھنبونے لگتا ہے، بالکل اسی طرح جب انسان کی بھی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ احکام الہی کو چھوڑ کر  
اپنی خواہش پر چلتا ہے، دنیا کی فراوانی ہو تو اور زیادہ ملنے کی حرص کرتا ہے۔ تنگ دستی اور فلاس ہو تو  
مال و دولت کے لئے تڑپتا ہے، چاہتا ہے کہ دنیا صرف میرے لئے ہو، تو اس کی یہ دنیا بمنزلہ  
مردار کے ہوتی ہے اور وہ مثل کتے کے ہوتا ہے، اور یہ مثل اس پر صادق آتی ہے کہ دنیا مردار  
ہے، اور اس کے طالب کتے ہیں۔

نتیجہ آیت بالا سے ثابت ہوا کہ احکام الہی کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کرنا ”دنیا“ ہے  
اور یہ دنیا اسی طرح حرام ہے، جس طرح مردار اور اس کے چاہنے والے مثل کتوں  
کے ہیں۔

آخری گزارش غالباً اب قول زیر بحث کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہوگا، ان تمام  
مباحث میں ہم نے دنیا کے اصطلاحی معنوں کے لئے قرآن مجید کا حوالہ دیا  
ہے، اب ہم ان اصطلاحی معنوں کے ثبوت کے لئے ایک حدیث کا حوالہ دے کر اس بحث کو ختم  
کرتے ہیں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں :-

اِنَّ اَنْبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ  
سَلَّمَ جَلَسَ ذَاتَ يَوْمٍ عَلَى

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر  
بیٹھ گئے اور ہم لوگ آپ کے گرد بیٹھ گئے،



الْمُنِيرَ وَجَلَسْنَا حَوْلَهُ فَقَالَ  
 إِنِّي مِمَّا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِمَّنْ  
 بَعْدِي مَا يَفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ  
 ذَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزَيْنَتِهَا فَقَالَ  
 رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَوْ يَأْتِي  
 الْخَيْرُ بِالشَّرِّ فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى  
 اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيلَ لَهُ مَا  
 شَأْنُكَ تُكَلِّمُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا يُكَلِّمُكَ فَرَأَيْنَا  
 أَنَّهُ يُنْزَلُ عَلَيْهِ قَالَ فَمَسَحَ عَنْهُ  
 الرُّحْضَاءُ فَقَالَ آيْنَ السَّائِلُ وَكَانَتْ  
 حِمْدُهُ فَقَالَ إِنَّهُ لَا يَأْتِي الْخَيْرُ بِالشَّرِّ  
 وَإِنْ مِمَّا يُنْبِئُ الرَّبِيعُ يَقْتُلُ أَوْ  
 يُبْلِغُ إِلَّا أَكَلَةَ الْخَضِرَاءِ أَكَلَتْ  
 حَتَّى إِذَا امْتَدَّتْ نَحَايَتُهَا اسْتَقْبَلَتْ  
 عَيْنُ الشَّمْسِ فَتَلَطَّتْ وَبَالَتْ وَدَكَعَتْ  
 وَإِنَّ هَذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلُوهٌ فَنَعْمَ  
 صَاحِبُ الْمُسْلِمِ مَا أَعْطَى مِنْهُ الْمُسْكِينُ  
 وَالْيَتِيمَ وَابْنَ السَّبِيلِ أَوْ كَمَا قَالَ  
 النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنَّهُ مَنْ  
 يَأْخُذْهُ بِغَيْرِ حَقِّهِ كَالَّذِي يَأْكُلُ وَلَدَ  
 يَشْبَعُ وَيَكُونُ شَعِيدًا عَلَيْهِ يَوْمَ  
 الْقِيَمَةِ رَحِيحُ بَخَارِي كِتَابِ  
 الزَّكَاةِ بَابُ الصَّدَقَةِ عَلَى الْيَتَامَى

آپ نے فرمایا مجھے اپنے بعد جن باتوں کا تم پر  
 خوف ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم پر دنیا کی  
 زیبائش اور مال و دولت کے دروازے کھول دیے  
 جائیں گے، ایک شخص نے عرض کیا، اے اللہ کے  
 رسول کیا اچھی چیز بھی برائی پیدا کرتی ہے رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، اس شخص سے کہا  
 گیا کہ تجھے کیا ہو گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم سے کلام کرتا ہے حالانکہ وہ تجھ سے کلام نہیں  
 فرماتے، پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی  
 ہے، پھر آپ نے پسینہ پونچھا اور فرمایا سائل کہا  
 ہے؟ گویا آپ نے اس کے سوال کو پسند فرمایا پھر  
 آپ نے فرمایا، بے شک اچھی چیز برائی پیدا نہیں  
 کرتی، مگر فصل ربیع ایسی گھاس بھی پیدا کرتی ہے  
 جو مار ڈالتی ہے یا بیمار کر دیتی ہے، مگر اس سبزی  
 چرنے والے کو نقصان نہیں پہنچاتی جو چرے،  
 پھر جب اس کے دونوں کوکھ بھر جائیں تو وہ  
 سورج کے سامنے آجائے، پھر لید کرے اور  
 پیشاب کرے۔ اور اس کے بعد پھر چرنے لگے،  
 اور بے شک یہ مال ایک سیٹھی سبزی ہے، پس  
 اس مسلم کا مال کتنا اچھا ہے جو اپنے مال سے  
 مسکین، یتیم اور مسافر کو دیتا رہتا ہے، اور بیشک  
 جو شخص اس مال کو ناجائز طریقہ سے لے گا وہ  
 اس شخص کی طرح ہے کہ کھائے اور سیر نہ ہو، اور  
 وہ مال اس پر قیامت کے دن گواہ ہوگا۔

حدیث بالا سے ثابت ہوا کہ دنیا سے مراد مسلم کی دنیا نہیں جس کو وہ حلال طریقہ سے حاصل کرتا  
 ہے، اس کا حریص نہیں ہوتا، اور پھر اس کے خرچ کرنے میں بخل نہیں کرتا، ہاں دنیا سے مراد وہ دنیا ہے  
 جس کو حرص اور طمع کے ساتھ جائز ناجائز ہر طریقہ سے حاصل کیا جائے اور اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کیا جائے،



یہ ہے وہ دنیا جو مردار ہے، اور بے شک اس کے طالب کتے ہیں، غرض یہ کہ حدیث میں اس بات کی قضا<sup>حت</sup> ہے کہ لفظ دنیا کا اطلاق کس دنیا پر ہوتا ہے، قرآن اور حدیث میں یہ لفظ ایک ہی اصطلاح میں استعمال ہوا ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ کاش برق صاحب قرآن و حدیث کا عمیق مطالعہ فرماتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں ”میں مسلسل چودہ برس تک حصول علم کے لئے مختلف علماء و صوفیہ کے ہاں رہا، درس نظامی کی تکمیل کی، سینکڑوں واعظین کے وعظ سنے، بیسیوں دینی کتابیں پڑھیں اور بالآخر مجھے یقین ہو گیا کہ اسلامی تعلیمات کا ما حاصل یہ ہے“ (دو اسلام ص ۱۵)

اس کے بعد برق صاحب نے سلسلہ داران چیزوں کو شمار کیا ہے جن کو انہوں نے اسلامی تعلیمات کا حاصل سمجھا تھا، ہم بھی ان چیزوں کو اسی سلسلہ سے بیان کر رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ اپنے معروضات بھی پیش کر رہے ہیں۔

غلط فہمی (۱) ”فرائض خمسہ یعنی تہجد کا اقرار اور صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کی بجا آوری“  
ازالہ برق صاحب ان پانچوں چیزوں کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے، آخر اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

غلط فہمی (۲) ”اذان کے بعد ادب سے کلمہ شریف پڑھنا“  
ازالہ مؤذن کلمہ شریف پڑھتا ہے ہم بھی اُس کے ساتھ اپنے عہدِ توحید و رسالت کی تجدید کر لیتے ہیں، رہا ادب سے پڑھنا تو آخر اس میں کیا اعتراض ہے، برق صاحب بے ادبی کو تو آپ بھی پسند نہیں کریں گے۔  
غلط فہمی (۳) ”مختلف رسوم مثلاً جمعرات، چہلم، گیارہویں وغیرہ کو باقاعدگی سے ادا کرنا“  
ازالہ واقعی یہ خرافات ہیں ہمیں آپ سے اتفاق ہے، صحیح حدیث کو ماننے والے ان بدعات سے کلیتہً بیزار ہیں۔

غلط فہمی (۴) ”قرآن کی عبارت پڑھنا“  
معلوم نہیں کہ اس میں کیا اعتراض ہے، اس لئے کہ تلاوت قرآن مجید کا حکم تو قرآن مجید میں موجود ہے، ارشاد ہے

اَنْذِرْ مَا اَوْحٰی اِلَیْكَ مِنَ الْكِتَابِ  
اَسْ کتاب کی تلاوت کیجئے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ (عنکبوت۔ ۴۵)

ہاں اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ بے سمجھے اور بغیر علم و عمل کی نیت کے پڑھنا، تو پھر ہمیں بھی آپ سے اتفاق ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے  
لَمْ یَفْقَهُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِیْ اَقْلٍ  
جو شخص تین دن سے کم میں قرآن ختم



مَنْ تَلَّثَّ (رواہ ابو داؤد و الترمذی و سندہ کزتابہ، وہ کچھ نہیں سمجھتا۔

صحیح۔ مرعاة شرح مشکوٰۃ جلد ۳ ص ۳۶۹)

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا بھی یہی ہے کہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھا جائے، دیکھا برق صاحب حدیث بھی آپ کی تائید کرتی ہے۔

بہر حال برق صاحب اتنا آپ کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ جو شخص قرآن کو بغیر سمجھے پڑھتا ہے وہ کچھ دیر ضرور اپنے آپ کو لغو کاموں سے بچا لیتا ہے اور اگر اس کی یہ نیت بھی ہو تو پھر لامحالہ ایسا پڑھنا بھی کچھ نہ کچھ مفید ضرور ہوگا۔

**غلط فہمی (۵) |** ”اللہ کے ذکر کو سب سے بڑا عمل سمجھنا“

**ازالہ |** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (العنکبوت۔ ۲۵) اور بے شک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔

لیجئے، جس چیز پر آپ کو اعتراض ہے وہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

**غلط فہمی (۶) |** ”قرآن اور درود کے ختم کرنا“، ”اُچھل اُچھل کر ہوشی کا درود کرنا“

”نجات کے لئے کسی مرشد کی بیعت کرنا“، ”مردوں سے مرادیں مانگنا“،

”مزاروں پر سجدے کرنا“، ”غلیظ لباس کو پیغمبری لباس سمجھنا“،

”سڑکوں اور بازاروں میں سب کے سامنے ڈھیلا کرنا“، ”تعویذوں اور منتروں کو مشکل کشا سمجھنا“

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب، نیز حاضر ناظر قرار دینا“

”کسی بیماری یا مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے ملاجی کی ضیافت کرنا“

”گناہ بخشوانے کے لیے قوالی سنتا“، ”ہر غیر مسلم کو ناپاک و نجس سمجھنا“

”امام ابو حنیفہؒ کی فقہ پر ایمان لانا“

**ازالہ |** برق صاحب ہمیں ان تمام باتوں میں آپ سے اتفاق ہے، احادیث صحیحہ ان کی تائید نہیں

کرتیں، یہ تمام خرافات ہیں جو گھڑے لئے گئے ہیں، ہاں قرآن مجید کی رو سے مشرکین عقیدتاً نجس

ضرور ہیں۔

**غلط فہمی (۷) |** ”صحابہ ستہ کو وحی سمجھنا“

**ازالہ |** صحابہ ستہ میں چھ کتابیں ہیں۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم کو چھوڑ کر باقی کتابوں میں چند ضعیف احادیث

بھی ہیں، پھر ان تمام کتابوں میں صحابہ اور ائمہ دین کے اقوال بھی ہیں، لہذا یہ کہنا کہ جو کچھ صحابہ ستہ میں

ہے وحی ہے، صحیح نہیں۔ گویا اس صورت میں ہمیں آپ سے اتفاق ہے، لیکن ان کتابوں میں جو صحیح

احادیث ہیں، ان کے متعلق ہم بلا خوف و جھجک بغیر کسی پس و پیش و احساس کمتری کے اعلان کرتے ہیں



کہ بے شک ان کا مفہوم و منشا وحی الہی ہے اور ان پر ہمارا اسی طرح ایمان ہے جس طرح قرآن مجید پر وہ اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح قرآن مجید، ہماری موجودہ اصطلاح میں اس کا نام وحی خفی ہے اور یہی ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف کا نقطہ آغاز ہے، اس وحی خفی کے اثبات میں ارادہ تھا کہ آپ کی کتاب کے آخری باب کے سلسلہ ہم اپنی معروضات پیش کرتے اور آپ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے لیکن مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہید میں بھی کچھ لکھا جائے۔ وباللہ التوفیق، یہ بحث کئی عنوانات پر مشتمل ہے جو ذیل میں سلسلہ وار درج کیے جا رہے ہیں۔

### کیا انبیاء سابقین پر کتاب الہی کے علاوہ وحی نازل ہوئی۔

انبیاء سابقین پر کتاب الہی کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی، اس کی چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ ہوں۔  
آدم علیہ السلام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ (بقرہ - ۳۲)

اے آدم فرشتوں کو ان کے نام بتا دو۔

پھر ارشاد فرمایا :-

يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، اور  
خوب کھاؤ، جہاں سے چاہے مگر اس درخت کے

الآیۃ۔

(البقرہ - ۳۵)

قریب نہ جانا۔

لیکن شیطان کے بہکانے سے انہوں نے اس درخت میں سے کھالیا۔

وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى (طہ - ۱۲۱)

آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گئے۔

فَتَلَقَى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ

آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے

عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ قُلْنَا

پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، بے شک اللہ توبہ

أَهْبِطُوهَا جَمِيعًا فَا مَّا يَأْتِيَنَّكُمْ

اور رحیم ہے۔ ہم نے کہا تم سب یہاں سے اترو،

مِمَّنِّي هُدَىٰ فَسَمِعُ تَبَعَ هَذَا أَيُّ قُلُوبٍ

پھر جب کبھی تمہارے پاس میری ہدایت آئے تو

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

جس نے میری ہدایت کی پیروی کی وہ بے خوف اور

(البقرہ - ۳۷ - ۳۸)

بے غم ہوگا۔

آدم علیہ السلام جنت سے اتارے جاتے ہیں، اس وقت کتاب ہدایت کے بھیجنے کا وعدہ کیا جاتا ہے  
گویا ابھی تک کتاب نہیں آئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے باتیں کرتا تھا حتیٰ کہ اس کتاب سے پہلے  
اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو چند کلمات بھی سکھائے تھے جن کے ذریعہ سے ان کی توبہ قبول ہوئی، لہذا



ثابت ہوا کہ کتاب اللہ کے علاوہ بھی آدم علیہ السلام پر وحی آتی تھی۔

### موسیٰ علیہ السلام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَلَمَّا آتَاهَا نُودَىٰ يَمُوسَىٰ ۖ إِنِّي أَنَا  
رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ -

جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے، تو ان کو  
پکارا گیا، اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، اپنی  
جوتیاں اتار دو۔

(طہ ۱۱ و ۱۲)

فَاسْمِعْ بَمَا يُوْحٰى (طہ ۱۳)

سنو جو کچھ وحی کی جارہی ہے۔

أَقْرِبَ الصَّلٰوةَ لِيَذْكُرْ (طہ ۱۴)

میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے پوچھا:-

وَمَا تَلَكَ بِبَيْنِكَ يَمُوسَىٰ ۚ (طہ ۱۵)

اے موسیٰ تمہارے ہاتھ میں یہ کیا ہے۔

پھر عصا اور ید بیضا کے معجزات عطا ہوئے، پھر ارشاد ہوا،

إِذْ هَبُّ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰى -

فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہو

گیا ہے۔

(طہ ۲۴)

الغرض موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تبلیغ کرتے ہیں، جادو گروں سے مقابلہ ہوتا ہے، اس موقع پر پھر

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (طہ ۶۸)

ڈرو مت تم ہی غالب رہو گے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام وہاں سے ہجرت کرتے ہیں، فرعون غرق ہو جاتا ہے، موسیٰ علیہ السلام وادی

سینا میں تشریف لے آتے ہیں، پھر اس موقع پر ان کو کتاب دی جاتی ہے۔

ارشاد باری ہے:-

وَكُتِبْنَا لَهُ فِي الْاَلْوَاخِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ

اور ہم نے تختیوں میں ان کے لئے ہر قسم کے نصائح

مَوْعِظَةً وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخَذَهَا

اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی اور حکم دیا کہ اس کو

بِقُوَّةٍ دَامِرٍ قَوْمَكَ يَأْخُذُ اِبَاهُ سِنِهَا -

قوت کے ساتھ پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ

ان اچھی باتوں پر عمل کرے۔

(الاعراف - ۱۴۵)

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس واپس آئے اور پھر اپوجنے کی وجہ سے ان پر اتنا غصہ آیا کہ وہ تختیاں

زمین پر پٹخ دیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَالْقَى الْاَلْوَاخِ (الاعراف - ۱۵۰)

اور تختیاں پٹخ دیں۔



وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ  
الْأُكُوحَ (الاعراف ۱۵۴)  
اور جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو  
تختیاں اٹھالیں۔

برق صاحب دیکھا آپ نے کتابِ تواب ملی ہے لیکن اس سے پہلے اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر بے شمار  
مرتبہ وحی کر چکا تھا، کتاب دینے کے بعد فرمایا ”اے مضبوطی سے پکڑو“ اور تو اور کتاب جیب نازل ہوئی  
تو ایسی کہ اس میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر طرح کی تفصیل تھی لیکن اس کے بعد بھی وحی جاری رہی، موسیٰ علیہ  
السلام ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لے جاتے ہیں، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں، ایک بجلی آتی ہے  
اور سب مرجاتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے۔

عَذَابِيْ اُصِيبُ بِهِ مَنْ اَشَاءُ وَرَءَايَ  
وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف ۱۵۶)  
میں اپنا عذاب پہنچاتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور  
میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔

الغرض کتابِ الہی سے پہلے بھی وحی جاری ہے اور کتابِ الہی کے بعد بھی وحی جاری ہے۔

### خلاصہ

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے مختلف مواقع پر گفتگو فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے، اے موسیٰ یہ مقدس  
وادی ہے، جوتے اُتار دو، یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے، اسے زمین پر ڈال دو، ڈرو نہیں، میرے پاس  
رسول ڈرا نہیں کرتے، اس کو اٹھا لو، یہ پھر لائٹ بن جائے گا، ہاتھ کو جیب میں ڈالو، فرعون کے پاس جاؤ،  
اُس سے نرمی سے بات کرنا، انہوں نے جواب دیا ڈر لگتا ہے کہیں وہ قتل نہ کر دے، دعا کی مجھے ایک وزیر  
چاہیئے، میری زبان صاف نہیں اس کی اصلاح فرمائیئے، جواب ملا، اچھا یہ باتیں قبول ہیں وغیرہ وغیرہ،  
حکم ملا گائے کو ذبح کرو، قوم نے طرح طرح کے بے ہودہ سوالات کئے، اللہ تعالیٰ جواب دیتا رہا، غرض یہ  
کہ اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہیں، برق صاحب انصاف سے بتائیئے، کیا یہ  
سب باتیں اس کتابِ الہی میں موجود تھیں جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی،

### یوسف علیہ السلام

ارشاد باری ہے :-

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْعَلُوا لَهُ يَجْعَلُوهُ  
فِي غُيُبَاتِ السُّبْحِ وَادْعُوا إِلَيْهِ  
لَتَنْبِتَنَّهُمْ يَا مَرْهَمُ هَذَا وَهُمْ  
لَا يَشْعُرُونَ ۝

جب وہ یوسف علیہ السلام کو لے کر چلے اور اس  
بات پر اتفاق کیا کہ ان کو کنویں میں ڈال دیا جائے  
تو ہم نے یوسف کو وحی بھیجی کہ ایک وقت آئے گا  
جب تم ان کو اس کام کی خبر دو گے اور وہ نہ  
سمجھتے ہوں گے۔

(یوسف - ۱۵)

یوسف علیہ السلام ابھی بچے ہیں لیکن وحی آرہی ہے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے :-



وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا  
 (یوسف - ۱۲۲) علم دیا۔  
 جب وہ جوان ہوئے تو ہم نے ان کو حکم اور

سیاق سیاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انہیں کتاب نہیں دی گئی تھی ورنہ وہ مبلغ کی حیثیت سے سامنے آتے، اس کے بعد زمانِ مصر نے انہیں اپنی طرف مائل کرنا چاہا، انہوں نے انکار کیا جس کے نتیجہ میں وہ قید خانہ میں بھیج دئے گئے، قید خانہ میں تبلیغ شروع ہوتی ہے، اگر بالفرض حکم و علم کے ملنے سے مراد کتابِ الہی کا ملنا ہے تو پھر کتاب سے پہلے بچپن میں وحی کا آنا ثابت ہے، گویا یوسف علیہ السلام پر کتابِ الہی کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔

دیگر انبیاء کرام سے اللہ تعالیٰ کی گفتگو

چند فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچے ہیں، فرشتے بیان کرتے ہیں کہ وہ لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف عذابِ الہی کے ساتھ بھیجے گئے ہیں۔

آگے ارشاد باری ہے :-

يٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَوْمٌ لُّوْطُہ  
 (ہود - ۷۴)  
 ابراہیم قوم لوط کے بارے میں ہم سے  
 جھگڑنے لگے،

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اے ابراہیم

اٰخِرُصُّحٰی هٰذَا (ہود - ۷۶) اس بات کو جانے دو،

کیا ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے مجادلہ اور سوال و جواب صحیفِ ابراہیم میں موجود تھا۔

زکریا علیہ السلام دعا کرتے ہیں، اے اللہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں مجھے فرزند عنایت فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، تمہارے ہاں لڑکا ہو گا جس کا نام یحییٰ ہو گا اور یہ نام پہلے کسی کا نہیں ہوا، پوچھا اے اللہ کیسے ہو گا، میں بوڑھا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے، جواب ملا یہ میرے لئے آسان ہے، عرض کیا اے اللہ اس کی نشانی مقرر فرما دے، جواب دیا اس کی نشانی یہ ہے کہ تین رات تک تم بات نہ کرو۔ (مریم سہ ماہی ۱) کیا یہ باتیں حضرت زکریا علیہ السلام کی کتاب میں موجود تھیں۔

قرآن مجید کے محولہ بالا واقعات سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے پاس کتابِ الہی کے علاوہ بھی وحی آیا کرتی تھی پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سید المرسلین کے پاس سوا قرآن مجید کے دوسری

وحی نہ آئے، ضرور آتی تھی ورنہ لازم آئے گا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں آپ اس نعمت سے محروم تھے، انبیاء سابقین سے اللہ تعالیٰ کی باتیں ہوتی تھیں، سوال و جواب ہوتے تھے، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے علاوہ کبھی اللہ تعالیٰ سے سوال کیا اور نہ کبھی جواب ملا، ضرور سوال و جواب ہوئے لیکن وہ قرآن مجید میں موجود نہیں، لہذا وہ دوسری وحی (حدیث) میں ہیں۔



(۲) حدیث اگر حجت ہے تو پھر اس کا منزل من اللہ ہونا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

إِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (الاعراف)

اس چیز کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور اس کے علاوہ کسی ولی کا اتباع مت کرو۔

اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث حجت ہے اور اس کے بغیر قرآن مجید پر عمل کرنا ناممکن ہے تو پھر یقیناً حدیث وحی ہے کیونکہ آیت بالا کی رو سے صرف وحی کا اتباع لازم ہے اور غیر وحی کا اتباع حرام ہے۔

## حدیث کے حجت ہونے کے دلائل

### دلیل اول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور قوم کو خطاب کیا (اے قوم)،

إِنَّا رَسُولُ اللَّهِ بَعَثَنِي إِلَى الْعِبَادِ  
أَدْعُوهُمْ إِلَى أَنْ يَتَّعِبُوا اللَّهَ  
لَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَأَنْزَلَ عَلَيَّ  
كِتَابًا

میں اللہ کا رسول ہوں، مجھے اللہ نے بندوں کی طرف مبعوث کیا ہے کہ میں انہیں اس بات کی دعوت دوں کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ ذرا سا بھی شریک نہ کرو اور مجھ پر اللہ نے ایک کتاب نازل کی ہے۔ (مسند احمد، وسندہ صحیح، بلوغ الامانی جز ۲ ص ۲۶۶)

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا الفاظ حجت ہیں تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے، اگر یہ الفاظ حجت نہیں تو پھر لازم آئے گا کہ نہ آپ اللہ کے رسول ہیں، نہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ آپ کی رسالت اور قرآن مجید پر ایمان لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ الفاظ حجت ہوں، جب تک یہ الفاظ حجت نہ ہوں قرآن مجید بھی حجت نہ ہوگا اور یہ الفاظ حدیث کے الفاظ ہیں لہذا حدیث کا حجت ہونا لازمی ہے۔

### دلیل دوم

قرآنی الفاظ کی تشریح و توضیح اور آیات قرآنی سے استنباط مسائل آج کل بھی لوگ کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے، عہد رسالت میں بھی لازماً ایسا ہوا ہوگا اور یہ عقلاً محال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ



علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی دوسرا تشریح و استنباط کے فرائض انجام دے، لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کام کو بھی انجام دیتے ہوں گے اور جب آپ کسی آیت قرآنی کی تفسیر کرتے ہوں گے تو کیا کسی کو اس کے تسلیم کرنے سے انکار کرنا جائز تھا؟ کیا وہ کہہ سکتا تھا کہ آپ کی بیان کردہ آیت صحیح اور آپ کی تفسیر غلط، پس آپ آیت سنا دیجئے، تفسیر ہم خود کر لیں گے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اور جب ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر تفسیر قرآن کے سلسلہ میں حدیث کا حجت ہونا ظاہر ہے۔

### ایک شبہ

یہاں بعض لوگوں کو ایک شبہ بھی پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ آپ کی تفسیر صرف آپ کی زندگی میں حجت تھی، آپ کے انتقال کے بعد آپ کے خلیفہ کی تفسیر حجت ہوگی کیونکہ وہی اس وقت مرکزِ ملت ہوگا اور تفسیر کا تعلق مرکزِ ملت سے ہے، منصبِ رسالت سے نہیں، یہ شبہ بذاتِ خود مضحکہ خیز ہے گویا رسالت کا منصب مرکزِ ملت کے منصب سے کم درجہ کا حامل ہے، یہ عقلاً اور شرعاً محال ہے اور اگر بالفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مرکزِ ملت کی تفسیر حجت ہوگی تو بہر حال قرآن مجید کے علاوہ ایک دوسری چیز حجت مانی گئی اور یہ یقیناً مرکزِ اولین یعنی رسول کی تشریح سے کم درجہ کی چیز ہوگی، جب یہ حجت ہو سکتی ہے تو مرکزِ اولین یعنی رسول کی تشریح کا حجت ہونا زیادہ قرینِ عقل ہے۔

### دلیل سوم

رسول صاحبِ وحی ہوتا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اس کی حدیث وحی الہی ہوتی ہے لہذا آیت زیرِ بحث کی رو سے اس کا اتباع لازمی ہے اور اس طرح ہم کسی قسم کے شرک میں مبتلا نہیں ہوتے لیکن جو لوگ مرکزِ ملت کی تشریح کو حجت شرعی سمجھتے ہیں اور اس کی اتباع کو لازمی قرار دیتے ہیں وہ یہ بتائیں کہ آیا ان کی یہ تشریح وحی ہوتی ہے یا نہیں، اگر وہ یہ کہیں کہ وحی ہوتی ہے تو گویا ہر مرکزِ ملت یعنی خلیفہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی ہوا اور یہ باطل ہے، اور اگر وہ یہ کہیں کہ وحی نہیں ہوتی تو پھر آیت زیرِ بحث کی رو سے اس کا اتباع حرام اور حرام کو حلال بلکہ فرض سمجھنا شرک اور کفر کے سوا کچھ نہیں، لہذا قرآن مجید کی تشریح کے لئے صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ اس کی تشریح بھی وحی ہو ورنہ اس کا اتباع حرام بلکہ شرک ہوگا اور وحی صرف رسول کے پاس آتی ہے، لہذا صرف رسول کی تشریح حجت ہوگی، کسی اور کی تشریح حجت نہیں ہوگی یعنی حدیث رسول حجت شرعیہ ہے، لہذا وحی ہے۔

### دلیل چہارم

کیا قرآن خود مکلفی ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس کو سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت ہے اور یہ مسئلہ امر ہے اس سے کسی کو انکار نہیں، خصوصاً اس صورت میں کہ اسلامی حکومت اس جگہ قائم ہو جہاں کی مادری زبان عربی نہ ہو اور مرکزِ ملت عربی سے نا آشنا ہو، ایسی صورت میں قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے عربی لغت



کی طرف رجوع کرنا ہوگا، پس ثابت ہوا کہ قرآن کفایت نہیں کرتا بلکہ اپنی تشریح کے لئے دوسری چیز کا محتاج ہے اور یہ حجت ہے، اور جب یہ چیز حجت ہے تو وہ چیز حجت کیوں نہ ہو جو قرآن کی شرعی لغت ہے، یعنی حدیث، لغت میں کسی لفظ کی تشریح یا معنی کسی ایک آدمی یا چند آدمیوں کی طرف منسوب ہوتے ہیں وہ آدمی بھی معصوم نہیں ہوتے کہ ان سے غلطی نہ ہو، پھر اکثر وہ مجہول ہوتے ہیں، مزید برآں ان کے بیان کردہ معانی مؤلف لغت تک سنداً نہیں پہنچتے، پھر لغت کا مؤلف ضروری نہیں کہ صادق القول اور اسخ فی العلم ہو، اگر باوجود ان تمام عوارض کے لغت کے مندرجات حجت ہوں تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ معصوم، الصادق المصدوق، صاحب وحی، انسان کامل، معلوم و معروف و مشہور، صادق القول، مسلمہ استادوں سے حاصل کر کے جمع کئے ہوں، حجت نہ ہوں پھر یہ افسوس اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے جبکہ ان معانی پر اُمت کا عملاً اجماع ہو وہ معانی مخبر صادق تک نقلاً بھی مشہور و متواتر ہوں اور عملاً بھی مشہور و متواتر ہوں، پھر بھی وہ تو حجت نہ ہوں، اور حجت ہو تو وہ لغت جو بالکل بے سند ہو، مزید برآں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مؤلف مسلم، باشرع، باوقار عالم بھی نہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ متعصب، غیر مسلم یا کم علم ملا ہو۔

### دلیل پنجم

لغت زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہے لہذا کس لغت کو حجت قرار دیا جائے اور کس کو نہیں اس مشکل کا حل سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ اُس لغت کو حجت مانا جائے جو مہبط وحی نے بنائی اور وحی کے اولین مخاطبین نے سمجھی اور اُس وقت بولی جاتی تھی جب قرآن مجید اتر رہا تھا۔

### دلیل ششم

ہر فن اور ہر علم کی ایک اصطلاح ہوتی ہے، بعض اوقات لغت میں کچھ اور معنی ہوتے ہیں اور اصطلاح میں کچھ اور ایسی صورت میں اصطلاحی معنی ہی منشاء کلام کو سمجھنے کے لیے حجت ہوتے ہیں، نہ کہ لغوی معنی، ایک شخص گو وہ کتنا ہی بڑا ادیب کیوں نہ ہو، علوم ریاضی، علوم طبیعیات، علوم طب وغیرہ کی کتابوں کو نہیں سمجھ سکتا، اس لئے کہ وہ فنی اصطلاحوں سے ناواقف ہوتا ہے، اس کے لئے لغت کا علم بے کار ہی نہیں ہوگا بلکہ مزید حیرانی کا موجب۔ قرآن مجید چونکہ علوم شرعیہ کا منبع ہے لہذا اس کی بھی کوئی نہ کوئی اصطلاح ہونی چاہیے مثلاً زکوٰۃ کے لغوی معنی کچھ اور ہیں اور شرع میں کچھ اور، اور شرع میں وہی معنی معتبر ہیں جو کہ اصطلاحاً مشہور و معروف ہیں اور اصطلاح بھی اس شخص کی مستند مانی جائے گی جس پر قرآن مجید نازل ہوا یا ان لوگوں کی جن کے زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا کیونکہ مَرُورِ ایام سے اصطلاح بھی بدل جایا کرتی ہے، الغرض حدیث، قرآن مجید کے اصطلاحی معنی بیان کرتی ہے لہذا تشریح قرآن مجید کے لئے وہی حجت ہے اور بس۔



## دلیل ہفتم

لغت میں ایک ہی لفظ کے دو دو، تین تین، چار چار بلکہ دس دس، بیس بیس معانی دئے ہوتے ہیں، اگر قرآنی تشریح کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو قرآن مجید باز بچہ اطفال بن جائے گا۔ کوئی کچھ معنی کرے گا اور کوئی کچھ، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ الحاد کو پینپنے کا موقع ملے گا، اختلافات کا ایک سیلاب عظیم ہوگا اور امت مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی جیسا کہ من مانی تفسیر کرنے سے فی الواقع ہو چکا ہے اور مختلف فرقوں کا وجود اس کا عملی ثبوت ہے، ان فرقوں نے حدیث کا براہ راست انکار کرنے کے بجائے اس کو ٹالنے کے لئے چور دروازے تلاش کئے، کبھی قرآن مجید کو بطور حجت پیش کیا اور اس کے معانی وہ اختیار کر لئے جو حدیث کے خلاف تھے اور پھر بطور فخر کہنے لگے کہ ہمارے قول کی دلیل قرآن مجید ہے، بھلا قرآن مجید کے مقابلہ میں حدیث کیسے مانی جائے گی، کبھی اپنی عقل ناقص کو معیار بنا کر حدیث کو خلاف عقل سمجھ لیا اور اس طرح حدیث سے نجات حاصل کر لی، اس اختلاف اور الحاد کے سد باب کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے ہر لفظ کے ایک معنی مقرر ہوں اور یہ کون کر سکتا ہے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایسی شخصیت ہیں جن پر سب جمع ہو سکتے ہیں، لہذا ضروری ہے کہ حدیث حجت ہو اور قرآن مجید کی وہی تشریح قابل تسلیم ہو جو حدیث میں بیان کر دی گئی ہو، پس ثابت ہوا کہ حدیث حجت ہے، لہذا منزل من اللہ ہے۔

## ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس مشکل کا حل بعض لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ مرکز ملت کی تشریح ہر شخص کو تسلیم کرنی ہوگی لہذا اختلاف و الحاد کا کوئی امکان نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جبری اتفاق ہوگا، اس سے ذہنی اختلاف دور نہ ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ ذہنی اختلاف عملاً پھوٹ پڑے اور بڑے بڑے فتنوں کا موجب بن جائے مثلاً خارجی اور سبائی تحریکیں اسی ذہنی اختلاف کا نتیجہ تھیں، دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ تاریخ اس بات کی تائید نہیں کرتی کہ مرکز ملت نے کوئی تشریح کی ہو اور کبھی اس کو چیلنج نہ کیا گیا ہو بلکہ بار بار ایسا ہوا ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے تاریخ کے طالب علم بخوبی واقف ہیں، تیسرے یہ کہ اگر ایک مرکز ملت اپنے زمانہ میں ایک آیت کے کچھ معنی کرے، دوسرا مرکز ملت کچھ اور، اور تیسرا مرکز ملت کچھ اور معنی کرے اور اسی طرح معنی بدلتے رہیں تو کیا یہ سب تشریحات صحیح مانی جائیں گی، کیا ہر تشریح کا لوحی من السماء ہوگی، کیا یہ تمام تشریحات ”شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر با“ کی مصداق نہ ہوں گی اور ایک غیر مسلم ان میں سے کون سی تشریح کو قرآنی تشریح خیال کرے گا۔ فرض کیجئے کہ ایک مرکز ملت پانچ وقت کی نماز فرض قرار دے اور دوسرا مرکز ملت تین وقت کی نماز فرض مانے تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دونوں تشریحات صحیح ہیں کوئی غلط نہیں جیسا کہ تقلیدی مذاہب میں ہوا اور ہو رہا ہے، ایک ہی چیز ایک مذہب میں حلال، دوسرے



میں حرام، اور دونوں اپنے اپنے دائرہ میں حتیٰ پر، اب اگر کوئی حرام کھا رہا ہے تو کھاتا ہے، ہمیں بولنے کی کیا ضرورت، وہ ہمارے لئے حرام ہے لیکن اس کے لئے حلال ہے، اس کو نادانی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، کتنا عجیب اور کس قدر مضحکہ خیز وہ سماں ہوگا جب ایک ہی زمانہ میں دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف مراکزِ ملت قائم ہو جائیں اور ہر ایک اپنی اپنی تشریح کرتا رہے، حلال و حرام کا فرق ہو، اختلافاً بعیدہ ہوں، لیکن ہم پھر بھی یہی کہیں کہ سب ٹھیک ہیں۔

برق صاحب ذرا غور فرمائیے وہ وقت کتنا عجیب ہوگا جب کوئی مرکزِ ملت کسی ایسے لفظ کی جو لغتِ اضداد سے ہو کوئی خاص تشریح کرے اور دوسرا مرکزِ ملت ایسی تشریح کرے جو پہلے کی ضد ہو۔ کیا یہ صورت ظہور پذیر نہیں ہو سکتی؟ ضرور ہو سکتی ہے، پھر کیا یہ صورت حتیٰ ہوگی؟ نہیں بالکل باطل ہوگی عقلِ سلیم کسی ایک معنی اور اس کی ضد دونوں کو صحیح نہیں مان سکتی، لہذا مرکزِ ملت کے معانی حجت نہیں ہو سکتے اور نہ اُس سے اختلاف والحاد کا سدِّ باب ہو سکتا ہے۔ یہ مرکزِ ملت کا مفروضہ اصول ہی بالکل مضحکہ خیز ہے، کاش یہ لوگ غور کرتے۔

جو تھی بات اس سلسلہ میں یہ بھی غور طلب ہے کہ جب کوئی مرکزِ ملت ہی نہ ہو، جیسا کہ آج کل ہے، تو پھر اختلاف والحاد کو روکنے کی کیا صورت ہوگی، اختلاف اور الحاد کے سدِّ باب کے لیے کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیئے جو عارضی نہ ہو بلکہ مستقل اور دائمی ہو، مرکزِ ملت اول تو اس مرض کی دوا نہیں، اور پھر مستقل اور دائمی نہ ہونے کی وجہ سے اس کو علاج کتنا کسی صورت سے صحیح نہیں، اس کا سدِّ باب وہی چیز کر سکتی ہے جو خود دائمی اور مستقل ہو، اور وہ سوائے حدیث کے اور کچھ نہیں، لہذا حدیث کے حجت ہونے میں کیا شبہ رہا، اور جب وہ حجت ہوئی، تو آیت زیرِ عنوان کی رو سے وحی ہوئی۔

### دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید اپنی تشریح آپ کرتا ہے، لہذا ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں، لیکن یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، حقیقت اس کے خلاف ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ“ صلوٰۃ قائم کرو، صلوٰۃ کسے کہتے ہیں، اس کی تفصیل نہیں، قرآن مجید میں جب اس کی تشریح تلاش کرتے ہیں تو عجیب حیرانی ہوتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے ”اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلٰوٰتٌ مِّنْ سَرَّابٍ مَّحْمُودَةٍ رَّحْمَةً صٰبِرِيْنَ“ پر اللہ کی طرف سے صلوٰۃ ہوتی ہے اور رحمت۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ”وَصَلِّ عَلَيْهِمْ رَاتٍ صَلٰوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ اِنْ يَرْصُلُوْا بِحَبِيْبٍ“ بے شک آپ کی صلوٰۃ ان کے لئے باعثِ سکون ہے، ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ نازل ہو رہی ہے، دوسری آیت میں بندے کو حکم ہو رہا ہے کہ صلوٰۃ نازل کرو، اب کوئی کیا سمجھے، ایک جگہ ارشاد ہے ”اَقِيْمُوا الدِّيْنَ“ دین قائم کرو، ہو سکتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی



دین کے ہوں اور اس آیت میں صلوٰۃ کی تشریح دین سے کی گئی ہو، پھر ارشاد ہوتا ہے ”وَاقِيْمُوا الْوَزْنَ“ وزن قائم کرو، لہذا صلوٰۃ کے معنی وزن کے بھی ہو سکتے ہیں، پھر ارشاد ہوتا ہے ”اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَرَافِعًا مِنَ اللَّيْلِ“ یعنی دن کے دونوں اطراف اور کچھ رات کے وقت بھی صلوٰۃ قائم کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ ایسی چیز ہے جو مسلسل قائم نہ رکھی جائے بلکہ دن اور رات کے بعض اوقات میں قائم کی جائے ”صلوٰۃ“ کے معنی کو لے ہلانے کے بھی ہو سکتے ہیں، اس لحاظ سے اگر کوئی ”اقِيْمُوا الصَّلٰوةَ“ کے معنی یہ کرے کہ ”ناچ کی محفل قائم کرو“ اور ثبوت میں یہ آیت پیش کرے ”اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ“ (حدید - ۲۰) دنیا کی زندگی بس لہو و لعب ہی تو ہے اور پھر اس طرح استدلال کرے کہ جب دنیا کی زندگی لہو و لعب ہی ہے تو دنیا میں محفل رقص و سرود قائم کرنا ہی ”اقِيْمُوا الصَّلٰوةَ“ کا اصلی منشاء ہے تو بتائیے اس کی تردید کیسے ہو سکتی ہے۔

### دوسری مثال اور دلیل، شتم

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وَآتُوا الزَّكٰوةَ“، زکوٰۃ دو، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:-  
 لِيُخَيِّطَ لَكُمْ مِنْ كِتَابِ بَقْوَةٍ وَاتَّقُوا  
 الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا  
 وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا  
 (مریمہ ۱۲، ۱۳)  
 اس دوسری آیت میں زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی کے ہیں، تو پہلی آیت کے معنی ہوئے ”پاکیزگی دو“ اور یہ معنی سراسر باطل ہیں، اور اگر پہلی آیت میں زکوٰۃ سے مراد ٹیکس ہے تو دوسری آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ٹیکس دیتا تھا، اور یہ بالکل مضحکہ خیز ہے۔  
 ان دونوں مثالوں سے واضح ہوا کہ قرآن مجید اکثر مقامات میں تشریح اصطلاحی کا محتاج ہے، یعنی ایک استاد کی ضرورت ہے جو اسے پڑھائے اور اس کے مشکل مقامات کو حل کرے اور وہ استاد سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کون ہو سکتا ہے کیونکہ یہ منصب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔  
 ارشاد ہوتا ہے:-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا  
 مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ  
 وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
 (الجمعة ۲)  
 وہ اللہ ہی ہے جس نے اُمیوں میں ایک رسول  
 مبعوث کیا جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے،  
 ان کو پاک کرتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت  
 کی تعلیم دیتا ہے۔



اب اگر پڑھانے میں تشریح شامل نہیں ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلاوت کر دینا کافی تھا لیکن محض تلاوت پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ تلاوت کا منصب بتانے کے بعد تعلیم کا منصب بھی بتایا گیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں، لہذا آپ کی تشریح بھی من جانب اللہ ہونی چاہیئے اور یہی وہ چیز ہے جس کو وحیِ خفی کہا جاتا ہے، اب اس کے حجت ہونے میں کیا شبہ رہ گیا۔

### دلیل نہم

قرآن مجید کی بہت سی آیات بالکل ناقابلِ عمل ہیں، جب تک ان کی وہ تشریح تسلیم نہ کی جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔  
(۱) الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ۔  
حج کے چند مہینے معلوم ہیں۔

(البقرة - ۱۹۷)

یہ مہینے کون سے ہیں؟ قرآن مجید اس سلسلہ میں خاموش ہے، ان مہینوں کے ناموں کا ذکر تو احادیث ہی میں ملتا ہے، غرض یہ کہ بغیر حدیث کے یہ آیت ناقابلِ عمل ہے۔  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۲) اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اَشْهُرٌ اَشْرَفَ شَهْرٍ اَوْ كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَلِكَ الْيَوْمُ الْقِيَمُ۔ (التوبة - ۳۶)

اللہ کے نزدیک آسمان و زمین کی پیدائش کے دن سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہ ہے دینِ قیَم۔

آیت مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دینِ بارہ مہینوں اور چار محترم مہینوں پر مشتمل ہے لیکن قرآن مجید ان چار محترم مہینوں کے ناموں کے سلسلہ میں خاموش ہے، بتائیے کن مہینوں کو حرمت والے مہینے سمجھا جائے، اگر یہ کہا جائے کہ رواج کے مطابق مان لیا جائے تو یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ کفار تو ان مہینوں کو بدل دیا کرتے تھے، جیسا کہ خود قرآن مجید نے بتایا ہے:-

اِنَّمَا النَّسِيْءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ۔  
یعنی مہینوں کا آگے پیچھے کر لینا کفر میں زیادتی ہے۔ (التوبة - ۳۷)

اب اگر ہم ان مہینوں کو رواج کے مطابق مان لیں تو پھر مہینوں کا نقرہ کفار کے ہاتھ میں ہوگا، نہ رسول کے ہاتھ میں، نہ مرکزِ ملت کے ہاتھ میں، جس مہینہ کو کافر حرمت والا کہہ دیں، بس ہم بھی اس کی حرمت کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

الشُّهُورُ الْحُرَامُ بِالشُّهُورِ الْحُرَامِ وَالْحُرُمَاتِ قِصَاصٌ (البقرة - ۱۹۸)

اگر کفار کسی مہینے کی حرمت کریں تو تم بھی حرمت کرو۔ ادب کی چیزیں ایک دوسرے کا بدلہ ہیں۔



گویا قرآن مجید کی آیت کفار کی فحاج ہوئی، جو عمل کفار کا وہی قرآن مجید کا منشاء۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

(۳) وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي آيَاتٍ مَّعْلُومَاتٍ

(الحج - ۲۸)

قرآن مجید پھر ساکت ہے، کہ ان آیات کی تشریح کرے، اب بتائیے اس پر کس طرح عمل ہو۔

(۴) حروف مقطعات کیوں واقع ہوئے ہیں، ان کی تشریح سے قرآن مجید خاموش ہے اور جو لوگ ان حروف کی تشریح قرآن مجید سے کرتے ہیں، وہ سوائے ننگ بندی کے اور کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

(۵) وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ وَآنَا

لَنَحْنُ الصَّافُّونَ (الصّٰفّٰت - ۱۶۴)

معلوم نہیں ان آیات کا متکلم کون ہے، پوری سورت پڑھ جائیے، کہیں اس جملہ کا متکلم

نہیں ملے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۶) ذَاتُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ

اللہ کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔

(البقرہ - ۹۶)

معلوم نہیں حج کیا چیز ہے، عمرہ کیا چیز ہے، اور ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۷) وَمَا نُنَزِّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ

ہم نہیں نازل ہوتے مگر آپ کے رب کے

حکم سے۔

(مریم - ۶۴)

بظاہر اس آیت میں متکلم اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ اس سے اوپر کی آیات میں مسلسل جمع متکلم کا صیغہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے استعمال کیا ہے، لہذا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نازل نہیں ہوتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کے حکم سے، گویا اللہ تعالیٰ کا بھی کوئی حاکم ہے جس کے حکم سے وہ نازل ہوتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

غرض یہ کہ اس قسم کی بیسیوں گتھیاں ہیں، اُن کو کون سلجھائے۔ اگر یہ کام مرکزِ ملت کے سپرد کر دیا جائے تو مختلف ادوار میں، بلکہ ایک ہی زمانہ کے مختلف مراکز میں حج کے مختلف مہینے ہوں گے، آیات معلومات مختلف ہوں گے، حروف مقطعات کی مختلف تشریحات ہوں گی، ایک ہی آیت کے مختلف متکلم مان لئے جائیں گے، مسلم خواہ کچھ بھی کہیں، غیر مسلم تو ان مختلف تشریحات کو دیکھ کر ہنسنے کے سوا اور کیا کرے



گا، ان گتھیوں کا بس ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کو حل کریں، لہذا حدیث حجت ہوئی اور آیت زیر عنوان کی رو سے وحی ہوئی۔

### دلیل دہم

قرآن مجید کی متعدد آیات پر عمل کرنا ممکن نہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

(۱) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (البقرة - ۱۵۰)

اور جہاں کہیں سے آپ نکلیں، اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر لیا کریں اور جہاں کہیں بھی تم ہو، اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر وقت ہر حال میں منہ کعبہ کی طرف رہنا چاہیئے، کیا یہ ممکن ہے؟ آخر یہ حکم کس وقت کے لئے ہے؟ کون بتائے، کس طرح اس پر عمل ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

(۲) وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ (البقرة - ۲۸۲)

جب تم خرید و فروخت کیا کرو، تو گواہ کر لیا کرو۔

بتائیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کے خریدتے وقت ہر دکان دار و خریدار گواہ کر لیا کریں، کیا یہ حکم قرآنی ممکن العمل ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

(۳) يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف - ۳۱)

اے بنی آدم، ہر نماز کے وقت اپنی زینت کی چیزیں پہن لیا کرو۔

اس آیت پر کس طرح عمل کیا جائے؟ زینت تو لباس بھی ہے، زیورات بھی ہیں، کیا اس آیت کی رو سے عورتوں کو زیورات پہن کر نماز پڑھنی چاہیئے؟

غرض کہ اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جو ناقابل عمل ہیں جب تک ان کے معنی اور ان کا موقع و محل متعین نہ ہوں ان پر عمل نہیں ہو سکتا اور یہ چیزیں کون متعین کر سکتا ہے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، لہذا حدیث حجت ہوئی اور آیت زیر عنوان کی رو سے وحی ہوئی۔ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ۔

مندرجہ بالا دس دلائل سے ثابت ہوا کہ حدیث حجت ہے، لہذا آیت زیر عنوان کی رو سے وحی ہے، ورنہ غیر وحی کا اتباع لازم آئے گا اور یہ آیت کے خلاف ہے۔

(۴) حدیث حجت کے وحی نغنی ہونے کا ثبوت قرآن مجید سے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے :-



(۱) مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لَيْتَةٍ أَوْ نَرَتْكُمْ هَا قَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ - جو درخت تم نے کاٹے یا چھوڑ دئے یہ سب اللہ کے حکم سے تھا۔

(المحشر - ۵)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ درخت اللہ تعالیٰ کے حکم سے کاٹے گئے تھے لیکن وہ حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں، لہذا ثابت ہوا کہ قرآن مجید کے علاوہ کوئی وحی تھی جس کے ذریعہ حکم بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۲) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ (البقرة: ۱۴۲) اور اس قبلہ کو جس پر آپ اس وقت ہیں یعنی بیت المقدس کو، ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں کون رسول کی اتباع کرتا ہے۔

بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کا حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں، لہذا وہ حکم بذریعہ وحی تھی تھا، واضح ہو کہ اس آیت میں قبلہ سے مراد بیت المقدس ہے کیونکہ اس سے آگے ارشاد ہے: "فَلَتَوَلَّيْنَاكَ قِبْلَتَكَ تَرْضَاهَا" ہم عنقریب اُس قبلہ کی طرف آپ کو موڑ دیں گے جس قبلہ کی آپ کو خواہش ہے یعنی کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۳) وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضُهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَاكَ هَذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ○

(التحریم - ۳)

اور جب نبی نے ایک بات پوشیدہ طور پر اپنی ایک بیوی سے کہی تو اس بیوی نے اس بات کو ظاہر کر دیا، اللہ نے نبی کو اس انشاء راز سے مطلع کر دیا تو نبی نے بعض بات بتادی اور بعض بات سے چشم پوشی کی، پس جب نبی نے اس بیوی سے اس بات کا ذکر کیا تو نبی نے پوچھا، آپ کو کس نے خبر دی؟ نبی نے کہا مجھے علیم وخبیر نے خبر دی۔

قرآن مجید میں کہیں نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مطلع کیا کہ فلاں بی بی نے تمہارا راز ظاہر کر دیا، پھر علیم وخبیر اللہ نے کس طرح خبر دی، ظاہر ہے کہ وحی تھی یعنی حدیث کے ذریعہ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۴) إِذْ نَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ تُبَدِّلُوا دِينَكُمْ بِشِرِّ الْأَفْئِدَةِ جس وقت اے نبی تم مؤمنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ



الْمَلَائِكَةُ مُزَلِّينَ ۝ بَلَىٰ إِنَّ  
تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّنْ  
فُورِهِمْ هَذَا يُمْدِدْ كُوْنُكُمْ  
بِحَمْسَةِ الْآلِافِ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ  
مُسَوِّمِينَ ۝

(الحجرات: ۱۲۳-۱۲۵)

رب تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے  
بلکہ اگر تم صبر کرو گے اور پرہیزگاری اختیار  
کرو گے، اور کافر پورے جوش و خروش سے  
تم پر حملہ آور ہوں گے تو تمہارا رب پانچ  
ہزار نشان دار فرشتوں سے تمہاری مدد  
نصرمائے گا۔

یہ خبر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے پہلے صحابہ کو دی تھی اور جس کا ذکر اللہ تعالیٰ  
نے جنگ کے بعد ان آیات میں کیا ہے، قرآن مجید میں کہاں ہے؟ آخر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ  
تین ہزار بلکہ پانچ ہزار فرشتوں سے مدد فرمائے گا۔  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

۵. اَلَمْ نَقْرَأْكَ الَّذِيْنَ نُهَوِّعَنِ الْجُبُوٰى  
ثُمَّ يَعُوْذُوْنَ لِمَا نُهَوِّعُهُمْ  
وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْاُخْرِى وَالْعُدُوْا اِنْ  
وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ  
(المجادلة: ۸)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشی  
سے منع کر دیا گیا تھا لیکن وہ اب بھی وہی  
کام کر رہے ہیں جس کی ممانعت کی گئی تھی اور  
وہ برابر گناہ، ظلم و زیادتی اور رسول کی  
نافرمانی کی سرگوشی کرتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے سرگوشی سے منع کیا گیا ہو گا لیکن ممانعت کا حکم قرآن  
مجید میں اس آیت کے بعد ہے، پس ثابت ہوا کہ پہلے بذریعہ وحی نهي منع کیا گیا تھا۔  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

۶. حَافِظُوْا عَلٰی الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ  
الْوُسْطٰى وَقُوْٓمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِيْنَ ۝  
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجًا لَاْ اُورِکُمْ بَنًا  
فَاِذَا اَآهَنْتُمْ فَاذْكُرُوْا اللّٰہَ کَمَا  
عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُوْنُوْا  
تَعْلَمُوْنَ  
(البقرة: ۲۳۸-۲۳۹)

نمازوں کی حفاظت کرو، خصوصاً اور میان  
نماز کی، اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے  
ہو کر، اگر تم کو خوف ہو تو پھر نماز پیدل  
یا سواری پر ہی پڑھ لو، لیکن جب امن ہو  
جائے تو پھر اسی طریقہ سے اللہ کا ذکر کرو جس  
طریقہ سے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے اور جس  
طریقہ کو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ نماز پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ مقرر ہے جو بحالت جنگ معاف ہے۔  
بحالت امن اسی طریقہ سے نماز پڑھنی چاہیئے، اس طریقہ کی تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا



ہے لیکن قرآن مجید میں یہ طریقہ کہیں مذکور نہیں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سکھایا اور حدیث کے بذریعہ سکھایا جو بذریعہ وحی نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۷) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ  
لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا  
إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ  
الجمعة: ۱۹

اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن نماز کے لئے تم کو بلایا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف جلدی سے آجایا کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو۔

آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کے لئے بلایا جاتا تھا لیکن اس بلانے کا کیا طریقہ تھا، یہ بلانا کس کے حکم سے مقرر ہوا تھا، قرآن مجید اس سلسلہ میں خاموش ہے۔ پھر جمعہ کی نماز کا اہتمام علاوہ اور دنوں کے کوئی خاص درجہ رکھتا تھا، پھر جمعہ کی نماز کا کوئی خاص وقت بھی مقرر ہو گا۔ یہ تو ہونی نہیں سکتا کہ ہر وقت تیار رہیں، جب بلایا جائے چلے آئیں، خواہ دن میں کئی مرتبہ بلایا جائے، یہ سب چیزیں اس آیت کے نزول سے پہلے مقرر ہو چکی تھیں لیکن قرآن مجید اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر یہ تمام کام بذریعہ وحی خفی یعنی بذریعہ حدیث مقرر ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۸) فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَلَيْسَ  
بَيْنَهُنَّ مَا شَرَكُ (النساء: ۳۴)

اگر دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کو دو تنہائی ترکہ ملے گا۔

آیت سے ظاہر نہیں ہوتا کہ کن حالات میں ترکہ اس طرح تقسیم ہو گا، لہذا لازمی ہے کہ ان حالات کا علم بذریعہ وحی خفی دیا گیا ہو، اسی طرح اس آیت میں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ تقسیم کے بعد باقی ترکہ کا کیا کیا جائے، آخر اس کا بھی کوئی مصرف ہونا چاہیے، یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے ضائع ہونے دیا جائے یا یوں ہی چھوڑ دیا جائے، لہذا اس کے متعلق بھی کوئی ہدایت ہونی چاہیے لیکن وہ ہدایت بھی قرآن مجید میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہدایت حدیث میں ہوگی، لہذا حدیث وحی ہوئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۹) فَإِذَا تَبَايَعْتُمْ  
بِالنِّقَاحِ (۱۸۷)

اب تم رمضان کی راتوں میں عورتوں سے مل سکتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پہلے رمضان کی راتوں میں عورتوں سے ملنا منع تھا، لیکن ممانعت کا حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں، لہذا یہ حکم بذریعہ وحی خفی نازل ہوا تھا، لہذا حدیث وحی خفی ہوئی۔



## (۴) حدیث بھی منزل من اللہ ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:-

« وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكَ فِي الْكِتَابِ  
 أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتَ اللَّهِ يَكْفُرُ بِهَا  
 وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ  
 حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ  
 إِنَّكُمْ إِذَا أَهْتَلُمُ »  
 (النساء: ۱۳۰)

اور اللہ تعالیٰ تم پر کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کے ساتھ کفر اور استہزاء ہوتا ہو اسنو، تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو، جب تک وہ کوئی اور بات نہ کریں، اگر تم ان کے پاس بیٹھ گئے تو پھر تم بھی ان ہی کے مشل ہو گئے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے یہ حکم نازل ہو چکا تھا کہ آیات کا مذاق اڑانے والوں کے پاس مت بیٹھو، لیکن وہ حکم قرآن مجید میں نہیں اور جو حکم قرآن مجید میں ہے اس کا مفہوم اور اندازِ خطاب یہ نہیں ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے، لہذا وہ حکم بذریعہ وحی نفعی نازل ہوا تھا، اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کتاب سے مراد صرف قرآن مجید ہی نہیں بلکہ حدیث بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

« وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
 وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ  
 فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا »  
 (النساء: ۱۱۳)

اور اللہ نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اور حکمت نازل فرمائی اور وہ باتیں بتائیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

اس آیت میں اگر کتاب سے مراد قرآن مجید ہے تو حکمت سے مراد سوائے حدیث کے اور کیا ہے۔ اگر حکمت سے بھی قرآن مجید ہی مراد ہے تو متعدد مقامات پر کتاب و حکمت کی تکرار بے فائدہ ہے، پس ثابت ہوا کہ حکمت سے مراد حدیث ہے اور یہ کہ حدیث بھی منزل من اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

« أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ  
 فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا  
 عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ  
 مَا حَمَلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا  
 تَهْتَدُوا »

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم (رسول کی اطاعت سے) منہ پھیرو گے تو اس کے ذمہ صرف وہ ہے جو اس پر لازم کر دیا گیا ہے (اللہ سے ذمہ نہ چیز ہے جو تم پر لازم کر دی گئی ہے اور اگر تم رسول



(النور: ۵۴)

کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْبَلَدُ

اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی حقیقت میں ہدایت

(البقرة: ۱۲۰)

ہے۔

یہ ہدایت کس طرح آتی ہے،

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَأَمَّا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا فَاتَّقُوا اللَّهَ

میری طرف سے وقتاً فوقتاً ہدایت آتی رہے گی

هَذَا يَوْمَ لَا خَوْفَ عَلَيْكُمْ وَلَا هُمْ

پس جن لوگوں نے میری ہدایت کی پیروی کی تو

يَحْزَنُونَ (البقرة: ۳۸)

وہ بے خوف اور بے غم ہوں گے۔

پہلی آیت سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہدایت ہے، اور دوسری اور تیسری آیات سے ثابت ہوا کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہتی ہے، لہذا ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام منزل من اللہ ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ رسول کی اطاعت صرف قرآن مجید کی اطاعت ہے، اس کے علاوہ نہیں بلکہ مطلق اطاعت کا حکم دیا، لہذا قرآن مجید اور غیر قرآن مجید ہر قسم کی اطاعت اس میں شامل ہے۔

اسلامی تعلیمات کے ماحصل کے سلسلہ میں برق صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی

(۲۰) ”تمام علوم جدیدہ مثلاً طبیعیات، ریاضیات، اقتصادیات، تعمیرات وغیرہ کو کفر

خیال کرنا“

(۲۱) ”غور و فکر اور اجتہاد و استنباط کو گناہ قرار دینا“

(۲۲) ”صرف کلمہ پڑھ کر بہشت میں پہنچ جانا“

(۲۳) ”ہر مشکل کا علاج عمل اور محنت سے نہیں، بلکہ دعاؤں سے کرنا“ (دوا سلام ص ۱۷)

ازالہ | برق صاحب یہ کسی مُلّا ہی نے کہا ہوگا، البتہ بعض حالات میں یہ باتیں صحیح بھی ہیں

برق صاحب پھر تحریر فرماتے ہیں کہ:-

غلط فہمی

”میں سارا قرآن پڑھ گیا اور کہیں بھی محض دعایا تعویذ کا کوئی صلہ نہ دیکھا، کہیں بھی

زبانی خوشامد کا اجر زمرہ میں محلات، لاکھ لاکھ حوروں اور حجوں کی شکل میں نہ پایا، یہاں میرے

کانوں نے صرف تلواروں کی جھنکار سنی، اور میری آنکھوں نے فانیوں کے وہ جھرمٹ دیکھے جو

شہادت کی لازوال دولت حاصل کرنے کے لئے جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود رہے

تھے“ (دوا سلام ص ۱۹)



برق صاحب جو کچھ آپ نے قرآن مجید میں دیکھا، یہ سب کچھ حدیث میں بھی ہے، ہم گماں ازالہ | تک فضائل جہاد کی احادیث نقل کریں، احادیث کے دفتر کے دفتر اس سے پڑھیں، براہ کرم آپ صرف مشکوٰۃ شریف ہی سے ابواب فضائل الجہاد نکال کر پڑھیں تو آپ کو اس سلسلہ میں قرآن مجید سے بہت زیادہ مواد ملے گا۔

اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | ”میں نے سوچا کہ حدیث و قرآن کی بتائی راہوں میں اتنا فرق کیوں ہے اور یہاں بھی ایسی کہ کسی مقام پر آپس میں نہیں ملتیں، احادیث کی تاریخ پڑھی تو مجھ پر منکشف ہوا کہ کہیں تو احادیث اسلام نے تو یہی اسلام کے لئے، اور کہیں ہمارے علماء نے قرآن کے تیغ و سنان والے اسلام سے بچنے کے لئے تقریباً چودہ لاکھ احادیث وضع کر رکھی ہیں۔ جہاں ایک ایک دعا کا صلہ لاکھ لاکھ جنت دیا ہوا ہے“ (دو اسلام ص ۲)

برق صاحب قرآن و حدیث کی راہوں میں تو فرق نہیں ہے، ہاں قرآن مجید اور خود تراشیدہ ازالہ | اسلام میں فرق ضرور ہے اور یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس قسم کی احادیث وضع کیں، ملا کی تو میں کتنا نہیں، مگر برق صاحب کیا علماء کے ہاں ان احادیث کی کوئی وقعت ہے، ہرگز نہیں، علماء کے ہاں تو جہاد اس ہی درجہ پر ہے، جہاں آپ اسے سمجھتے ہیں صحیح احادیث میں اس کے فضائل بے شمار ہیں اور قیامت تک اس کو باقی رکھا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لَنْ يَنْبُذَ هَذَا الدِّينُ قَائِلًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ  
عِمَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى تَقُومَ  
السَّاعَةُ (صحیح مسلم)

یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمین کی ایک جماعت قیامت تک اس دین کی خاطر لڑتی رہے گی۔

ہاں برق صاحب یہ چودہ لاکھ کی تعداد آپ نے بہت زیادہ لکھ دی، اس پر مزید غور فرمائیے گا۔

اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”اور ساتھ ہی یقین ہو گیا کہ اسلام وہی ہے، ایک قرآن کا اسلام، جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے

اور دوسرا وضعی احادیث کا اسلام“ (دو اسلام ص ۲)

ازالہ | برق صاحب ہمیں آپ سے اتفاق ہے۔ یہ خود تراشیدہ اسلام واقعی اصل اسلام سے علیحدہ ایک چیز ہے اور اس کی بنیاد متعدد وضعی احادیث پر رکھی گئی ہے اور بعد ازاں بدعات و خرافات پر، لیکن ایک وہ اسلام ہے جس کی بنیاد صحیح احادیث پر ہے، وہ وہی اسلام ہے جو قرآن مجید نے



بتایا ہے، بے شک آپ وضعی احادیث کے اسلام کرنے مابین، لیکن صحیح احادیث کے اسلام کو مان لینے میں تو آپ کو تاثر نہیں ہونا چاہیئے اور غالباً انہیں ہوگا کیونکہ آپ نے خود ہی آخری باب کا عنوان ”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“ مقرر کیا ہے، لہذا ہمیں آپ سے اختلاف ہی کب ہے، ہاں چند غلط فہمیاں آپ کو ہو گئی ہیں جن کا ازالہ انشاء اللہ آئندہ صفحات میں کر دیا جائے گا۔

یہاں تک تمہید کا جواب تھا، اب ہم اصل کتاب کا جواب شروع کرتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرتے ہیں اور آپ سے انصاف کے خواہاں ہیں۔







# پہلا باب

## ”حدیث میں تحریف“

**غلط فہمی** | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-  
 ”وضعی احادیث اقوال رسول کے ساتھ یوں غلط ملط ہو چکی ہیں کہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو رہا ہے“ (دو اسلام ص ۳۳ ملخصاً)

**ازالہ** | اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-  
 اِنَّا لَنُحِبُّ النَّازِلَاتِ الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَٰخَفِیْقُوْنَ ۝ (الحجہ: ۴) اس کے معانی ہیں :-  
 ہم نے یہ نصیحت نازل فرمائی ہے، اور ہم ہی

یہ تو ہم تمہید کے جواب میں ثابت کر آئے ہیں کہ حدیث وحی ہے اور اس کا اتباع لازمی ہے، لہذا اس کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی، حفاظت کے اسباب مہیا کیے جن کے ذریعہ صحیح احادیث کو محفوظ کر دیا گیا اور موضوعات کو چھانٹ کر الگ کر دیا گیا، ایک طرف اگر تحریف کا عمل جاری تھا، تو دوسری طرف تخلیص کا عمل بھی جاری تھا، حق کو باطل سے علیحدہ کر دیا گیا اور جس بات کو آپ ناممکن سمجھ رہے ہیں، وہ ممکن ہو گئی اور اس کو آپ نے خود تسلیم کیا ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی حدیث صحیح موجود ہی نہیں“

اس سے ذرا آگے تحریر فرماتے ہیں :-

”دوم کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں“

(دو اسلام ص ۳۴)



پھر تحریر فرماتے ہیں :-

”اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پر ہم نازاں ہیں“ (دو اسلام ص ۳۳۲)

برق صاحب آپ کے اس اعتراف کے بعد اب کوئی ضرورت اس امر کی باقی نہیں رہتی کہ تخلص احادیث کی تاریخ پیش کی جائے، اور یہ ثابت کیا جائے کہ دودھ الگ اور پانی الگ کر دیا گیا، تاہم اس سلسلہ میں چند معروفات پیش خدمت ہیں۔

### حدیث کی حفاظت

حدیث کی حفاظت دو طرح سے ہوئی۔

(۱) عملاً اور (۲) نقلاً

جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، اس پر ہر زمانے میں عمل ہوتا رہا، اور ہر زمانے میں وہ پڑھی جاتی رہی اور پڑھائی جاتی رہی، مثلاً حدیث میں ہے کہ نماز پانچ وقت کی فرض ہے ظہر کی چار رکعت ہیں، مغرب کی تین رکعت ہیں، ہر رکعت میں ایک رکوع، اس کے بعد دو سجدے ہیں، سال میں دو عیدیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی بے شمار حدیثیں ہیں جو ہر زمانہ میں بچہ بچہ کی زبان پر تھیں اور اگر زبان سے بیان نہ بھی ہوئیں تو کم از کم ذہن میں اور عمل میں ہر ایک کے موجود تھیں، تو ان کے ساتھ ان پر عمل ہو رہا تھا اور تو ان کے ساتھ نقل کی جا رہی تھیں، ان احادیث کی صحت قطعی ہے اور ان کا تواتر۔ قرآن مجید کے تواتر سے بھی زیادہ وسیع ہے،

قرآن مجید کی آیات چند علماء اور حفاظ کی حفاظت میں تھیں لیکن یہ احادیث ہر عالم اور جاہل مرد و عورت، چھوٹے اور بڑے کے عمل میں آ رہی تھیں اور ان کے ذہن میں محفوظ تھیں، پھر نقل کے اعتبار سے بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے، فرض کیجئے ایک محدث نے ایک حدیث بیان کی اور اپنے ہزار ہا شاگردوں کو املاء کرائی، پھر اس محدث کے ہم عصر سینکڑوں محدثین نے بھی اپنے اپنے ہزار ہا تلامذہ کو وہ حدیث املاء کرائی، ذرا حساب لگا کر دیکھیے، ایک ہی حدیث کو ایک ہی زمانہ میں لاکھوں نے حاصل کیا اور اس کو محفوظ کیا، لہذا بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر بے شمار احادیث ایسی ہیں جن کی صحت قرآن مجید کی آیات کی طرح قطعی ہے، غرض کہ عملاً اور علماً مفہوم حدیث کی حفاظت ہو رہی تھی اور ساتھ ساتھ حفظ و کتابت کے ذریعہ الفاظ حدیث کی حفاظت کا بھی انتظام ہو رہا تھا، لاکھوں آدمی حدیث کو حفظ بھی کر رہے تھے اور ضبط تحریر میں بھی لا رہے تھے، پھر ہر حدیث کو پرکھنے کے لئے فنون بھی ترتیب دیئے جا رہے تھے تاکہ کہیں کوئی شوشہ ادھر ادھر نہ ہو جائے۔

### ایک شبہ اور اس کا ازالہ

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث کو پرکھنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے، یعنی فن اسماء الرجال کے ذریعہ



حدیث کی سند میں جو ردی آئے ہیں، ان کی جانچ پڑتال، پس اگر ردی جانچ پڑتال سے ثقہ ثابت ہو جائیں تو حدیث صحیح ہو جائے گی، حالانکہ یہ ان کی لاعلمی ہے، حدیث کو پرکھنے کے فنون کی تعداد تقریباً سو ہے اور برن کی ایک مستقل حیثیت ہے اور برن پر مستقل تحریری مواد ہمارے پاس موجود ہے، جب ان تمام معیاروں سے کوئی حدیث بے داغ ثابت ہو جائے تو اس کو صحیح کہا جاتا ہے جن لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا کہ بس سند ہی ایک ذریعہ ہے، وہ اس دھوکہ میں بھی پڑ گئے کہ کسی شخص نے کوئی حدیث گھڑ دی اور دو چار ثقہ آدمیوں کے نام بطور سند کے اس گھڑے ہوئے متن کے ساتھ لگا دئے، لہذا حدیث صحیح ہو گئی، ان کو یہ نہیں معلوم کہ اس طرح سند لگا دینے سے حدیث صحیح نہیں ہوگی، قطع نظر دوسرے فنون کے وہ تو فن اسماء الرجال کے معیار پر بھی پوری نہیں اترے گی مثلاً ایک شخص مسلمی کوئی حدیث گھڑ لیتا ہے اور سند یہ لگا دیتا ہے کہ مجھ سے امام مالک نے بیان کیا ان سے امام نافع نے ان سے عبداللہ بن عمر نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔۔۔۔۔ یہ سند اگرچہ اصح الاسانید اور سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) ہے لیکن حدیث کی صحت کے لئے کافی نہیں اس لئے کہ مسلمی کی وجہ سے اس حدیث کی تصحیح میں تامل ہوگا۔ مسلمی سے اوپر کی سند بے شک بہت اعلیٰ اور معتبر ہے لیکن پوری سند میں یہ بات نہیں لہذا حدیث پایہ اعتبار سے گر جائے گی اور محض اوپر کی سند اس کی صحت کے لئے کافی نہ ہوگی۔ اب حدیث کی صحت کے لئے مسلمی کا حال معلوم کرنا ہوگا۔ اگر حالات نہ مل سکے تو وہ جہول ہوگا اور اس کی روایت کا اعتبار نہیں ہوگا اور اگر حالات مل گئے تو یا تو وہ صادق ہوگا یا کاذب، اگر کاذب ہو تو اس کی حدیث کا انکار کر دیا جائے گا اور وہ حدیث جھوٹی ہوگی اور تمام محدثین نے اگر دھوکہ کھا کر اس کو صادق کہہ دیا اگرچہ یہ ناممکن ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی طبع حدیث کو تمام محدثین نے صادق کہا ہو لیکن پھر بھی اگر بالفرض محال ایسا ہو جائے تو پھر دوسرے عجوب کی تلاش ہوگی۔ مثلاً حافظہ کی خرابی، وہم، مبالغہ آمیزی، متن اور تشریحی الفاظ کا خلط ملط کرنا، تلبیس وغیرہ وغیرہ اگر ان میں سے ایک بھی عیب پایا گیا تو اس حدیث کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اب اگر ان تمام ہرجوں سے وہ بچ گیا اور تمام محدثین نے غلطی سے بالاتفاق اس کو ہر لحاظ سے ثقہ کہہ دیا اگرچہ یہ ناممکن ہے اور نہ ایسا ہوا ہے کہ کسی وہمی، بد حافظہ کو محدثین نے ثقہ کہا ہو تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے کیا امام مالک کے دوسرے شاگرد بھی اسے بیان کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر بیان کرتے ہیں تب تو غیر وہ حدیث دوسری سند سے ثابت ہو جائے گی اور اگر دوسرے شاگرد بیان نہیں کرتے بلکہ وہ مسلمی کے خلاف روایت کرتے ہیں تو مسلمی کی روایت کردہ حدیث شاذ ہوگی اور صحت کے درجہ سے گر جائے گی اور اگر مسلمی کی بیان کردہ حدیث کا مضمون بالکل نیا ہوگا تو پھر وہ ہر حالت میں غریب ہوگی اور یہ بھی ایک قسم کی کمی ہی ہے۔ ہر حال مسلمی کی بیان کردہ حدیث ہرگز صحت کے درجہ تک نہ پہنچے گی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ابتدائی منازل ہی میں وہ ضعیف ثابت ہو جائے گی، مزید براں مسلمی جیسے جھوٹے آدمی کے لئے یہ کتنا مشکل ہوگا کہ وہ اپنی پوری زندگی تقویٰ و طہارت



اور خلوص کے ساتھ گزارے اور اگر یہ مشکل کام اس نے انجام دے بھی لیا تو بھی محدثین کے جنگل سے نکلنا اس کے لئے بہت مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ محدثین کی گرفت سے وہ لوگ بھی نہ بچ سکے جو صالح تھے، لیکن نیک نیتی سے حدیث میں تحریف کر دیا کرتے تھے، یہ لوگ بھی باوجود اپنے زہد و تقویٰ کے محدثین کو دھوکہ نہ دے سکے، غرض یہ کہ محدثین نے جس حدیث کو صحیح کہا، وہ حقیقت میں قطعی الصحت ہے اس لئے کہ شبہ اور شکوک کے تمام منازل کو اس نے عبور کر کے ہی مقام صحت کو حاصل کیا ہے، جو لوگ اب بھی صحیح حدیث کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ فرق حدیث سے نا آشنا ہیں اور ان تفاسیر کا انہیں علم نہیں ہے اگر ان فنون کو عام کر دیا جائے تو انشاء اللہ تمام شکوک دور ہو جائیں گے اور محدثین کے کارناموں کی یہ لوگ بھی اسی طرح داد دیں گے جس طرح بعض غیر مسلم یورپین محققین نے دی ہے، الغرض ان معروضات کے بعد یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بس جو شخص چاہے حدیث گھڑ دے اور اس کے ساتھ ایک سند لگا دے، وہ حدیث صحیح ہو جائے گی اور نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ معاملہ اس قدر الجھ چکا تھا کہ اس کو سلجھانا انسانی دسترس سے باہر تھا۔

برق صاحب ایصح احادیث اور موضوع احادیث کا معاملہ بڑا صاف تھا، صحیح کو موضوع سے بڑی آسانی سے الگ کر دیا گیا، واضعین کے نام محدثین کو معلوم تھے وہ نام آیا اور حدیث کو موضوع سمجھ لیا گیا، بڑے علامہ اور مؤرخین جن کے نام کے ساتھ عوام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ محدثین کے ہاں وضامین اور کذابین کی فہرست میں شامل ہیں، وہ نہ کسی کے علم سے دھوکہ کھا سکے، نہ کسی کے زہد و تقویٰ سے ان کو مغالطہ ہوا۔ محدثین کی اصل محنت تو اس کام میں صرف ہوئی کہ جو حدیث درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی وہ حدیث من وعن محفوظ ہے یا نہیں، گھڑی ہوئی احادیث کے سلسلہ میں انہیں کوئی دشواری پیش ہی نہیں آئی، لہذا تحریف کا شبہ بے بنیاد ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی**

”صحابہ کی تمام تر توجہ قیام سلطنت، نشر اسلام اور تعمیر ملت پر صرف ہو رہی تھی (ص ۳۳)

برق صاحب! گویا آپ کا یہ مطلب ہے کہ صحابہ کرام نے حفاظت حدیث کے سلسلہ میں کوئی کا زنامہ انجام نہیں دیا۔ یہ خیال بھی غلط فہمی پر مبنی ہے، قبل اس کے کہ ہم صحابہ کرام کی جدوجہد کے متعلق کچھ عرض کریں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حفاظت کی طرف توجہ دی، مندرجہ ذیل حدیثیں ملاحظہ فرمائیے۔

## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احادیث کی حفاظت

(۱) قبیلہ عبد القیس کے لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو بہت سے امور دین کی تعلیم دی، پھر فرمایا :-



ان احکام کی حفاظت کرنا، اور اپنے پیچھے لوں کو بھی اس سے مطلع کر دینا۔

أَحْفَظُوهُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِنَّ مَنْ  
وَرَاءَكُمْ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

(۲) حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نصیحت کرنے کے لئے چند دن مقرر کر رکھے تھے، ہماری پریشانی کو ناپسند کرتے ہوئے (روزانہ وعظ نہیں فرماتے تھے)

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْأَيَّامِ  
كَزَاهَةِ السَّامَةِ عَلَيْنَا  
(صحیح بخاری)

(۳) حضرت انس فرماتے ہیں :-

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مسئلہ بیان فرماتے تو تین مرتبہ اس کو دہراتے یہاں تک کہ وہ مسئلہ سمجھ میں آجاتا۔

إِنَّهُ كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا  
ثَلَاثًا حَتَّى تَفْهَمَ عَنْهُ  
(صحیح بخاری کتاب العلم)

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند احادیث بیان کرنے کے بعد فرمایا :-

حاضر کو چاہیے کہ غائب کو میری باتیں پہنچا دے، اس لئے کہ شاید حاضر ایسے شخص کو پہنچائے جو اس سے زیادہ اس کو محفوظ کر سکے۔

لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَإِنَّ الشَّاهِدَ  
عَسَى أَنْ يُبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعَى لِمَا مِنْهُ  
(صحیح بخاری کتاب العلم)

متعدد صحابہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے (کتب حدیث ملاحظہ فرمائیں) یہ پیشینگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ محدثین نے صحابہ کرام سے احادیث کو اخذ کیا، اور ان کو بالکل محفوظ کر دیا۔

(۵) یمن کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا :-

ہمارے ساتھ کسی آدمی کو بھیج دیجئے جو ہمیں سنت اور اسلام کی تعلیم دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو بھیج دیا۔

إِبْعَثْ مَعَنَا رَجُلًا يُعَلِّمُنَا السُّنَّةَ  
وَالْإِسْلَامَ فَبَعَثَ أَبَا عُبَيْدَةَ  
بَنَ الْجَرَّاحِ  
(صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة)

(۶) مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی تعلیم کے لئے کچھ دن مقرر کر رکھے تھے، ایک عورت آئی اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول :-

یعنی مرد تو آپ کی احادیث حاصل کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے لئے بھی کوئی دن مقرر فرما دیجئے تاکہ اس دن ہم آپ کی خدمت میں

ذَهَبَ الرِّجَالُ لِحَدِيثِكَ فَاجْعَلْ  
لَنَا مِنْ نَفْسِكَ يَوْمًا نَأْتِيكَ فِيهِ  
نُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللَّهُ قَالَ اجْتَمِعْنَ



یَوْمَ كَذَّابًا كَذَّابًا  
 حاضر ہو جایا کریں اور جو باتیں اللہ نے آپ کو سکھائی  
 (صبح صلو، کتاب البرق) ہیں، وہ باتیں آپ ہمیں بھی سکھایا کریں، آپ نے  
 الصلوة وروی الخلفی غوہ فی کتاب العلم فرمایا، فلاں فلاں دن جمع ہو جایا کرو۔

### کتابت احادیث

احادیث کی تعلیم اور اس کی حفاظت کے اہتمام کے ساتھ ساتھ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث کو لکھوایا تھا۔ مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں:-

كَتَبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابَ الزَّكَاةِ وَرَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ  
 یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب  
 الصدقہ تحریر فرمائی تھی۔

کتاب الزکوۃ ورواہ ثقافت کلنا شوالہد۔

(۲) ابوراشد الحمرانی فرماتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے میرے سامنے ایک کتاب رکھی اور  
 فرمایا

هَذَا مَا كَتَبَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 یعنی یہ وہ کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھ کر مجھ کو دی تھی۔

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:-

وَجَدْتُ فِي مَقَائِمِ سَيْفِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابَانِ  
 یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار  
 کے قبضہ میں دو نوشتہ ملے تھے (ان میں مختلف  
 ہدایات مندرج تھیں)

الحدود ورواہ حسان، التعلیق المغنی ص ۱۳۲

(۴) موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں:-

عِنْدَنَا كِتَابٌ مَعَاذِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو حضرت معاذ  
 کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 لکھی تھی۔

رواہ ثقافت، فقیر

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس کتاب کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے حضرت معاذ کے ساتھ بھیجی تھی منگوایا، اور اس کو پڑھوا کر مسناد نصب الرایہ کتاب الزکوۃ  
 جلد ۲ ص ۳۵۲

(۵) ایک تحریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ جہینہ کو بھیجی تھی، جس میں مختلف احکام درج تھے (رواہ



ابوداؤد فی کتاب اللباس ورواۃ ثقات،

(۶) حضرت جابرؓ کہتے ہیں :-

كُتِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
عَلَى كُلِّ بَطْنٍ عَقُولُهُمْ ثُمَّ كُتِبَ  
أَنَّهُ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَتَوَلَّى  
مَوْلَى رَجُلٍ مُسْلِمٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِ  
ثُمَّ أَخْبَرْتُ أَنَّهُ لَعَنَ فِي صَحِيفَةٍ  
مَنْ فَعَلَ ذَلِكَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا  
تھا کہ دیت عصبہ کے ذمہ واجب الادا ہے،  
پھر یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ کسی مسلم کو جائز نہیں  
کہ کسی دوسرے مسلم کے مولیٰ کو بغیر اس کی  
اجازت کے اپنا مولیٰ بنالے پھر مجھے خبر دی گئی  
کہ آپ نے اس کتاب میں اس کام کے کرنے  
والے پر لعنت فرمائی۔

(صحیح مسلم، کتاب العتق)

(۷) امام طاؤسؒ فرماتے ہیں :-

عَمَدَنَا فِي كِتَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ وَفِي الْأَنْفِ إِذَا قُطِعَ مَارِدُهُ مِائَةً  
مِنْ الْإِبِلِ (نیل الاوطار جزء ۱۹ جلد ۱۸ کتاب  
اما شافعی سکت علیہ الشوکافی)

ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ناک کا اگلا نرم  
حصہ کٹ جائے تو دیت میں سوا دنت دینے  
ہوں گے۔

(۸) إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
كُتِبَ إِلَى أَهْلِ الْيَمَنِ كِتَابًا بَيْنَهُ الْفَرِيقُ  
وَالسَّنُّ وَالذِّيَاتُ وَبَعَثَ بِهِ عُمَرُ  
بْنُ كُزَيْبٍ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن  
حزم کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو اہل یمن کے لئے  
ایک کتاب بھی لکھ کر مرحمت فرمائی تھی جس  
میں فرائض، سنن اور دیات کے مسائل تحریر  
تھے۔

(نسائی جلد ۲ ص ۲۸۸ سند صحیح نیل الاوطار جزء ۱۸)

مشہور تابعی امام زہریؒ فرماتے ہیں :-

”میں نے وہ کتاب پڑھی اور وہ کتاب ابو بکر بن حزم کے پاس تھی (نسائی ۲ ص ۲۱۸)۔

پھر امام زہری نے اس کتاب کا مضمون بیان کیا ہے (ملاحظہ ہوں نسائی)

حضرت سعید بن مسیب نے بھی اس کتاب کو پڑھا تھا اور اس کے مضمون کو نقل کیا ہے۔ (نسائی

جلد ۲ ص ۲۱۸)۔

خليفة راشد حضرت عمر بن عبد العزيز نے اس کتاب کی صحت کی شہادت دی ہے (نیل الاوطار جزء ۱ ص ۱۶)

امام یعقوبؒ فرماتے ہیں :-

لَا أَعْلَمُ فِي جَمِيعِ الْكُتُبِ الْمَنْقُولَةِ  
خَيْرَ كِتَابٍ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ



کِتَابًا أَصَحَّ مِنْ كِتَابِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ  
هَذَا فَإِنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالتَّابِعِينَ يَرْجِعُونَ  
إِلَيْهِ وَيَذْخَرُونَ رَأْيَهُمْ  
(نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۱۶)

سے منقول یعنی مکتوب چلی آرہی ہیں ان میں میرے  
علم کے مطابق کوئی کتاب عمرو بن حزم کی اس کتاب  
سے زیادہ صحیح نہیں کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین  
عظام اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنی راہوں  
کو چھوڑ دیتے ہیں۔

امام یعقوب کے بیان سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی کتابیں بہت تھیں اور سب  
صحیح تھیں لیکن ان کے علم کے مطابق سب سے زیادہ صحیح کتاب عمرو بن حزم کی کتاب تھی، کیونکہ تواتر اور شہرت کا  
جو درجہ اس کو حاصل تھا، وہ کسی کتاب کو نہ تھا، امام ابن عبد البر فرماتے ہیں :-

هَذَا كِتَابٌ مَشْهُورٌ عِنْدَ أَهْلِ  
السَّيْرِ مَعْرُوفٌ مَا فِيهِ عِنْدَ أَهْلِ  
الْعِلْمِ (نیل الاوطار)

یہ کتاب اہل سیر کے نزدیک مشہور ہے اور  
جو کچھ اس میں ہے وہ اہل علم کے نزدیک  
معروف ہے۔

(۹) امام محمد بن مسلم فرماتے ہیں :-

هَذِهِ نُسْخَةُ كِتَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِي  
كَتَبَ فِي الصَّدَقَةِ وَهِيَ عِنْدَ  
أَبِي عَمْرٍو بْنِ الْخَطَّابِ

یہ اس کتاب کا ایک نسخہ ہے جو کتاب رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کے متعلق لکھوائی  
تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کتاب حضرت  
عمرؓ کے خاندان کے پاس تھی۔

پھر فرماتے ہیں :-

أَقْرَأُ فِيهَا سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو  
فَوَعَيْتُهَا عَلَى وَجْهِهَا وَهِيَ الَّتِي انْتَسَخَ  
عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ مِنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ  
عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو وَسَلَوِ بْنِ عَبْدِ  
اللَّهِ ابْنِ عُمَرَ فَذَكَرَ  
الْحَدِيثَ (ابوداؤد ۲۳۸ دارقطنی  
۲۴۹، رواہ ثلاثاً، تقریب)

یہ کتاب حضرت عمرؓ کے پوتے حضرت سالم نے  
مجھے پڑھائی تھی اور میں نے اس کو پوری طرح  
محفوظ کر لیا ہے۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے اس  
کتاب کو حضرت عمرؓ کے پوتوں سالم اور عبد اللہ  
سے لے کر لکھوایا تھا پھر اس کے بعد امام محمد  
بن مسلم نے اس کا مضمون بیان کیا ہے جو کتب  
حدیث میں مذکور ہے۔

(۱۰) سوید بن غفلہ فرماتے ہیں :-

قَدْ مَرَّ عَلَيْنَا مُصَدِّقُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَأْتُ فِي كِتَابِهِ لَا

یعنی ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کا تحصیل دار آیا، میں نے اس کی کتاب میں



يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ وَلَا تُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ  
پڑھا کہ زکوٰۃ کے خوف سے متفرق مال  
جمع نہ کیا جائے اور مجتمع مال کو متفرق نہ کیا  
جائے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحصیل داروں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب ہوتی تھی جس میں تحصیل زکوٰۃ کے احکام درج ہوتے تھے۔  
(۱۱) متعدد صحابہ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احادیث لکھوایا کرتے تھے، عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

بَيْنَا مَخْرَجَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
نَكْتُبُ إِذَا مَسَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
أَيُّ الْمَدِينَةِ تَقْلَمُ أَوَّلًا تَسْطَنِيَّةً أَوْ رُمِيَّةً  
نَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بَلْ مَدِينَةٍ  
هِيَ أَوَّلُهَا دَارِيٌّ وَمِنْهَا ثَقَاتٌ وَحَسَنٌ تَقْرِبُ  
ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد  
بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے، اس حالت  
میں آپ سے پوچھا گیا، کون سا شہر پہلے  
فتح ہوگا تَسْطَنِيَّةً یا رُمِيَّةً آپ نے فرمایا  
ہر قتل کا شہر سب سے پہلے فتح ہوگا۔

کیا اب بھی یہ کنا صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو محفوظ کر بنے کا کوئی انتظام نہیں فرمایا، مندرجہ بالا حوالہ جات سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی بہت سی کتابیں کھوائیں، کچھ مدینہ منورہ میں رہیں، کچھ آپ نے گورنروں کے ہمراہ مختلف ممالک کو روانہ فرمائیں، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس حدیث کی حفاظت کا انتظام اور اہتمام فرمایا، اور صحابہ کرامؓ کو بھی حکم دیا کہ احادیث کو قلم بند کر لو۔

### رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو احادیث لکھنے کا حکم دیا۔

ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-  
(۱) اُكْتُبُوا لِیْ شَآءَ  
یہ احادیث ابو شاہ (رضی اللہ عنہ) کو لکھو کہ  
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۸) صحیح مسلم ج ۱ ص ۵۶۹  
دے دو۔

(۲) حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-  
اُكْتُبْ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ  
مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ  
احادیث لکھا کرو، قسم اس ذات پاک کی  
جس کے ہاتھ میں میری جان ہے،  
اس منہ سے حق کے سوا دوسری بات  
نہیں نکلتی۔

(ابوداؤد ج ۱ ص ۱۵۸، ورجالہ)

(ثقات، تقریب)



## حدیث کی حفاظت کرنے والے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی حفاظت کا حکم ہی نہیں دیا بلکہ حفاظت کرنے والے کے لئے دعا بھی فرمائی، آپ نے فرمایا:-

نَحْمَدُ اللَّهَ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَاتِي فَحَفِظَهَا  
وَرَعَاهَا وَآذَانَهَا

اللہ اس بندے کو تردادہ رکھے جو میرے اقوال سنے، پھر ان کو حفظ کرے اور محفوظ

رہے (رواہ النافعی وابوداؤد وابن ماجہ والترمذی وصحیحہ)

اس حدیث کو متعدد صحابہ نے روایت کیا ہے (کتب حدیث) ان ہی احادیث کی تعمیل میں صحابہ کرام اور دیگر محدثین نے احادیث کو حفظ کیا، پھر ان کو مکتوب کر کے محفوظ کر لیا، پھر ان کو دوسروں تک پہنچا دیا، یہی وہ سلسلہ ہے جو مؤلفین صحاح تک قائم رہا، بلکہ آج تک قائم ہے اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔

## ”صحابہ کرام کا حدیث کی حفاظت کرنا“

### حضرت ابو بکرؓ کی کتاب

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ  
كَتَبَ لَهُ هَذَا الْكِتَابَ لِقَاءَ وَجْهَةِ إِلَى  
الْبَحْرَيْنِ - بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
هَذِهِ قَرِيبَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِي قَرَضَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى  
الْمُسْلِمِينَ وَالَّتِي أَمَرَ اللَّهُ بِهَا رَسُولُكَ  
(صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب ان کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک نوشتہ لکھ کر دی جس کا مضمون یہ تھا بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ یہ زکوٰۃ کے قرائن ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے اور ان ہی کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے۔

میں نے یہ کتاب حضرت انسؓ کے پوتے ثمامہ سے حاصل کی تھی۔

حدیث کے راوی حماد بن سلمہ کہتے ہیں:-  
أَخَذْتُ هَذَا الْكِتَابَ مِنْ  
ثُمَّامَةَ (نسائی کتاب الزکوٰۃ)  
درواتہ ثقات، تقریب



## حضرت عمرؓ کی کتاب

حضرت عمرؓ نے بھی زکوٰۃ کے متعلق ایک کتاب تحریر فرمائی تھی۔

محمد انصاری فرماتے ہیں :-

إِنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ جِئَ اسْتَخْلَفَ  
أَرْسَلَ إِلَى الْمَدِينَةِ يَلْقَى عُمَرَ رَسُولَ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَالْصَّدَقَاتِ  
فَوَجَدَهُ عِنْدَ آلِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ كِتَابَ  
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى عَمْرِو  
بْنِ حَزْمٍ فِي الصَّدَقَاتِ وَوَجَدَ عِنْدَ  
آلِ عُمَرَ بَيْنَ الْخَطَابِ كِتَابَ عُمَرَ إِلَى  
عُمَالِهِ فِي الصَّدَقَاتِ بِمِثْلِ كِتَابِ  
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى عَمْرِو  
بْنِ حَزْمٍ فَأَمَرَ عُمَرَ ابْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ  
عُمَالَهُ عَلَى الصَّدَقَاتِ أَنْ يَأْخُذُوا  
بِمَا فِي ذَيْنِكَ الْكِتَابَيْنِ فَكَانَ فِيهِمَا  
(دارقطني ص ۲۱ ورواته ثقات او صدق)

جب حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے  
تو انہوں نے لوگوں کو مدینہ بھیج کر رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب الصدقہ تلاش  
کرائی وہ کتاب عمرو بن حزم کے خاندان کے  
پاس ملی۔ یہ وہ کتاب تھی جو آپ نے عمرو  
بن حزم کو لکھ کر مرحمت فرمائی تھی اور  
حضرت عمرؓ کی کتاب حضرت عمرؓ کے خاندان  
کے پاس ملی، ان دونوں کتابوں کا مضمون  
ایک ہی تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے حکم دیا  
کہ ان کتابوں کے مطابق صدقات وصول کئے  
جائیں، پھر محمد انصاری نے ان کتابوں کا  
مضمون بیان کیا جو کتب حدیث میں  
محفوظ ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں :-

إِنَّهُ قَرَأَ كِتَابَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَابِ فِي  
الصَّدَقَةِ (موطأ امام مالک ص ۱۰۹)

میں نے حضرت عمرؓ کی کتاب پڑھی (اس کا  
مضمون یہ ہے)۔۔۔۔۔

## حضرت عمرؓ کی دوسری تحریر

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ كَتَبَ مَعِيَ عُمَرُ بْنُ  
الْخَطَّابِ إِلَى أَبِي عُبَيْدَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا  
رَسُولُهُ مَوْلَى مَنْ لَمْ يَمُوتْ  
وَالْخَالِ وَارِثٌ مَنْ لَمْ يَرِثْ لَهُ دَاهٍ أَوْ مَرِثَ

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوامامہؓ کے ہمراہ  
حضرت ابو عبیدہؓ کو یہ لکھ کر روانہ فرمایا تھا کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ  
اس شخص کا وارث اللہ اور اس کا رسول ہے،  
جس کا کوئی وارث نہ ہو اور ماموں وارث



فی ابواب الفرائض وحسنہ

ہے اس شخص کا جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

## حضرت عمرؓ کی تیسری تحریر

كُتِبَ عُمَرُ إِلَى عُتْبَةَ بْنِ فَرْقَدٍ أَنَّ النَّبِيَّ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ فِي عَنِ الْحَرِيِّ الْأَ  
هَكَذَا إصْبَعَيْنِ  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عتبہ بن فرقہ کو لکھا  
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حریر پہننے  
سے منع فرمایا ہے۔ البتہ دو انگلی (کے حاشیہ  
تک) کی اجازت دی ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب اللباس)

## حضرت عمرؓ کا چوتھا نوشتہ

ورثہ کے متعلق ایک مقدمہ پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا ہے۔

مَا أَحْرَزَ الْوَلَدُ وَالْوَالِدُ فَهُوَ لِعَصْبَتِهِ  
مَنْ كَانَ قَالَ فَكُتِبَ لَهُ كِتَابًا فِيهِ  
شَهَادَةُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ وَ  
زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ وَرَجُلٍ آخَرَ  
جو مال بیٹا یا باپ جمع کرے وہ اس کے  
عصبہ کے لئے ہے خواہ وہ کوئی ہو پھر حضرت  
عمرؓ نے اس فیصلہ کو لکھ کر دے دیا اور اس  
پر بطور شہادت عبدالرحمن بن عوف، زید بن  
ثابت اور ایک اور آدمی کے دستخط کرائے۔  
(ابوداؤد)

پھر خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں مقدمہ پیش ہوا۔  
فَقَضَى لَنَا بِكِتَابِ عُمَرَ  
تو عبدالملک نے حضرت عمرؓ کی اس کتاب کے  
مطابق فیصلہ فرمایا۔  
(ابوداؤد، کتاب الفرائض و رجالہ ثقات اقرب)

## حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کی حفاظت کی۔

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ حُمَرٍ قَالَ كَتَبَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابَ  
الصَّدَقَةِ.... فَعَمِلَ بِهَا أَبُو بَكْرٍ  
حَتَّى قُبِضَ ثُمَّ عَمِلَ بِهَا عُمَرُ  
حَتَّى قُبِضَ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ  
لکھوائی تھی۔۔۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ  
رضی اللہ عنہ اپنی دنات تک عمل کرتے  
رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ  
اپنی دنات تک عمل کرتے  
رہے۔

(ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۶، رواۃ ثقات)



## حضرت عمرؓ کا حدیث کی حفاظت اور تعلیم کا اہتمام کرنا

انْ عُمَرَوْنِ الْخَطَّابَ حَظَبَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ  
.... قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَشْهَدُكَ عَلَى  
اَمْرَاءِ الْاُمُصَارِ وَاِنِّيْ اَنْصَابُكُمْ  
عَلَيْكُمْ لِيَعْدِلُوْا عَلَيْكُمْ وَلِيَعْلَمُوْا  
النَّاسَ دِيْنَكُمْ وَسُنَّةَ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب فی من اصابہ)  
حضرت عمرؓ خود بھی وقتاً فوقتاً سنت کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً ایک مرتبہ مسجد میں تشریف لائے  
اور فرمایا:-

اَبْلُوْا عَلٰی بُحُوْهِكُمْ اُصَلِّتُمْ بِكُمْ  
صَلٰوَةَ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ اَلَمْ يَكُنْ يَصَلِّيْ وَيَاْمُرُ بِهَا فَاَقَامَ  
مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ وَرَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى  
حَاذَى بِرَأْسِ مَا مِنْ كِبِيَّةٍ ثُمَّ كَبَّرَ ثُمَّ  
رَكَعَ وَكَذَلِكَ حِيْنَ رَفَعَ فَقَالَ اَلْقُوْا  
هَكَذَا اِذَا كَانَ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى  
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصَلِّيْ يَنَا  
(خلافیات دلامم البیهقی وسندہ صحیح  
تسہیل القاری جلد ۳ ص ۱۰۰)

میری طرف منہ کر دو میں تم کو رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم کی طرح نماز پڑھ کر بتاؤں  
جس طرح کہ آپ پڑھتے تھے اور جس طرح  
پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے پس حضرت عمرؓ  
کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھوں کو کندھوں  
کے برابر اٹھایا پھر تکبیر کہی، پھر رکوع کیا اور  
جب رکوع سے اُٹھے تب بھی اسی طرح (رفع  
یدیں) کیا، تمام صحابہؓ نے فرمایا، اسی طریقہ  
سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں نماز  
پڑھایا کرتے تھے۔

## حضرت عثمانؓ کی کتاب

عَنْ ابْنِ الْحَنَفِيَّةِ قَالَ اَرْسَلَنِيْ اِبْنُ  
حُذَافَةَ الْكِتَابِ فَاذْهَبْ اِلَى  
عُثْمَانَ فَإِنَّ فِيْهِ اَمْرَ النَّبِيِّ  
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي  
الصَّحِيْفَةِ

حضرت علیؓ نے اپنے لڑکے محمد بن حنفیہ  
سے فرمایا، اس کتاب کو عثمانؓ کے  
پاس لے جاؤ اور ان سے اس پر عمل کے لئے  
کہو کیونکہ اس میں صدقہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کے احکام مندرج ہیں۔



بب وہ اس کتاب کو لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا :-  
 اَغْنِيَنَا  
 میں اس سے مستغنی ہوں یعنی میرے پاس یہ  
 (صحیح بخاری، کتاب الجہاد) احکام موجود ہیں ۔

## حضرت عثمانؓ کا سنت کی تعلیم کا اہتمام کرنا

اِنَّ عُثْمَانَ تَوْصِيًا بِالْمَقَاعِدِ فَقَالَ لَا  
 اُرِيكُمْ وُضُوءَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 اَللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّأَ ثَلَاثًا  
 ثَلَاثًا (صحیح مسلم)  
 حضرت عثمانؓ نے مقاعد میں لوگوں سے  
 کہا، کیا میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا  
 وضو نہ بتاؤں پھر آپس انہوں نے وضو کیا اور ہر  
 عضو کو تین تین مرتبہ دھویا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کو تبلیغ سنت کا کتنا جوش تھا کہ باوجود بار خلافت  
 کے وضو تک کی سنتوں کی تعلیم دیتے تھے ۔

## حضرت علیؓ کی کتاب

حضرت علیؓ فرماتے ہیں :-  
 مَا عِنْدَنَا شَيْءٌ إِلَّا كِتَابُ اللَّهِ  
 وَهَذِهِ الصَّحِيفَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 (صحیح بخاری، کتاب الحج و صمیم مسلم)  
 ہمارے پاس کوئی چیز نہیں سوائے کتاب  
 اللہ کے اور اس صحیفہ کے جس میں رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں ۔

اس کتاب میں حضرت علیؓ نے بہت سے احکام تحریر کئے تھے اور یہی وہ کتاب تھی جس کو انہوں نے  
 حضرت عثمانؓ کے پاس بھیجا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں (اس  
 کتاب کا ذکر صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر گزر چکا ہے)

## حضرت علیؓ کا حدیث کی حفاظت کا حکم دینا

حضرت علیؓ فرماتے ہیں :-  
 تَذَكَّرُوا هَذِهِ الْحَدِيثَ وَتَزَادُوا رِوَايَاتِكُمْ  
 اِنْ لَمْ تَفْعَلُوا يَذْرُبُ رِوَاةُ الدَّارِ هِيَ جَزْءُ اَوَّلِ  
 صَاحِبِ رِوَاةٍ ثَقَاتٍ تَقْرِبُ  
 حدیث کا مذاکرہ کرتے رہا کرو، ایک  
 دوسرے سے ملتے رہا کرو ورنہ حدیث  
 محو ہو جائے گی ۔

بلکہ حضرت علیؓ خود بھی سنتوں کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً ایک مرتبہ وضو کیا، ہر عضو کو تین تین مرتبہ



دھویا اور پھر سرمایا :-

اَحْبَبْتُ اَنْ اُرِيَكُمْ كَيْفَ كَانَ ظُهُورُ رَسُولِ  
اللّٰهِ صَلَّيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواه الترمذی)  
میں چاہتا تھا کہ تمہیں بتاؤں کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح وضو  
وقال حديث علي احسن شيئا في هذا الباب (اصح)  
کرتے تھے۔

## حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی شہرہ آفاق کتاب

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے حدیث کی ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام صادقہ تھا، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں :-

مَا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَدٌ أَكْثَرَ حَدِيثًا عَنْهُ مِنْهُ إِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو  
فَإِنَّهُ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا أَكْتُبُ  
(صحيح بخاری)  
صحابہ کرامؓ میں سے کوئی شخص بھی مجھ سے  
زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث  
بیان نہیں کرتا، سوائے عبداللہ بن عمروؓ  
کے، اس لئے کہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں  
نہیں لکھتا تھا۔

یہی وہ عبداللہ ہیں جن سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ ”لکھا کرو اس زبان سے سوائے حق کے دوسری بات نہیں نکلتی، (ابوداؤد۔ کتاب العلم جلد ۲ ص ۱۵۸) اور حالہ ثقات یقرب) یہی وہ کتاب ہے جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی اور ان کے پرپوتے عمرو بن شعیبؓ محدثین نے اس کو اخذ کیا اور ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

## حضرت ابوہریرہؓ کی کتاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں تو حضرت ابوہریرہؓ احادیث نہیں لکھتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں، ابن وہب کی روایت میں ہے، ایک تابعی کہتے ہیں :-

فَأَخَذَ بَيْدِي إِلَى بَيْتِهِ فَأَرَانَا كُتُبًا  
مِنْ حَدِيثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
وَقَالَ هَذَا هُوَ مَكْتُوبِي عِنْدِي  
(رواه ابن وهب وسكت عليه الحافظ فيقول البارئ)  
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میرا ہاتھ پکڑ  
کر اپنے گھر لے گئے اور مجھے احادیث کی  
کتابیں دکھائیں اور فرمایا کہ یہ میرے پاس  
کتابی شکل میں بھی موجود ہیں۔

جامعہ و جامعہ بیان العلم جز اول ص ۱۷۴

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک کتاب اپنے شاگرد ہمام کے لئے مرتب کی تھی، جو صحیفہ ہمام کے نام



سے مشہور ہے (اور اب چھپ چکی ہے)۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک تالیف ان کے شاگرد بشیر بن نہیک نے مرتب کی تھی۔ بشیر کہتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے جو کچھ سنتا تھا، لکھ لیتا تھا، جب میں نے ان سے رخصت ہونا چاہا تو اَمِيَّتُهُ بِكِتَابِهِ فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ هَذَا مَا سَمِعْتُ مِنْكَ قَالَ نَعُو

میں ان کے پاس ان کی (لکھائی ہوئی) کتاب لایا اور ان کو پڑھ کر سنائی اور ان سے کہایہ وہ احادیث ہیں جو میں نے آپ سے سنی

ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ”ہاں“ (دارمی جزاؤں ۱۲۱ و رجالہ ثقات، تقریب)

### حضرت سمرہ بن جندبؓ کی حدیث کی کتاب

حضرت سمرہؓ نے بھی ایک کتاب تحریر فرمائی تھی، حضرت امام حسن بصریؒ کے پاس وہ کتاب تھی۔

اِنَّمَا يُحَدِّثُ عَنْ صَحِيفَةِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ (ترمذی ۲، ابواب البیوع ج ۱ ص ۴۴۰ وسندہ صحیح)  
اور وہ حضرت سمرہؓ کی کتاب سے حدیث سنایا کرتے تھے۔

### حضرت سعد بن عبادہؓ کی کتاب

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی، ان کے بیٹے فرماتے ہیں:-  
وَجَدْنَا فِي كِتَابِ سَعْدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضَى بِالْيَمِينِ مَعَ الشَّاهِدِ (رواہ الترمذی فی ابواب الاحکام وحسنہ)  
ہم نے سعد رضی اللہ عنہ کی کتاب میں یہ لکھا ہوا دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کیا ہے۔

### حضرت ابن عباسؓ کا حدیث کی تفہیم کا اہتمام کرنا

قَيْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ عِصْمَةً عَلَى تَعْلِيلِ الْقُرْآنِ وَالسُّنَنِ وَالْفَرَائِضِ (رواہ ابن سعد فی الطبقات ابو نعیم فی الحلیۃ ورواہ البخاری فی تعلیقہ فی کتاب ما یدکر فی الاشخاص والخصومة)  
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عکرمہ کو قرآن و حدیث اور فرائض سکھانے کے لئے روک رکھا تھا۔

وَسَكَتَ عَلَيْهِ الْحَافِظُ فَيْتَمُ الْبَارِي جَزْءُ ۲ ص ۴۶۲



## حضرت انس رضی اللہ عنہ اور احادیث کی حفاظت کا اہتمام

حضرت انسؓ اپنے پیوں سے فرمایا کرتے تھے :-

يَا بَنِي قَيْدٍ وَاهَذَا الْعِلْمُ (دارمی حجاز) اے میرے پتھر! اس علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔ (اول ورواۃ ثقات، تقریب)

حضرت انسؓ نے ایک مرتبہ ایک حدیث سنی، انہیں وہ بہت اچھی معلوم ہوئی، انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا :-

اُكْتُبْ فَكُتِبَ (صحیح مسلم کتاب الایمان باب من نقلی اللہ با) اس حدیث کو لکھ لو، انہوں نے اس حدیث کو لکھ لیا۔ (الایمان وهو غیر مثاک فیہ دخل الجنة)

## حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی کتاب

حضرت جابرؓ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی :

سیمان تیمی کہتے ہیں :-

ذَهَبُوا بِصَحِيفَتِي جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ إِلَى الْحَنِ الْبَصَرِيِّ فَأَخَذَهَا (ترمذی باب) لوگ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی کتاب کو امام حسن بصری کے پاس لے گئے تو انہوں نے اس کو یاد کر لیا۔ (البیوع ورواۃ ثقات، تقریب)

## حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور کتابت احادیث

سیمان بن موسیٰ کہتے ہیں :-

أَنَّهُ رَأَى نَافِعًا مَوْلَى ابْنِ عُمَرَ يُصَلِّي عِلْمًا وَيَكْتُبُ بَيْنَ يَدَيْهِ (رواہ الدارمی ص ۱۲۸) انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام نافع کو دیکھا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ اپنا علم لکھوا رہے تھے اور وہ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے۔ (رواہ الدارمی ص ۱۲۸)

## حضرت براء بن عازبؓ اور حفاظت حدیث کا اہتمام

حضرت براء بن عازبؓ کے پاس بیٹھ کر لوگ ان کی احادیث کو لکھا کرتے تھے (دارمی ص ۱۲۸)



## حضرت رافع بن خدیج کی کتاب

نافع کہتے ہیں کہ مروان نے خطبہ دیا اور اس میں مکہ کے حرم ہونے کا ذکر کیا تو حضرت رافع بن خدیج نے ان کو پکار کر کہا، کیا بات ہے کہ مکہ کی حرمت کا تم نے ذکر کیا اور مدینہ کا ذکر نہیں کیا، پھر فرمایا:-

وَقَدْ حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
وَسَلَّمَ مَا بَيْنَ لَيْلَتَيْهَا وَذَلِكَ عِنْدَنَا فِي  
أَدِيمِ خَوْلَانِي إِشْتِئْتُ أَنْ أَتُكِّدَ (مصحف مسلم)  
بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
دونوں سنگستانوں کے درمیانی علاقہ کو حرم قرار  
دیا ہے اور یہ حکم میرے پاس خولانی چمڑے  
پر لکھا ہوا ہے اگر تم چاہو تو پڑھ کر سناؤ۔  
باب فضل المدینۃ ج ۱ ص ۵ مطبوعہ مصر

## صحابہ کی ایک کثیر تعداد احادیث کو قلمبند کیا کرتی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-  
بَيْنَمَا كُنْ حَوْلَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَكْتُبُ إِذَا سَلَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَّا الْمَدِينَتَيْنِ نَقُتَمُ أَوَّلًا قُسْطَنْطِينِيَّةً أَوْ رُومِيَّةً الْخ  
ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے  
چاروں طرف بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے، اسی  
اثناء میں آپ سے پوچھا گیا، کون سا شہر پہلے  
فتح ہوگا؟ قسطنطنیہ یا رومیہ؟ آپ نے فرمایا  
ہر قل کا شہر یعنی قسطنطنیہ۔  
(دارمی ص ۱۲۱ ورواہ ثقات اوصدق، تقریب)

نوٹ :- ہم نے اوپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی بعض کتابوں کا ذکر کیا  
اور بہت سی کتابوں کا ذکر چھوڑ دیا، محض اس لئے کہ ہمیں ان کی سندوں کی جانچ پڑتال کرنے  
کا موقع نہ مل سکا۔ ہم نے اس کتاب میں سند کی جانچ پڑتال کر کے روایتیں نقل کی ہیں، کوئی  
ضعیف روایت نقل نہیں کی۔

مندرجہ بالا بیان سے ثابت ہوا کہ خلفائے راشدین نے حدیث کی حفاظت کا اہتمام کیا، اور  
نتیجہ کتابیں لکھیں، اسی طرح دوسرے صحابہ کرام نے بھی کتابیں لکھیں، احادیث املاء کرائیں، تو پھر  
یہ کہنا کہ صحابہ کرام کے احادیث نہ جمع کرنے کی فلاں فلاں وجوہ تھیں، خود بخود غلط ثابت ہو جاتا ہے۔  
برق صاحب نے آگے چل کر تحریر فرمایا ہے کہ:-

غلط فہمی | صحابہ کرام کے احادیث جمع نہ کرنے کی بڑی بڑی دو وجوہ تھیں، اول، وہ قرآن کی



موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے، صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ جب رحلت سے پہلے حضور پر نور نے فرمایا کہ ”لاؤ قلم، دوات اور کاغذ، میں تمہیں ایک چیز لکھ کر دے جاؤں کہ میرے بعد تمہاری گمراہی کا کوئی امکان باقی نہ رہے“ تو حضرت عمر بن الخطاب جھٹ بول اُٹھے، ہمیں کسی مزید تحریر کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ ہمارے پاس کتاب الہی موجود ہے جس میں انسانی فلاح و نجات کے مکمل گہ درج ہیں اور یہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔ (دو اسلام ص ۳۷-۳۸)

**ازالہ** اس کا جواب کئی طرح سے ہے، اول یہ کہ گزشتہ اوراق میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ صحابہ کرام نے بلکہ خاص طور پر حضرت عمرؓ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام کیا، خود تعلیم دی، دوسروں کو تعلیم پر مامور فرمایا، خود احادیث کو ضبط تحریر میں لائے، دوسروں سے لکھوایا، حتیٰ کہ ان کے یہ نوشتے محدثین نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان کو اپنی کتابوں میں نقل کیا، اگر وہ صرف قرآن مجید کو کافی سمجھتے تھے، تو حفاظت احادیث کا یہ اہتمام بے سود ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ وہ احادیث کو بھی ماخذ دین سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے قرآن مجید کے ساتھ اس کی بھی تعلیم دیا کرتے تھے اور تحریر کرتے تھے، لہذا حدیث تحریر نہ کرنے کی یہ وجہ خود بخود باطل ہو جاتی ہے۔

دوم۔ یہ جملہ ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ یعنی کتاب الہی ہمارے لئے کافی ہے، حضرت عمرؓ کا قول ہے نہ کہ تمام صحابہ کا، اکثر صحابہؓ نے اس سے اتفاق نہیں کیا، بلکہ حدیث کے الفاظ ہیں اَكْثَرُ النَّاسِ وَالْاِخْتِلَافَ بَعْنِ صَحَابَةٍ كَرَّمَ اللهُ وَجْهَهُ اس کمنے پر خاموش نہیں ہوئے بلکہ بڑی گڑبڑ ہوئی اور شدید اختلاف کیا (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے بعد کیا ہوا، حدیث کے الفاظ میں سینے ”ذَهَبُوا بِرُؤُوسِهِمْ“ عکسہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار پوچھتے رہے (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ظاہر ہے کہ اختلاف رائے کے باوجود صحابہؓ نے آپ کو تحریر لکھوانا یا دد لایا اور بار بار یاد دلایا تو یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آپس میں اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ لکھنا ضروری ہے یا کم از کم اکثریت کا فیصلہ ہی تھا اور اقلیت نے خاموشی اختیار کر لی، لہذا ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ کی تردید خود صحابہ کرام نے کر دی اور حضرت عمرؓ کو خاموش ہونا پڑا، صحابہ کرام کے فیصلہ کے خلاف اب بھی اس قول کو دلیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

سوم۔ یہ جملہ ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ حضرت عمرؓ کا قول ہے، جہاں تک ہم سمجھتے ہیں حضرت عمرؓ کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ ”حدیث“ قابلِ حجت نہیں اور اگر حضرت عمرؓ کے متعلق یہ فرض کر لیا جائے کہ ان کے نزدیک حدیث حجت نہیں تھی تو یہ ان کی ذاتی رائے تھی جس سے انہوں نے رجوع کر لیا اور حدیث کی حفاظت اور تعلیم کا انتظام کیا، حدیث کی کتابیں لکھیں، حدیث کی اشاعت کی، ان تمام باتوں کا ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے، ذیل میں چند روایات مزید پیش کی جا رہی ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حدیث کو



حجت سمجھتے تھے۔

(۱) حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ سے اپنا حصہ

طلب کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا:-

لَسْتُ شَارِكًا شَيْئًا كَاتٍ  
يَعْمَلُ بِهِ إِلَّا عَمِلْتُ بِهِ قَالِي أَخْتِ  
إِنْ تَرَكْتُ شَيْئًا مِنْ أَمْرِ  
أَنْ أَرْيَحَ

میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑوں گا جو  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے بلکہ  
میں اُسی پر عمل کروں گا کیونکہ مجھے ڈر ہے  
کہ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
امر میں سے کسی بھی چیز کو چھوڑ دوں گا تو گمراہ  
ہو جاؤں گا۔

(صحیح بخاری، کتاب

الجهاد)

حضرت ابوبکرؓ کے ان الفاظ کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے، شان صدیقی ملاحظہ فرمائیے، سنت چھوڑنے  
سے صاف انکار ہے، سنت چھوڑنے سے ڈرتے ہیں، کہ کہیں گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں، حضرت  
ابوبکرؓ کے اس قول و فعل کو حضرت عمرؓ کے الفاظ میں بیٹے، حضرت عمرؓ نے اسی مقدمہ کے سلسلہ میں اپنی  
خلافت کے دور میں فرمایا تھا:-

فَعَمِلَ فِيهَا بِمَا عَمِلَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُ  
فِيهَا لَصَادِقٌ بَارِكُ رَأِيْدٌ تَابِعٌ  
لِلْحَقِّ

ابوبکرؓ نے اس معاملہ میں وہی عمل کیا جو رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے بے شک اللہ  
جانتا ہے کہ اس معاملہ میں ابوبکرؓ یقیناً  
سچے، نیک کام کرنے والے، ہدایت یافتہ اور  
حق کے تابع تھے۔

(صحیح بخاری، کتاب الجہاد)

گویا حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے قول کی تائید کر دی کہ سنت رسول کو نہ چھوڑنے والا ہی تابع الحق اور  
ہدایت پانے والا ہے اور اس میں ذرا سی بھی کمی کرنے والا گمراہ ہے، پھر حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:-

أَعْمَلُ فِيهَا بِمَا عَمِلَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا  
عَمِلَ فِيهَا أَبُو بَكْرٍ وَاللَّهُ يَعْلَمُ  
إِنِّي فِيهَا لَصَادِقٌ بَارِكُ رَأِيْدٌ  
تَابِعٌ لِلْحَقِّ

میں بھی اس طرح عمل کروں گا جس طرح  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کیا  
تھا اور جس طرح ابوبکرؓ نے عمل کیا تھا اور  
اللہ جانتا ہے کہ میں اس معاملہ میں یقیناً  
سچا، نیک عمل کرنے والا، ہدایت یاب اور حق  
کا تابع ہوں۔

(صحیح بخاری، کتاب الجہاد)

اس جملہ میں حضرت عمرؓ نے واضح کر دیا کہ اتباع حق اور نیکی یہی ہے کہ سنت رسول پر چلا جائے، یہی سچائی



ہے اور یہی ہدایت ہے، پھر حضرت عمرؓ فریقین کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :-  
 إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 قَالَ لَا تَوَرُّثُ مَا تَرَكَتُمْ صَدَقَاتِهِ  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا  
 کوئی وارث نہیں ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ  
 صدقہ ہے۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد ابواب فوض الخمس،

حضرت عمرؓ نے علی الاعلان تمام صحابہؓ کی موجودگی میں وہ حدیث پڑھ دی جو بظاہر قرآن مجید کے خلاف  
 ہے اور اس کو علی الاعلان بطور حجت شرعیہ پیش کیا، نہ فریق مقدمہ حضرت علیؓ نے اس کی تردید کی، نہ  
 فریق ثانی حضرت عباسؓ نے اس کی تردید کی، نہ صحابہؓ کے مجمع میں سے کوئی آواز اٹھی کہ یہ حدیث قرآن مجید  
 کے خلاف ہے، قرآن مجید کی رو سے بلا استثناء ہر شخص کا ورثہ تقسیم ہونا چاہیے، قرآن مجید میں اس قسم کی  
 کوئی تخصیص نہیں ہے، لہذا یہ حدیث حجت نہیں، تمام صحابہؓ نہ یہ کہ صرف خاموش ہی رہے بلکہ اس حدیث  
 کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں، اس حدیث کو پیش کرنے والے وہی فاروق اعظم ہیں جن کی زبان سے یہ جملہ  
 نکل گیا تھا حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ، یہ وہی فاروق اعظم ہیں کہ حدیث کو حجت میں پیش فرما رہے ہیں،  
 اور ایسی حالت میں پیش فرما رہے ہیں کہ بظاہر وہ قرآن مجید کی آیت کے بھی خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت  
 عمرؓ کے جملہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ، کا مطلب کچھ اور تھا، یہ مطلب نہ تھا جو آج کل لیا جا رہا ہے، اس کے  
 بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا :-

قَوْلُ اللَّهِ الَّذِي يَأْذِيهِ تَقْوَمُ السَّمَاءُ  
 وَالْأَرْضُ لَا أَقْصِي جَهَنَّمَ غَيْرَ ذَلِكَ  
 إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)  
 قسم اس ذات پاک کی جس کے حکم سے آسمان  
 اور زمین قائم ہیں، میں قیامت تک اس فیصلہ  
 کے علاوہ کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

ملاحظہ فرمائیے، کس طرح قسم کھا کر وہ اپنی پیش کردہ حدیث کے خلاف فیصلہ کرنے سے اپنے عجز کا اظہار فرما  
 رہے ہیں بلکہ وہ تو یہاں تک عقیدہ رکھتے ہیں کہ قیامت تک فیصلہ نبوی علیٰ حالہ قائم رہنا ضروری ہے، اسے  
 کسی حالت میں بدلا نہیں جاسکتا، اگر صرف قرآن مجید کافی تھا تو وہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے کیوں  
 مجبور تھے، کیوں اس کو ہدایت سمجھتے تھے، غور کیجئے اور انصاف فرمائیے۔

(۲) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ :-

وَاللَّهِ إِنِّي لَا أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ لَا  
 تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ وَلَوْ لَا آتَى رَأَيْتُ رَسُولَ  
 اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 اسْتَلَمَكَ مَا اسْتَلَمْتُكَ فَاسْتَلَمْتُ  
 (صحیح بخاری، کتاب المناسک)  
 اللہ کی قسم میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر  
 ہے۔ نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ اگر  
 میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ  
 دیتے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی بوسہ نہ دیتا، پھر  
 حضرت عمرؓ نے اس کو بوسہ دیا۔



حجر اسود کو بوسہ دینا بظاہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن حضرت عمرؓ اس معمولی سی سنت کو بھی اپنونا گوارا نہیں کرتے۔

(۳) حضرت عمرؓ نے رمل کے متعلق فرمایا ہے:-

فَمَا لَنَا وَالرَّمْلَ إِنَّمَا كُنَّا أَئِمَّةَ  
الْمُشْرِكِينَ وَقَدْ أَهْلَكَهُمُ اللَّهُ ثُمَّ  
قَالَ شَيْءٌ صَنَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ فَلَا يُحِبُّ أَنْ نَتَرُكَهُ

رمل کرنے کی اب ہمیں کیا ضرورت ہے یہ  
تو ہم نے مشرکین پر اپنی قوت کے اظہار کے  
لئے کیا تھا اور اب مشرکین کو اللہ تعالیٰ نے  
ہلاک کر دیا، پھر فرمایا لیکن جس چیز کو رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے ہم اس کو چھوڑنا  
پسند نہیں کرتے۔

(صحیح بخاری، کتاب الحج

باب الزممل)

دیکھا آپ نے حضرت عمرؓ کس قدر سنت کے دلدادہ ہیں کہ اس سنت پر بھی عمل کر رہے ہیں جس کا مقصد فوت ہو چکا ہے۔

(۴) حج تمتع کے متعلق جب آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا:-

إِنْ تَأْخُذُ بِكِتَابِ اللَّهِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُنَا  
بِالْتِّمَامِ وَإِنْ تَأْخُذُ بِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَجْلِ حَتَّى يَبْلُغَ  
الْهَدْيَ مَحِلَّهُ (صحیح بخاری، کتاب

اگر ہم کتاب اللہ کو ماخذ تسلیم کریں تو وہ ہمیں  
حج اور عمرہ پورا کرنے کا حکم دیتی ہے اور اگر  
ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو  
ماخذ تسلیم کریں تو بے شک رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے احرام نہیں کھولا جب تک  
قربانی نہیں کی۔

الحج باب الذبح قبل الحلق)

حضرت عمرؓ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں کو بطور حجت پیش کیا، اگر کتاب اللہ کو کافی سمجھتے، تو  
صرف کتاب اللہ کو پیش کر دینا کافی تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ سنت کو بھی حجت میں شامل کیا،  
ان کے جواب سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے کہ اگر ان کو حج تمتع کے متعلق جواز کی حدیث معلوم ہوتی تو وہ  
یقیناً اس کو تسلیم کرتے، اگرچہ وہ بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتی، انہوں نے حج تمتع سے صرف  
اس لئے انکار کیا کہ ان کے علم میں سنت سے اس کا ثبوت نہیں تھا، اگر ثبوت مل جاتا تو وہ کبھی انکار نہ  
کرتے، جیسا کہ دوسرے صحابہ نے جب حدیث ان کو مل گئی تو حج تمتع کو تسلیم کر لیا، کسی صحابی نے یہ نہیں کہا  
کہ یہ تو قرآن مجید کے خلاف ہے، لہذا حجت نہیں، اس روایت سے ثابت ہوا کہ صحابہ حدیث کو بھی ماخذ  
قانون سمجھتے تھے۔

(۵) مانعین زکوٰۃ سے جب حضرت ابو بکرؓ نے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ می تھے جنہوں نے اس کی



مخالفت کی اور حجت میں حدیث پیش کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا، آپ کیسے ان سے لڑ سکتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

رَبِّ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا  
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَقَدْ قَالَ لَوْلَا  
إِلَّا اللَّهُ عَصَوْا مِنْ مَالِهَا  
وَنَفْسِهَا إِلَّا بِحَقِّهِ وَحِسَابِهِ  
عَلَى اللَّهِ

مجھے سکھ دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں،  
یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ پڑھیں، پس جس  
نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا تو اس نے مجھ سے اپنے  
مال اور اپنی جان کو بچا لیا مگر اس کے حق کے  
ساتھ اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی حدیث کے آخری حصہ ”اَلَا بِحَقِّهِ“ سے استدلال کیا  
اور فرمایا :-

فَإِنَّ الزَّكَاةَ حَقُّ الْمَالِ

بے شک زکوٰۃ مال کا حق ہے۔

لہذا حدیث ہی کی رو سے حق کے لئے لڑنا جائز ہے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :-

فَعَرَفْتُ أَنَّهُ الْحَقُّ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

پھر میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے۔

یعنی حضرت عمرؓ نے ”اَلَا بِحَقِّهِ“ سے استدلال کرنے کو صحیح مانا، غرض یہ کہ حضرت ابو بکرؓ نے بھی  
اور ”حسبنا کتاب اللہ“ کے قائل یعنی فاروق اعظمؓ نے بھی حدیث کو حجت مانا اور اسی کے مطابق  
عمل کیا، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کو کافی سمجھ کر قرآن مجید کی  
کوئی آیت نہ پڑھی؟ کیوں قتال کے خلاف آیت قرآنی کو پیش نہ فرمایا۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ  
وہ جانتے تھے کہ محض قرآن مجید کافی نہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حدیث بھی اسی طرح ماخذ قانون  
ہے جس طرح قرآن مجید، یہی وجہ ہے کہ وہ بے دھڑک حدیث کو بطور حجت کے پیش کر دیا کرتے تھے اور  
ایسی حدیث کو بھی پیش کر دیا کرتے تھے جو بظاہر قرآن مجید سے ٹکراتی تھی، مثلاً یہی حدیث سورہ توبہ  
لی ان آیات کے خلاف ہے جن میں کفار سے جنگ بند کرنے کا حکم اس وقت ہے جب وہ ایمان  
لے آئیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، حضرت عمرؓ کی پیش کردہ حدیث میں نماز اور زکوٰۃ کا کوئی ذکر نہیں،  
لیکن پھر بھی وہ اس حدیث کو پیش کرنے میں تامل نہیں کرتے، پھر حضرت ابو بکرؓ کی حالت ملاحظہ  
فرمائیے، وہ سورہ توبہ کی آیت پیش نہیں کرتے بلکہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو  
حجت شرعیہ کے طور پر پیش کرنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت  
عمرؓ نے حدیث ہی کی بنا پر ایک رائے قائم کی اور پھر حدیث ہی کی بنا پر اپنی اس رائے کو غلط سمجھا اور  
اس سے رجوع کر لیا۔

(۶) مطلقہ عورت کی رہائش اور نفقہ کے متعلق حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :-



لَا تَذُرْكَ كِتَابُ اللَّهِ وَسُتَّةٌ بَيْنَنَا صَلَّيْ  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (صحیح مسلم)  
(۷) حضرت مسورؓ فرماتے ہیں :-

إِسْتَشَارَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي إِمْلَاحِ  
الْمَرْأَةِ فَقَالَ الْمُعِيزُ كَأَنَّ  
شُعْبَةَ شَهِدَتْ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضَى فِيهِ بِعْدَةِ عَجْدٍ  
أَوْ أَمَةٍ فَقَالَ عُمَرُ إِنْ تَنَبَّيْ بِمَرُ  
يُشْهَدُ مَعَكَ قَالَ فَشَهِدَ لَهُ مُحَمَّدُ  
بْنُ مُسْلَمَةَ

(صحیح مسلم باب دية الجنين) نے شہادت دی۔

مندرجہ بالا حدیث سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ حدیث پر صرف عمل ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی  
حفاظت اور توثیق کا بھی خیال رکھتے تھے، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا :-

اللَّهُ أَكْبَرُ لَوْ لَمْ أَسْمَعْ بِهَذِهِ الْقَضِيَّةِ  
بِغَيْرِ هَذَا

(البوداد، کتاب الدیات ورجالہ ثقات، تقریب)

یعنی حضرت عمرؓ لا علمی میں بھی حدیث کے خلاف فیصلہ کرنے کو برا سمجھتے تھے۔

(۸) ایک دن حضرت عمرؓ نے خطبہ میں فرمایا :-

إِنَّ اللَّهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ وَأَنْزَلَ  
عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا أَنْزَلَ  
اللَّهُ آيَةَ الرَّجْمِ فَقَرَأْنَاهَا  
وَوَعَيْنَاهَا وَعَقَلْنَاهَا رَجْمَ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ فَأَخْشَى  
إِنْ طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ أَنْ يَقُولَ  
قَاتِلُوا اللَّهَ مَا لِحُدُودِ آيَةِ الرَّجْمِ فِي كِتَابِ

بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم  
کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اور آپ پر شریعت  
نازل فرمائی۔ اس میں رجم کا حکم بھی ہے۔ ہم نے  
اس کو پڑھا ہے اور یاد کیا ہے، اور سمجھ لیا ہے۔  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے اور  
آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے، میں ڈرتا  
ہوں کہ کہیں امتدادِ زمانہ کے باعث کوئی کہنے  
والا یہ نہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں  
رجم کا حکم نہیں ہے۔ پس لوگ اللہ تعالیٰ کے



اللّٰهُ فَيَضِلُّوْا بِتَرْكِ فَرِيضَةٍ اَنْزَلَهَا  
 اللّٰهُ وَالرَّجْعُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ  
 عَلٰی مَنْ رَزٰى اِذَا اُحْصِنَ (صحیح بخاری  
 باب رجیم الجلی و صحیح مسلم باب رجوع الثیب)

نازل کردہ فریضہ کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں اور  
 بے شک رجیم کتاب اللہ میں ثابت ہے  
 اس شخص کے لئے جو شادی شدہ ہو کر  
 زنا کرے۔

حضرت عمرؓ حکم رجیم کو نازل شدہ مان رہے ہیں اور اس کو کتاب اللہ میں قائم اور ثابت سمجھ رہے ہیں  
 حالانکہ رجیم کا حکم قرآن مجید میں نہیں ہے بلکہ حدیث میں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کے  
 نزدیک قرآن مجید ہی کتاب اللہ اور منزل من اللہ نہیں ہے بلکہ حدیث بھی کتاب اللہ اور منزل من اللہ  
 ہے۔ یہاں بھی حضرت عمرؓ اس حدیث کو حجت تسلیم کر رہے ہیں جو بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہے بلکہ  
 تمام صحابہؓ اس کو تسلیم کر رہے ہیں، کوئی ایک بھی اس کی حجت سے انکار نہیں کرتا۔ اس اثر سے یہ  
 بھی ثابت ہوا کہ ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ“ سے حضرت عمرؓ کی مراد قرآن اور حدیث تھی، یعنی شریعت الہیہ  
 جو منزل من اللہ ہے۔

(۹) حضرت عمرؓ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے کہ اتنے میں ایک مہاجر صحابی تشریف  
 لائے حضرت عمرؓ نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا — کہنے لگے کہ میں نے دفعتاً اذان سُنی اور فوراً  
 وضو کر کے چلا آیا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

وَالْوُضُوْءُ اَيْضًا وَقَدْ عَلِمْتُ اَنَّ رَسُوْلَ  
 اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُ بِالْغُسْلِ  
 (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

مروت وضو کر کے آنا بھی غلطی ہے جبکہ تمہیں  
 یقیناً یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم غسل کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے حدیث کو بطور حجت پیش فرمایا اور تمام صحابہؓ نے اسے تسلیم کیا، کسی ایک نے بھی  
 یہ نہیں کہا کہ یہ حکم نبوی عارضی تھا، اب نہانا ضروری نہیں، پھر حضرت عمرؓ خود مرکزِ مِلّت تھے، چاہتے  
 تو خود حکم دے دیتے کہ نہا کر آیا کرو، لیکن نہیں وہ اپنے حکم کو حجت شرعیہ نہیں سمجھتے تھے، لہذا  
 اُس چیز کو پیش کیا جو حقیقتاً حجت شرعیہ تھی۔

(۱۰) حادث کہتے ہیں، میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اگر عورت نحر کے دن طواف کر  
 لے اور پھر اس کو حیض شروع ہو جائے تو کیا کرے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آخری کام بیت اللہ کا  
 طواف ہونا چاہیے، حادث نے کہا یہی فتویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔  
 حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

اَرَبَيْتَ عَنْ يَدِيْكَ مَا لَتَنِىْ عَنْ شَيْءٍ  
 تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں تو نے مجھ سے ایسی بات



سَأَلْتُ عَنْهُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُونُ الْخَالِفَ (ابوداؤد، کتاب الحج ورجاله ثقات، تقریب)

پوچھی جس کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے  
پوچھ چکا تھا۔ کیا میں فیصلہ نبوی کے خلاف  
کہہ سکتا ہوں۔

(۱۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ وہ خزانہ جو کعبہ کے اندر مدفون ہے، نکال کر تقسیم کر دیں، ایک شخص نے کہا، آپ ایسا نہیں کر سکتے، کہنے لگے کیوں؟ اس نے کہا:

لَمْ يَفْعَلْهُ صَاحِبُكَ قَالَ هُمَا الْمَرْزَأَانِ يُقْتَدَفَانِ بِهِمَا

تمہارے دونوں ساتھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ نے ایسا نہیں کیا،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ان دونوں کی پیروی کی جاتی ہے۔

اصحیح بخاری، کتاب الاحصاء، کتاب السنة و کتاب المناسک

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں بھی سنت نبوی کو حکم ماننا اور اپنے ارادہ سے باز رہے، انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اب میں مرکزِ ملت ہوں، جو چاہوں کروں۔

(۱۲) ایک عورت اپنے پوتے کی میراث میں سے حصہ لینے آئی،

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:-

مَا لَكَ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ وَمَا عَلِمْتُ لَكَ فِي سُنَنِ نَبِيِّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا

نہ کتاب اللہ میں تمہارا کوئی حصہ مقرر ہے اور نہ میرے علم کے مطابق سنت نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہارا کوئی حصہ مقرر ہے۔

اس کے بعد فرمایا، تم پھر آنا، میں لوگوں سے پوچھوں گا، پس انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا۔ حضرت مغیرہؓ اور حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی کو چھٹا حصہ دیا تھا۔ یہ حدیث سننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اس کو چھٹا حصہ دے دیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے پاس متوفی کی نانی میراث مانگنے آئی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

مَا أَنَا بِدَايِدٍ فِي الْفَرَايِضِ وَلَكِنْ ذَلِكَ السُّدُسُ فَإِنْ اجْتَمَعَتْهُمْ هُوَ بَيْنَكُمْ. (رواہ ابوداؤد والترمذی وصحیح واللفظ لابی داؤد)

میں مقررہ حصہ میں زیادتی نہیں کر سکتا۔ وادی یا نانی کا چھٹا حصہ ہے، اگر دونوں موجود ہوں تو چھٹا حصہ دونوں میں تقسیم ہوگا۔

نانی یا وادی کا حصہ قرآن مجید میں نہیں ہے، صرف حدیث میں ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ



تعلیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اس مقررہ حصہ میں زیادتی نہیں کر سکتا، یعنی جو کچھ حدیث میں ہے، وہی حجت ہے، اسی پر عمل ہوگا۔ مرکزِ ملت کو سنت رسول کے بدلنے یا اس میں ترمیم و تفسیح کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ حدیث کو حجت شرعیہ سمجھتے تھے۔

(۱۳) حضرت سعید فرماتے ہیں :-

كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَقُولُ الدِّيَةُ  
لِلْعَاقِلَةِ وَلَا تَرِثُ الْمَرْءُ أَكَا مِنْ دِيَّتِهِ  
زَوْجُهَا شَيْئًا حَتَّى قَالَ لَهُ الصَّعَّاءُ بْنُ  
سُفْيَانَ كَتَبَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ دَرَّتْ أَمْرًا أَتَيْتُ  
النَّبِيَّ مِنْ دِيَّةِ زَوْجِهَا فَجَعَلَ عُمَرُ  
(رواه ابوداؤد في كتاب الفرائض ورواه  
الترمذی و صححه)

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ دیت عاقلہ کے ذمہ ہے اور بیوہ کو اس میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں تک کہ حضرت صعصعہؓ نے ان سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لکھ کر بھیجا تھا کہ اشیم کی بیوی کو بھی دیت میں سے حصہ دیا جائے تو حضرت عمرؓ نے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا۔

(۱۴) لَمْ يَكُنْ عُمَرُ أَخْذَ الْجَزِيَّةِ مِنَ  
الْبَجُوسِ حَتَّى شَهِدَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ  
عَوْفٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ أَخَذَ هَامِنْ بَجُوسٍ هَجَرَ (مجمع  
بخاری کتاب فرض النعمس، باب الجزية)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجوس سے جزیہ نہیں لیتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے شہادت دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے جزیہ لیا تھا۔

قرآن مجید میں صرت اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم ہے۔ حضرت عمرؓ اس پر عمل کرتے تھے، مجوس سے جزیہ لینے کا حکم قرآن مجید میں نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی جزیہ لیا۔ بظاہر یہ حدیث بھی قرآن مجید کے خلاف تھی لیکن حضرت عمرؓ نے بغیر کسی پس و پیش کے اس کو قبول کیا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک حدیث حجت شرعیہ ہے، خواہ وہ قرآن مجید کے موافق ہو یا بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہو۔

(۱۵) ایک پاگل عورت نے زنا کیا، حضرت عمرؓ نے حکم دیا، اس کو سنگسار کر دو، حضرت علیؓ ادھر سے گزرے، پوچھا کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا، یہ مجنون عورت ہے، اس نے زنا کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، اس کو واپس لے چلو، پھر حضرت عمرؓ کے پاس



آئے اور کہا:-

يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَمَّا عَلِمْتُ  
أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ الْقَلَمَ رَفَعَ عَنْ ثَلَاثَةٍ  
عَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَأْتِيَ أَوْ عَنِ  
النَّاسِ حَتَّى يَسْتَقِظَ وَ عَنِ  
الصَّبِيِّ حَتَّى يَعْقِلَ قَالَ بَلَى قَالَ  
فَمَا بَالُ هَذِهِ تُرْجِمُ قَالَ  
لَوْ شِئْتُ قَالَ فَارْسَلَهَا  
قَالَ فَارْسَلَهَا قَالَ فَجَعَلَ  
يُكَبِّرُ

(ابوداؤد، کتاب الحدود، ورجالہ)

ثقات، تقریب)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں حدیث کو حجت جانتے  
تھے اور مرکزِ ملت کو اس کا تابع سمجھتے تھے۔

(۱۷) عمرو بن مہمون کہتے ہیں:-

كُنَّا وَقُوفًا بِجَمْعٍ فَقَالَ عُمَرُ  
بْنُ الْخَطَّابِ إِنَّ الْمَشْرِكِينَ كَانُوا  
لَا يُفِيضُونَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ  
فَكَانُوا يَقُولُونَ أَشْرِقَ شَيْءٌ  
وَأَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ خَالَفَهُمْ فَأَخَذَ مِنْ حُمْرِ  
قَبْلِ طُلُوعِ الشَّمْسِ

رواہ الترمذی فی کتاب الحج وصححه)

اس مسئلہ میں بھی حضرت عمرؓ نے سنت پر عمل کیا۔

(۱۸) یعلیٰ بن اُمیہ کہتے ہیں:-

قُلْتُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ لَيْسَ

یعنی اے امیر المؤمنین! آپ کو نہیں  
معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے فرمایا ہے کہ تین آدمی مرفوع القلم  
ہیں۔ مجنون جب تک تندرست نہ ہو،  
سونے والا جب تک نہ جاگے۔ اور بچہ  
جب تک سمجھ دار یعنی بالغ نہ ہو، حضرت  
عمرؓ نے فرمایا! مجھے معلوم ہے، حضرت علیؓ  
نے کہا پھر کس لئے اس کو سنگسار کیا جا رہا  
ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ”کوئی وجہ نہیں“  
حضرت علیؓ نے کہا، پھر اس کو چھوڑ دیجئے  
حضرت عمرؓ نے اس کو چھوڑ دیا اور اللہ اکبر

کہا۔

ہم مزدلفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ  
حضرت عمرؓ نے فرمایا! ”بے شک مشرکین  
مزدلفہ سے واپس نہ ہوتے تھے جب تک  
سورج نہ نکل آئے، وہ کہتے تھے کہ اسے  
نبیر روشن ہو جا! اور تحقیق رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی ”دیہ  
کہہ کر، حضرت عمرؓ مزدلفہ سے طلوع  
شمس سے پہلے چل وٹے۔

میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ



عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا  
مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ  
أَنْ يَفْتِنَكُمْ الْدِّينَ كُفْرًا  
فَقَدْ آمَنَ النَّاسُ فَقَالَ  
عُمَرُ (رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ) عَجِبْتُ  
مِمَّا عَجِبْتُ مِنْ رَسُولِ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ صَدَقَ  
صَدَقَ اللَّهُ بِهَا عَلَيْكُمْ  
فَاتَّبِعُوا صَدَقْتُمْ

صحیح مسلم، باب صلاة  
المسافرین

فرماتا ہے: ”تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم نماز  
میں کمی کرو جب تمہیں یہ خوف ہو کہ کافر  
تم کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے،“ لیکن  
اب تو بالکل امن ہے۔ اب نماز میں قصر  
کیوں کیا جائے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا  
کہ جس چیز سے تمہیں تعجب ہوا ہے، مجھے  
بھی تعجب ہوا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، آپ نے فرمایا یہ  
اللہ کا احسان ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے  
پس اُس کے احسان کو قبول کرو یعنی  
امن و امان کے سفر میں بھی قصر کرتے

رہا کرو۔

امن کی حالت میں قصر کرنا بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہے لیکن حضرت عمرؓ بغیر چون و چرا  
اُسے تسلیم کرتے ہیں اور اُسے تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ ایسی حدیث کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔  
(۱۹) مالک بن اوس کہتے ہیں میں نے کہا ”کون مجھے سونے کے بدلے درہم دے گا؟“  
حضرت طلحہؓ نے فرمایا، ہمیں اپنا سونا دکھاؤ، پھر جب ہمارا خادم آجائے تو تم آنا، ہم تم کو چاندی  
دے دیں گے، حضرت عمرؓ وہاں موجود تھے، آپ نے فرمایا:۔

كَلَّا وَاللَّهِ لَتُعْطِيَنَّ وَرَقَةً أَوْ  
لَتُرَدَّنَّ إِلَيْنَا هَبْهَ فَإِنَّ رَسُولَ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ  
الْوَرَقُ بِالذَّهَبِ رِبًّا إِلَّا هَاءَ وَ  
هَاءَ الْ (صحیح مسلم، کتاب البیوع)

ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا، یا تو اس کو چاندی  
دو ورنہ سونا واپس کر دو کیونکہ رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ  
چاندی سونے کے بدلے سود ہے، اگر  
نقد نہ ہو۔

الغرض اس قسم کی بیسیوں روایتیں ہیں، جن سے حضرت عمرؓ کا حدیث پر عمل کرنا اور حدیث  
کو حجت ماننا ثابت ہوتا ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ حضرت عمرؓ کا ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ کہنے سے یہ مطلب  
محقا کہ حدیث حجت نہیں، صرف قرآن مجید کافی ہے، ایک ایسی بات ہے جس کے لئے کوئی شہاد  
نظر نہیں آتی بلکہ جو کچھ حضرت عمرؓ سے بتواتر ثابت ہے وہ اس کے خلاف ہے۔



**غلط فہمی** | برقی صاحب آگے جا کر تحریر کرتے ہیں ”یہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے“ حضرت فاروق کا یہ جملہ رسالت پناہ کے حضور میں جسارت ہے جا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ مجبور تھے (دو اسلام ص ۳۸) **ازالہ** | حدیث زیر بحث، حدیث قرطاس کے نام سے مشہور ہے، عموماً لوگوں کو اس میں بہت سے اشکال ہیں لہذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل مطلب کو تفصیل سے واضح کر دیا جائے، **حدیث قرطاس** | ابن عباس فرماتے ہیں:-

لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ قَالَ ائْتُونِي بِكِتَابٍ أَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا  
 جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض نے شدت اختیار کی تو آپ نے فرمایا ایک کتاب لائیں تمہارے لئے ایک تحریر  
 (صحيح بخاری، کتاب العلم)

اس کے بعد فرمایا:-

لَا تَصِلُوا بَعْدَهُ أَبَدًا  
 پھر تم نہیں بھولو گے۔  
 یعنی ہو سکتا ہے کہ ویسے تم میری وصیت کو بھول جاؤ لیکن تحریری وصیت کے بعد تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس فرمان کے بعد ایک مکالمہ شروع ہو جاتا ہے جس کے بعض فقرے مختلف سندوں میں بیان ہوئے ہیں اور بعض بالکل مخدوٹ ہیں، حضرت عمرؓ نے حاضرین سے کہا:-

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَهُ الْوَجَعُ  
 اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درد کی شدت ہے،

بہتر یہ ہے کہ اس وقت آپ کو تکلیف نہ دی جائے۔  
 پھر کہنے لگے:-

وَعِنْدَكُمْ الْقُرْآنُ (صحیح بخاری، باب من القرآن) اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے۔

یعنی قرآن مجید کی موجودگی میں آپ کو کیوں تکلیف دی جائے، بظاہر ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی میں حدیث کی ضرورت نہیں، لہذا حضرت عمرؓ نے یا تو لوگوں کے اعتراض پر یا خود ہی یہ کہا عِنْدَنَا كِتَابُ اللَّهِ حَسْبُنَا ہمارے پاس اللہ کی شریعت ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے (کیونکہ کتاب اللہ میں قرآن مجید اور حدیث دونوں شامل ہیں اور حضرت عمرؓ اسی کے قائل تھے، جیسا کہ حدیث رحم میں اوپر گزر چکا ہے لہذا حضرت عمرؓ نے اپنے جملہ کو صحیح کر لیا،-

حدیث میں حضرت عمرؓ کے دو جملے متصل بیان ہوئے۔ ایک ”تمہارے پاس قرآن ہے“



دوسرا ”ہمارے پاس کتاب اللہ ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے“ اگر یہ دونوں جملے حضرت عمرؓ نے یکے بعد دیگرے کہے تھے تو عبارت میں بڑا نقص پیدا ہو جائے گا پہلے جملہ میں ضمیر مخاطب دوسرے میں ضمیر متکلم، پھر دونوں جملے مل کر عجیب اور بے جوڑ سی عبارت پیدا کرتے ہیں، لہذا لازمی ہے کہ دونوں جملے بہ یک وقت نہ کہے گئے ہوں بلکہ کچھ وقفہ کے بعد، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ یا تو وہ خود بخود سمجھ گئے ہوں کہ پہلا جملہ محل اعتراض ہے یا کسی نے اعتراض کیا ہو جیسا کہ اسی حدیث میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے الفاظ پر کافی اختلاف ہوا، غرض یہ کہ وجہ کوئی بھی ہو انہوں نے اپنے جملہ کی تصحیح کر لی، مزید برآں جب قرآن مجید کا نام لیا تو اس کے ساتھ ”کافی“ کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن جب کتاب اللہ کا تو کافی ہونے کی صراحت کر دی۔ حضرت عمرؓ کے ان الفاظ پر بھی کافی اختلاف ہوا، لوگ خاموش نہیں ہوئے بلکہ

فَاخْتَلَفُوا وَكَثُرَ اللَّغَطُ فَمِنْهُمْ مَنْ  
يَقُولُ قَرَّبُوا بَكْتَبَ لَكُمْ كِتَابًا وَ  
مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ غَيْرَ ذَلِكَ  
رِصَالُ بَابِ مَرَضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
اختلاف رائے ہوا اور بہت شور ہونے لگا۔  
بعض کہنے لگے کہ قلم دوات لے آؤ تاکہ آپ  
وصیت تحریر کر دیں بعض اس کے علاوہ کوئی  
اور بات کہنے لگے۔

مثلاً اس وقت ہی ایسی کیا ضرورت ہے کہ آپ کو تکلیف دی جائے وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ کہ مختلف باتیں کہی گئی ہوں گی جن کو حضرت ابن عباسؓ نے نظر انداز کر دیا۔ حدیث کے آئندہ آنے والے الفاظ اس بات کے متقاضی ہیں کہ لوگ تحریر کے کام کو ملتوی کرانا چاہتے تھے تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو، جب فوری تحریر کی موافقت کرنے والوں نے اصرار کیا تو اس کو ملتوی کرنے والوں نے دریافت کیا ”مَا شَأْنُكَ أَهَجَرَ اسْتَفْهِمُوا“ (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم)، (آخر اسی وقت لکھوانا کیوں ضروری ہے) آخر آپ کا کیا حال ہے؟ کیا آپ دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں؟ آپ ہی سے پوچھ لو (یعنی اگر آپ وفات پانے والے ہیں تو خیر اسی وقت لکھوا لیا جائے ورنہ پھر دیکھا جائے گا)، غرض یہ کہ سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ آپ سے دریافت کیا جائے ”قَدْ هَبُوا يَرْدُّونَ عَلَيْهِ“ (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم)، یعنی لوگ آپ سے پوچھنے لگے یا آپ کے سامنے اس سوال کو پیش کرنے لگے، اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم دوات لانے کا حکم احتیاطاً اور مشورۃً دیا تھا، اگر یہ حکم ضروری ہوتا تو ضرور آپ دوبارہ ارشاد فرماتے اور صحابہ میں مشورہ اور اختلاف نہ ہوتا، حکم دے کر آپ نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی بلکہ جب خود صحابہ کرامؓ نے بار بار پوچھا تو فرمایا ”دَعُونِي“ مجھے چھوڑ دو یعنی مجھ سے لکھوانے کا تقاضا مت کرو بلکہ اس وقت تو تم مجھے متوجہ بھی مت کرو۔

قَالَ ذِي أَنَا فَيَرْخَبُ مِمَّا  
کیونکہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس حالت



تَدْعُوْنَكَ الْيَبْرُ (صحیح بخاری) سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے  
باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔

(یعنی جو قرب الی اس وقت مجھے حاصل ہے وہ میرے لئے تمہاری طرف متوجہ ہونے سے بہتر ہے،  
رہ گیا وصیت تحریر کرانا، تو زبانی ہی سن لو) ”دَاوَصَاهُمْ بِثَلَاثٍ“ پھر آپ نے صحابہ کو تین وصیتیں  
کیں پھر فرمایا:

قُوْهُمُوْا عَنِّيْ وَلَا يَذْبَعِيْ عِنْدِيْ  
الشَّارِعُ  
(صحیح بخاری، کتاب العلم) اچھا اب میرے پاس سے چلے جاؤ، اور  
(یاد رکھو کہ میرے پاس تم کو اختلاف نہیں  
کنا چاہیے۔)

## دو شبے اور ان کا ازالہ

(۱) مندرجہ بالا تشریح میں ہم نے ”لَا تَضِلُّوْا بَعْدَكَ“ کے معنی کئے ہیں اس کے بعد تم نہ بھولو  
گے ”یعنی تَضِلُّوْا کے معنی کئے ہیں ”تم بھولو گے“ حالانکہ عام طور پر ”تَضِلُّوْا“ کے معنی ”تم گمراہ ہو گے“  
کئے جاتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں آیا ہے، اللہ تعالیٰ  
فرماتا ہے:

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ  
رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ يَكُنَا  
رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ  
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ  
أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ  
إِخْدَاهُمَا الْآخَرَ

بین دین کے معاملہ میں تحریر کرتے  
وقت مسلم مردوں میں سے دو گواہ کر لیا  
کرد، اگر دو مرد نہ ہوں تو ان گواہوں  
میں سے جن سے تم راضی ہو، ایک مرد  
اور دو عورتیں گواہ کر لیا کرو۔ اس لئے کہ  
اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری

(البقرة: ۲۸۲)

عورت اُسے یاد دلا دے۔

آیت مذکورہ میں ”تَضِلَّ“ کے معنی بھولنے کے کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ اس جگہ یہی مناسب  
ہیں۔ اسی طرح حدیث زیر بحث میں بھی بھول ہی کے معنی مناسب ہیں کیونکہ مکمل شریعت کی  
موجودگی میں گمراہی کے معنی مناسب نہیں، ہاں بعض احکام کو بھولا جاسکتا ہے، اسی بناء پر  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کرنے کا ذکر فرمایا۔ اس واقعہ سے آپ کا مقصد ان وصایا  
کی اہمیت کو بتانا تھا اور اس طرح ان کی حفاظت مقصود تھی، آیت اور حدیث میں ایک اور  
مناسبت بھی ہے، وہ یہ کہ دونوں جگہ تحریر کے ذکر میں لفظ ”ضلالت“ کا استعمال ہوا ہے،



تحریر کا مقصد محض بھول کا دفعیہ ہوتا ہے۔ لہذا "ضلالت" کے معنی بھول جانا ہی ہر دو جگہ مناسب ہے۔  
(۲) دوسرے یہ کہ ہم نے کتاب اللہ کے معنی "اللہ کی شریعت" کئے ہیں۔ حالانکہ عام طور سے کتاب اللہ سے قرآن مجید مراد لیا جاتا ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں:-

وجہ اول۔ خود اسی حدیث میں حضرت عمرؓ نے پہلے "عِنْدَ كَرِ الْقُرْآنِ" کہا تھا۔ پھر "عِنْدَ نَاكِتَابِ اللہ" کہا صحیح بخاری کتاب العلم اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ حضرت عمرؓ کو پہلے جملہ سے غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے قرآن کی جگہ کتاب اللہ کہہ دیا۔

وجہ دوم۔ خود حضرت عمرؓ نے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ حدیثِ رحم کو کتاب اللہ کہا ہے۔  
وجہ سوم۔ حضرت عمرؓ کی ساری زندگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ حدیث کو بھی حجت سمجھتے تھے۔ لہذا "حَبْنَا كِتَابَ اللہ" سے صرف قرآن مجید مراد لینا، خود متکلم یعنی حضرت عمرؓ کی منشاء کے خلاف ہے۔

**حدیث کو کتاب اللہ کہا جاتا ہے** | حدیث کو کتاب اللہ کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے مندرجہ ذیل حدیث اس پر کھلی دلیل ہے۔

دو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فیصلہ کے لئے حاضر ہوئے۔  
فَقَالَ أَحَدُهُمَا إِنَّمَا نَبِيْنَا كِتَابُ اللہ وَقَالَ  
الْآخَرُ مَا جَلَّ يَا رَسُولَ اللہ فَانْفِصْنَا كِتَابَ اللہ  
ایک نے کہا کتاب اللہ سے ہمارا فیصلہ کیجئے۔ دوسرے  
نے کہا ہاں یا رسول اللہ کتاب اللہ سے ہمارا فیصلہ کیجئے۔  
مقدمہ سننے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

أَمَّا الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا تُخْصِيَانِ  
بَيْنَكُمَا كِتَابُ اللہ  
قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں  
ضرور تمہارا فیصلہ کتاب اللہ سے کروں گا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔  
أَمَّا بَنُكَ فَعَلِيٌّ بِجَلْدَةٍ مِائَتٍ  
وَتَغْرِيْبٍ عَامٍ وَأَمَّا أَنْتَ يَا أُنَيْسُ  
فَاغْدُ عَلَى امْرَأَةٍ فَإِنْ اِخْتَرَفَتْ  
فَارْجُمْهَا فَإِنْ اِخْتَرَفَتْ فَرَجِّمِهَا  
تیرے بیٹے کو سو درے لگائے جائیں گے اور ایک  
سال کے لئے جلاوطن کیا جائے گا۔ اور اے انیس، تم  
اس عورت کے پاس جاؤ۔ اگر وہ زنا کا اقرار کرے  
تو اس کو رجم کرو اس نے اقرار کیا اور انہوں نے  
اسے سنگسار کر دیا۔  
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

یہ مزاج اس حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ کتاب اللہ سے مراد یہاں حدیث ہے۔

کتاب اللہ کا اطلاق نہ صرف قرآن مجید اور نہ صرف حدیث بلکہ پوری شریعت پر بھی ہوتا



ہے اور یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے، ارشاد باری ہے:-

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ  
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ تَصْدِيقُ الَّذِي  
بَيَّنَّ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا  
رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ (یونس: ۳۷)

اس آیت میں اگر کتاب سے قرآن مجید مراد لیا جائے، تو معنی یہ ہوں گے کہ قرآن قرآن کی تفصیل کرتا ہے اور یہ کسی طرح صحیح نہیں، صحیح معنی یہ ہیں کہ شریعت کی تفصیل کرتا ہے احکام شریعت کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتا ہے۔ اس روایت سے ثابت ہوا کہ کتاب اللہ کے معنی شریعت الکتبیہ کے بھی ہیں اور جب قرآن حدیث اور حضرت عمرؓ کے قول سے یہ ثابت ہو چکا کہ حدیث بھی کتاب اللہ ہے تو پھر ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ سے حدیث کی مخالفت ثابت نہیں ہوتی۔

یہاں تک صحابہ کرام کے حدیث جمع نہ کرنے کی پہلی مفروضہ وجہ کا جواب تھا اب دوسری وجہ سنئے اور جواب ملاحظہ فرمائیے:-

**غلط فہمی**

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-  
دوم۔ حضور نے حدیث لکھنے سے روک دیا تھا۔ ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآن کے بغیر میرا کوئی قول قلمبند نہ کرو اور اگر کوئی شخص ایسا کوئی قول لکھ چکا ہو تو اسے مٹا دے۔ صحیح مسلم (دو اسلام ص ۳۹)

برق صاحب نے خود ہی اس ممانعت کی دو وجہیں لکھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں اول یہ کہ کہیں غلطی سے احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں اور درحقیقت یہی اس کی اصل وجہ ہے اور یہی صحیح ہے۔

**جواب**

(۲) اس کے بعد برق صاحب اس حکم امتناعی کی دوسری وجہ لکھتے ہیں:-

**غلط فہمی**

دوم۔ خود رسول کریمؐ کی زندگی میں ان کے اقوال محرف ہو چکے تھے (دو اسلام ص ۳۹)  
یہ وجہ قطعاً صحیح نہیں، اولاً اس لئے کہ کسی روایت میں یہ منقول نہیں کہ خود آپ کی زندگی میں آپ کی احادیث محرف ہو چکی تھیں۔

**جواب**

ثانیاً، پہلی وجہ جو اوپر بیان ہوئی وہ صحیح ہے لہذا یہ وجہ باطل ہے۔

ثالثاً۔ یہ وجہ عقلاً بھی محال ہے کسی شخص کے اقوال میں تحریف یا اختلاف اس وقت رونما ہوتا

ہے جب وہ موجود نہ ہو اور جب وہ موجود ہو تو تحریف کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا، اس لئے کہ یہ فوراً گرفت میں آنے والی بات ہے اور کہنے والا خود اس کی تکذیب کر سکتا ہے اور جب ہاتھ میں حجت



ہو تو پھر سزا بھی دے سکتا ہے، اسی طرح اختلافِ لفظی یا منہوی کا وقوع بھی محال ہے اور اگر بالفرض محال ایسا ہو بھی جائے تو اس اختلاف کو فوراً رفع بھی کیا جاسکتا ہے، غرض کہ قائل کی زندگی میں اس کے قول کے مفہوم میں جو اختلاف پیدا ہو گا وہ عارضی ہو گا، دائمی نہیں، لہذا برق صاحب کا یہ کہنا کہ خود آپ کی زندگی میں آپ کے اقوال محرف ہو چکے تھے، عقلاً و نقلاً کسی طرح صحیح نہیں۔

اس کے بعد برق صاحب لکھتے ہیں:-

**غلط فہمی**

فرض کرو، ایک محفل میں چھ آدمی گھنٹہ بھر گفتگو کرتے رہے کیا یہ ممکن ہے کہ

اختتامِ مجلس تک وہ تمام گفتگو بالفاظِ دہرا سکیں! ناممکن ہے“ (دو اسلام ص ۳۹)

برق صاحب جو چیز آپ کے لئے ناممکن ہے، ضروری نہیں کہ وہ ہر شخص کے لئے

**جواب**

ناممکن ہو۔ اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک دفعہ کتاب پڑھی

اور پوری کتاب یاد ہو گئی مثلاً امام شافعی، امام بخاری، امام ابن تیمیہ وغیرہ محدثین کے حافظہ

کے متعدد واقعات ہیں، بخوف طوالت نظر انداز کر رہا ہوں، براہِ کرم اپنے حافظہ کے سپمانہ سے

دوسرے لوگوں کے حافظہ کی پیمائش نہ کیجیے پھر عام گفتگو کو درس و تدریس سے کیا نسبت! درس و

تدریس میں سننے والا سنتا اس لئے ہے کہ اس کو محفوظ رکھے، پھر عام درس و تدریس کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ سے کیا نسبت! صحابہ کرام بڑے شوق سے ارشاداتِ نبوی

کو سنتے تھے بلکہ عورتیں تک درخواست کرتی تھیں کہ ہمارے لئے بھی کوئی دن مقرر کر دیا

جائے اور ان کی درخواست پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دن مقرر کر دئے تھے (صحیح

بخاری کتاب العلم) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے تھے۔

صحابہ کرام آپ سے سوال بھی نہیں کرتے تھے اس لئے کہ قرآن مجید میں اس کی ممانعت

تھی، حضرت انسؓ کہتے ہیں، ہم کو قرآن مجید میں سوال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا لہذا ہم

اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ کوئی سمجھ دار دیہاتی آکر سوال کرے (صحیح بخاری کتاب العلم)

ایسے حالات میں ارشادات کی قلت ہوگی اور جتنی قلت ہوگی اتنی ہی حفاظت زیادہ ہوگی،

پھر صحابہ کرام نے آپ کے ارشادات کے جستہ جستہ فقرے بیان کئے ہیں نہ کہ مسلسل ڈھائی گھنٹہ

کی تقریر اور جستہ جستہ اہم فقروں کا یاد کر لینا کیا مشکل ہے، پھر مسائل کی نوعیت اور بھی مختلف

ہے اس لئے کہ مسئلہ سنتے ہی یاد ہو جاتا ہے۔ پھر اگر کسی سائل کے جواب میں بیان کیا جائے

تو کم از کم سائل کو تو وہ حفظ ہو ہی جائے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل تقریر کے

عادی نہیں تھے، متوسط خطبہ دیا کرتے تھے (صحیح مسلم) پھر اکثر اوقات ایک ایک بات



تین تین مرتبہ دہرایا کرتے تھے (صحیح بخاری کتاب العلم) مہلّا ان حالات میں ایک مخلص دین سیکھنے والے کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ ارشادِ انتِ عالیہ کو حفظ کر سکے، یہ ایک فطری چیز ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** ”ایک واقعہ کو پچاس آدمی دیکھتے ہیں۔ اگر آپ ان کے پاس علیحدہ علیحدہ جا کر اس واقعہ کی تفصیل قلم بند کریں تو آپ کو ان تفصیل میں کافی اختلافات نظر آئیں گے“ (دو اسلام ص ۳۹)

**جواب** بات یہاں یہ نہیں ہے جو برق صاحب نے لکھی ہے۔ یہاں تو بات یہ ہے کہ حدیث کو پچاس آدمی سنتے ہیں اور پچاس کے پچاس ایک ہی مفہوم روایت کرتے ہیں اور اگر بالفرض محال ایک دو آدمی غلطی کر بھی جائیں تو اکثریت کے مقابلہ میں ان کی بات قابل رد ہوگی۔

پھر برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** اگرچہ ماہ یا سال بھر بعد انہی لوگوں کے پاس جا کر اس واقعہ کی تفصیل دوبارہ قلم بند کریں تو اختلافات اور نمایاں ہوگا (دو اسلام ص ۴۰)

**جواب** حدیث کے سلسلہ میں یہ بات بھی صحیح نہیں اس کی آزمائش بھی ہو چکی ہے سال سال بھر بعد راویوں سے بغیر ان کے علم کے ان کی بیان کردہ احادیث کو دہرایا گیا اور سر مو فرق نہیں آیا، برق صاحب علم حدیث کا مطالعہ کیجیے۔ قرآن میں کے حالات کو غور سے پڑھیے، پھر برق صاحب احادیث کو واقعات سے تشبیہ دینا بھی تو صحیح نہیں، احادیث مسائل ہیں اور مسائل کا یاد کر لینا اور ان کے بیان پر متفق ہونا کوئی مشکل نہیں اگر کسی حدیث میں کوئی واقعہ بھی مذکور ہو تو واقعہ اصل چیز نہ ہوگی بلکہ وہ مسئلہ جو اس واقعہ کے اختتام پر بصورت حدیث واقع ہوگا، اصل چیز ہوگی اور صرف اس مسئلہ کی حفاظت کافی ہوگی نہ کہ پورے واقعہ کی۔ واقعہ کی نوعیت بالکل شان نزول کی سی ہوگی، جس طرح شان نزول کی عدم حفاظت سے آیات قرآنی مشکوک نہیں ہوتیں، اسی طرح اگر کسی واقعہ کی تفصیل پوری طرح محفوظ نہ ہو تو اصل مسئلہ مشکوک نہ ہوگا۔

پھر برق صاحب فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** ”مرو زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تفصیل یوں بدلتی جائیں گی کہ ان کا تعلق حقیقت

سے بالکل منقطع ہو جائے گا“

(دو اسلام ص ۴۱)



## جواب

حدیث کے سلسلہ میں یہ بات بھی صحیح نہیں، صحابہ کرام اور بعد کے محدثین نے احادیث قلم بند کر لی تھیں، ان پر عمل کرتے تھے، درس و تدریس جاری تھا لہذا تفصیل کا بدلنا ناممکن ہے اور اگر بالفرض محال بدل بھی جاتے تو وہ مضطرب المتن کہلا میں گی اور ضعیف سمجھی جائیں گی لیکن اس ضعیف کی وجہ سے جو صحیح ہوں گی، ان پر اس ضعف کا کیا اثر پڑے گا، ضعیف کو رد کیا جائے گا، نہ کہ صحیح کو، برق صاحب پھر گزارش کرتا، ہوں کہ فنون حدیث کا اگر مطالعہ کیجیے۔ جب کوئی حدیث محدثین کے نزدیک صحیح ہوتی ہے تو وہ ان تمام شکوک سے بالاتر ہوتی ہے جو آپ وارد کر رہے ہیں بلکہ ان سے بہت زیادہ معیار اور مزعومہ شکوک کو عبور کرتی ہوتی درجہ صحت کو پہنچتی ہے۔

## مزید غلط فہمی اور اس کا ازالہ

پھر برق صاحب نے مسٹر محمد علی جناح کی تقاریر کی مثال دی ہے یہ مثال بھی صحیح نہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ایک لیڈر کے اقوال میں زمین و آسمان کا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک لفظ بیش قیمت قانون اور شریعتِ اسلامیہ کا ماخذ ہے، علم و عمل کا سرمایہ اور توشہ آخرت ہے لیڈر کے اقوال کو یہ اہمیت حاصل نہیں پھر کہاں تین تین گھنٹہ کی تقریر اور کہاں معلم کتاب و حکمت، مزی و مدثر کی تعلیم اور تدریس، دونوں میں بعد المشرقین ہے نبی کی بات اس لئے سنی جاتی ہے کہ یاد رکھی جائے عمل کیا جاتے، عمل کرایا جاتے، لیڈر کی بات کو یہ مقام کہاں حاصل ہے۔ اس کی تقریر سے الا ماشاء اللہ کوئی فیض حاصل نہیں کرتا نہ اسے حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے، پھر نبی کی مجلس ایک تربیت گاہ ہوتی ہے، جہاں صبح و شام بلکہ ہر وقت ہر شخص کے اعمال و اقوال پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ اس کو مبلغ بنایا جاتا ہے اور دیگر مقامات پر بھی بھیجا جاتا ہے، لیڈر کی تقریریں لفاظی اور سحر بیانی ہوتی ہے وہ جذبات سے کھیلتا ہوا کچھ کا کچھ کہتا چلا جاتا ہے، اس کے بعض بیان اور بعض مفروضے بالکل سیاسی حربے ہوتے ہیں، برخلاف اس کے نبی کی ہر بات حقائق پر مبنی ہوتی ہے، وہاں نہ لفاظی ہوتی ہے نہ سحر بیانی، وہ جنتہ اور جامع فقرے استعمال کرتا ہے جو قلوب میں پیوست ہو جاتے ہیں اور جوارح سے عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، بھلا کہاں لیڈر اور کہاں نبی، برق صاحب کچھ تو غور کر کے لکھا ہوتا۔

پھر برق صاحب لکھتے ہیں کہ:-

غلط فہمی حضرت فاروق کے زمانہ میں عراق کا قرآن حجاز سے مختلف ہو گیا



تھا... حضرت فاروق نے اس کا علاج یہ کیا کہ قرآن کے کافی نسخے لکھوا کر قلمرو کے مختلف حصوں میں بھیج دئے، (دو اسلام ص ۴)

اس واقعہ کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف صحیح نہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں پیش آیا تھا، اسی سلسلہ میں برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

جواب

غلط فہمی ”صحابہ کرام عشق خدا میں ڈوبے ہوئے تھے... اگر ان عاشقانِ خدا کو قرآن کی آیات بھول گئی تھیں تو حدیث کے بھولنے پر انہیں کون ملامت کر سکتا تھا“ (دو اسلام ص ۴)

صحابہؓ کا قرآن مجید کی آیات بھلا دینا خلاف واقعہ ہے اور صحیح نہیں معلوم نہیں برق صاحب کس حوالہ سے ایسا لکھ رہے ہیں، ہاں اختلافِ لب و لہجہ ضرور واقع ہوا تھا اور یہ اور چیز ہے، بھلا دینا اور چیز ہے، پھر روایت زیر بحث میں جو اختلاف مذکور ہے وہ صحابہ کے متعلق نہیں ہے بلکہ عام لوگوں کا اختلاف مراد ہے، برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی، صحابہ نہ آیات بھولے نہ احادیث، اگر انفرادی طور پر بھول ہو بھی جاتے تو اکثریت کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں، احادیث کے سلسلہ میں انفرادی بھول کا تدارک کر لیا گیا ہے۔

جواب

اس کے بعد برق صاحب تحریر فرماتے:-

غلط فہمی ”حضور کا مقصد بھی یہی تھا، کہ قرآن حکیم کے بغیر کوئی اور کتاب

ہدایت باقی نہ رہے“ (دو اسلام ص ۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ مقصد نہیں تھا نہ اس کا آپ نے کوئی ثبوت دیا، بلکہ اس کے خلاف ثبوت ملتا ہے، سنئیے۔

جواب

ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا۔ اے لوگو! میں تم میں ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اس کو پھڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اس کے بنی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ

۱۔ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي خُطْبَتِهِ حَجَّةَ الْوَدَاعِ... أَيْهَا النَّاسُ إِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ اجْتَمَعْتُمْ بِهِ قَلَنْ تَضِلُّوا أَبَدًا كِتَابُ اللَّهِ وَسُنَّةُ نَبِيِّهِ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۳)

۲۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ



اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنِّیْ تَدْرُکُ فِیْکُمْ شَیْئَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا  
بَعْدَ هٰذَا کِتَابِ اللّٰهِ وَ سُنَّتِیْ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم میں  
دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ان کے  
ہوتے ہوئے تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔  
اللہ کی کتاب اور میری سنت۔

(مسند رک حاکم ج ۱ ص ۱۳ وسکت علیہا صاحب المرواة ج ۱ ص ۲)

عَنْ مَقْدَامٍ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اِنِّیْ اُوتِیْتُ  
الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعًا اَلَا یُؤْتِیْکَ رَجُلٌ  
شَبْعَانَ عَلٰی اَرِیْکَتَہِ یَقُوْلُ عَلَیْکُمْ ہٰذَا  
الْقُرْآنُ فَمَا وَجَدْتُمْ فِیْہِ مِنْ حَلَالٍ فَاحِلُوْہُ  
وَمَا وَجَدْتُمْ فِیْہِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْہُ وَاِنَّ مَا  
حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ کَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا لِیَحِلَّ  
لَکُمُ الْحِنَا اِلَّا لَهْلِ رِوَاہِ اَحْمَد وَاِبُو دَاوُدَ  
وَالدَّارِمِ وَابْنِ مَاجَہُ وَسَنَدُہُ صَحِیْحٌ مَّرْعَاۃ ج ۱ ص ۱۵۶  
مقام کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا مجھے قرآن دیا گیا ہے  
اور اس کے ساتھ اسی کی مثل ایک اور چیز  
بھی دی گئی ہے۔ خبردار عنقریب ایک  
پیٹ بھر شخص چھپر کھٹ پر بیٹھ کر کہے گا  
کہ بس قرآن کو لازم سمجھو۔ جو اس میں حلال  
ہے اس کو حلال مانو اور جو اس میں حرام  
ہے اس کو حرام مانو حالانکہ جو رسول اللہ نے حرام کیا  
وہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا خبردار تمہارے  
نئے شری گدھا حلال نہیں۔

لَا الْفِیْنِ اَحَدُکُمْ مُّتَّکِعًا عَلٰی اَرِیْکَتَہِ  
یَأْتِیْہِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِیْ مِمَّا اَمَرْتُ  
بِہِ اَوْ هَیْئَتْ عَنْہُ فِیَقُوْلُ لَا تَذَرِیْ  
مَا وَجَدْتُ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ اَتَّبَعْنَا  
رِوَاہِ اَحْمَد وَاِبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَسَنَدُہُ  
حَسَنٌ مَّرْعَاۃ شَرْحُ مَشْکُوۃ جلد ۱ ص ۱۵۵  
میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ اپنے چھپر کھٹ  
پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو، جب میرا کوئی  
حکم اس کو پہنچے یا میری ممانعت اس کو  
پہنچے تو وہ کہے ہم نہیں جانتے، ہم تو جو  
کچھ کتاب اللہ تعالیٰ میں ہے اسی کا اتباع  
کرتے ہیں۔

عرباض بن ساریہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَلِیَحْسِبُ اَحَدُکُمْ مُّتَّکِعًا عَلٰی اَرِیْکَتَہِ  
یَظُنُّ اَنَّ اللّٰہَ لَمْ یُجِزْہُمْ شَیْئًا اِلَّا مَا  
فِیْ ہٰذَا الْقُرْآنِ اِلَّا وَاِنِّیْ وَاَدْلٰہُ قَدْ  
اَمَرْتُ وَوَعَّظْتُ وَهَیْئَتْ عَنْ اَشْیَاءَ  
اِنَّہَا لِیَمِثْلُ الْقُرْآنِ اَوْ اَکْثَرُ  
کیا تم میں کوئی شخص چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے  
ہوئے یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی  
چیز حرام نہیں کی سوائے اس کے جو قرآن  
میں ہے۔ خبردار اللہ کی قسم میں نے حکم  
دئے ہیں اور نصیحت کی ہے اور بہت



لم رواہ ابو داؤد و فی سندہ اشعث و ثقہ  
ابو داؤد و ابن حبان و قال الحافظ هو مقبول  
مرعاة شرح مشکوٰۃ جلد اول ص ۱۵۱  
بکہ اس سے بھی زیادہ۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** ”(حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ نے احادیث اس لئے جمع نہیں کیں کہ)  
اقوال رسول میں تحریف ہو چکی تھی“ (دو اسلام ص ۱۲)

برق صاحب! اس جملہ کو تحریر کرتے وقت آپ نے کچھ غور بھی فرمایا کہ آخر  
**جواب** تحریف کرنے والے کون تھے۔ اس لئے کہ حضرت صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ  
در رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی راوی تو تھا ہی نہیں، پھر تحریف کرنے والے  
صدیقؓ اور فاروقؓ ہی ہو سکتے ہیں اور بالفرض محال چند حدیثیں ایسی ہوتیں جو دوسرے صحابی سے سن کر  
فلم بند کرتے تو کیا اس صحابی نے تحریف کی تھی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** ”حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہوا  
تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت صدیقؓ کے مجموعہ سے زیادہ قابل اعتماد اور کون سا مجموعہ ہو سکتا تھا لیکن ایک  
صبح اٹھ کر اسے جلادیا“ (دو اسلام ص ۱۲)

برق صاحب کو اعتراف ہے کہ یہ مجموعہ سب سے زیادہ قابل اعتماد تھا لیکن  
**جواب** پھر بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسے جلادیا۔ برق صاحب نے یہ نہیں لکھا  
کہ کیوں جلادیا۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ برق صاحب کا منشا وہی ہے کہ احادیث  
میں تحریف ہو چکی تھی لہذا حضرت صدیق اکبرؓ اس کی صحت پر مطمئن نہیں تھے، لیکن  
یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ تحریف کرنے والے تھے کون؟ کیا پانچ سو احادیث  
بھی ایسی نہ تھیں جن کو وہ خود براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوں؟  
کیا ان روایات میں کوئی سلسلہ اسانید تھا جس میں کذاب اور وضاع راویوں کی بھرمار تھی؟  
کیا حضرت صدیقؓ کو صحابہ کرام میں کوئی عداوت القول راوی دستیاب نہ ہو سکا؟ سمجھ میں نہیں  
آتا کہ برق صاحب کیسے اس بے سرو پا، خلاف قیاس و عقل روایت کو اپنے ثبوت میں پیش  
فرما رہے ہیں۔

۲:- یہ روایت جس طرح عقلاً باطل ہے نقلاً بھی باطل اور سرتاپا جھوٹی ہے۔ اس کی  
سند میں ایک راوی علی بن صالح مستور و مجهول الحال ہے (تقریباً) دوسرا راوی محمد بن موسیٰ



ہے جس کے متعلق امام دارقطنی فرماتے ہیں "قوی نہیں" (لسان المیزان) تیسرا راوی موسیٰ بن عبد اللہ ہے جس کے متعلق امام بخاری فرماتے ہیں "فنیہ نظر" الغرض سنداً یہ روایت صحیح نہیں، برق صاحب کو بڑی غلط فہمی ہوئی کہ ایسی جھوٹی روایت کو اپنے ثبوت میں پیش کر دیا۔

پھر برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | حضرت فاروقؓ کے متعلق مذکور ہے کہ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کا اسوہ لکھوانے کا ارادہ کیا۔ مہینہ بھر استخارہ کرتے رہے اور پھر فرمایا: تم سے پہلے ایسی قومیں گزر چکی ہیں جنہوں نے کتابیں لکھیں، اور خدائی کتاب کو چھوڑ کر انہی پہ جھک پڑیں۔ خدا کی قسم میں قرآن کے راستہ میں کسی اور کتاب کو قطعاً نہیں آنے دوں گا۔

(دوا سلام ص ۲۲-۲۳)

حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کردہ قول کے آخری حصہ کے الفاظ یہ ہیں:-  
**ازالہ** | **ملوادلہ لا آشوب کتاب اللہ شیئاً** ابدالاً و اسلام ص ۲۳، برق صاحب نے اس کا ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "میں کتاب اللہ میں کسی چیز کی آمیزش نہیں کروں گا" اور اس کے تو سب ہی قائل ہیں کہ متن قرآن مجید میں ملاوٹ ممنوع ہے بہر حال ترجمہ کچھ بھی ہو، یہ روایت ہی باطل ہے۔ سنداً غیر متصل اور منقطع ہے (برق اسلام ص ۹۳) لہذا ایسی جھوٹی روایت سے مدعا ثابت نہیں ہوگا، یہاں کھراسکہ چلتا ہے، کھوٹا سکہ نہیں چلتا۔

پھر برق صاحب فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | جب حضرت صدیقؓ مسند خلافت پر جلوہ آرا ہوئے تو آپ نے ایک دن ایک مجمع عام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "تم لوگ آج احادیث میں اختلاف رکھتے ہو۔۔۔ آئندہ یہ اختلاف بڑھتا جائے گا اس لئے تم آنحضرتؐ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو اور اگر کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے پاس قرآن ہے، جو اس نے جائز قرار دیا ہے اسے جائز اور جسے ناجائز قرار دیا ہے اسے ناجائز سمجھو"۔

(دوا سلام ص ۲۳)

برق صاحب یہ روایت بھی جھوٹی ہے اس کی سند منقطع ہے متصل نہیں

**ازالہ** | **توجیہ النظر** میں ہے: "واما الروایۃ عن ابی بکر الصدیق فمن قطعہ لاتصلح"

یعنی اس روایت کا سلسلہ سند منقطع ہے لہذا صحیح نہیں (برق اسلام ص ۳۱) برق صاحب ایسی ضعیف روایتیں آپ کیوں پیش فرماتے ہیں دیکھتے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے تو صحیح سند سے یہ



دری ہے جو درج ذیل ہے۔

حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں:-

لَسْتُ تَارِكًا شَيْئًا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْمَلُ بِهِ إِلَّا عَمِلْتُ بِهِ فَإِذَا أَخَشَيْتُ أَنْ تَرَكْتُ شَيْئًا مِنْ أَمْرِهِ أَنْ أَرْيَغَ

میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑ سکتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں کوئی چیز بھی آپ کے قول و فعل میں سے چھوڑ دوں گا تو گمراہ

(صحیح بخاری، کتاب الجہاد) ہو جاؤں گا۔

اور وہ چھوڑ بھی کیسے سکتے تھے جب کہ وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ اللہ کا فرمان ہے۔ حضرت ابو بکرؓ اپنی کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں:-

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ هَذِهِ فَرِيقَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِي فَرَضَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ وَالْقِيَامُ وَاللَّهُ بِمَا رَسُولُهُ فَرَضَ مِنْ سُلْمَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ عَلَى وَجْهِهَا فَلْيُعْطِهَا وَمَنْ سُئِلَ فَوْقَهَا فَلَا يُعْطِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ زکوٰۃ کے یہ وہ فرائض ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانین پر فرض کیا ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا پس جس سے اس کے مطابق مانگا جائے تو اسے دے دینا چاہیے اور جس سے اس سے

(صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ) زیادہ مانگا جائے تو وہ زیادہ نہ دے۔

یہ ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی کتاب کا تمہیدی بیان۔ اس کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے فرائض بیان کئے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس تمہیدی بیان سے ثابت ہوا کہ:-

۱۔ جو کچھ حدیث میں ہے اسی کے موافق عمل کیا جائے۔

۲۔ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض کیا ہے وہ من جانب اللہ فرض ہے۔ گویا حدیث بھی من جانب اللہ نازل ہوئی ہے۔

۳۔ اگر کوئی حاکم حدیث کی مقرر کردہ شرح سے زیادہ مانگے تو نہ دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرح کو اپنی رعایا پر فرض نہیں فرمایا بلکہ مسلمانین پر مقرر فرمایا ہے یعنی حدیث کے احکام وقتی نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانہ میں بھی اس کو نافذ کیا اور آئندہ کے لئے بھی ہدایت چھوڑ گئے کہ اس سے زیادہ مانگا جائے تو نہ دیا جائے۔ یعنی حاکم وقت مختار نہیں ہے کہ اس میں حالات زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی کر سکے۔ یہ ہیں ابو بکر صدیقؓ اور یہ ہے ان کا بیان ان کی اپنی کتاب میں۔



اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-  
**غلط فہمی** | ایک مرتبہ حضرت فاروقؓ نے تمام صحابہ سے فرمایا "گھر جاؤ اور احادیث کا تمام ذخیرہ اٹھا لاؤ۔ جب یہ ذخیرہ جمع ہو گیا تو آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے جلا دیا۔  
 (رد اسلام ص ۴۳-۴۴)

یہ روایت بھی منقطع ہے، متصل نہیں (برق اسلام ص ۹۵) یہ روایت نہ سنداً صحیح ہے  
**ازالہ** | اور نہ عقلاً۔ سنداً اس لئے کہ منقطع ہے، عقلاً اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے خود حدیث کی کتاب لکھوائی جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی۔ امام مالک نے اس کتاب کو خود پڑھا تھا (موطا امام مالک) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کی نقل کرا کر اس پر عمل کرایا تھا (دارقطنی) اس کتاب کا مفصل حال اوپر گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں، پھر حضرت عمرؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ کے پاس بھی کتابیں تھیں۔ ان کا تذکرہ بھی اوپر گزر چکا ہے۔ یہ کتابیں ان کی اولاد کے پاس باقی رہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی کتاب عادیہ بڑی مشہور و معروف کتاب ہے جو ان کے پڑپوتے پڑھایا کرتے تھے۔ تفصیل کے لئے گزشتہ صفحات ملاحظہ ہوں۔ اگر سب کتابیں جلادی گئی تھیں تو یہ کتابیں کہاں سے آگئی تھیں۔ حضرت علیؓ تو اپنی خلافت کے زمانہ میں اپنی کتاب کا مظاہرہ جمع عام میں فرمایا کرتے تھے اور اس کا مضمون سنایا کرتے تھے (صحیح بخاری) لہذا یہ جلانے کی روایت کسی دشمن اسلام کی گھڑی ہوئی ہے۔ حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ اور دیگر صحابہ ہی کی یہ کتابیں ہیں جن کو امام بخاری و ذخیرہ نے اپنی کتابوں میں جمع کر دیا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-  
**غلط فہمی** | "وہ صحابہ جن کی دیانت اور سچائی پر کچھ بھروسہ کیا جاسکتا تھا فوت ہو چکے تھے اور بد میں لگے تھے۔ ہم جیسے لوگ، امام حسینؓ کے قاتل، حضرت علیؓ کے باغی، کعبہ ڈھا دینے والے، حاکم شرابی، امراء راشی، غنی عیاش، فقیر لپست کردار، کیا ایسے ماول (امیہ کا دور) میں کسی حدیث کا اصلی حالت میں رہنا ممکن تھا؟  
 (رد اسلام ص ۴۴-۴۵)

برق صاحب کا خیال ہے کہ محدثین یہی لوگ تھے افسوس بہنہ محدثین کا ان لوگوں سے  
**ازالہ** | کوئی تعلق تھا اور نہ وہ ان کی روایتوں کو قابلِ اعتماد سمجھتے تھے۔ اگر کوئی راوی کسی روایت میں آ بھی گیا تو اس روایت سے بیزاری کا اظہار کیا گیا، اسے منکر کہ گیا۔ پھر برق صاحب نے خلافت بنو امیہ کا جو نقشہ کھینچا ہے سرتاپا لغو ہے۔ سنداً بالکل نامستبر ہے۔ اس کی حیثیت محض یہی فریب سے زیادہ نہیں جو بنو امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے وضع کیا



گیا تھا۔ برق صاحب کچھ تو تحقیق کر لیا ہوتا۔ پھر برق صاحب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ بنو امیہ کا دور صحابہ کے فوت ہو جانے کے بعد شروع ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خلافت بنو امیہ کا دور صحابہ کے دور میں گزرا (اس سلسلہ میں ہماری کتاب ”صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین“ ملاحظہ فرمائیں تو مناسب ہوگا)۔

برق صاحب فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”بعض صحابہ سے بھی اخلاقی لغزشیں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ بخاری میں مذکور ہے کہ ایک صحابی روزے کی حالت میں جماع کر بیٹھے تھے“  
(دوا سلام ص ۴۵)

**جواب** | برق صاحب لغزش اور چیز ہے اور قصداً جھوٹ بولنا اور چسپیز ہے۔ لغزش ایک ہنگامی چیز ہوتی ہے اور ایسے وقت سرزد ہوتی ہے کہ دل و دماغ ساتھ نہیں دیتا، عقل بے کار ہو جاتی ہے لیکن جھوٹ بولتے وقت کسی ایسی چسپیز کا غلبہ نہیں ہوتا، پھر لغزش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا کرنے سے کیا نسبت! کسی صحابی پر اس قسم کی تہمت نہیں ہے، نہ ایسا ہوانہ ایسا ہو سکتا قرین قیاس ہے۔ پھر دو ایک صحابیوں کی منفرد لغزش سے تمام صحابہ کیسے ناقابل اعتماد ہو گئے۔

برق صاحب لکھتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”رُحلت رسول کے بعد بعض مرتد ہو گئے اور بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا“ (دوا سلام ص ۴۵)

**جواب** | برق صاحب! یہ صحابہ نہیں تھے بلکہ عہد رسالت کے وہ لوگ تھے جنہوں نے فتوحات اسلامی سے خائف ہو کر کلمہ پڑھ لیا تھا اور ابھی ایمان نے قلوب میں جگہ نہیں پکڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور یہ مال کے بندے دوسری طرف جھک گئے۔ ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

برق صاحب فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کی جنگ میں دونوں طرف صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد تھی اور ظاہر ہے کہ دونوں راستی پر نہیں ہو سکتے تھے، ان حالات میں بالکل ممکن ہے کہ کسی صحابی نے عہد اُحدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں“  
(دوا سلام ص ۴۵)



برق صاحب! اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ صحابہ کرام ایسے بددیانت تھے تو پھر  
**جواب** اللہ ہی حافظ ہے، نہ اسلام پہلے تھا اور نہ اب ہے، شکایت ہی بے کار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے بھی، اللہ نے کتاب بھی نازل فرمائی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جماعت تیار کی وہ بددیانت تھی۔ یہ جماعت جب اپنے رسولؐ پر افستہ پردازی سے نہ چوکتی تھی تو ظاہر ہے کہ دوسرے معاملات میں اور بھی زیادہ بددیانت ہوگی۔ ایسی حالت میں ان لوگوں کی بات بھی کافی وزنی ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ بعض صحابہ نے قرآن میں تحریف کر کے سترہ ہزار آیتوں میں سے صرف ۶۶۶۶ آیتیں باقی رکھیں (اصول کافی مستخرج بنام الشافعی جلد ۲ کتاب فضل القرآن باب ۱۴ النوادر ص ۶۳۲ مطبوعہ آفیسٹ پریس کراچی) لہذا قرآن ناقابل اعتماد ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ صحابہ آپس میں لڑتے تھے، جھوٹ بولتے تھے، آیات اور احادیث گھڑتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مزکی اور معلم حکمت بنا کر بھیجے گئے تھے وہ دنیا سے قطعاً ناکام گئے العیاذ باللہ۔

برق صاحب! حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علیؓ میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ چند سبائی منافقین کا بلوہ تھا۔ صحابہ ہرگز بلوہ میں شریک نہیں ہوئے بلکہ فوراً بلوہ کو روک دیا گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا جنگ کرنا از سر تا پا لغو ہے۔ سنداً بالکل غیر معتبر ہے۔ مورخین نے بغیر جرح و تعدیل کے اس کو نقل کیا ہے اور ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے پھر صحابہ کا لڑنا قرآن مجید کے بھی خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ وَرَحِمَاءُ بَيْنَهُمْ

(الفتح :- ۲۹)

صحابہ کفار پر سخت ہیں اور آپس میں  
 بڑے رحیم ہیں۔

پھر بددیانتی کا الزام بھی غلط ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا اٰخٰی

يَهَادُوْا اَهْلًا (الفتح :- ۳۶)

اللہ نے ان کے ساتھ پرہیزگاری کی بات  
 کو لازم کر دیا ہے اور وہ اس کے حقدار  
 ہیں اور اہل بھی۔

یہ ہیں وہ صحابہ جن سے اللہ تعالیٰ نے راضی ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔ کیا ایسے لوگ بددیانت ہو سکتے ہیں؟





برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”دوسو پچاس برس تک یہ حدیثیں کروڑوں زبانوں پر جاری رہیں ہر نیک و بد

کے پاس پہنچیں، الفاظ بدلے، مفہوم بدلا، اضافے ہوئے۔“

(دو اسلام ص ۴۵)

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ احادیث دوسو پچاس برس بعد لکھی گئیں، حالانکہ یہ

**جواب** | قطعاً صحیح نہیں۔ صحابہ کرام کی کتابوں کا حال اوپر گزر چکا ہے، پھر تابعین کے

دور میں تو بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا صحیفہ جو ان کے شاگرد ہمام کے نام سے مشہور ہے چھپ چکا ہے، حضرت امام مالک کی کتاب بھی موجود ہے جو تقریباً سو سال بعد لکھی

گئی۔ اس کی اکثر روایتوں میں یہ دو راوی ہیں: نافع اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ بتائیے ان میں سے کون سے راوی نیک ہیں اور کون سے بد؟ موطا میں دوسری مشہور سند یہ ہے۔ امام محمد

بن شہاب، سالم بن عبداللہ، عبداللہ بن عمرؓ۔ ہے کوئی راوی جس کو ان میں سے بد کہا جائے؟ حضرت عائشہؓ کی سند میں یہ دو راوی ہیں۔ ہشام بن عمرو اور عروہ بن زبیر۔ حضرت انسؓ

کی روایت میں صرف امام زہری راوی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی سند میں امام ابو الزناد اور امام اسحاق ہیں۔ حضرت عمرؓ کی حدیث کی سند میں امام زہری اور حضرت سعید بن مسیب ہیں، غرض یہ کہ اس قسم کی

صد ہا سندیں ہیں جن میں صحابی اور امام مالک کے درمیان ایک یا دو راوی ہیں اور سب زبردست امام ہیں۔ امام مالک سے یہ کتاب بڑے بڑے ائمہ نے نقل کی اور ان سے امام بخاری نے نقل کر لی۔ بتائیے جھوٹ،

تحریف اور غلط بیانی کہاں سے داخل ہوئی؟

برق صاحب لکھتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”ان مشتبہ گوشش بریدہ اور خود تراشیدہ احادیث کا سیلاب عظیم

جب حضرت امام بخاری کے دور میں داخل ہوا تو آپ نے چھ لاکھ احادیث میں سے

جو آپ کو یاد تھیں صرف ۴۷۵، انتخاب کیں اور باقی تمام کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔“

(دو اسلام ص ۴۵-۴۶)

برق صاحب کی عبارت کا خلاصہ یہ ہوا کہ:-

**جواب** | ۱: امام بخاری نے خود تراشیدہ احادیث میں سے احادیث کا انتخاب کیا؛

۲:- امام بخاری سے پہلے حدیث کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ انہوں نے احادیث کو زبانی

حاصل کیا تھا۔

یہ دونوں باتیں قطعاً صحیح نہیں، جواب سلسلہ وار ملاحظہ فرمائیے۔



۱۔ امام بخاری فرماتے ہیں:-

مَا أَذْخَلْتُ فِي كِتَابِي الْجَامِعِ إِلَّا مَا  
صَحَّ وَتَرَكْتُ كَثِيرًا مِنَ الصَّحَاحِ  
حَتَّى لَا يَطُولَ الْكِتَابُ  
(مقدمہ ابن صلاح وغیرہ)

میں نے اپنی جامع میں کوئی ایسی حدیث  
نقل نہیں کی جو صحیح نہ ہو اور بہت  
سی صحیح احادیث کو کتاب کی طوالت  
کے خوف سے چھوڑ دیا۔

اس قول سے معلوم ہوا کہ جو احادیث امام بخاریؒ نے چھوڑ دیں ان میں بھی بہت سی حدیثیں صحیح  
تھیں

امام بخاری فرماتے ہیں:-

أَحْفَظُ مِائَةِ أَلْفِ حَدِيثٍ صَحِيحٍ  
مَجْمَعٍ أَحَدُ لَكْهُ صَحِيحٍ أَحَادِيثٍ  
(مقدمہ ابن صلاح)

یاد ہیں -

عینی لکھتے ہیں:-

نُقِلَ عَنِ الْخَلِيفَةِ أَنَّهُ صَنَّفَ كِتَابًا أَوْرَدَ  
فِيهِ مِائَةَ أَلْفِ حَدِيثٍ صَحِيحٍ  
(نصرة الباری ص ۱ بحوالہ عبدہ "المقاری")

امام بخاری نے ایک کتاب ایسی بھی  
لکھی تھی جس میں ایک لاکھ صحیح  
حدیثیں تھیں -

غرض یہ کہ امام بخاریؒ نے ایک لاکھ صحیح احادیث یعنی ایک لاکھ صحیح سندوں میں سے کم و بیش صرف  
سات ہزار صحیح سندیں نقل کیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سندیں غایت درجہ کی صحیح تھیں جو صحیح سندوں  
میں سے چھانٹ کر رکھی گئیں نہ کہ خود تراشیدہ احادیث میں سے چھانٹ کر رکھی گئیں۔ محدثین کی اصطلاح  
میں ہر سند کو حدیث کہتے ہیں لہذا ایک لاکھ احادیث سے مراد ایک لاکھ سندیں ہیں نہ کہ ایک لاکھ  
متن، برق صاحب کی تفسیر کے مطابق صحیح بخاری میں ۵۷، ۵۸ احادیث ہیں یعنی ۵۷، ۵۸ سندیں  
ہیں نہ کہ متن۔ متن تو تقریباً اس تعداد کا نصف ہیں۔ ایک ہی حدیث امام بخاریؒ کو متعدد اسناد  
سے پہنچی۔ ان میں سے جو بہترین سند تھی، اس کو انہوں نے اپنی جامع میں نقل کیا۔

## امام بخاری کے دور سے پہلے شہر کتابیں لکھی جا چکی تھیں

الف۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ "نوسال کی عمر میں عبد اللہ بن مبارک اور دکیع وغیرہ کی کتب حدیث میں  
نے حفظ کر لی تھیں۔" (نصرة الباری ص ۱۴ بحوالہ مقدمہ فتح الباری)

ب۔ امام بخاریؒ کے استاد امام داخلی حدیث پڑھا ہے تھے کہ سند میں ایک راوی کا



نام غلط لے دیا۔ امام بخاریؒ نے شیخ کو متوجہ کیا۔ شیخ نے اپنی کتاب دیکھی اور فرمایا تم نے سچ کہا۔  
(نصرة الباری ص ۴۶)

ج - امام بخاری کے استاد اسماعیل بن ابی ادیسؒ کی کتاب سے امام بخاریؒ نے چند احادیث کا انتخاب کر لیا تو ان منتخب احادیث کو امام اسماعیل نے لکھ لیا اور ان پر یہ الفاظ لکھے۔  
”یہ وہ حدیثیں ہیں جن کو محمد بن اسماعیل (بخاری) نے میری حدیثوں میں سے منتخب کر لیا ہے۔“  
(نصرة الباری ص ۴۷)

د : امام بخاری کے استاد شیخ عبد اللہ بن یوسف نے امام بخاری سے فرمایا تھا۔  
اُنْظُرْ فِي كُتُبِي وَاخْبِرْ بِنَافِئَتِهَا مِنْ  
السَّقَطِ (نصرة الباری ص ۴۸)  
آپ میری کتابوں کو دیکھئے اور اس میں جو  
کچھ لغزشیں ہوں ان سے مطلع فرمائیے۔  
۴ - امام بخاری کے استاد شیخ محمد بن سلامؒ نے بھی فرمایا تھا۔

اُنْظُرْ فِي كُتُبِي فَمَا وَجَدْتَ فِيهَا مِنْ  
خَطَاٍ فَاصْرُبْ عَلَيْهِ (نصرة الباری)  
میری کتب کو دیکھئے اور جہاں خطا ہو گئی  
ہو وہاں نشان لگا دیجئے۔  
الغرض جب امام بخاری نے ہوش سنبھالا تو بے شمار کتب حدیث تھیں مثلاً صحیفہ ابو ہریرہؓ،  
المشہورہ بصحیفہ ہمام بن منبہ، صحیفہ صادقہ، مولفہ حضرت عبد اللہ بن عمرو، صحیفہ معمر، موطا امام مالک،  
موطا امام محمد، کتاب الآثار، کتاب الخراج، مسند شافعی، کتاب الام، مسند امام احمد، مسند اسماعیل بن راہویہ،  
سنن ابن القطان، کتب دکیع، کتب عبد اللہ بن مبارک، مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبد الرزاق،  
کتب علی بن مدینی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں اکثر کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور آج بھی موجود ہیں اور آسانی  
سے دستیاب ہو سکتی ہیں لہذا یہ کہنا کہ امام بخاریؒ سے پہلے احادیث مکتوب نہ تھیں قطعاً صحیح نہیں۔

قَلَّ اللَّهُ الْحَمْدُ

برق صاحب فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** امام بخاری اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تقریباً اڑھائی سو سال کا  
طویل زمانہ مائل تھا (دو اسلام ص ۴۱)

اس جملہ سے پھر وہی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ ڈھائی سو سال تک احادیث قلمبند  
**جواب** نہیں ہوئی تھیں غیر محفوظ تھیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہر دور میں حدیث کتب بے شمار  
کتابیں لکھی گئیں۔ ان بے شمار کتب حدیث، ائمہ حدیث اور اہتمام درس و تدریس سے  
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ڈھائی سو سال کا طویل زمانہ پاٹ دیا گیا اور مختلف ائمہ دین اور کتب  
کے ذریعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام بخاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھے حدیث



نقل کر رہے ہیں۔ جس طرح آج ہم صحیح بخاری پڑھتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا امام بخاری درس دے رہے ہیں، محض اس لئے کہ یہ گیارہ بارہ سو سال کا زمانہ صحیح بخاری کے راویوں سے پٹا ہوا ہے اور صحیح بخاری اپنے مصنف تک متواتر ہے۔

برق صاحب فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”چھ لاکھ حدیث، ہر حدیث کے کم از کم چھ چھ راوی یعنی چھتیس لاکھ راوی، جن میں سے تیس بتیس لاکھ لازماً مرچکے ہوں گے، نہ ان کے حالات محفوظ، نہ انہیں کوئی جاننے والا موجود۔ امام بخاری کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس کے تمام راوی سچے تھے؟“  
(دو اسلام ص ۴۶)

**جواب** | برق صاحب! آپ نے غالباً صحیح بخاری کا غور سے مطالعہ نہیں فرمایا، صحیح بخاری کی سند میں کم سے کم تین راوی ہوتے ہیں نہ کہ چھ اور یہ حدیثیں ثلاثیات بخاری کہلاتی ہیں۔ اگر آپ زیادہ سے زیادہ چھ چھ راوی کہتے تو بھی غنیمت تھا۔ اس لئے کہ چند حدیثوں میں چھ چھ راوی ہیں لیکن اکثر سندوں میں چار سے زیادہ راوی نہیں ہیں۔

برق صاحب کو دوسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ ان کے خیال میں ایک راوی سے ایک ہی حدیث منقول ہے لہذا چھ لاکھ حدیثوں میں ۶ لاکھ راوی ہو گئے حالانکہ یہ بھی قطعاً غلط ہے۔ ایک راوی سے دس دس، بیس بیس، سو سو بلکہ ہزار ہزار احادیث مروی ہیں۔ لہذا راویوں کی تعداد چند ہزار سے زائد نہیں اور پھر ان میں سے صحیح بخاری کی اسناد کے راوی چند سو سے زائد نہیں لہذا اس قلیل تعداد راویوں کے حالات کا مفصل تذکرہ ملنا اور اس کا محفوظ ہونا کچھ مشکل امر نہیں، پھر اگر بالفرض محال کسی راوی کا حال معلوم نہ ہو تو وہ مجہول الحال ہوگا اس کی روایت صحیح بخاری میں آنے ہی کیوں لگی۔ لہذا صحیح بخاری کی احادیث پر یہ اعتراض کا عدم ہے۔

فلاحہ احمد

تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ امام بخاری کو ان راویوں کے حالات کیسے پہنچے جب کہ وہ مرچکے تھے، سنئے! ان کے حالات کا علم اس طرح ہوا جس طرح حدیث کا علم ہوا، جس طرح حدیث ان تک سنداً پہنچی۔ اسی طرح راوی کے ہم عصر علماء کی جرح و تعدیل بھی سنداً ساتھ ساتھ پہنچی، آخر اس میں اشکال ہی کیا ہے۔ امام بخاری نے اپنے اساتذہ کو خود دیکھا تھا۔ ان استادوں نے اپنے اساتذہ کا حال بیان کیا۔ ان استادوں نے اپنے اساتذہ کا حال بیان کیا اور اس طرح ہر زمانہ کے راویوں کا حال امام بخاری تک سنداً پہنچ گیا، پھر جس طرح حدیث کی



کتابیں امام بخاری سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں۔ جسرح و تعدیل کی کتابیں بھی تصنیف ہو چکی تھیں۔ اسماء الرجال کا فن باتا عدہ منضبط ہو چکا تھا اور یہ سب تحریری مواد تھا جو امام بخاری کے سامنے موجود تھا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | "علاوہ ازیں ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص بھی تھا کہ وہ کسی کردار پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے عادی نہیں تھے، ہمیشہ حسن ظن سے کام لیتے تھے اور مبالغہ آمیز مدح سرائی پر اتر آتے تھے۔ اس وقت ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ میسر سامنے پڑا ہے جس میں ہزار ہا بڑے بڑے راویان و حفاظ حدیث کے حالات مرقوم ہیں۔ میں ایک ہی دور کے چند راوی لے کر ذہبی کی زبانی ان کی کہانی سناتا ہوں، جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ہمارے بزرگوں کا انداز کردار نویسی میں کیا تھا،" (د اسلام ۴۶-۴۷)

برق صاحب! آپ کو چھپر غلط فہمی ہو گئی، امام ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ، اسماء الرجال کی کتاب نہیں ہے بلکہ بقول آپ کے بڑے بڑے راویان و حفاظ حدیث کے حالات پر مشتمل ہے، یہ لوگ آئمہ دین تھے، مرجع انام تھے، متقی تھے، حافظ تھے اور ضابط تھے۔ اگر آپ کو جسرح دیکھنی ہو تو انہی امام ذہبی کی کتاب "میزان الاعتدال" ملاحظہ فرمائیے، کتاب آپ وہ دیکھتے ہیں جس میں حفاظ کا حال ہے تو جسرح آپ کو وہاں کیسے ملے گی۔ وہ کتاب تذکرۃ الضعفاء نہیں کہ وہاں آپ کو جسرح مل سکے۔ رہا یہ کہ مبالغہ آمیزی تو یہ سوانح نگار کا قصور نہیں ہے بلکہ انہوں نے ہر واقعہ کو سند کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اب جس کا قول ہے اس کا مبالغہ ہے، پہلے سند کو دیکھئے کہ صحیح ہے یا نہیں، پھر قائل کو دیکھئے کون ہے۔ اگر ہر طرح سے وہ ثابت ہو جائے تو بے شک وہ مدح ممدوح کے حق میں صحیح ہوگی۔ اس میں امام ذہبی کا کوئی قصور نہیں۔ سند پیش کر کے وہ بری الذمہ ہو گئے، پھر انہی حفاظ میں سے اگر کسی پر جسرح ہے تو وہ بھی امام ذہبی نے میزان میں نقل کر دی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیے۔ جسرح و تعدیل کے لئے وہی کتاب مخصوص ہے اور تاریخی حالات کے لئے تذکرہ۔

برق صاحب لکھتے ہیں:-

**غلط فہمی** | "علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب کے متعلق لکھتے ہیں آپ رات دن میں ایک ہزار رکعت بڑھا کرتے تھے، اگر سونے، کھانے، ضروری حاجات اور وضو



کیئے کم از کم آٹھ گھنٹے الگ کر لئے جائیں تو باقی سولہ گھنٹے بچتے ہیں۔ اگر ہر رکعت پر اوسطاً دو منٹ صرف ہوں تو یہ تینتیس گھنٹے اور بیس منٹ بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سولہ گھنٹوں میں "تینتیس گھنٹوں کا کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔"

(اداسلام ص ۴۷)

برق صاحب یہ صحیح ہے کہ یہ مبالغہ ہے مگر مفاد یہ ہے کہ آپ کو بھی ہوا، وہ یہ کہ **ازالہ** اوسطاً ہر رکعت پر ایک منٹ شمار کرتے تو یہ آپ کے حساب سے بھی سولہ سترہ گھنٹے میں ہو سکتا تھا اور پھر یہ ممکن تھا۔ بلا وجہ آپ نے ۲ منٹ فی رکعت حساب میں لگا کر اس کو ناممکن بنا دیا۔

چند اکابر کے متعلق تذکرۃ الحفاظ سے مدحیہ جملے نقل فرمانے کے بعد برق صاحب کہتے ہیں:-

**غلط فہمی**

"دیکھا آپ نے سوانح نویسی کا انداز، یہ سب محدثین ہم سرسخت تھے، ذہبی ہر ایک کو بے مثال، سب سے بڑا عالم، سردار قرار دے گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زمانہ اور تقریباً ایک ہی ملک کے سب لوگ بے نظیر و بے مثال نہیں ہو سکتے۔"

(دو اسلام ص ۹۰)

برق صاحب! آپ کو پھر غلط فہمی ہو گئی۔ امام ذہبی نے یہ کہیں لکھا ہے **ازالہ** کہ سب لوگ بے نظیر و بے مثال تھے، ہاں چند محدثین کے متعلق بے نظیر یا بے مثال کے لفظ ضرور استعمال کئے ہیں مگر یہ قصیدہ گوئی امام ذہبی کی نہیں ہے بلکہ وہ دوسرے اماموں کے اقوال نقل کر رہے ہیں۔ کسی امام نے شعبی کو سب سے بڑا عالم کہہ دیا اور کسی نے امام عطاء کو۔ یہ تضاد نہیں ہے حقیقت صرف اتنی ہے کہ امام شعبی اور امام عطاء دونوں بہت بڑے عالم ہیں، کسی کے نزدیک کوئی زیادہ ہے، کسی کے نزدیک کوئی زیادہ ہے۔ ہر ایک کا اپنا اندازہ ہے، اگر ایک ہی شخص کے یہ جملے ہوتے تو تصفد کا شبہ ہو سکتا تھا حالانکہ ہونا اس وقت بھی نہیں چاہیے تھا۔ اس لئے کہ جب دو عالم برابر درجے کے ہوں تو پھر کسی ایک کے متعلق زیادہ بڑا ہونے کا فیصلہ مشکل ہوتا ہے اور ایسی ہی حالت میں دونوں کو سب سے بڑا عالم کہہ دیا جاتا ہے۔

فَلَاحِ الْحَمْدِ

اچھا برق صاحب قرآن مجید کی ایک آیت سنئے۔

ارشاد باری ہے:-

وَلَا يَجْعَلْ مَنكُمْ شَنَا نًا قَوْمٍ عَلَىٰ آٰتٍ ۖ

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ



تَعْدِلُوا إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى  
نہ کرے کہ تم نا انصافی کرو۔ بلکہ انصاف  
ہی کرو۔ یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔  
(المائدہ ۵: ۸)

برق صاحب کیا اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نا انصافی بھی تقویٰ کے قریب ہے لیکن  
انصاف زیادہ قریب ہے ہرگز نہیں تو پھر اقرب کا صیغہ جو استعمال ہوا اس کی کیا تاویل ہو  
گی۔ اقرب تفضیل بعض یا تفضیل کل کا صیغہ ہے لیکن یہاں تفضیل کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اسی  
طرح کسی عالم کے متعلق اعلم کا لفظ تفضیل کل کا مفہوم ادا نہیں کرتا بلکہ اس سے اس کے علم کی عظمت  
مراد ہوتی ہے۔ کاش ان معنوں میں اگر آپ ان مدح سرائیوں کا مطالعہ فرماتے تب بھی کوئی غلط فہمی  
نہ ہوتی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | امام مالک نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ حدیث لکھی، نو سو اساتذہ  
سے تعلیم حاصل کی اور سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر درس دینا شروع کر دیا۔  
\_\_\_\_\_ ایک دن حدیث پڑھا رہے تھے کہ پھوکیڑوں  
میں گھسی گیا۔ اس نے سولہ مرتبہ امام صاحب کو کاٹا لیکن امام صاحب نے درس ختم کر  
کے ہی اس کی طرف توجہ دی ...

اتنا لکھنے کے بعد برق صاحب فرماتے ہیں:-

”نو سو اساتذہ سے پڑھا بھی اور پھر سترہ برس میں فارغ التحصیل بھی ہو گئے،  
کوئی پوچھے کہ اس زمانہ میں نو سو اساتذہ عرب میں جمع کہاں سے ہو گئے تھے؟  
اگر بالفرض ہو ہی گئے تھے تو یہ نہ بتایا کہ امام مالک ہر استاد کے پاس کتنا عرصہ رہے  
تھے، اگر ایک استاد کے پاس صرف ایک مہینہ بھی بسر کیا تھا تو بھی ان کا زمانہ تعلیم پچھتر  
برس بنتا ہے“ (دو اسلام صفحہ ۵)

برق صاحب کو پھر غلط فہمی ہوئی۔ آپ اس خیال میں ہیں کہ ہر استاد کے پاس  
**ازالہ** | جانے کے لئے علیحدہ زمانہ مقرر تھا حالانکہ ایسا نہیں، ایک ہی مہینہ میں مختلف

استادوں کے پاس حاضری دی جاسکتی تھی۔ بلکہ ایک ہی دن کے مختلف اوقات میں مختلف استادوں  
کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا جاسکتا تھا پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر استاد کے پاس کم از  
کم ایک مہینہ ہی صرف ہوا، ہو سکتا ہے کہ بعض کے پاس صرف ایک دن یا صرف ایک گھنٹہ ہی  
صرف ہوا ہو بلکہ اگر کسی استاد سے صرف ایک ہی حدیث سنی ہوگی تو صرف چند منٹ ہی صرف



ہونے ہوں گے۔ پھر نو سو اساتذہ کا ایک جگہ جمع ہونا ضروری نہیں، ایک ہی شہر میں متعدد استاد ہوتے تھے اور ان کے پاس سفر کر کے جانا کوئی مشکل نہ تھا، پھر نو سو اساتذہ کا ایک جگہ جمع ہونا بھی ناممکن نہیں مثلاً حج کے موقعہ پر ہزار ہا شیوخ جمع ہوتے تھے اور اگر اس وقت ان کی صحبت سے کوئی شخص فیضیاب ہو جائے اور کئی سال ایسا ہوتا رہے تو اس کے استادوں کی تعداد کا ہزاروں تک پہنچ جانا کیا مشکل ہے۔  
برق صاحب پھر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | پچھو کاٹنے کا گپوڑ بھی قابلِ داد ہے (دو اسلام ص ۵۱)

**ازالہ** | امام مالک رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ حدیث نبوی کا جو احترام ان کے قلب میں جاگزیں تھا یہ واقعہ اس احترام کی زندہ مثال ہے۔ مبالغہ کے علاوہ اس میں قابلِ اعتراض کوئی بات نہیں۔

تویہ تھے وہ سوانح نگار جن کی تحریرات کو تم وحی سمجھ کر بعض راویوں کو سچا اور بعض کو جھوٹا قرار دیتے تھے اور پھر ان سچے راویوں کی احادیث ایک کتاب میں جمع کر کے ان کا نام رکھ دیتے تھے۔ ”صحیح بخاری صحیح مسلم“ (دو اسلام ص ۵۱)

**ازالہ** | برق صاحب کو پھر غلط فہمی ہوئی سوانح نگاروں کی یہ مبالغہ آمیز تعریفیں محدثین کے فنِ مخرج و تعدیل پر اثر انداز نہ ہوئیں۔ کسی شخص کا صادق، عابد، متقی، عالم ہونا اور بات سہیہ اور ثقہ ہونا اور بات ہے۔ اگر یہ تمام محاسن بھی ایک شخص میں جمع ہو جائیں، تب بھی ضروری نہیں کہ وہ شخص ثقہ ہو اور اگر ثقہ ہو بھی جائے تب بھی لازمی نہیں کہ اس کی روایت کردہ تمام احادیث صحیح ہوں۔ غلطی کا امکان موجود ہے، غلطی پر گرفت کرنا یہ ایک مستقل فن ہے جس کی بنیاد پر احادیث کو صحیح یا ضعیف کہا جاتا ہے کسی شخص کا امام وقت ہونا محدثین کو مرعوب نہیں کرتا۔ بہت سے اہل زہد اور اہل خیر حضرات کی غلط بیانی پر محدثین نے گرفت کی غرض یہ کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر پکڑ کی گئی اور اس طرح احادیث کی تیقہ عمل میں آئی۔

برق صاحب فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | حضرت عبداللہ بن یسار فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت علیؑ نے تمام



صحابہ کو جمع کر کے حکم دیا کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد ہر شخص پہلا کام یہ کرے کہ اپنے ذخیرہ احادیث کو جلا ڈالے (دو اسلام ص ۵۵)

برق صاحب نے اس اثر کا مطلب نہیں سمجھا۔ عربی عبارت میں اصل الفاظ **ازالہ** ”احادیث علماء ہم“ یعنی علماء کی باتیں ہیں یعنی حضرت علیؓ نے علماء کے فتوے اور اقوال کو جلانے کا حکم دیا نہ کہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ احادیث علماء کو احادیث رسول آپ نے کیسے سمجھ لیا۔

۲۔ دوم یہ کہ حضرت علیؓ تو خود احادیث لکھتے تھے، ان کے صحیفہ کا ذکر صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر گزر چکا ہے لہذا عقلاً یہ روایت باطل ہے۔

۳۔ قطع نظر اصل مفہوم کے یہ روایت بالکل جھوٹ اور سرتاپا کذب ہے، اس کی سند میں جابر جعفی کذاب ہے۔

برق صاحب لکھتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ابی بن کعبؓ جیسے حبیل القدر صحابی کو روایت احادیث کی بنا پر پٹینے پر تل گئے اور اس جرم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابوذرؓ جیسے عظیم المرتبت اصحاب کو قید کر دیا تھا؛ (دو اسلام ص ۵۵)

**ازالہ** | زمانہ نہیں پایا۔ (تذکرۃ الحفاظ) لہذا یہ روایت منقطع اور ناقابل اعتبار ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ وغیرہ کی روایت کے متعلق علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:-

هُوَ فِي نَفْسِهِ ظَاهِرُ الْكُذْبِ  
(کتاب الاحکام فی اصول الاحکام)

اس کا جھوٹ ہونا بالکل ظاہر ہے

برق صاحب تریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | (عبداللہ بن مسعودؓ) کہا کرتے تھے: جب تمہیں حصول علم کی ضرورت پیش آئے تو قرآن پڑھو، اس لئے کہ اس میں اولین و آخرین کا علم موجود ہے۔ (دو اسلام ص ۵۲)

برق صاحب اگر آپ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ابن مسعودؓ حدیث کو حجت نہیں **ازالہ** سمجھتے تھے تو یہ قطعاً صحیح نہیں، وہ تو فرمایا کرتے تھے:-

لَوْ تَرَكْتُكُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ لَضَلَلْتُمْ  
(صحیح مسلم)

اگر تم اپنے نبیؐ کی سنت چھوڑ دو گے  
تو گمراہ ہو جاؤ گے۔



ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:-

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
عَلَّمَائِسَانِ الْهُدَى (صحیح مسلم)  
بکہ ابن مسعودؓ تو یہاں تک عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام سنتیں من جانب اللہ ہیں، وہ فرماتے ہیں:-  
إِنَّ اللَّهَ شَرَعَ لِنَبِيِّكَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
سُنَنَ الْهُدَى (مجمع مسلم باب صلوة الجماعة)  
بکہ ابن مسعودؓ کا تو یہ عالم تھا کہ وہ حدیث کو کتاب اللہ سمجھتے تھے۔ ام یعقوب، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ  
کے پاس آئیں اور کہا:-

بَلَّغْنِي عَنْكَ أَنَّكَ لَعَنْتَ الْوَاشِمَاتِ  
وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنِمِّصَاتِ  
وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْعُسْنِ الْمُغَيَّرَاتِ  
خَلَقَ اللَّهُ  
مجھے خبر ملی ہے کہ تم گودنے والی، گدوانے والی  
چہرہ پر سے بال اکھیرنے والی، خوبصورتی  
کے لئے دانتوں پر سوہن کرنے والی،  
اللہ تعالیٰ کی پیدائش میں تغیر کرنے والی  
عورت پر لعنت کرتے ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:-

وَمَا لِي لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ  
فِي كِتَابِ اللَّهِ.  
اس عورت نے کہا:-

لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ كُوحِي الْمُصْحَفِ  
فَمَا وَجَدْتُه  
میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مگر اس میں  
یہ چیز مجھے نہیں ملی۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:-

لَئِنْ كُنْتُ قَرَأْتِيهِ لَقَدْ وَجَدْتِيهِ  
قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ مَا أَتَاكُمُ الرَّسُولُ  
فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ  
فَانْتَهُوا  
اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو تمہیں یہ بات  
مل جاتی۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: جو حکم  
رسول دے، اس پر عمل کرو اور جس کا  
منع کرے اس سے باز رہو۔

اس عورت نے کہا تمہاری بیوی میں بھی یہ بات موجود ہے۔ انہوں نے کہا جاؤ اور سچو،  
ہائیں لیکن ان کو ان کی بیوی میں اس قسم کی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ پھر واپس آئیں اور



کہا مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ابن مسعودؓ نے کہا :-

أَمَّا لَوْ كَانَ ذَلِكَ لَمْ نَجْأِمْهَا (صحیح بخاری، صحیح مسلم باب تحریم فعل الواصلة)

اگر ایسا ہوتا تو ہم اس کو اپنے ساتھ کیسے رکھ سکتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ابن مسعودؓ تو ہر حدیث کو کتاب اللہ سمجھتے تھے اور اس پر سختی سے عمل کرتے اور عمل کراتے تھے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | ایک شخص نے ابی بن کعبؓ سے کہا مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔

فرمایا کتاب اللہ کو ہاتھ میں لو اور صرف اسی کے فیصلوں پر عمل کر دو (دوسلام ص ۵۲)

اذا حضرت ابی بن کعبؓ کا مطلب وہ نہیں جو برق صاحب سمجھنے میں۔ قرآن مجید ازالہ | تو خود اتباع رسولؐ، اسوۂ رسولؐ اور اطاعت رسولؐ کی طرف دعوت دیتا ہے، بلکہ

یہاں تک فرماتا ہے :-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ

آپ کے رب کی قسم لوگ مومن نہیں ہو سکتے

يُحْكَمُوا كِتَابَ اللَّهِ فِي شَأْنِ النَّسَاءِ (۶۵)

جب تک آپ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں۔

لہذا صرف کتاب اللہ کو پکڑ لینے کے یہ معنی ہوئے کہ جو کچھ کتاب اللہ میں ہے اس پر عمل کیا جائے اور کتاب اللہ میں فیصلہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ماننے کا حکم موجود ہے لہذا بنیادی طور پر کتاب اللہ کافی ہے اور اس کی رو سے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع لازمی ہے۔

ثانیاً :- ابی بن کعبؓ کی اصل عبارت میں لفظ "صرف" نہیں ہے۔

ثالثاً :- کتاب اللہ سے مراد صرف قرآن مجید ہی نہیں ہوتا بلکہ قرآن مجید اور حدیث دونوں ہوتے

ہیں اور یہ گزشتہ اوراق میں ثابت کیا جا چکا ہے اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث مذکورہ بالا بھی اس پر شاہد ہے، لہذا حضرت ابی بن کعبؓ کے الفاظ سے حجۃ حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ وہ احادیث کو حجۃ سمجھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | حضرت عبداللہ بن عباسؓ سینکڑوں احادیث کے راوی ہیں لیکن

علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ حدیث رسولؐ کے وقت آپ کی عمر صرف ۱۲ برس کی تھی،

تیرہ برس کا بچہ بے حد غیر ذمہ دار ہوتا ہے، اسے کیا خبر کہ نبیؐ دنیا میں کیوں آتا

ہے، اس کے اقوال کو کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اگر ان اقوال میں رد و بدل



کر دیا جائے تو کیا قبائح پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح کے غیر ذمہ دار بچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اسناد کی کوئی کڑی قائم نہ کرنا اور خود انہیں عاقل، بالغ اور ثقہ سمجھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ روایت کے قابل قرار دینا درست نہیں۔“  
(دو اسلام ص ۵۳)

**ازالہ** | برق صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ نبی دنیا میں ایک عظیم الشان مقصد کے لئے آتا ہے۔ اس کے اقوال کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اگر ان اقوال میں رد و بدل کر دیا جائے تو بڑے بڑے قبائح پیدا ہوتے ہیں۔ برق صاحب جب بات یہ ہے تو نبی کے اقوال لازماً دین ہونے چاہئیں ورنہ اہمیت ختم ہو جائے گی اور رد و بدل سے قبائح پیدا نہیں ہوں گے۔

برق صاحب تیسرہ سال کا بچہ اس زمانہ میں جب کہ حافظہ کا قحط ہے چھ چھ سات سات مضامین میں میٹرک کا امتحان پاس کر سکتا ہے۔ ریاضی، سائنس وغیرہ کے بڑے بڑے دقیق مسئلے اور مشکل سوالات حل کر سکتا ہے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں پڑھ کر امتحان دے سکتا ہے بلکہ چھ سات سال کی عمر میں پورا قرآن حفظ کر سکتا ہے تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحبت یافتہ تیسرہ سال کا بچہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو حفظ کر سکے۔ یہ بتائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح وضو کرتے تھے، کس طرح نماز پڑھتے تھے، کس طرح دوسرے کام کرتے تھے، یہ تو بہت آسان بات ہے، اس پر تعجب کیوں ہے، یہ تو وہ بچہ ہے جس کی قدر و منزلت کے فاروقِ اعظمؑ معترف تھے، میٹرک خاص کی حیثیت سے ارکانِ شوریٰ میں جگہ دیتے تھے۔ لوگوں نے امتِ امن بھی کیا تو حضرت عمرؓ نے عملاً اس بچہ کی علمی قابلیت کو ان پر ثابت کر دیا۔ تمام لوگوں کا امتحان یا لیکن کوئی صحابی صحیح جواب نہ دے سکا، صحیح جواب دیا تو صرف تیسرہ سالہ بچہ نے، جہاں ان بزرگوں کی سمجھ کی رسائی نہ ہو سکی۔ وہاں اس بچہ کے فہم کی رسائی ہوئی اور وہ معترض بھی معترف ہو گئے۔ ملاحظہ فرمائیے، صحیح بخاری تفسیر اذہاء نصر اللہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے تحصیلِ علم میں کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زیادتیِ مسلم کے لئے دعا کی۔ وہ صحابہ کے گھر خود جاتے اور احادیث ان سے حاصل کرتے تھے اور پھر ان ہی سے روایت کرتے تھے۔ لہذا ان کی روایت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

فَللّٰهُ الْحَمْدُ

برق صاحب تحریر کرتے ہیں:-



**غلط فہمی** ”ایک مرتبہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ معاویہ کے دربار میں گئے۔ امیر نے احادیث کی سرمانش کی۔ آپ نے چپہ احادیث سنائیں اور منشی دربار کے ساتھ لکھتا گیا۔ آپ نے وہ کاغذ لے کر پتیر ڈالا اور فرمایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ (دو اسلام ص ۵۳)

**ازالہ** اس روایت کو مطلب بن عبد اللہ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کیا ہے، مطلب کا حضرت زید سے سماع ثابت نہیں (المراہیل لابن ابی حاتم) لہذا یہ روایت منقطع ہے اور ناقابل اعتبار ہے۔

**غلط فہمی** اسود بن ہلال کہتے ہیں کہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک بیاض یا کتاب لے کر گیا۔ جس میں کچھ احادیث درج تھیں، آپ نے پانی منگوا کر پہلے اس کتاب کو دھویا اور پھر جلا دیا (دو اسلام ص ۵۳)

**ازالہ** احادیث سے مراد یہاں کہانیاں یا علماء کے اقوال ہیں کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ اسی روایت میں آگے فرماتے ہیں کہ اہل کتاب اسی لئے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ مزید برآں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ احادیث رسول اللہ کو بھی کتاب اللہ کہتے تھے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ثابت کیا جا چکا ہے لہذا اس روایت میں احادیث سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نہیں ہیں۔

**غلط فہمی** برق صاحب تحریر کرتے ہیں :- ”صنّاک بن مزاحم فرمایا کرتے تھے وہ زمانہ جلد آرہا ہے، جب احادیث کی کثرت ہو جائے گی۔ لوگ کتاب الہی کو ترک کر دیں گے۔ مکڑیاں اس پر جالے تنیں گی“ (دو اسلام ص ۵۳)

**ازالہ** برق صاحب آج تک تو ایسا ہوا نہیں، سنئے یہ روایت سرتاپا جھوٹ ہے، بہتان عظیم ہے، اس کی سند میں سیف بن ہارون برجمی ضیف، متروک الروایہ ہے۔ امام ابن حبان کہتے ہیں۔ یہ جھوٹی روایتیں نقل کرتا ہے۔ دوسرا راوی احمد بن ہارون کذاب ہے (برق اسلام ص ۶۲)

**غلط فہمی** برق صاحب نے ص ۵۵ پر ابن مسعودؓ کا وہ واقعہ دوبارہ نقل فرمایا ہے جس میں ہے کہ انہوں نے احادیث کو دھو ڈالا تھا۔



اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے مزید برآں جیہ روایت مشکوک ہے۔ اس کی سند میں **ازالہ** دوراوی مدّس ہیں اور وہ عن سے روایت کرتے ہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** ”جویر بن عبد الحمید کہتے ہیں کہ منصور، مغیرہ اور الاعمش جیسے محدثین کتابتِ حدیث کو گناہ سمجھتے تھے“ (ص ۵۵)

یہ روایت بھی بالکل جھوٹی ہے اس کی سند میں عمر بن محمد جمحی مجہول ہے کسی کتاب میں اس کا ترجمہ نہیں ہے (برق اسلام ص ۱۱)

**غلط فہمی** ”قرظہ بن کعب کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم عراق کو روانہ ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ مقام حرات تک ہمارے ساتھ آئے۔ وہاں نماز ادا کی پھر فرمایا دیکھو میں ایک نہایت اہم بات کہنے کے لئے تمہارے ہمراہ آیا ہوں اور وہ یہ کہ عراق کی سر زمین سے تلاوتِ قرآن کی سُری آوازیوں اُٹھ رہی ہے جیسے چھتے کے ارد گرد شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ خدا کے لئے انہیں احادیث میں پھنسا کر قرآن سے دور نہ پھینکنا“ (دو اسلام ص ۵۶)

یہ روایت ضعیف ہے اس کی سند منقطع ہے۔ شعبی نے اس کو قرظہ سے روایت کیا ہے اور ان دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی (برق اسلام ص ۱۲)

۲ :- عقلاً بھی یہ محال ہے اس لئے کہ عراقی برائے نام مسلم تھے، نہ انہیں قرآن مجید سے محبت تھی نہ حدیث سے۔ وہ توفتنہ پرور اور دین کے دشمن تھے۔ (ملاحظہ ہو کتب حدیث اور کتب تاریخ)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** ”رحلت حضورؐ سے صرف تین برس پہلے حضرت ابوہریرہؓ مشرف باسلام ہوئے تھے لیکن روایاتِ احادیث میں سب سے بازی لے گئے۔“ (دو اسلام ص ۵۶)

**ازالہ** اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس کا جواب انہوں نے خود دے دیا ہے۔ وہ یہ کہ ”مہاجرین و انصار اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور میں ہمہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا لہذا جو کچھ وہ نہ سُن سکے، میں نے سُن لیا“ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق برق صاحب لکھتے ہیں :-



**غلط فہمی** | ایک مرتبہ پٹے بھی یکن روایت سے باز نہ آئے، واقعہ یوں ہے کہ آپ رسول اکرم صلم کے ہاں تشریف لے گئے، حضورؐ نے فرمایا کہ ابوہریرہؓ جا اور ہر اس شخص کو جنت کی بشارت دے دے جس نے زبان سے لا الہ کہہ دیا ہو۔ ابوہریرہؓ باہر نکلے تو سب سے پہلے حضرت عمر بن الخطابؓ سے ملاقات ہوئی اور یہ بشارت سنائی۔ عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو ایک زور کا تھپتھپ رسید کیا۔ ابوہریرہؓ روتے ہوئے دربار رسالت میں پہنچے۔ پیچھے پیچھے عمرؓ بھی پہنچ گئے۔ حضورؐ نے پوچھا اسے کیوں پٹیا ہے، کہا کیا آپ نے صرف لا الہ کہنے پر جنت کی بشارت دی ہے۔ فرمایا ہاں۔ عمرؓ نے کہا ازراہ نوازش ایسا نہ کیجئے ورنہ تمام لوگ اعمال ترک کر دیں گے فحلم یعملون (آپ لوگوں کو کام کرنے دیں) حضورؐ نے فرمایا تو بہت اچھا، لوگوں کو کہہ دو کہ کام کریں (دو اسلام ص ۵۶-۵۷)

**ازالہ** | برق صاحب اصل واقعہ تو اس طرح نہیں، جس طرح آپ نے نقل فرمایا ہے۔ آپ نے صحیح مسلم کا حوالہ دیا ہے اور اسی سے میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہؓ سے فرمایا :-

مَنْ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبًا قَبَشِيرًا  
بِالْجَنَّةِ  
جو شخص اس بات کی شہادت دے کہ  
اللہ کے سوا کوئی حاکم و معبود نہیں اور اس  
پر اسے دلی یقین ہو تو اس کو جنت کی

(صحیح مسلم) بشارت دے دو۔

یعنی صرف زبان سے کہنا کافی نہیں بلکہ دلی یقین ہونا بھی شرط ہے برق صاحب اس حدیث کا یہ ٹکڑا بالکل قرآن مجید کے مطابق ہے، قرآن مجید میں ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا  
تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا  
وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي  
كُنْتُمْ تُوعَدُونَ  
جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے  
اور اسی پر جمے رہے ان پر فرشتے نازل  
ہوتے ہیں اور کہتے ہیں نہ ڈرو، نہ غم  
کو اور تم کو خوشخبری ہو اس جنت کی جس

(بحم السجدة :- ۳۰) کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

لہذا برق صاحب کا یہ فرمانا کہ "کتنی دلچسپ حدیث ہے صرف دو لفظ لا الہ منہ سے نکالو اور جنت لے لو، نہ صوم و صلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جنگ میں لہو بہانے کی حاجت" (دو اسلام ص ۵۷) دراصل قرآن مجید پر اعتراض ہے کیونکہ قرآن مجید میں بھی یہی ہے کہ صرف دو لفظ



”رَبَّنَا اللَّهُ“ منہ سے نکالو اور جنت لے لو۔ آیت میں جو کلمہ ”ثُمَّ اسْتَغْفَرُوا“ ہے وہ بالکل حدیث کے الفاظ ”مُسْتَقْبِلًا بِهَا قُلُوبُهُ“ کے قائم مقام ہے یعنی دل میں یہ چیز بیٹھ گئی کہ اللہ ہی اللہ ہے دوسرا کوئی اللہ نہیں تو پھر جنت مل گئی۔ استقامت اور ایمان قلبی یہی وہ چیزیں ہیں جو خود اعمال کی طرف دعوت دیتی ہیں اور ان ہی چیزوں کی موجودگی میں عمل کا موجود ہونا لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے لہذا نہ حدیث میں عمل کی نفی ہے نہ آیت میں۔ ہاں غلط فہمی ہو سکتی ہے۔

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو اس خوشخبری کا اعلان کرنے کے لئے روانہ کیا۔ حضرت ابوہریرہؓ روانہ ہوئے تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے وہ بشارت سنائی۔ حضرت عمرؓ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا، جس سے وہ گر پڑے پھر فرمایا، اے ابوہریرہؓ واپس چلو۔

برق صاحب نے ان الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ پٹ گئے حالانکہ سینہ پر ہاتھ مارنے کی غرض مارنا نہیں تھا بلکہ واپس چلنے کے لئے تنبیہ تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس قوت کو برداشت نہ کر سکے کیونکہ اکثر اوقات بھوکا رہنے کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ انہوں نے فاقہ کشی اور اس کی وجہ سے اکثر اوقات خود بخود گر جانے کو خود ہی بیان کیا ہے (کتب حدیث) حضرت عمرؓ کی نیت ان کو گرانے یا زکوٰۃ کو بکرنے کی نہ تھی اور اسی وجہ سے دربار رسالت میں اس بات پر جواب طلب نہ ہوا نہ قصاص لیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن مجید میں مذکور ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک تختہ مار کر ایک قبیلے کو قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی نیت قتل کرنے کی نہ تھی لیکن یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تختہ کی تاب نہ لاسکا اور مر گیا اور اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ حضرت عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ کو احادیث کی روایت پر مارا کرتے تھے تو یہ قصور حضرت عمرؓ کا ہو سکتا ہے نہ کہ حضرت ابوہریرہؓ کا۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے اس حدیث کی روایت پر مارا جو حقیقتاً صحیح تھی اور صحیح بات پر مارنا، مارنے والے کا قصور ہوتا ہے نہ کہ بیان کرنے والے کا، لیکن برق صاحب اس کو حضرت ابوہریرہؓ کے قصور کے اثبات میں نقل فرما رہے ہیں اور یہی غلط فہمی ہے۔

الغرض حضرت ابوہریرہؓ واپس ہوئے اور حضرت عمرؓ کی شکایت کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، اے عمرؓ! تم نے انہیں کیوں مارا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ، کیا آپ نے بشارت کا اعلان کرنے کے لئے ابوہریرہؓ کو بھیجا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا، ایسا نہ کیجئے مجھے ڈر



ہے کہ کہیں لوگ اس پر پھروسہ نہ کر لیں۔ آپؐ انہیں چھوڑ دیجئے تاکہ عمل کرتے رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا انہیں چھوڑ دو (صحیح مسلم)

یہ حدیث حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ دونوں نے سنی لیکن ان میں سے کسی نے نہ نماز چھوڑی نہ جہاد، اس لئے کہ وہ اس حدیث کی صداقت کے ساتھ اس کی منشاء سے بھی واقف تھے بلکہ اسی مضمون کی حدیث متعدد صحابہ سے مروی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ تارک الصلوٰۃ تھا اور نہ تارک الجہاد۔ ان کو اس حدیث نے غلط فہمی میں مبتلا نہ کیا مہتاً بلکہ وہ اس کی رمز سے واقف تھے۔ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی اور وہی غلط فہمی ہوئی جس کا اندیشہ حضرت عمرؓ کو ہوا تھا حضرت عمرؓ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی سعی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مشورہ کو قبول فرمایا کہ اصل غلط فہمی کے انداد کے لئے اشاعت عام سے روک دیا تاکہ نااہل اور نا فہم لوگ گمراہ نہ ہو جائیں۔

اس حدیث پر مزید اعتراض کرتے ہوئے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-  
**غلط فہمی** ”مذہب کے معاملہ میں حضرت فاروق سرور کائنات کی راہنمائی فرما رہے ہیں“ (دو اسلام صفحہ ۵)

**ازالہ** برق صاحب ہر کام کی ایک مصلحت ہو کر تھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو۔ اس حدیث کی اشاعت اور پھر اس کی روک تھام میں کیا مصلحت تھی۔ اللہ ہی جانتا ہے۔ مشورہ آپؐ نے اس لئے قبول فرمایا کہ اس کی مصلحت کو آپؐ بھی جانتے تھے۔ مشورہ کو قبول کرنے سے ایک چھوڑا، دو دینی سنتوں کا قائم کرنا مقصود تھا۔

۱۔ اگر کسی خبر کی اشاعت سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا اور اس کی وجہ سے گمراہ ہونے کا خوف ہو تو اس خبر کی اشاعت خلاف سنت ہوگی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی کم درجہ کا آدمی بھی کوئی شخص صحیح مشورہ دے تو اس کے مشورہ کو قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرنا چاہیئے اور اگر ایسے موقع پر کوئی شخص صحیح مشورہ قبول نہ کرے تو وہ سنت کا مخالف ہوگا بلکہ اس کا یہ فعل تجبر اور ہٹ دھرمی کی تعریف میں آئے گا۔

غرض یہ کہ کم از کم دو سبق تو ہمیں اس حدیث سے ملتے ہیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حدیث کو بیان ہی نہ کرتے تو نہ یہ حدیث علماء راہبیں کو ملتی نہ یہ اسباق حاصل ہوتے۔

اب رہا یہ اعتراض کہ حضرت عمرؓ جس نتیجہ پر پہنچے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔ یہ بھی صحیح نہیں، ہم یہ نہیں کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کو نہ جانتے



تھے لیکن مشورہ کی سنت کو قائم کرنا بھی ضروری تھا اور یہ معاملہ اسی طرح مقدر تھا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اس کی مثال قرآن مجید سے سنئے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں کیا ہے لیکن پھر بھی پوچھتا ہے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ۔ اے موسیٰ! یہ ہتھارے ہاتھ میں کیا ہے؟

(رطہ: ۱۷)

یہاں موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کہلوانا مقصود تھا اس سے اللہ تعالیٰ کی لامعلیٰ ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اس میں کوئی مصلحت ضرور تھی جس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کتنا ہے ہمیں اختیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں دخل دیں اور اس کی مصلحتوں کی بے ضرورت چھان بین کریں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید کی مزید چند آیات درج ذیل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے اس قصہ میں ہے کہ حضرت خضر نے ایک معصوم بچے کو قتل کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بطور اعتراض فرمایا:-

أَقْتَلْتُ نَفْسًا ذَكِيَّةً لِّغَيْرِ نَفْسٍ  
لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا ذُكْرًا۔

یہ آپ نے کیا کیا کہ ایک معصوم  
لڑکے کو بغیر کسی قصاص کے قتل کر  
دیا۔ یہ تو آپ نے بہت ہی برا کیا

(الکہف: ۷۲)

انہوں نے اس اعتراض کا جو کچھ جواب دیا اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں سنئے۔

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ  
فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا  
وَفُكْرًا۔

اور اس لڑکے کو اس لئے قتل کیا گیا کہ  
اس کے ماں باپ مؤمن تھے۔ پس ہم  
ڈرے کہ وہ ان دونوں کو سرکش اور کفر

میں مبتلا نہ کر دے۔

(الکہف: ۸۰)

دنیا میں سینکڑوں ماں باپ اپنے بچوں کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی خاطر ان کی اولاد کو قتل نہیں کراتا۔ پھر اس بچہ کو کیوں قتل کرایا؟ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی۔ حدیث زیر بحث کی اشاعت کو حضرت عیسیٰ کے مشورہ سے روکنا منظور تھا اور لڑکے کو پیدا کر کے ہی قتل کرنا مقدر تھا مصلحت وہ جانے ہم تو یہ کہتے ہیں کہ "أَمَّا بِنَا"۔



مندرجہ بالا آیات تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور ہمارے ظاہری اعتراض کی وضاحت کیلئے پیش کی تھیں۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ مشورہ قبول فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِذْ هَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَفَرٌ ذَلِيلٌ (طہ: ۲۷)  
اے موسیٰ فرعون کے پاس جاؤ وہ کفری میں مبتلا ہے  
موسیٰ علیہ السلام مشورہ دیتے ہیں:-

وَأَجْعَلْ لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۚ هَارُونَ أَخِي ۚ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۚ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۚ (طہ: ۲۹ تا ۳۲)  
”اے اللہ میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا  
دے اور مجھے اس کے ذریعہ قوت عطا فرما  
اور اس کو میرے کام میں شریک  
کر دے۔“

بلکہ موسیٰ علیہ السلام یہاں تک کہہ گئے:-

وَيُضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَايَ فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ (الشعراء: ۱۳)  
میرا سینہ تنگ ہوتا ہے میری زبان بھی رکتی ہے  
اس لئے ہارون کو بھی مضرب رسالت دے دے  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

قَدْ أَوْثَقْنَاكَ يَا مُوسَىٰ (طہ: ۱۰)  
اے موسیٰ تمہاری دعا قبول کی گئی۔

ان آیات کو پڑھنے کے بعد کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہیں تھا کہ یہ کام تنہا موسیٰ علیہ السلام کے بس کا نہیں۔ اس میں ہارون علیہ السلام کی وزارت اور رسالت کی بھی ضرورت ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے توجہ دلائی اور مشورہ دیا تو اللہ تعالیٰ کو بھی خیال آیا کہ ہاں ٹھیک ہے ایسا ہی ہونا چاہیے یقیناً ہم ایسا نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت کو اللہ ہی جانتا ہے کہ ہارون علیہ السلام کو رسول بنانا، موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ پر کیوں موقوف تھا اور حدیث زیر بحث کی اشاعت کو حضرت عمرؓ کے مشورہ سے روکنا کیوں ضروری تھا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے صحیح مشورہ کو قبول فرمالیتا ہے تو نبی پر کیا اعتراض ہے اگر وہ اپنے ایک امتی کے مشورے کو قبول فرمالے، لاعلمی کا اعتراض نہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے نہ اس کے رسول پر۔

حدیث زیر بحث پیش کر کے سبق صاحب کا نتیجہ نکالنا کہ حضرت عمرؓ نے

حضرت ابوہریرہؓ کو حدیث بیان کرنے پر مارا تھا کسی طرح صحیح نہیں، نہ یہ

صحیح ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عمرؓ کے خوف سے حدیث بیان نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حضرت عمرؓ تو خود حدیث کے متلاشی رہتے تھے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ حضرت عمرؓ کی موجودگی میں۔ ﷺ بقول

**خلاصہ**



برق صاحب ”اکڑ کر اور چھاتی تان کر“ (دو اسلام ص ۵۲) احادیث بیان کرتے تھے، سینے پر۔

اَتَى عُمَرُ بِأَمْدَةٍ تَشْمُ فَقَالَ  
اُشْهِدْكُمْ بِاللَّهِ هَلْ سَمِعَ أَحَدٌ  
مِنْكُمْ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ فَقُمْتُ  
فَقُلْتُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ إِنَّا  
سَمِعْنَاهُ قَالَ فَمَا سَمِعْتَهُ  
قُلْتُ سَمِعْتُهُ يَقُولُ لَا تَشْمَنَّ  
وَلَا تُسْتَوْشَمَنَّ ه

حضرت عمرؓ کے پاس ایک عورت لائی  
گئی جو بدن گودتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے  
فسد مایا میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں،  
کیا تم میں کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے  
اس سلسلہ میں کچھ سنا ہے۔ حضرت  
ابو ہریرہؓ کہتے ہیں میں کھڑا ہو گیا اور میں  
نے کہا، اے امیر المؤمنین! میں نے سنا ہے  
حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے کیا سنا ہے؟  
حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا۔ آپ کو یہ فرماتے سنا  
ہے نہ گودا جائے نہ گد دیا جائے۔

ر نسائی۔ کتاب النیۃ جلد دوم  
۲۳۸۔ ورواۃ ثقات، تقییبے)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

**غلط فہمی**

”میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ اس قسم کی احادیث تراشا  
کرتے تھے بلکہ یہ ہے کہ یار لوگ گھڑ کر ان کے نام جڑ دیتے تھے (دو اسلام ص ۵۸)۔  
یہ یار لوگ کون تھے؟ اگر واقعی یہ یار لوگ تھے تو محدثین نے ان کو گرفت  
ازالہ میں لے لیا اور ان کی پوری قلعی کھول دی ہے اور اگر یہ ائمہ دین تھے تو

اعتراض ہی کیا ہے؟

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

**غلط فہمی**

”اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابو ہریرہؓ خود بھی روایت میں قدرے غیر  
محتاط واقع ہوئے ہوں علامہ قسبی نے ان کا یہ فقرہ نقل کیا ہے۔ ابو ہریرہؓ فرماتے  
ہیں کہ ”میں نے ایسی ایسی احادیث بیان کی ہیں کہ اگر عمر بن خطاب کے زمانے میں  
بیان کرتا تو وہ مجھے دُڑے سے پیٹ ڈالتے۔ کیوں پیٹ ڈالتے؟ سرور کائنات  
کا اسوہ بیان کرنے پر، کیا کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے، نہیں۔ بلکہ مشتبہ  
احادیث کی روایت پر (دو اسلام ص ۵۸)

یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ قدرے غیر محتاط تھے۔ ان کو تمام احادیث

**ازالہ**

حفظ محققین اور پھر ان کو لکھ بھی رکھا تھا (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)۔  
حدیث سناتے تھے اور پھر بتاتے تھے کہ دیکھو یہ اسی طرح میرے پاس لکھی ہوئی بھی ہے



لہذا یہ کہنا کہ وہ قدرے غیر محتاط تھے۔ قطعاً صحیح نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

لو كنت احدث في زمان عمر  
مثل ما احدثكم لضربى بمخففة  
اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس  
کثرت سے حدیث روایت کرتا جتنی اب  
(برق اسلام ص ۳۶)  
کرتا ہوں تو وہ مجھے دُڑے سے مارتے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ بموجب فرمان نبویؐ کثرت روایت سے روکتے تھے، اس لئے کہ سننے والے کو یاد نہیں رہتیں۔ نہ یہ کہ مطلقاً حدیث کی روایت سے روکتے تھے۔ یہ تو کسی طرح صحیح نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ یا دیگر صحابی مشتبہ احادیث روایت کرتے تھے، مشتبہ کہنے کی آخر کوئی وجہ تو ہونی چاہیے آخر صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی اور راوی تھے جن کی وجہ سے روایتیں مشتبہ تھیں۔ ہرگز نہیں یہ چیز عقلاً محال ہے۔ لہذا حضرت عمرؓ کا مشتبہ حدیثوں کی بناء پر تشدد کرنا صحیح نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ کسی شخص میں یہ جرات پیدا نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جو چاہے منسوب کر دے اور اسی وجہ سے وہ صحابہ کے ساتھ بھی سختی کرتے تھے تاکہ منافقین یا اور لوگوں کو افتراء کا موقع کا نہ ملے اور وہ عبرت پکڑیں اور یہ سب کچھ حدیث کی تخلص کے لئے تھا نہ کہ حدیث دشمنی کی خاطر۔ اس کی مثال کے لئے مندرجہ ذیل واقعہ ملاحظہ ہو اس واقعہ کو برق صاحب نے بھی اعتراضاً ۵ پر نقل فرمایا ہے)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے مکان پر گئے۔ تین دفعہ سلام کیا لیکن اجازت نہ ملی تو واپس چلے آئے۔ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے اس لئے اجازت نہ دے سکے۔ جب کام سے فارغ ہوئے تو کہا بلاؤ حضرت ابو موسیٰؓ کو واپس بلایا گیا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے واپس چلے جانے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

اِذَا اسْتَاذَنَ اَحَدُكُمْ ثَلَاثًا فَلَمْ يُؤْذَنَ  
لَهُ فَلْيَرْجِعْ،  
جب تم میں سے کوئی تین دفعہ اجازت  
طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے، تو

واپس چلا جائے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

اس پر گواہ پیش کرو ورنہ تمہیں سزا دوں گا

اَقِمْ عِيَةَ الْبَيْتَةِ وَالْاَوْفِئْتُكَ

اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

اِيَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الْحَدِيثِ عَنِّي رواہ احمد وسندہ صحیح بلخی لابی حمزہ اشعریؓ کے ساتھ حدیث مان کرنے سے بچو



حضرت ابو موسیٰؓ وہاں سے پریشان حالت میں انصار کی ایک مجلس میں پہنچے اور ان سے اس کی تصدیق چاہی۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا، ان کے ساتھ ہماری قوم کا سب سے چھوٹا آدمی جائے گا۔ مطلب حضرت ابی بن کعبؓ کا یہ تھا کہ بچہ بچہ کو یہ حدیث حفظ ہے اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ (الغرض حضرت ابوسعید خدریؓ ان کے ساتھ آئے اور گواہی دی۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے بطور انوس فرمایا:-

خَفِيَ عَلَىٰ هَٰذَا مِنْ أَمِيرِ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْهَانِ عَنَّهُ  
الْقَنْقُ بِأَلَا سَوَاقِ  
حضرت ابی بن کعبؓ نے اسی موقع پر حضرت عمرؓ سے کہا۔ یہ حدیث میں نے بھی سنی ہے۔ پھر  
فرمایا اے ابن خطاب :-

فَلَا تَكُونُوا عِدَايَا عَلَى أَصْحَابِ رَسُولِ  
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
حضرت عمرؓ نے معذرتا فرمایا۔

سُبْحَانَ اللَّهِ إِنَّمَا سَمِعْتُ شَيْئًا  
فَأَحْبَبْتُ أَنْ أَتَشَبَّهَ (صحیح مسلم باب  
الاستیذان) لَا أَكُونُ عَبْدًا عَلَى أَهْلَ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
(ابوداؤد ورواہ ثقاة تقریب)

یعنی میری منشا کچھ اور ہی ہے۔ حضرت عمرؓ کی منشا کیا تھی۔ وہ حضرت عمرؓ ہی کے الفاظ میں سنئے۔ حضرت عمرؓ نے اسی موقع پر حضرت ابو موسیٰ سے معذرتاً اور ان کی دلجوئی کی خاطر فرمایا تھا:-

إِنِّي لَمْ أَكْهَمْكَ وَلَكِنَّ الْحَدِيثَ عَنْ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
شَدِيدٌ وَفِي رِقَايَةٍ وَلَكِنْ خَشِيتُ  
أَنْ يَتَقَوْلَ النَّاسُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
(القول في هذه كتاب الادب



ورواتہما لا باس  
خوف ہوا کہ کہیں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کی طرف جھوٹ بات بنا کر منسوب نہ کرنے لگیں۔

یعنی لوگ عبرت پکڑیں کہ صحابہ کرام پر اس معاملہ میں سختی ہوتی ہے تو ہمارا نہ معلوم کیا  
ہوگا، کیا سزا ملے گی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کیوں سختی کرتے تھے۔ اس طے نہیں  
کہ وہ حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس لئے کہ جو بھی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب  
ہو وہ اپنے طریقہ سے ثابت شدہ اور قطعی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دھیل کی بنا پر سر کس و ناکس رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات منسوب کر دے اور اسے یہ خیال و ڈر بھی نہ ہو کہ گواہی  
کی ضرورت پیش آئے گی اور ثبوت مہیا کرنا پڑے گا۔ اس حدیث کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ  
حضرت عمرؓ کے زمانہ تک کسی شخص کو حدیث بنانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ لہذا حضرت عمرؓ کے زمانہ  
میں گٹری ہوئی حدیث کا وجود یا مشتبہ احادیث کا پایا جانا محض وہم ہے اور بعد میں بلکہ بہت بعد میں  
جن لوگوں نے حدیثیں بنائیں وہ پنج کرنسیں نکل سکے۔ فن حدیث نے پوری طرح ان کا تعاقب  
کیا اور ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ برق صاحب یہ ہیں صحیح و معتبر احادیث جن کو اوپر نقل کیا گیا،  
اور یہ ہے حضرت عمرؓ کا طرز اور اہتمام تحفظ حدیث، ہم تو صحیح احادیث پیش کر کے آپ کی غلط فہمی  
کو دور کرتے ہیں اور آپ محض تاریخی اقتباسات پیش کرتے رہتے ہیں جن کا کوئی اعتبار نہیں جیسا  
کہ ہم نے پہلے ہر روایت کو موضوع یا نام معتبر ثابت کر دیا۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی احادیث کے مقابلہ میں  
تذکرۃ الحفاظ یا اسی قسم کی دوسری کتابوں کی روایات پیش کرنا جن کی سند میں مغتری و معمول راوی ہوں کسی  
طرح زیبا نہیں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے (بشرطیکہ یہ قول ان کا تسلیم کر لیا  
جائے) کیوں یہ گمان کیا کہ حضرت عمرؓ مجھے مارتے، اس لئے کہ ان کے سامنے یہ واقعہ موجود تھا اور وہ  
ڈرتے تھے کہ کہیں حدیث بیان کر دوں اور گواہ نہ ملے تو ممکن ہے کہ سزا ملے حالانکہ حضرت عمرؓ کا  
منشا مارنا نہیں تھا بلکہ حدیث کی حفاظت کے لئے لوگوں کو ہوشیار کرنا تھا جیسا کہ حضرت ابی بن  
کعبؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کو جو مذکورہ بالا جوابات انہوں نے دئے ان سے ظاہر ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** ہمارے موجودہ علما میں ایک دو خرابیاں بھی ہیں اول کہ ملکہ تنقید  
سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح و غلط میں تمیز نہیں کر سکتے۔ دوم۔ وہ اسلاف  
پرستی اور اندھی تقلید کے امراض میں مبتلا ہیں (دو اسلام ص ۵۹)

یہ صحیح نہیں کہ ملکہ تنقید سے علماء بالکل بے بہرہ ہیں معافی قریب میں ایسے  
**ازالہ** لوگ گند چکے ہیں جن کو فن تنقید میں کافی مہارت تھی اور بہت سے علماء اب



بھی موجود ہیں جو سندوں پر ناقذانہ نظر ڈال سکتے ہیں بلکہ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ برق صاحب کو ان کا علم نہ ہو۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ ہمارے تمام علماء اسلاف پرستی اور اندھی تقلید کے امراض میں مبتلا ہیں بلکہ ایسے بہت سے علماء موجود ہیں جو اندھی تقلید سے کلیتہً بیزار ہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | شیخ عبدالحق دہلوی لاکھ چلاٹیں کہ صحاح میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے۔  
(دو اسلام ص ۵۹)

یہ کس نے کہا ہے کہ صحاح میں صرف احادیث ہیں، نہیں بلکہ دوسروں کے اقوال بھی ہیں،  
**ازالہ** | مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ صحیح احادیث کے متن میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے،  
یہ قطعاً صحیح نہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | علامہ ابن حجر ہزار کہیں کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث جھوٹی ہیں۔  
(دو اسلام ص ۵۹)

یہ بالکل غلط ہے، علامہ ابن حجر نے یہ کہیں نہیں کہا، جس شخص نے ایسی عبارت نقل  
**ازالہ** | کی ہے، اس نے یا تو دھوکہ دیا ہے یا دھوکہ کھایا ہے۔ ابن حجر کا حاشا و کلام ایسا کوئی قول  
نہیں، ابن حجر تو صحیح بخاری کی ہر حدیث کو قطعی الصحت سمجھتے ہیں۔ (فیض الباری شرح صحیح بخاری جلد  
اول ص ۴۵)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | شیخ حمید الدین فراہی بے شک کہتے پھر ہیں۔ میں نے صحاح میں ایسی  
احادیث دیکھیں جو قرآن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ ہم اس عقیدہ سے پناہ مانگتے ہیں کہ کلام رسول  
کلام خدا کو منسوخ کر سکتا ہے (دو اسلام ص ۶۰)

فراہی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ قطعاً صحیح نہیں۔ وہ حدیث کو سمجھے ہی نہیں اور  
**ازالہ** | اسی لئے انہوں نے اس کو قرآن مجید کے خلاف سمجھا۔ پھر فراہی صاحب نہ خود محدث

ہیں نہ صحیح العقیدہ، لہذا ان کا قول ساقط الاعتبار ہے۔ صحاح میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں جو قرآن مجید  
کے خلاف ہو یا قرآن مجید کی کسی آیت کو منسوخ کرتی ہو، مزید برآں فراہی صاحب کا اللہ تعالیٰ کے  
کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو علیحدہ سمجھنا بھی غلطی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کی حدیث بھی اصل میں اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے لہذا احکم ہول سے حکم الہی کا منسوخ ہونا بعید از



عقل نہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ایک مرتبہ صحابہ کرام نے رسول اللہ سے التجا کی حد ثنا کوئی حدیث بیان فرمائیے تو جھٹ یہ آیت نازل ہوئی اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا۔۔۔ اللہ نے قرآن نازل کیا ہے اور یہی بہترین حدیث ہے دوبارہ کہا حَدِّثْنَا شَیْئًا دُوْنَ الْقُرْآنِ (قرآن کے بغیر کوئی اوس بات سنائیے) تو سورہ یوسف اترنے لگی۔ (دوا سلام ص ۶۰)

**ازالہ** | برق صاحب نے پورے الفاظ نقل نہیں کئے۔ پورے الفاظ اس طرح ہیں۔ حَدِّثْنَا حَدِّثْنَا حَدِّثْنَا دُوْنَ الْقُرْآنِ یعنی حدیث و قرآن کے علاوہ کچھ سنائیے (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۶) ان الفاظ کے ہوتے ہوئے اعتراض کا لعدم ہے۔  
۲۔ مزید برآں "حَدِّثْنَا" کا ترجمہ یہ کرنا کہ حدیث بیان کیجئے صحیح نہیں، ہاں حَدِّثْنَا سے مراد یہ ہے کہ کوئی قصہ کہانی سنائیے اور یہ چیز صراحتاً بیان ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت سعدؓ کی روایت میں ہے:-  
لَوْ قَصَصْتَ عَلَيْنَا کاش آپ ہمیں کوئی کہانی سناتے۔  
حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے:-

لَوْ قَصَصْتَ عَلَيْنَا (تفسیر ابن کثیر) کاش آپ ہمیں کوئی قصہ سناتے  
۱۳۔ یہ قصہ نامعتبر ہے اس لئے کہ سورہ یوسف مکی ہے اور مکی زندگی میں قصے کہانیوں کا مطالبہ روئے قیاس نہیں۔ اس زمانہ میں تو توحید اور شرک کے درمیان ہنگامہ خیز کشمکش جاری تھی، کسے ہوش تھا کہ توحید کے علاوہ کسی اور چیز کی معلومات کا مطالبہ کرتا۔

دفاعہ بن رافع کہتے ہیں کہ میں نے یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ ہی میں سنی تھی۔ میں مکہ میں اسلام لایا۔ لوگ مجھے دیوانہ کہنے لگے (مستدرک حاکم ملخصاً وسندہ جید۔ تفسیر احسن التفامیر) مزید برآں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ کہانی کا مطالبہ کرنا نہ صحابہ کرام کو زیب دیتا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان ہے۔

۱۴۔ اس قصہ کے نامعتبر ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ سورہ یوسف بعض لوگوں کے کسی سوال کے جواب میں نازل ہوئی، نہ کہ قصہ کہانی سنانے کی درخواست پر۔  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِّلسَّاعِلِينَ (یوسف: ۷۵)  
یوسف اور انکے بھائیوں کے قصہ میں سوال کرنے والوں کے لئے یقیناً بہت سی (عبرت کی) نشانیاں ہیں



برق صاحب نے سورہ یوسف کا جو شان نزول نقل کیا ہے وہ قرآن مجید کے بیان کردہ شان نزول کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے۔

برق صاحب نے حضرت سفیان ثوری، امام سفیاری بن عیینہ اور بکر بن حماد شاعر کے اقوال نقل کئے ہیں جن کا مضمون واحد ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث اچھی چیز نہیں اگر اچھی چیز ہوتی تو اچھی چیزوں کی طرح کم ہوتی جاتی، لیکن یہ تو بڑھ رہی ہے لہذا بری چیز ہے۔ (دو اسلام ملخصاً ص ۱)

۱۔ حضرت سفیان ثوری کی طرف جو قول منسوب ہے وہ بالکل کذب و افتراء ہے اس کی سند میں اسحاق بن ابراہیم بن نعمان مہمل ہے دوسرا راوی محمد بن علی بن مروان بھی مہمل ہے۔ تیسرا راوی علی بن جمیل زلی کذاب ہے جو جھوٹی روایتیں نقل کیا کرتا تھا (برق اسلام ص ۶) سفیان ثوری سے حدیث اور اصحاب الحدیث کی تعریف میں متعدد اور اسناد اقوال منقول ہیں جن کا نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ تفصیل کے لئے برق اسلام ملاحظہ فرمائیں۔ سفیان ثوری بہت بڑا محدث ہیں اور حدیث ہی کی وجہ سے ان کی عزت ہے۔

۲۔ امام سفیان بن عیینہ کی طرف جو قول منسوب ہے وہ بھی کذب و افتراء ہے۔ اس کی سند میں محمد بن سلیمان بن ابی شریف اور زکریا تطلان مہمل غیر معتبر ہیں اور محمد بن موسیٰ کئی ہیں معلوم نہیں یہ کون سے ہیں گویا سلسلہ رواۃ ہی وہی تباہی ہے (برق اسلام ص ۷) دوسرے یہ کہ حضرت سفیان بن عیینہ بھی بہت بڑے محدث ہیں اور حدیث کے ائمہ میں سے ہیں۔

۳۔ بکر بن حماد شاعر کے قول کی ہمیں پرواہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَلَاظُ ۚ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ  
فِي كُلِّ وَادٍ يَمِيمُونَ ۚ (الشُّعْرَاءُ ص ۲۲۲-۲۲۵)

اس آیت کی روشنی میں شعراء کی بات ماننے والے گمراہ ہوتے ہیں لہذا ہمیں بکر بن حماد کے قول سے دوسرا دھنا چاہیے۔ پھر یہ قول کہ غیر کم ہوتی جاتی ہے اور بڑائی بڑھتی رہتی ہے، کلیتہً صحیح نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ  
الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۚ (بقرہ ص ۸۱)

جو خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نازل ہوئی وہ بڑھتے بڑھتے کمال کو پہنچ گئی، صحابہ کرام کے ایمان کا زیادہ ہوتے رہنا خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

غلط فہمی | بشیر بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے ابو خالد الاسمر الکوفی (وفات ۱۹۶ھ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایسا زمانہ بھی آ رہا ہے کہ لوگ قرآن شریف کو ایک طرف رکھ دیں



گے اور احادیث کی تلاش میں نکل چیں گے، ” (رد و اسلام ص ۶۲)

یہ قول بھی نامعتبر ہے، اس کی سند میں دو راوی غمخوش ہیں۔ ایک عبداللہ بن  
**انزالہ** محمد بن عبدالمؤمن جن کا ضبط تحریر بہت کمزور تھا تاریخ اندلس علماء ابن الغرضی  
 جلد اول ص ۲۸۸، دوسرا راوی عبدالباقی بن قانع ہیں۔ یہ آخر میں محکم ہو گئے تھے معلوم نہیں جلالہ  
 بن محمد نے یہ روایت ان سے کب سنی تھی۔

آگے چل کر برق صاحب اور ادو وظائف اور اللہ کے ذکر کے فضائل پر اعتراض  
غلط فہمی کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں

”جو شخص دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ و الحمد للہ کا ورد کرے گا اس کی تمام سیاہ کاریاں معاف ہو جائیں گی خواہ وہ سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ پہلے (اور اسلام سے پہلے) از اللہ | اس غلط فہمی کے کئی جواب ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

**پہلا جواب** | وَمِنْ مَّجْلَىٰ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ الذَّلِيلِ ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے ہیں یعنی نر اور مادہ، اچھے اور برے، اگر ہر پیدا کیا ہے تو ساتھ ہی تریاق بھی پیدا کیا ہے۔ اگر ضرر ریاں جراثیم پیدا کئے ہیں تو ساتھ ہی ان کی مدافعت کرنے والے اور ان کو فنا کرنے والے جراثیم بھی پیدا کئے ہیں۔ کروڑوں نقصان ریاں جراثیم ہمارے جسم پر ہر لحظہ حملہ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمارے جسم کے نفع بخش جراثیم ان کو پسپا کر کے ہلاک کر دیتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ضرر ریاں جراثیم کا غلبہ ہوتا ہے اور ہم بیمار ہو جاتے ہیں پھر ان ضرر ریاں جراثیم کے غلبہ کو توڑنے کے لئے دوا استعمال کرنی پڑتی ہے، غرض یہ کہ ساری کائنات میں یہی چیز کارفرما ہے۔ ایک عند دوسری عند کو فنا کر دیتی ہے۔ یہی حال خیر و شر کا ہے کبھی شر کا غلبہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:-

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ  
أَيْدِي النَّاسِ (الروم: ۳۰)

لوگوں کی بد عملی کی وجہ سے بحر و بر میں  
فساد کا غلبہ ہو گیا۔

اسی طرح حدیث میں ہے، حضرت حذیفہؓ پوچھتے ہیں :-

اَنَا كُنَّا فِي جَاهِلِيَّتِهِ وَكَثُرَ فُجَاءَنَا اِلَهُ  
 هَذَا التَّعْسِيرِ قَهْلًا بَعْدَ هَذَا الْخَيْرِ مِنْ  
 كَثَرِ قَالِ نَعَمْ (صحیح بخاری، صحیح مسلم  
 اور کبھی خیر کا غلبہ ہوتا ہے جیسا کہ حدیث بالا میں ہے اور جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ہے:-  
 وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ مُتْلِفًا (۸۱) کہہ دیجئے حق آگیا، باطل مٹ گیا۔



بالکل یہی حالت گناہ و ثواب کی ہے، گناہ بھی ہوتے سہتے ہیں اور نیکیاں بھی ہوتی رہی ہیں اور ان دونوں کا تصادم بھی ہوتا رہتا ہے، کبھی برائیوں کا غلبہ ہو جاتا ہے نیکیاں مغلوب ہو جاتی ہیں اور کبھی نیکیاں غالب ہوتی ہیں اور برائیاں مغلوب ہو جاتی ہیں۔ نیکی اور بدی ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک دوسرے کی فتنا کا سبب، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک گناہ سارے نیک اعمال ختم کر دیتا ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَنْ أَشْرَكَتَ لِيَحْبَطَ عَمَلُكَ  
(الزمر: ۶۵)

اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے سارے اعمال ضائع کر دئے جائیں گے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ  
كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ  
أَعْمَالُكُمْ

اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے بلند آواز سے بات کرتے ہو، رسول سے اس طرح بات نہ کیا کرو (کیوں ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں۔

(حجرات: ۲)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا  
الرَّسُولَ وَلَا تَبْطُلُوا أَعْمَالَكُمْ

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع مت کرو۔

(محمد: ۳۳)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور سے بولنا اور اللہ اور رسول کی نافرمانی سارے نیک اعمال کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے:-

مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ  
حَبَطَ عَمَلَهُ (صحیح بخاری)

جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی، اس کا عمل ضائع ہو گیا۔

ایک اور حدیث میں ہے:-

إِنَّ الْعَصَا بِأَكْلِ الْحَشَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْعُطْبَ  
(رواہ ابو داؤد کتاب الادب ورواہ ثقات اوسدق تنقہ)

بے شک حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔

مندرجہ بالا آیات و احادیث سے ثابت ہوا کہ بعض گناہ تمام نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں۔

بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ جو خاص قسم کی نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى  
(البقرة: ۲۶۴)

احسان اور اذیت سے اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو۔



مطلب یہ کہ جو شخص کسی کو کچھ خیرات دے اور پھر اس پر احسان بھی رکھے یا اس خیرات کی وجہ سے خیرات لینے والے کو کسی قسم کی تکلیف پہنچائے تو اس کا خیرات کرنا اس کے لئے مفید نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی خیرات ضائع کر دی جائے گی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ احسان اور اذیت سے صدقات کا عدم ہو جاتے ہیں۔

جس طرح گناہ نیکیوں کو ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح نیکیاں بھی گناہوں کو فنا کرتی رہتی ہیں جیسا کہ برق صاحب کی وارو کردہ حدیث میں ہے اور یہ چیز قرآن مجید سے ثابت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۚ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۚ (الاحزاب: ۱۰۴)  
اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچی بات کہو اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کر دے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔  
اس آیت میں صرف اللہ سے ڈر کر سچ کہہ دینے کو مغفرتِ ذنوب کا سبب بنا دیا۔

## نیکیاں گناہوں کو فنا کر دیتی ہیں قرآن کا اٹل قانون

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (هود: ۴۰)  
دوسری آیت:- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ (البقرة: ۲۷۱)  
اگر تم علانیہ خیرات کرو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر فقراء کو دو تو یہ بہتر ہے اور اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔

تیسری آیت:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ ۖ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (الانفال: ۲۹)  
اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو اللہ تمہارے لئے ایک فرقان مقرر کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تم کو بخش دے گا بے شک اللہ بڑے فضل والا ہے۔

چوتھی آیت:-

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ  
اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے



رہے ہم ان کے گناہ معاف کر دیں گے۔

عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ (العنکبوت:-۷)  
پانچویں آیت :-

ہم مسلمان کے نیک کاموں کو قبول کرتے ہیں  
اور گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں (اور یہی  
لوگ جنت والوں میں (سے) ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَقْبَلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ  
مَّا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي  
أَصْحَابِ الْجَنَّةِ (الاحقاف:-۱۶)  
چھٹی آیت :-

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اللہ کے  
راستہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے  
لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے  
گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمہیں جنت  
میں داخل کر دے گا۔

تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ  
فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ  
ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ تَكْمُرُ أَنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ه  
يَغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَرَبُّهُ خَالِكُكُمْ  
جَنَّةٍ (الصف:-۱۱، ۱۲)  
ساتویں آیت :-

اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے  
گناہ معاف کر دے گا اور اس کو بہت بڑا  
اجر دے گا۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَغْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ  
وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا  
(الطلاق:-۵)

آٹھویں آیت :-

مگر جس نے گناہ کیا اور گناہ کے بعد اسے  
نیکی سے بدل دیا تو میں معاف کرنے والا  
رحم کرنے والا ہوں۔

إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ  
سُوِّءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ  
(النمل:-۱۱)

## گناہ کون سے معاف ہوتے ہیں

حدیث مذکور میں جن گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہے وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں صغیرہ گناہ ہیں  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

جو لوگ بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں  
سے بچتے ہیں سوائے اس کے کچھ چھوٹے چھوٹے  
گناہ سرزد ہو جائیں تو بے شک آپ کا رب بڑی  
وسیع مغفرت والا ہے۔

الَّذِينَ يَخْتَدِبُونَ كَبِيرُوا لِأَثْمِهِمْ  
وَالْفَوَاحِشِ إِلَّا اللَّسَمَ لَاتِ  
رَبُّكَ وَاسِعُ الْغُفْرِ  
(النجم:-۳۲)



دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

إِنْ تَحْتَسِبُوا كَثِيرًا مَّا تَشْهَوْنَ عَنْهُ  
نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ (النساء: ۱۲)

اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہے تو اللہ  
تعالیٰ تمہارے (سب گناہ) معاف کر دے گا۔

دیکھئے اس آیت میں تمام گناہوں کی مغفرت کا بیان ہے خواہ وہ سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ ہوں، پھر یہ کہ ان آیات میں صرف بڑے گناہوں سے بچنے کو صغائر کی مغفرت کا سبب بتایا ہے اور جہاں بڑے گناہوں سے بچ کر کوئی نیکی بھی کر لی جائے مثلاً روزانہ سورۃ سبحان اللہ و بحمدہ پڑھ لیا جائے تو کیا تعجب ہے کہ تمام صغیرہ گناہ معاف ہو جائیں۔ غالباً اب حدیث کا مطلب سمجھ میں آ گیا ہو گا، قرآن مجید تو بغیر نیکی کے سب گناہ معاف کرنے کی خوشخبری سناتا ہے، حدیث میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہے یعنی تسبیح و تحمید اگر حدیث پر اعتراض ہو سکتا ہے تو قرآن مجید پر نعوذ باللہ اس سے زیادہ اعتراض ہونے کی گنجائش ہے لیکن یہ صرف غلط فہمی ہوتی ہے حقیقت کچھ اور ہے اور قرآن و حدیث کو صحیح طور پر نہ سمجھنا ہی ایسی غلط فہمیوں کا باعث ہوا کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

پانچویں نمازیں جمعہ اور رمضان درمیانی عرصہ کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔

إِذَا اجْتَنَبَ الْكَبَائِرَ (صحيح مسلم کتاب الطہارۃ) بشرطیکہ بڑے گناہوں سے بچا جائے

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اگر بڑے گناہوں سے بچا جائے تو مذکورہ بالا نیکیاں خود بخود چھوٹے چھوٹے گناہوں کو فنا کر دیتی ہیں پس قرآن و حدیث سے ثابت ہوا کہ بعض نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں اور وہ گناہ بڑے گناہ نہیں ہوتے بلکہ صغائر ہوتے ہیں لہذا حدیث پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ کالعدم ہے۔

## بغیر نیکی کے گناہ معاف ہونا

ادھر ہم ایک آیت نقل کر چکے ہیں کہ صرف کبائر سے پرہیزی تمام خطاؤں کو معاف کرنے کا سبب بن جاتا ہے یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ویسے ہی بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور معافی کے لئے کوئی سبب بھی بیان نہیں کرتا۔  
ارشاد دہاوی ہے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنَ الْمُصِيبَاتِ  
فَمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْرِضُوا عَنْهُ

جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال  
ہی کے سبب سے پہنچتی ہے اور اللہ تو بہت



گنہگار (الشوریہ ۳۰) سے گناہ معاف کر دیتا ہے۔  
یعنی وہ مصیبت کا سبب نہیں بنتے بلکہ ویسے ہی معاف ہو جاتے ہیں۔

## گناہ کی مغفرت عقل کی کسوٹی پر

اگر شبہ ہو کہ معمولی نیکی سے اتنے گناہوں کی مغفرت کیسے ہو سکتی ہے تو یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایک ہی گناہ سارے اعمال کے جھوٹ کا سبب بن سکتا ہے اور ایک ہی نیکی ساری چھوٹی چھوٹی بد اعمالیوں کے خاتمہ کا سبب بن سکتی ہے جیسا کہ اوپر قرآن و حدیث کی تصریحات گزر چکی ہیں اور یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جاری و ساری ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اس کی تائید میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ انجیکشن کے چند قطرات کروڑوں ضرر رساں جراثیم کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ یہ انجیکشن کے ان قطرات کی قوت ہے جو ان جراثیم کو ختم کر دیتی ہے۔ یہاں مقدار کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کا دار و مدار قوت پر ہوتا ہے۔ انجیکشنوں کی مختلف قوتیں ہوتی ہیں اور ان قوتوں پر ہی ان کے اثر کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اگرچہ مقدار میں تقریباً سب انجیکشن برابر ہوتے ہیں لیکن اثر و نفوذ کے لحاظ سے برابر نہیں ہوتے۔ کیمیائی تجربہ گاہ میں جب کسی محلول کی قوت کی پیمائش کی جاتی ہے تو بعض مرتبہ تیزاب کا ایک قطرہ الکلی کے بہت بڑے محلول کے اثر کو زائل کر دیتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہاں قطروں کی مقدار کا فرما نہیں ہوتی بلکہ اس قطرہ کی قوت کا فرما ہوتی ہے جو بڑی مقدار کے محلول کی طاقت کو فنا کر دیتی ہے۔ ظاہر میں انسانوں کو یہ ایک عجیب چیز معلوم ہوگی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اسی طرح ایٹمی قوت کو ملاحظہ کیجئے۔ ایٹم کتنا چھوٹا ذرہ ہوتا ہے لیکن کتنی بڑی بڑی قوتوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ یہاں بھی مقدار بیچ نظر آتی ہے اور وہ قوت جو اس ذرہ میں پنہاں ہے کار فرما ہوتی ہے۔ ہماری ظاہری نظریں یہ چیزیں عجوبہ ہیں حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اسی طرح کسی نیکی میں کتنی قوت پنہاں ہے اسے کون جانتا ہے۔ اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

## مزید توضیح

ہو میو پیمنٹی کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے۔ ایک گولی جس میں ذرا سادوا کا اثر ہوتا ہے کتنی طاقت رکھتی ہے اور جتنی دوا کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے اسی قدر قوت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ دوا کئی کئی سال تک اپنا اثر بھی رکھتی ہے اور نقصان رساں اثرات کو زائل کرتی رہتی ہے۔ یہاں بھی دوا کی قوت کا فرما ہے، مقدار کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر سو گولیاں بھی بیک وقت کھالی جائیں تو



اثر ایک گولی کے مقابلہ میں کچھ بھی زیادہ نہ ہوگا۔ دوا کی معمولی سی مقدار بڑے بڑے مخالف امراض کا مقابلہ کرتی ہے اور ان کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ یہی حال نیکی کا ہے۔ یہاں نیکی کی مقدار نہیں دیکھی جاتی بلکہ وہ قوتِ خلوص اور قوتِ ایمانی دیکھی جاتی ہے جو اس نیکی کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ جب یہ قوتِ خلوص اور قوتِ پنہاں زیادہ ہوتی ہے تو معمولی سی نیکی گناہوں کی کثیر تعداد کو زائل کر دیتی ہے۔ اس قوتِ پنہاں کا جاننے والا اور اس قوتِ خلوص کا ناپنے والا اللہ تعالیٰ ہے ہم ان قوتوں کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

## قرآن مجید اور برق صاحب کا اعتراض

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَاتٍ  
وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى  
إِلَّا مِثْلَهَا (الانعام: ۱۶۰)

جو شخص نیکی کرے گا تو اس کو دس گنا ثواب  
ملے گا اور جو شخص برائی کرے گا تو برائی کا گناہ  
اس کے مثل ہوگا۔

اب بتائیے کیا قرآن مجید پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ نیکی کے ساتھ یہ رعایت کیوں ہے؟ دوسری جگہ ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا  
حَسَنًا فَيُضْعِفَ لَهُ أَضْعَافًا  
كَثِيرًا (البقرة: ۲۴۵)

جو شخص اللہ کو قرض حسنہ دے گا  
تو اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا  
ثواب دے گا۔

اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس کے نزدیک کثیر کتنا ہوگا بہر حال نیکی کم اور ثواب بہت زیادہ اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے غلم نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ  
تَكَ حَسَنَةً فَيُضْعِفْهَا (النساء: ۴۰)

بے شک اللہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ اگر نیکی  
ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا کر دیگا۔

قرآن مجید کی ان آیات سے ثابت ہوا کہ نیکی کئی گنا ہو جاتی ہے اور بدی صرف ایک ہی رہتی ہے اب جب کہ نیکی کی قوت کا یہ عالم ہے کہ اپنے سے کئی گنا ہو جاتی ہے تو پھر گناہ کی کیا حقیقت کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ ایک ہی نیکی جب لاکھ گنا ہو جائے تو کیا وہ ہزار گنا ہوں کا مقابلہ نہ کر سکے گی اور اگر نیکیوں کی یہ فراوانی رہی تو گناہ اگرچہ سمندر کے جھاگ سے زیادہ ہوں فنا ہو جائیں گے، اس لئے کہ نیکیاں گناہوں سے کئی گنا زیادہ ہوں گی۔ غالباً اب حدیث کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا۔ اب رہی یہ بات کہ ایسا کب ہوتا ہے تو اس کے لئے کچھ شرائط ہوتے ہیں۔ دوا کے خواص کا بیان کر دینا اور بات ہے



لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان خواص کا ظہور ہمیشہ ہو۔ دعا کے اثر کے لئے چند شرائط ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعا کے اثر کے لئے بھی چند شرائط ہوتے ہیں۔ جب وہ شرائط پورے ہوتے ہیں تو دعا اپنا کام کرتی ہے۔ حدیث مذکور میں دعا کی خاصیت مذکور ہے۔ یہ نہیں کہ ہمیشہ ہر حالت میں ایسا ہوتا ہے، خاصیت کا ہونا اور بات ہے اثر کا ہونا اور بات ہے۔ یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ شرائط پورے ہوئے یا نہیں۔ وہ دعا مقبول ہوئی یا نہیں۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں وضو سے تمام گناہوں کی معافی کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:-

وَلَا تَغْتَرُّوا (صحیح بخاری کتاب الرقاق) (اس بشارت سے) دھوکا مت کھانا۔

اب جو شخص احادیث سے بخوبی واقف ہے وہ دھوکا نہیں کھاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ایسی چیزوں کو عوام کے سامنے بیان کرنے سے روک دیا ہے تاکہ وہ غلط فہمی کی وجہ سے گمراہ نہ ہو جائیں۔

۲:- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ (البقرة:- ۵۸)

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ اس شہر میں جاؤ اور با فراغت کھاؤ یہو لیکن دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور حطہ کہنا، ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔

”سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا“ اور ”حطہ“ کہنا اتنی معمولی سی نیکی سے سارے گناہ معاف کرنے کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔ اب وہ گناہ خواہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں، خواہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں یا اس سے بھی زیادہ، اور پھر گناہ بھی کیسے کیسے۔ اللہ کی پناہ، ان کے گناہوں کے تذکرہ سے قرآن مجید معمور ہے بہ حال تمام گناہوں کے معاف کر دینے کا وعدہ ہے اور کتنی سی بات پر کہ ایک مرتبہ جھک کر حطہ پڑھ لینا۔ بتائیے اگر ایک مرتبہ حطہ پڑھنے سے بنی اسرائیل کے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ نا انصافی کرے گا کہ اگر ہم ”استغفر اللہ“ پڑھیں تو ہمارے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا۔ ضرور کرے گا وہ ظلم نہیں کرتا۔ قرآن تو اتنی سی نیکیوں سے سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے تو اگر حدیث میں اس قسم کی باتیں پائی جائیں تو تعجب کی آخر کون سی بات ہے۔ جب قرآن مجید پر اعتراض نہیں تو حدیث پر اعتراض کیوں؟

تحریر بالا میں ان تمام احادیث کا جواب ہے جن میں معمولی سی نیکی پر بہت زیادہ ثواب **خلاصہ** کی بشارت دی گئی ہے اور محض اس بنا پر کہ معمولی سی نیکی پر اتنا اجر نہیں مل سکتا، حدیث کو موضوع کہہ دینا صحیح نہیں اور یہ معیار ہی باطل ہے، سطحی نظر سے حدیث کا مطالعہ غلط فہمی اور



گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے ورنہ حقیقت بین زگا ہیں اس کے رموز کو پالیتی ہیں۔ سطحی نظر سے تو قرآن مجید کا مطالعہ بھی گمراہ کن ہو سکتا ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

"يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا" (البقرة ۲۶) اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے ذریعہ بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے تو کیا قرآن مجید ذریعہ گمراہی ہے ؟ نہیں، ہرگز نہیں لیکن بہر حال ظاہری معنوں سے تو یہی نکلتا ہے اور یہ بڑا زبردست اعتراض بن سکتا ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | ابی الدرداء (صحابی) کہتے ہیں آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بہتر

عمل جس سے تمہارے مدارج بہت بلند ہو جائیں، کون سا ہے ؟ ایسا عمل جو سونے اور چاندی کی قربانی اور جہاد سے بھی بہتر ہو۔ وہ جہاد جس میں تم دشمن کا سر کاٹتے ہو اور وہ تمہارا۔ لوگوں نے کہا فرمائیے۔ کہا "اللہ کا ذکر" ہر صاحب علم جانتا ہے کہ حدیث کی دنیا میں موطا کا درجہ کتنا بلند ہے۔ اس بلند کتاب میں اس حدیث کو پڑھنے کے بعد کسی کو کیا پڑی کہ وہ ملک و ملت کی حفاظت یا اپنی مستورات کی عزت و عفت بچانے کے لئے سر دیتا پھرے، وہ غلام ہے یا آزاد اس کی بلا سے، ساری دنیا جنت کے لئے مرنے اور یہ نعمت اس کو زبانی یا د خدا سے مل سکتی ہے، پھر وہ خواہ مخواہ دکھ کیوں اٹھائے (دو اسلام ص ۶۳-۶۴)

**ازالہ** | اس حدیث کا عام جواب تو اوپر گزر ہی چکا ہے تاہم مزید تشفی کے لئے ہم کچھ عرض کئے دیتے ہیں۔ اس حدیث میں "ذکر اللہ" کو تمام اعمال سے افضل بتایا گیا ہے اور یہ بالکل قرآن مجید کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ اور درحقیقت اللہ کا ذکر سب سے بڑا عمل ہے۔ اب اگر اس آیت میں ذکر سے مراد تسبیح و تحمید ہے تو پھر حدیث پر کیا اعتراض ہے اور اگر کچھ اور مطلب ہے تو پھر جو اس آیت کا مطلب ہے وہی حدیث کا بھی ہوگا، بہر حال اعتراض کا کوئی موقع نہیں اور اگر ذکر اللہ میں تبلیغ دین بھی شامل ہے تو پھر یہ حقیقت ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ اور جنگ و جدال کی اسکے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں۔ جنگ و جدال میں ایک ہنگامی کوفت اور محض جسمانی تکلیف ہوتی ہے لیکن تبلیغ میں ایسے ایسے کٹھن مرحلے آتے ہیں کہ جنگ اس کے مقابلہ میں بیچ نظر آتی ہے، تبلیغ میں ان روحانی و جسمانی خدمات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ جنگیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور



پھر وہ صدقات مسلسل ہوتے ہیں۔ آنا فانا میں ختم ہونے والے نہیں۔ جنگ کی نوبت بھی اس تبلیغ کے پیچھے پیچھے آتی ہے۔ بغیر تبلیغ کے حزب اللہ کہاں سے آئے گا جو میدانِ کارزار میں سر دھڑکی بازی لگائے۔ پس ثابت ہوا کہ تبلیغ جنگ فی سبیل اللہ سے افضل ہے اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بھی صدیقین کو شہداء پر مقدم کیا ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | امام داؤد دطائی سے کسی نے پوچھا کہ آپ احادیث کی روایت کیوں نہیں کیا کرتے؟ فرمایا، میں بچوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتا۔ (دو اسلام ص ۶۲)

اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ طلباء حدیث میں ان کی غلطیاں پکڑتے تھے اور وہ اس سے بچنا چاہتے تھے اور یہ عبارت خود ان سے مروی ہے جو اس کے آگے ہے کہ جب اس راستہ میں میری غلطیاں نکلیں تو پھر غلط راستہ پر چلنا مجھے پسند نہیں (برق اسلام ص ۶۲) لہذا اس قول میں کوئی اعتراض تو ہے نہیں تاہم یہ بات واضح کر دینی مناسب ہے کہ یہ روایت بھی جھوٹ و افتراء ہے۔ اس کی سند میں تین راوی مجہول ہیں (۱) اسمعیل بن ابراہیم بن نعمان (۲) محمد بن علی بن مروان (۳) ابو عبد الرحمن الضریر (برق اسلام ص ۶۳)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ایک مرتبہ چند طلبہ حدیث حضرت فضیل بن عیاض کے ہاں درس لینے کے لئے آئے۔ آپ نے انہیں ان الفاظ میں ڈانٹ پلائی۔ تم لوگوں نے اللہ کی کتاب کو ضائع کر دیا ہے، اگر تم کتابِ الہی کی تلاش کرتے تو اس میں تمہیں شفا مل جاتی۔ (دو اسلام ص ۶۵-۶۶)

یہ روایت بھی ناقابلِ اعتبار ہے، اس کی سند میں دو راوی ناقابلِ اعتبار ہیں۔  
**ازالہ** | ایک راوی احمد بن مندرس ہے یہ مجہول ہے (برق اسلام ص ۶۲) دوسرا راوی ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمن ہے یہ مجہول الحال ہے (بغیۃ الملتبس وجدة المقتبس)۔ مزید براں اس نامعتبر روایت میں بھی حدیث پر کوئی اعتراض نہیں۔ برق صاحب نے فضیل بن عیاض کی پوری عبارت نقل نہیں فرمائی۔ اگر وہ پوری عبارت نقل فرما دیتے تو اعتراض خود بخود کا عدم ہو جاتا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | سفیان ثوری کا قول ہے۔ انا فی الحدیث منذ سنתי سنتہ ووددت ان نخرجت منه کما فاعلا علی ولا لی "میں گزشتہ نامٹھ برس سے حدیث کی دلیل میں پھنسا



ہوا ہوں اور اب اس سے اس حالت میں نکلنا چاہتا ہوں کہ اس کے فائدہ اور نقصان  
 سے دو سے محفوظ رہوں (دوا اسلام ص ۶۶)

یہ روایت معنابالکل صحیح ہے۔ برق صاحب نے جو ترجمہ اس کا کیا ہے وہ صحیح نہیں  
**ازالہ** | صحیح مطلب اس کا یہ ہے کہ میں ساٹھ برس سے حدیث کی درس و تدریس میں مشغول  
 ہوں اور یہ کام اتنا مشکل ہے کہ اگر برابر برابر ہی چھوٹ جاؤں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی پکڑ نہ ہو  
 تو بھی غنیمت ہے گویا سفیان ثوری حدیث کی عظمت بیان کر رہے ہیں اور برق صاحب نے غلط فہمی  
 سے ترجمہ کر کے اس کا منشا کچھ سے کچھ بنا دیا۔

برق صاحب یموت بن المزروع کا مندرجہ ذیل قول نقل کرتے ہیں:-

**غلط فہمی** | اذ ارایت مشیخا بعد و فاعلم ان اصحاب الحدیث خلفہ جب تم کسی  
 عالم کو سرپٹ بھاگتا دیکھو تو سمجھ لو کہ طلبہ حدیث اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔  
 (دوا اسلام ص ۶۶)

اس قول کا اصل مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی شیخ الحدیث کو جاتے دیکھو تو سمجھ لو کہ طلبہ  
**ازالہ** | حدیث بھی اس کے پیچھے ہوں گے یعنی شیوخ الحدیث کی یہ شان ہے کہ ہمیشہ ان کے پیچھے  
 طلبہ حدیث کا جھگڑتے ہوئے وہ کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔

اگر وہی مطلب لیا جائے جو برق صاحب نے لیا ہے یعنی علماء درس حدیث سے گھبرا کر بھاگتا کرتے  
 تھے لیکن طلبہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے اور تنگ کرتے تھے تو آخر اس میں اعتراض ہی کیا ہے۔  
 برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | "محمد بن سلام حضرت فاروق کے اس قول کے راوی ہیں کہ میں نے حدیث  
 سے بہتر کوئی علم اور اہل حدیث سے زیادہ ذلیل کوئی مخلوق نہیں دیکھی" (دوا اسلام ص ۶۶-۶۷)

قول مذکور حضرت عمرؓ کا نہیں ہے بلکہ عمرو بن الحارث کا ہے (جامع بیان العلم لابن  
**ازالہ** | عبد البرج ۲ ص ۱۳) برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے عمرو بن الحارث کو عمر  
 بن الخطابؓ سمجھ لیا۔

پھر عمرو بن عارث سے بھی یہ قول صحیح سند سے ثابت نہیں، محمد بن سلام نے اس کو عمرو بن الحارث  
 سے روایت کیا ہے۔ عمرو بن عارث سے محمد بن سلام کی ملاقات ثابت نہیں لہذا یہ روایت منقطع  
 اور ناقابل اعتبار ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | سفیان بن عیینہ، مسعر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے



کہا "خدا میرے دشمن کو محدث بنادے! ایک اور موقعہ پر فرمایا "کاش علم حدیث میرے سر پر شیشوں کا ایک ٹوکرا ہوتا جو گر کر چور چور ہو جاتا۔" (دوا سلام ص ۶۷)

یہ اقوال بھی بہتان ہیں ان کی سند میں علی بن سعید رازی مجروح ہے۔

**ازالہ** (برق اسلام ص ۷۷)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** ایک دفعہ چند طلباء حدیث سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا "تم میری آنکھ کی جلن ہو" اور ساتھ ہی کہا "اگر آج عمر بن خطاب زندہ ہوتے اور ہم سب کو دیکھ پاتے تو مار مار کر ہمارا پیتر بگاڑ دیتے"

(دوا سلام ص ۶۷)

یہ بھی کذب و بہتان ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی مسلم بن قاسم ہیں جو ضعیف العقل تھے (لسان المیزان) دوسرے راوی احمد بن عیسیٰ ہیں جو غیر معروف ہیں۔

**ازالہ** (برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-)

**غلط فہمی** امام شعبہ نے فرمایا ایک زمانہ تھا کہ میں اصحاب حدیث سے مل کر خوش ہوتا تھا لیکن آج ایسے شے بغض الی من ان ارنی واحد منهم میرے ہاں سب سے زیادہ قابل نفرت یہی لوگ ہیں (دوا سلام ص ۶۷-۶۸)

اس کی سند میں ایک راوی احمد بن الفضل منکر الروایت ہے، دوسرا راوی محمد بن عبد اللہ الدوسقی جھوٹا (برق اسلام ص ۷۷) لہذا یہ روایت بالکل باطل ہے۔

**ازالہ** (برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-)

**غلط فہمی** ایک مرتبہ چند طلبہ امام شعبہ کے پاس درس حدیث لینے کے لئے آئے آپ نے کڑک کر فرمایا "یہ حدیث تمہیں اللہ کے ذکر سے روکتی ہے کیا تم باز نہیں آؤ گے؟"

(دوا سلام ص ۶۸)

امام شعبہ کے مذکورہ بالا قول میں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ جو شخص حدیث کی طلب میں نماز وغیرہ سے غافل ہو جائے اسے کون اچھا کہے گا۔

**ازالہ**

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** "ایک مرتبہ امام اعظم نے طلبہ حدیث سے کہا۔ مجھے حدیث حنظل سے بھی زیادہ کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ تم جس شخص کے قریب جاتے ہو اسے جھوٹ بولنے (یعنی احادیث پڑھنے) کی ترغیب دیتے ہو" (دوا سلام ص ۶۸)



**ازالہ** امام اعمش کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

لَقَدْ رَدَدْتُمُوهُ حَقَّ صَارِفِي حَلَقِي      تم نے اس بات کو رو کر کے میرے حلق  
امْرُؤٌ مِنَ الْعَلَقِ مَا عَطَفْتُمْ عَلَيَّ      کو اندرائن سے بھی زیادہ تلخ بنا دیا ہے تم  
احد الاحملىتموه على الكذب      جس شخص کا رخ کرتے ہو اسے جھوٹ بگوا  
(برق اسلام ص ۱۲۵)

اس کی سند میں احمد بن فضل منکر الحدیث ہے (جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۳۱) لہذا یہ روایت جھوٹی ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** سعید القطان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ”یہ صوفی و زاہد لوگ احادیث کے معاملہ میں سب سے بڑے جھوٹے واقع ہوئے ہیں۔“ (دو اسلام ص ۶۹)

یہ تو فن حدیث کی خوبی ہے کہ اس نے ان صوفی اور زاہد لوگوں کو بھی نہ چھوڑا۔ ان کے **ازالہ** زاہد نے محدثین کو مرعوب نہیں کیا۔ یہ لوگ زہد و تقویٰ کی وجہ سے مرجع انام ہوتے تھے۔ اور ان کی طرف مشکل سے تریف کا گمان ہو سکتا تھا لہذا یہ لوگ دین کے لئے بڑے خطرناک ہو سکتے تھے، لیکن محدثین نے ان کا پردہ چاک کر دیا اور حدیث کو تحریف سے بچالیا۔  
ابو بکر بن عیاش نے فرمایا ممتا:-

**غلط فہمی** ”خدا کی قسم مجھے فساق سے اتنا خطرہ محسوس نہیں ہوتا جتنا اہم حدیث سے۔“  
(دو اسلام ص ۶۹)

یہ دراصل مغیرہ کا قول ہے اس کا راوی اسمعق بن ابراہیم بن النعمان ہے جو غیر معروف ہے **ازالہ** اس کا ترجمہ نہیں ممتا لہذا یہ روایت بالکل ناقابل اعتبار ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ تین قسم کی احادیث میں بُری طرح تحریف ہو چکی ہے پیش گوئیاں جنگیں اور تفسیری احادیث (دو اسلام ص ۶۹)

یہ قول تو کسی طرح ہمارے مخالف نہیں، یہ تو فن حدیث اور تدوین حدیث کی تائید کرتا **ازالہ** ہے، محدثین نے مفسرین اور مؤرخین کی بیان کردہ احادیث کو ذرا بھی وقعت نہیں دی، بلکہ ان کو فن حدیث سے پرکھا تو معلوم ہوا کہ اس میں اکثر محرف اور موضوع ہیں۔ محدثین کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوئے بلکہ احادیث صحیحہ کی تخلیص میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔





## باب اول کا خلاصہ

اس باب میں ائمہ دین کے جو اقوال برق صاحب نے نقل فرمائے ہیں ان میں سے اکثر گھڑے ہوئے اور ان پر بہتان ہیں اور جو صحیح ہیں ان کی وضاحت اوپر کر دی گئی ہے۔ برق صاحب نے ان موضوعہ اقوال کو صحیح سمجھا ہے اس لئے نقل فرمایا بہر حال یہ برق صاحب بھی مانتے ہیں کہ یہ اقوال احادیث صحیحہ کی مخالفت میں نہیں ہیں بلکہ احادیث موضوعہ کے متعلق ہیں مثلاً تمہید میں ص ۲ پر وہ لکھتے ہیں:۔

”اسلام دو ہیں ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے اور دوسرا وضعی احادیث کا اسلام“

اور پہلے باب میں ص ۵۹ پر لکھتے ہیں ”حاشا وکلا مجھے حدیث سے بغض نہیں بلکہ ان انسانی اقوال سے ضد ہے جنہیں یہودیوں، زندیقیوں اور ہما سے فرقہ باز راہنماؤں نے تراش کر مہبط وحی صلعم کی طرف اس لئے منسوب کر دیا تھا کہ خدا، رسول اور قرآن کا کوئی دقت دنیا میں باقی نہ رہے“ برق صاحب ہم نے تو ان اقوال کو صحیح نہیں مانا اور اگر آپ صحیح مانتے ہیں اور اس سے گھڑی ہوئی احادیث مراد لیتے ہیں تو خیر ہمارا اس میں حرج بھی کیا ہے۔ صحیح احادیث کو نو آپ بھی مانتے ہیں بلکہ آپ کی کتاب کے آخری باب کا عنوان ہی ہے ”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“ الغرض صحیح احادیث اور موضوع احادیث کے متعلق تو ہمارا آپ کا ایک ہی عقیدہ ہے لہذا ہم میں اور آپ میں اختلاف ہی کہاں ہے۔ محدثین نے یہی کارنامہ انجام دیا اور ہر قسم کے کھوٹ سے صحیح احادیث کی تخلص کر دی اور یہودیوں، زندیقیوں اور فرقہ باز راہنماؤں نے جو حدیثیں وضع کی تھیں ان کی حقیقت کو دواشگاف کر دیا۔ فللہ الحمد۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## باب

### تذوین حدیث

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

صحابہ کرامؓ جمع احادیث کے خلاف تھے (دو اسلام ص ۱)

غلط فہمی

صحابہ کرامؓ جمع احادیث کے خلاف نہیں تھے۔ مفصل جواب باب اول میں

دیا جا چکا ہے اور متعدد صحابہ کرام کے صحائف کا تذکرہ بھی اسی باب میں کر دیا

ازالہ

کیا ہے۔ وہیں ملاحظہ فرمائیں، اتنا تو برق صاحب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ تین صحابہ کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں۔

وہ تحریر فرماتے ہیں :-

صحابہ کرامؓ میں سے صرف تین بزرگ یعنی انس بن مالکؓ، ابو ہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ ایسے نظر

آتے ہیں جن کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں (دو اسلام ص ۱)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

الودادؓ میں یہ حدیث ملتی ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اکرمؐ سے دریافت

کیا کہ کیا میں آپ کے اقوال لکھ سکتا ہوں تو حضورؐ نے فرمایا "نعم افی الا قول الا حقا" بیشک لکھ

لیا کرو، اس لئے کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں، حیرت ہے کہ جس ہستی نے کتابت احادیث سے منع فرمایا

تھا (مسلم) اور جس کے جلیل القدر جانشین آپ کے ارشاد کی تعمیل میں نہ صرف اپنے مجموعے بلکہ

ہر صحابی کے مجموعے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کرتے رہے۔ اسی ہستی نے عبداللہ بن عمرؓ کو کتابت



کی اجازت کیسے دیدی، مزید حیرت اس امر پر کہ جب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے احادیث جلائے کا حکم دیا تھا تو ابن عمرؓ نے کیوں تعمیل نہ کی، کیا قرآن کی رو سے اولی الامر کی اطاعت فرض نہیں یا تو ہم یہ تسلیم کریں کہ صحیح مسلم کی حدیث جھوٹی ہے اور یا ابن عمرؓ کو رسول خدا اور خلفائے اسلام کی حکم عدولی کا ملزم ٹھہرائیں۔ حضور کے خلفاء کے عمل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث صحیح ہے اور اگر مسلم کی حدیث کو صحیح قرار دیں تو ابو داؤد والی حدیث وضعی ثابت ہوتی ہے اور اس لئے ابن عمرؓ پر جمع احادیث کا الزام غلط ہے۔ (دو اسلام صفحہ ۱۸)

قرآن مجید میں ہے:-

ازالہ | قُلْ لَوْ كَانِ فِي الْأَرْضِ  
مَلَائِكَةٌ يَتَّبِعُونَ مُظْهِرِينَ لَنُزِّلْنَا  
عَلَيْهِمُ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا  
(ابن اسرئیل :- ۹۵)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ فرشتہ رسول بن کر نہیں آتا، اب مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے۔

اللَّهُ يُصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا  
رَّوَاهُ النَّاسِ (الحج :- ۷۵)

اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے  
یہوں کو منتخب فرماتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ  
جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا  
(فاطر :- ۱)

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں  
کا اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں  
کو رسول بنانے والا ہے۔

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر نہیں آیا۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ پہلی آیت صحیح ہے اور اگر وہ صحیح ہے تو غلط فہمی سے کہا جاسکتا ہے کہ آخری دو آیتیں صحیح نہیں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تینوں آیات صحیح ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے ہر ایک ثابت و سچی ہے، بالکل یہی حالت ان ہر دو احادیث کی ہے جن کو برق صاحب نے بطور تضاد پیش کر کے ایک کو سچی اور ایک کو جھوٹی کہا ہے، حالانکہ اگر وہ اس حدیث کو سچی کہتے جس کو انہوں نے جھوٹی کہا ہے تو زیادہ مناسب تھا اس لئے کہ مسلمین کی متواتر تاریخ اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ احادیث ہر زمانہ میں لکھی جاتی رہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت احادیث سے منع نہیں فرمایا تھا بلکہ قرآن مجید کے ساتھ ملا کر لکھنے سے منع فرمایا تھا (مفصل جواب کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیں، باب اول میں یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ صحابہ کرام



کے احادیث جملانے کی روایت موقوف یعنی بناوٹی ہے) قرآن مجید کی رو سے اولوالامر کی اطاعت بے شک فرض ہے لیکن اختلاف کی حالت میں قرآن مجید ہی حکم دیتا ہے کہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو یعنی غلط بات میں اولوالامر کی اطاعت فرض نہیں، اللہ ہی نے حکم دیا ہے طَاعَتُهُ مَقْرُوفٌ (النور ۵۳) یعنی معروف بات ہی میں اطاعت کی جائے اور سبک جملانے کا حکم غیر معروف بات تھی لہذا تعمیل نہ کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں، پھر یہ بھی غلط ہے کہ اولوالامر میں سے کسی نے احادیث جملانے کا حکم دیا ہو، یہ روایت ہی جعلی ہے تو اولوالامر کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:-

ابن عمرو پر جمع احادیث کا الزام غلط ہے اور خود ہی اس سے پہلے تحریر فرما چکے ہیں کہ تین بزرگوں کے پاس احادیث محفوظ تھیں ان تین بزرگوں میں انہوں نے ابن عمرو کا نام بھی شامل کیا ہے۔ معلوم نہیں دونوں باتوں میں سے کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط، برق صاحب کا پہلا کلام تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ابن عمرو کا صحیفہ صادقہ مشہور ہے جو ان کے پڑپوتے تک منتقل ہوتا ہوا محدثین کو ملا۔ ان کے پڑپوتے عمرو بن شعیب اس صحیفہ کو سامنے رکھ کر احادیث بیان کرتے تھے۔ اس صحیفہ کا ذکر متواتر ہے اور اس کا انکار غلط فہمی ہے یا لاعلمی۔

صحیح مسلم کی حدیث سے قرآن و حدیث کو یکجہ لکھنے کی ممانعت ہے، اور سنن ابوداؤد کی حدیث میں احادیث کو علیحدہ لکھنے کی اجازت، لہذا دونوں میں کوئی تضاد نہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ مزید برآں کتابت حدیث کی احادیث متواتر ہیں اور اس لحاظ سے قطعی القہر ہیں۔

دو اسلام میں غالباً کتابت کی غلطی سے بار بار "ابن عمرؓ" طبع ہو گیا ہے حالانکہ صحیح "ابن عمرؓ" ہے۔

ترمذی کے مجموعہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق لکھا ہے آپ احادیث لکھ دیا کرتے تھے لیکن صحیح بخاری میں خود ابوہریرہؓ کی یہ روایت موجود ہے کہ "تمام صحابہ میں صرف عبداللہ بن عمر کی روایات مجھ سے زیادہ تھیں" اس لئے کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھا کرتا تھا۔

چونکہ امام بخاری کی صحیح، ترمذی سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اس لئے ترمذی کے بیان کو ہم صحیح قرار نہیں دے سکتے (دو اسلام ص ۷۱)



برق صاحب نے صحیح بخاری کی روایت کو ابو ہریرہ کی کتابت حدیث کی روایت  
**ازالہ** کے خلاف سمجھا ہے حالانکہ دونوں روایتوں میں مختلف زمانوں کا ذکر ہے۔  
 عبداللہ بن عمروؓ عہد رسالت میں لکھا کرتے تھے اور ابو ہریرہؓ عہد رسالت میں نہیں لکھتے تھے۔  
 یہ ہے بخاری کی روایت کا مفہوم، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابو ہریرہؓ  
 بھی لکھنے لگے تھے۔ یہ ہے دوسری روایت کا مفہوم (حضرت ابو ہریرہؓ کی تحریر کردہ کتب احادیث  
 کی مفصل معلومات کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیں)

برق صاحب کی عبارتوں میں یہاں بھی تضاد ہے برق صاحب پہلے لکھ چکے ہیں کہ ابو ہریرہؓ کے  
 پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں، اور یہاں فرماتے ہیں کہ ترمذی کے بیان کو ہم صحیح قرار نہیں دے  
 سکتے یعنی ابو ہریرہؓ احادیث نہیں لکھتے تھے معلوم نہیں یہ صحیح و غلط کی آمیزش ان کی کتاب میں کیا  
 طرح آگئی۔ غالباً غلط فہمی اور عدم تحقیق کی بنا پر ایسا ہوا ہے۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے  
 پاس احادیث محفوظ و مکتوب تھیں جیسا کہ برق صاحب نے صحت پر تسلیم کیا ہے۔  
 حضرت انسؓ کے متعلق برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** آپ سرور کائنات صلعم کے خادم خاص تھے اور عمر میں بہت چھوٹے، یعنی  
 جب حضور مدینہ میں تشریف لائے تھے تو انسؓ کی عمر صرف ساڑھے نو  
 برس تھی اور رحلت رسول کے وقت قریباً بیس برس۔ اپنے ارد گرد نظر ڈال کر دیکھئے اور  
 اندازہ لگائیے کہ کیا کوئی لڑکا اٹھارہ انیس برس کی عمر تک کسی قسم کی کوئی ذمہ داری محسوس کر  
 سکتا ہے؟ حضرت انسؓ کا کام محترم نبوی اور ذات نبوی کی خدمت، دن کا بیشتر حصہ  
 خرید و فروخت، لین دین، جھاڑ پھونک میں گزر جاتا تھا، کچھ فرصت ملتی تو قرآن شریف یاد  
 کیا کرتے تھے۔ وہ ارشادات نبوی ضرور سنتے ہوں گے لیکن لڑکپن کا زمانہ تھا۔ انہیں کیا پٹری  
 تھی کہ ہر ارشاد اور ہر واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد کرتے پھرتے، واقعہ سامنے آیا اور گزر گیا، کچھ  
 یاد رہا اور کچھ بھول گیا، کوئی بات کان سے ٹکرائی اور پھر کام میں لگ گئے لیکن جب حضور کی رحلت  
 کے بعد لوگ قرآن کو چھوڑ کر احادیث کے پیچھے پڑ گئے اور راویان حدیث کی منزلت بڑھ گئی تو  
 آپ نے بھی بھولے بسرے واقعات اور گوش گذشتہ ارشادات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ممکن  
 ہے کوئی ارشاد بالفاظ یاد رہا ہو اور بعض دیگر کا خاکہ خود مکمل کر لیا ہو۔ (دوا سلام ص ۷۷)

اس کا جواب برق صاحب نے خود آگے چل کر دے دیا ہے برق صاحب فرماتے ہیں:-

گزشتہ ۷۴ برس میں مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو رنگ آمیزی، مبالغہ  
**ازالہ** اور دیگر سخن گسترانہ عیوب سے پاک ہو، میں خود ان عیوب سے مبتلا نہیں اور



آج کہ میری عمر ۴۲ سے کچھ اوپر ہو چکی ہے۔ علم کی کئی منازل طے کر چکا ہوں، متانت، حقیقت اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں، پھر بھی داستان سرائی مبالغہ اور رنگ آمیزی سے پوری طرح نہیں بچ سکا (دو اسلام ص ۱۲۱)

الغرض حضرت انسؓ کے متعلق برق صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا، اس میں عبارت آرائی اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں نہ کوئی خرید و فروخت ہوتی تھی نہ لین دین، نہ جھاڑ پھونک، آپ کی زندگی بہت سادہ تھی، نہ آپ تاجر تھے نہ ساہوکار، نہ آپ کے پاس کوئی محل تھا جس کی جھاڑ پھونک کے لئے کافی وقت درکار ہوتا۔ برق صاحب صحابہ کرام کے متعلق اس قسم کی عبارت مناسب نہیں، آپ اپنے زمانہ کے نوجوانوں پر عہد رسالت کے نوجوانوں کو قیاس نہ کیجئے۔ اگر مقابلہ ہی کرنا ہے تو ان کی شان اسلام اور قوت ایمان کا مقابلہ ہماری شان اسلام اور قوت ایمان سے کیجئے پھر دیکھئے کتنا بڑا فرق نظر آئے گا اور اس وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ ان نوجوانوں کے ایمان کے مقابلہ میں ہمارے بڑے سے بڑے بزرگ عالم باعمل، متقی، پرہیزگار کا ایمان بیسج ہے۔ آپ کی یہ عبارت ”یاد کرتے پھرتے“ کس قدر نامناسب ہے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ”انہیں کیا پڑی تھی کہ یاد کرتے“ پھر انہیں کیا پڑی تھی۔ یہ جملہ بھی ایک صحابی جلیل کے متعلق قطعاً نازیبا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا وہ علوم دینی سے بے پرواہ تھے۔ دینی علوم کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں تھی کہ صحبت رسول میں رہ کر اسے حاصل کرتے، پھر یہ واقعہ کے بھی خلاف ہے انہوں نے احادیث یاد ہی نہیں کیں بلکہ ان کو محفوظ تک کر لیا تھا۔

جیسا کہ برق صاحب نے اپنی کتاب کے ص ۱ پر خود بھی تسلیم کیا ہے کہ انسؓ کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں۔

برق صاحب! آپ ہمیں اندازہ لگانے کی دعوت دیتے ہیں لیکن آپ بھی تو اندازہ لگائیے، اس زمانہ میں جب کہ لوگوں کی قوت حافظہ بہت کم ہو گئی ہے بیس سال کی عمر میں ایم اے اور ایم ایس سی پاس کرنے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ایف اے اور بی اے کرنے والوں کی تعداد شمار سے باہر ہے لیکن اس عہد مبارک میں جب کہ حافظہ بہت قوی تھے، بیس سال کی عمر میں حضرت انسؓ کا اپنے محبوب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو محفوظ کرنا اتنا بعید ہے کہ آج اس پر تعجب ہی کا اظہار نہیں ہو رہا بلکہ اسے ناممکن سمجھا جا رہا ہے۔

”بہر حال جو احادیث آپ (حضرت انسؓ) سے مروی ہیں ان کی تعداد ۱۲۸۶

ہے جن میں سے ۱۶۸ کی صحت پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے اور باقی ۱۱۱۸ کو

ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے۔ امام بخاری نے ان متفقہ احادیث میں سے صرف ۸۳ نقل کی ہیں۔ مسلم

غلط فہمی



نے اے اور باقی کو مشکوک سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ (دو اسلام سرے)

اس ضمن میں برق صاحب کو دو غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔

**ازالہ** | **اولے:**۔ برق صاحب کا خیال ہے کہ جو احادیث مشکوک ہیں ان میں شک کی وجہ خود حضرت انسؓ ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں، جن احادیث کی صحت مشکوک ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ حضرت انسؓ نے غلط احادیث بیان کیں، عاشا وکلا، ضعف کی وجہ نیچے کے راوی ہیں نہ کہ حضرت انسؓ۔

**دوم:**۔ برق صاحب کی دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ انہوں نے حضرت انسؓ کی صحیح احادیث کی تعداد ۱۶۸ بتائی ہے حالانکہ یہ ان احادیث کی تعداد ہے جو بخاری اور مسلم میں مشترک ہیں۔ اصل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

لَهُ الْفَرْدُ وَمَا شَأْنُ حَدِيثٍ وَسَيِّئَةٍ وَ  
ثَمَانُونَ اتَّفَقَا عَلَى مِائَةٍ وَثَمَانِيَةٍ  
وَسِتِّينَ وَالْفَرْدَ الْبُخَارِيُّ بِثَلَاثِي  
وَسِتِّينَ وَمُسْلِمٌ بِأَحَدٍ وَسَبْعِينَ  
حضرت انسؓ کی روایت کردہ احادیث  
کی تعداد ۱۶۸ ہے جن میں سے ۱۶۸  
بخاری و مسلم کی متفق علیہ احادیث ہیں،  
۸۳ صرف بخاری میں ہیں اور ۸۵ صرف  
مسلم میں۔ (عاشیہ نسائی رحمہم دہلی ج ۱ ص ۲۵)

اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ امام بخاری نے ۱۶۸ میں سے ۸۳ نقل نہیں کیں بلکہ ۱۶۸ + ۸۳ = ۲۵۱ نقل کی ہیں۔ اسی طرح امام مسلم نے ۱۶۸ + ۴۲۹ = ۵۹۷ کو یا صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی احادیث کی تعداد ۱۶۸ + ۸۳ + ۴۲۲ = ۶۷۳ ہے۔ پھر امام بخاری و امام مسلم نے جن احادیث کو اپنی کتاب میں درج نہیں کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ سب مشکوک ہیں بلکہ اس کی دو بڑی وجہیں حسب ذیل ہیں:

**اولے:**۔ بعض احادیث صحیح ہوتی ہیں لیکن امام بخاری و امام مسلم کے سخت شرائط کی متحمل نہیں ہوتیں۔

**دوم:**۔ بعض احادیث کو کتاب کی طوالت کے خیال سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں:

وَتَرَكْتُ كَثِيرًا مِّنَ الصَّحَاحِ  
حَقِّ لَا يَطُولُ الْكِتَابُ  
میں نے کتاب کے طویل ہو جانے کے خیال  
سے بہت سی صحیح احادیث کو چھوڑ دیا  
رنصرة الباری ص ۲ بحوالہ مقدمہ فتح الباری و مقدمہ ابن صلاح وغیرہا



برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

” اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد آپ کی بعض احادیث بدستور محل نظر ہیں۔

**غلط فہمی**

مثلاً عتبہ بن مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضور سے التماس کی کہ وہ میرے گھر میں آکر نماز پڑھیں، آپ نے یہ التجا قبول فرمائی۔ آپ کے ہمراہ چند صحابہ بھی تشریف لائے، صحابہ نے منافقین کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ کہنے لگے کتنا اچھا ہوا اگر حضور مالک بن خثعم (منافق) کی ہلاکت کی دعا کریں، حضور نے فرمایا کیا وہ کلمہ نہیں پڑھتا؟ صحابہ نے کہا، زبان سے تو پڑھتا ہے لیکن اس کا دل بے ایمان ہے۔ فرمایا جو شخص کلمہ پڑھتا ہے وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث عجیب معلوم ہوئی چنانچہ میں نے اپنے بیٹے کو کہا کہ لکھ لے اور اس نے لکھ لی (صحیح مسلم کتاب الایمان)

” اگر ابن خثعم واقعی منافق تھا اور اتنے صحابہ کی شہادت کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور خود حضورؐ نے بھی اس کی تردید نہیں فرمائی تو پھر اس کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (دو اسلام ص ۷۲-۷۳)

**ازالہ** برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی کاش وہ حدیث کا گہرا مطالعہ کرتے، حدیث میں تو موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے منافق ہونے کی تردید فرمائی

حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

ایک شخص نے کہا مالک بن خثعم منافق ہے، اللہ اور رسول سے محبت نہیں کرتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ مت کہو کی تم کو نہیں معلوم کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر لا الہ الا اللہ پڑھا ہے۔ (آپ کا یہ جملہ اس کے نفاق کی صریح تردید ہے کیونکہ منافق کا کلمہ پڑھنا اللہ کی خوشنودی کے لئے نہیں ہوتا) اس شخص نے کہا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے (یعنی ہم نے تو اپنے علم کی بنا پر کہا تھا اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ منافقین سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی خیر خواہی کرتا ہے۔

فَقَالَ بَعْضُهُمْ ذَٰلِكَ مُنَافِقٌ ۖ لَا يَحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُلْ ذَٰلِكَ ۚ لَا تَرَاكَ ۚ قَدْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يُرِيدُ بِذَٰلِكَ وَجْهَ اللَّهِ ۚ قَالَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ أَعْلَمُ قَالَ فَيَا نَارَ وَجْهَهُ ۚ وَنَصِيحَتُهُ ۚ إِنِّي أَنَا الْمُنَافِقُ ۚ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۚ فَإِنَّ اللَّهَ قَدْ خَدَمَ عَلَى الْمَنَارِ ۚ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ



إِلَّا اللَّهُ يَبْتَغِي بِذَلِكَ  
وَجْهَ اللَّهِ •

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس

نے اللہ کو خوش کرنے کے لئے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا

وہ دوزخ پر حرام ہے (یعنی صرف ظاہری باتوں

سے اس کے قلبی ایمان کی نفی نہیں ہو سکتی)

اصحیح بخاری ج ۱ باب المساجد

فی البیوت

القرض حضرت انسؓ کی یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

دوسری غلط فہمی برق صاحب کو یہ ہوئی کہ وہ حضرت انسؓ کو اس حدیث کا براہ راست راوی سمجھ بیٹھے حالانکہ انہوں نے خود یہ روایت عتبان بن مالک سے سنی تھی۔

تیسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ انہوں نے "أَعْجَبَنِي" کے معنی "مجھے عجیب معلوم ہوئی" کئے حالانکہ اس کے صحیح معنی یہ ہیں "مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی، مجھے بہت پسند آئی"۔

حضرت انسؓ نے اپنے بیٹے سے کہا، اس حدیث کو لکھ لو۔ اس سے یہ ثابت

**انتباہ** | ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں احادیث لکھی جاتی تھیں اور وہ اپنے بیٹوں کو

لکھنے کا حکم دیتے تھے (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیے)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

ایک اور حدیث ملاحظہ ہو۔ "انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ

بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ آپ کے پاس جبریل آیا، آپ کو پکڑا، زمین

پر گرایا، سینہ چیر کر دل نکالا، پھر دل کو چیرا، اور ایک ٹکڑے کے متعلق کہا کہ یہ شیطان والا حصہ ہے، اس حصہ کو سونے کے طشت میں آب زمزم سے دھویا، پھر دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑ کر دوبارہ سینہ میں رکھ دیا۔ یہ حدیث کئی طرح سے مشکوک ہے۔

اول جب بچپن میں حضور بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے تو حضرت انسؓ کہاں تھے؟ آپ ایک ایسے واقعہ کے عینی شاہد بنے ہوئے ہیں جو آپ کی پیدائش سے قریباً پچھتیس برس پہلے ہوا تھا (دو اسلام مہ)۔

حضرت انسؓ نے یہ کہاں کہا ہے کہ میں اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا۔ آخر یہ

**ازالہ** | کن الفاظ کا ترجمہ یا مفہوم ہے، انہوں نے اس واقعہ کو خود رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے سنا ہو یا کسی صحابی سے سنا ہو، ہر دو صورت میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"دل کے دو حصے ہیں... دل ایک پمپ ہے... یہ صرف گوشت کا

**غلط فہمی** | ایک لو تھڑا ہے جو ہاتھ پاؤں کی طرح لذت والہم کا احساس نہیں کرتا۔



نہ ہی وہ خیر و شر کا محرک، تمام افکار، جذبات، خیالات اور تصورات کا مرکز دماغ ہے۔ خیر و شر کی تحریک یہیں پیدا ہوتی ہے اور ارادے یہیں بندھتے ہیں۔ اگر جبریل کا مقصد مینع شر کو مٹانا تھا تو دماغ کو چیرتا نہ کہ دل کو۔۔۔ اور دماغ کا مسکن کھوپری ہے نہ کہ سینہ“ (دوا سلام ص ۷۵-۷۶)

ازالہ | ڈاکٹر سید محمد جمیل اور محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں:-

”دل انسانی جسم میں سرمایہ حیات ہے اگر کسی چوٹ کی وجہ سے دل کی حرکت بند ہو جائے تو فوراً موت واقع ہو جاتی ہے (علم الابدان ص ۱۹۲) ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دل کی حرکت بند ہو جائے اور انسان زندہ رہے اور اس کا دماغ رنج و الم، غصہ و گھبراہٹ وغیرہ کا احساس کرتا رہے، ہاں ایسا ہوتا ہے کہ دماغ بے کار ہو جائے لیکن دل اپنا کام کرتا رہے اور انسان ایک عرصہ تک زندہ رہے۔

## قرآن مجید کی تائید

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِيلِ فَإِنَّهُ  
نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ  
(البقرة: ۹۷)

(اے رسول) کہہ دیجئے کون شخص جبریل کا  
دشمن ہو سکتا ہے کیونکہ جبریل تو وہ ہے جس  
نے یہ قرآن آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے

بتائے جب تمام افکار، جذبات، خیالات اور تصورات کا مرکز دماغ ہے تو قرآن مجید کا نزول دماغ پر ہونا چاہیے تھا نہ کہ دل پر۔ جب دل کو لذت و الم کا احساس نہیں ہوتا، نہ وہ خیر و شر کا محرک ہے اور محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے تو اس پر قرآن مجید کا نزول کیا معنی رکھتا ہے۔ جو اعتراض حدیث پر تھا وہی قرآن مجید پر ہوگا۔ ہاں اگر تاویل کر کے آیت میں دل کے معنی دماغ کئے جائیں تو پھر انصافاً بتلیئے، کیا اس قسم کی تاویل حدیث میں نہیں ہو سکتی لیکن اس تاویل سے حقیقت کو نہیں بدلا جاسکتا کیونکہ دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت ہے۔

ارشاد باری ہے:-

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (الاعیان)  
ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے:-

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ  
وَمَا يُعْلِنُونَ (النمل: ۷۴)

اور بے شک آپ کا رب جانتا ہے جو ان کے سینہ  
چھپاتے ہیں اور جس چیز کو یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں



اس قسم کی آیات قرآن مجید میں بیسیوں مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ افکار اور خیالات کا مرکز سینہ ہے۔ اب بتائیے سینہ میں دل ہے یا دماغ؟ لاہر ہے کہ سینہ میں تو دل ہی ہے، تو پھر مرکز خیال دل ہوا نہ کہ دماغ، کیونکہ دماغ تو کھوپری میں ہے۔ ایک اور آیت سنئے :-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا  
(الاعراف ۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں لیکن وہ ان کے ذریعہ سمجھتے نہیں۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ افکار و تفقہ کا مرکز دل ہے نہ کہ دماغ۔ قرآن مجید میں اس قسم کی آیات بار بار آئی ہیں لیکن کہیں بھی دماغ کا لفظ استعمال نہیں ہوا پھر اس دل کی جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے اتنے واضح طریقہ پر متعین فرمادی کہ جس سے تمام تاویلات کا سد باب ہو گیا۔ سنئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُوا  
لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ  
يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى  
الْبُصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ  
الَّتِي فِي الصُّدُورِ  
(الحججہ :- ۱۷۹)

تو کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر و مباحثہ نہیں کی کہ ان کے دل ایسے ہوتے کہ ان کے ذریعہ سمجھتے یا کان ایسے ہوتے جن سے سنتے کیونکہ (نہ سمجھنے والوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں۔

کتنی واضح آیت ہے اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ عقل و افکار کا مرکز دل ہے نہ کہ دماغ اور یہ کہ دل سینہ میں ہے نہ کہ کھوپری میں۔ اس آیت کی موجودگی میں حدیث پر اعتراض لا یعنی ہے۔ کیا ان آیات کو پڑھ کر نفوذ باللہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ رسول اور جبریل ہر سہ دل و دماغ کی ساخت اور ان کے اعمال سے نا آشنا تھے، ہرگز نہیں۔ درحقیقت بات یہی ہے اور قرآن مجید و احادیث کی روشنی میں ہمارا ایمان بھی یہی ہے کہ دل ہی عقل و سمجھ، جذبات و تصورات کا مرکز ہے، جدید سائنس نے جو کچھ کہا ہے اس پر ہمارا ایمان نہیں۔ اس یقینی علم کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں کیونکہ بارگاہ الیسا ہو چکا ہے کہ سائنس کی دنیا میں اصول بنے اور بگڑے۔ ایک عصر تک تسلیم کئے گئے اور پھر مسترد کر دیئے گئے۔ اگر سائنس کا بیان صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ دماغ محض ذریعہ اور آلہ ہے جس طرح کان، آنکھ، ناک دماغ کے لئے آلات کا کام دیتے ہیں بالکل اسی طرح دماغ دل کے لئے آلہ کا کام کرتا ہے۔ دماغ کے ذریعہ احساسات دل کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور دل کے اندر جو روحانی قوت موجود ہوتی ہے وہ ان کا



اور اک کرتی ہے۔ اگر بظاہر دل ایک لو تھڑا ہے تو دماغ بھی بظاہر ایک گودے کے سوا اور کچھ نہیں اگر وہ ادراک نہیں کر سکتا تو یہ کیسے کر سکتا ہے اور اگر یہ کر سکتا ہے تو اس کے کرنے پر تعجب کیوں؟ دل کی روحانی قوت دماغی آلات پر حکومت کرتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے دل کو تمام اعضا کا بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے ہو سکتا ہے مستقبل قریب میں سائنس کے ذریعہ اس سلسلہ میں مزید انکشافات ہوں اور اصل حقیقت سامنے آجائے۔ سائنس کے مزعومات سے فوراً مرعوب ہو جانا شکست خوردہ ذہنیت ہے، سائنس تو خود سرگردانی کے عالم میں پھر پھیرا کر بالآخر شریعت کی مطابقت کرتی ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ ایسا ہی ہوتا ہے گا۔

### حدیث مذکور اور مزید غلط فہمیاں

اس حدیث پر برق صاحب نے تین مادی اعتراض کئے ہیں ان کا جواب اتنا ہی کافی ہے کہ ”فَعَالٌ لِّمَآ يُرِيدُ“ (۱۶) ”اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے“ روحانی باتوں کو مادی ترازو میں تولنا کوئی مناسب فعل نہیں بہر حال برق صاحب کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ جب خطا کاری کی استعداد ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محروم کر دیا گیا تو پھر آپ کی تقدس مآب زندگی کوئی قابلِ فخر چیز نہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ حدیث میں جس چیز کو شیطان کا حصہ بتایا گیا ہے اس کو واپس دل میں نہ لانے کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے لہذا اعتراض کا لعدم ہے۔ اب ذرا قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے، ارشاد باری ہے۔

اور بے شک اس عورت نے (یوسف علیہ السلام) سے بد فعلی کا ارادہ کیا تھا اور اگر وہ رب کی برائی کو نہ دیکھتے تو وہ بھی اس عورت سے بد فعلی کا ارادہ کر لیتے۔ یہ اس لئے ہوا کہ ہمیں یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی سے بچانا ہی مقصود تھا بے شک وہ ہمارے مخلص

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ  
كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ  
وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ

(یوسف: ۲۲)

بندوں میں سے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کسی ذریعہ سے بچایا اور جب بے حیائی سے بچانے کا ذریعہ خود اللہ تعالیٰ نے مہیا فرمایا تو پھر یوسف علیہ السلام کی مقدس و مطہر باعصمت زندگی کوئی قابلِ فخر چیز نہیں رہی۔ اسی سورت میں آگے ارشاد ہوتا ہے:-

اِنَّ النَّفْسَ لَآ مَآرَآةً بِالسُّوْءِ  
بے شک نفس برائی کا حکم دیتا ہے مگر جس پر



إِلَّا مَا رَجَوْنِي (یوسف: ۵۳) میرے رب کا رحم و کرم ہو جائے۔  
گویا برائی سے بچنا بھی اللہ کے رحم و کرم پر موقوف ہے، اب اگر کوئی شخص برائی سے بچ جائے تو اس آیت کی رو سے اس نے کون سا کمال کیا کہ جس پر فخر کیا جائے۔

برق صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اللہ ماں کے پیٹ ہی میں ایسی ساخت بنا سکتا تھا کہ گناہ کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو، ہم کہتے ہیں کہ شوقِ صدر سے ساخت میں تبدیلی ہی کہاں ہوئی۔  
لہذا اعتراض مندرج ہے۔ اب قرآن مجید کی سیئے وہ کیا کہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر کے ذریعہ ایک لڑکے کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ کہیں بڑا ہو کر اپنے نیک ماں باپ کو سرکشی میں مبتلا نہ کر دے۔ آیت ملاحظہ فرمائیے:-

وَأَمَّا الْفُلَّامُ نَكَنَ أَبُو الْأُمَمِيِّينَ  
فَخَشِينَا أَنْ يُزْهِقَهُمَا طُغْيَانًا  
وَكُفْرًا (الكهف: ۸۰) اور لڑکے کو اس لئے قتل کیا کہ اس کے ماں باپ مؤمن تھے ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا نہ کر دے۔

کیا اس واقعہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ ایسے بچے کو پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی جس کو قتل کرانا مقصود تھا، پھر ان ماں باپ کی مقدس زندگی کس طرح قابلِ فخر و ستائش سمجھی جاسکتی ہے جن کے لئے گناہ میں مبتلا کرنے والی چیز ہی باقی نہیں رہی۔ نہ معلوم بغیر آزمائش کے اللہ تعالیٰ ان پر کیوں ایسا مہربان تھا کہ ان کے ننھے معصوم بچے کو قتل کر دیا بغرض یہ کہ اعتراض کی گنجائش تو ہر جگہ باقی رہتی ہے مگر اللہ تعالیٰ ایسے اعتراضات سے محفوظ رکھے کہ جن کی زد سے نہ قرآن بچ سکے نہ حدیث۔

برق صاحب کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ پانی سے مرکز گناہ کو دھونا بھی عجیب و غریب ہے۔  
دھونے سے گناہ کیسے ختم ہو جائیں گے اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے کہ روحانیات میں مادی اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں، پھر حدیث میں یہ کہاں ہے کہ وہ حصہ اس لئے دھویا گیا کہ آئندہ اس سے گناہ سرزد نہ ہوں یا گندہ شے گناہ مٹ جائیں۔ حدیث میں اس شیطانی حصہ کو دھونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ دل کو دھونے کا ذکر ہے۔ حدیث کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

شَقَّ عَنْ قَلْبِهِ فَاسْتَخْرَجَ الْقَلْبَ  
فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ عِلْقَةً فَقَالَ هَذَا حِطُّ  
الشَّيْطَانِ مِنْكَ ثُمَّ غَسَلَهُ فَوُطِئَتْ  
مِنْ ذَهَابٍ بِمَاءٍ زَمْزَمٍ ثُمَّ لَأَمَهُ  
ثُمَّ أَعَادَ فِي مَكَانِهِ  
حضرت حیریل نے آپ کے دل کو چیرا پھر  
دل کو باہر نکالا اور اس میں سے ایک علقہ  
نکالا اور کہا کہ یہ آپ کے دل میں شیطان کا  
حصہ ہے۔ پھر دل کو سونے کے ٹکڑے میں  
آبِ زَمْزَم سے دھویا پھر دل کے ٹکڑے کو



(صحیح مسلم) ملا دیا، پھر دل کو اس کی جگہ پر رکھ دیا۔  
یہی وہ دل ہے جس کو مستقبل میں مہبطِ وحی بنا تھا لہذا اس کی نورانیت کے لئے پہلے سے  
انتظامات ہوئے تھے۔ ان انتظامات سے اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت تھی۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | مغیرہ شعبی، اعمش اور قاسم جیسے علمائے تابعین جمع احادیث، کونا جائز سمجھتے

رہے (دو اسلام ص ۷۷)

**ازالہ** | امام شعبیؒ کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

مَا كُنْتُ سَوَادَ فِي بَيَاضٍ قَطُّ وَمَا سَمِعْتُ

مِنْ رَجُلٍ حَدِيثًا قَارَدْتُ أَنْ يُعِيدَ لِي

عَلَى (جامع بیان العلم)

امام شعبی اپنے حافظہ کی تعریف کر رہے ہیں، اس سے یہ کہے معلوم ہوا کہ وہ جمع احادیث

کے خلاف تھے۔

امام مغیرہ اور امام اعمش کے اقوال ثابت نہیں کیونکہ ان کی سند میں ایک راوی عمر بن

محمد بھی مہول ہے (برق اسلام ص ۱۰)

امام قاسم کی روایت ثابت نہیں، اس کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن یونس مہول الحال

ہے، مزید برآں امام قاسم کے اصل الفاظ یہ ہیں اِنَّهُ كَانَ لَا يَكْتَلِبُ الْحَدِيثَ يَعْنِي رَدِّ حَدِيثٍ

نکلتے نہیں تھے۔ ان الفاظ سے ان کے حافظہ کی قوت ظاہر ہوتی ہے نہ یہ کہ وہ جمع احادیث

کے خلاف تھے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”جن احادیث کو مشتبہ سمجھ کر فاروق و صدیقؓ جلا رہے تھے وہ اڑھائی سو

برس بعد کیسے صحیح بن سکتی تھیں“ (دو اسلام ص ۷۹)

**غلط فہمی**

صدیقی اور فاروقی دور میں ہرگز ایسا نہیں ہوا جو روایت بیان کی جاتی

ہے وہ سراسر کذب و افتراء ہے۔ تفصیل کے لئے بابِ اول ملاحظہ ہو۔

**ازالہ**

علامہ محمد طاہر گجراتی نے اپنی مشہور تصنیف ”قانون الاخبار المضمومة وارسا“

الضعفاء میں تقریباً دو ہزار ایسے اشخاص کے نام دیئے ہیں جو زندگی

**غلط فہمی**

بھر احادیث گھڑتے رہے (دو اسلام ص ۷۹)



**ازالہ** | دو ہزار کی تعداد صحیح نہیں، کتاب مذکور میں تقریباً ایک ہزار راویوں کا حال ہے جن میں سے اکثر ضعیف ہیں اور صرف چند ایسے ہیں جو احادیث گھڑتے تھے، کتاب کا نام جو برق صاحب نے تحریر فرمایا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ضعیف راویوں کا حال بھی ہے یعنی ایسے راویوں کا بھی حال ہے جو صادق تو تھے لیکن حافظہ کے کمزور تھے۔ برق صاحب نے راویوں کو گنا نہیں محض اندازے سے دو ہزار کی تعداد لکھ دی اور غلط فہمی سے متعاقب کو دنایع سمجھ لیا۔

**غلط فہمی** | برق صاحب نے چند واضعین حدیث کے نام لکھ کر یہ شبہ وارد کیا ہے کہ ان کی وضع کردہ احادیث صحاح ستہ میں داخل ہو گئیں۔

(ادو اسلام ص ۷۹)

**ازالہ** | جن واضعین کے نام برق صاحب نے لکھے ہیں، ان سے کوئی روایت صحاح ستہ میں نہیں ہے اور اگر بالفرض محال ہوتی بھی تو اس متن کے ساتھ اس کی سند میں اس واضع کا نام بھی موجود ہوتا تو پھر بتلیے دھوکا کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کا نام آتے ہی وہ حدیث، حدیث نہیں رہتی، جن کتب میں ایسی احادیث جمع کی گئی ہیں، وہ ان گھڑنے والوں کے نام بھی موجود ہیں۔ لہذا کوئی شخص ان کی جعل سازی سے دھوکا نہیں کھا سکتا، برق صاحب یاد رکھیے، محدثین اس حدیث پر فتنی بحث ہی نہیں کرتے جو موضوع ہوتی ہے۔ محدثین تو صحیح سند سے ثابت شدہ متن کی تحقیق میں اپنا سارا زور خرچ کرتے ہیں۔ موضوع حدیث کا تو مقام ہی علیحدہ ہے۔ آپ نے غلط فہمی سے دونوں کو خلط ملط کر دیا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | صحاح ستہ میں بعض ایسی احادیث راہ پاچگی ہیں جو نہ عرف قرآن سے متصادم ہوتی ہیں بلکہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند علم و عظیم المرتبت شخصیت بے مثال کردار کے سخت منافی ہیں (ادو اسلام ص ۷۹)

**ازالہ** | صحاح ستہ میں ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں اگر غلط فہمی سے کسی حدیث کا ایسا مطلب لے لیا جائے تو پھر تو یہ قرآن مجید کی آیات کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں برق صاحب ایسی احادیث پیش کریں گے وہیں ہم بھی اس قسم کی آیات کی نشاندہی کر سینگے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | مولانا عبید اللہ سندھی نے فرمایا تھا، میں ایک یورپین نو مسلم کو کتاب



بخاری کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ اس کی وجہ میں مجلس عام میں نہیں بتا سکتا (دو اسلام ص ۷۹-۸۰)  
 اول تو معلوم نہیں کہ عبید اللہ سندھی کا یہ قول ان کی کس کتاب میں ہے۔

**ازالہ** | صرف رسالہ "الفرقان" کا حوالہ اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

دوم عبید اللہ سندھی کا شمار ذی علم ہستیوں میں نہیں لہذا اگر وہ صحیح بخاری کو نہ سمجھ سکے  
 ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ایسی صورت میں ان کا قول کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | احادیث تراشی میں بڑے بڑے "بزرگان قوم" شامل تھے (دو اسلام ص ۸۱)

برق صاحب! ان کو بزرگان قوم کون کہتا ہے عوام جو چاہیں کہیں، کسی کو

**ازالہ** | علامہ کہہ دیں اور کسی کو قاضی کہہ دیں مگر محدثین کی فہرست میں یہ لوگ بزرگان

قوم میں شمار نہیں ہوتے بلکہ مشہور کذاہین کی فہرست میں داخل ہیں، لہذا صحیح احادیث ان  
 کے دھود سے پاک ہیں۔



## باب ۳

### چند عجیب راوی و صحابہ

**غلط فہمی** | برق صاحب نے صفحہ ۸۷ پر ایک موضوع حدیث جماع کے بعد غسل کرنے کی فضیلت میں نقل کی ہے اور صفحہ ۸۸ پر ایک موضوع حدیث کلمہ پڑھنے کی فضیلت میں نقل کی ہے اور ان دونوں احادیث پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔

**ازالہ** | برق صاحب! آپ کو تعجب کس پر ہے، گھڑنے والے پر یا محمد شین پر، اگر گھڑنے والے پر ہے تو ہم بھی آپ کے شریک ہیں اور اگر محمد شین پر ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ محمد شین نے بہت پہلے ان کو جعلی کہہ دیا تھا۔ آپ تو آج ان کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن محمد شین نے بڑی متانت سے پہلے ہی دن ان کی حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا لہذا محمد شین پر تعجب کرنا خود تعجب خیز ہے۔

**غلط فہمی** | آگے چل کر برق صاحب نے چند جھوٹوں کا تذکرہ کیا ہے کہ ان لوگوں نے کئی سو سال بعد صحابی ہونے کا دعویٰ کیا مثلاً قیس بن تیم، سرہانک، جیسر بن حرب، ابو عبد اللہ محمد العقلی، جعفر بن نظور، بابارتق ہندی۔ ان لوگوں کا ذکر کرنے سے پہلے برق صاحب لکھتے ہیں:۔

”اب ذرا سوارخ میں ان کی حقیقت نگاری کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے“ (دو اسلام ص ۸۸)

آگے چل کر سرہانک کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

”حیرت ہے کہ جب اسحاق بن ابراہیم ستہ کے قریب سرہانک سے ملاقاتی ہوا تھا تو اس



کی عمر سات سو و ستر برس تھی اور ۲۳۳ھ یعنی ۳۶۸ برس پہلے اس کی عمر ۸۹ سال تھی۔ ریاضی کے ان محدثانہ نکات کو ہم جیسے بے علم کیا سمجھیں۔ (رد اسلام ص ۹)

برق صاحب! یہ حقیقت نگاری محدثین کی نہیں ہے بلکہ وہ جالین و کذابین کی ہے۔ محدثین نے تو بہت پہلے ہی ان کو کذابین کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ ان سب لوگوں کا مفصل مال آپ کو تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۰۲ تا صفحہ ۱۰۸ میں ملے گا۔ ریاضی کی یہ خطیاں افسوس ہے کہ آپ ان کو محدثین کی طرف منسوب کر رہے ہیں حالانکہ محدثین کے پاس ایسا زبردست معیار ہے جس کی بنیاد پر وہ آنکھ بند کر کے ان مدعیانِ صحبتِ نبوی کے کذب پر قسم کھا سکتے ہیں اور اسی معیار پر رکھ کر محدثین نے ان کے کذاب ہونے کی صراحت کی ہے۔

دوم: ایک بات اور یاد رکھیے وہ یہ کہ یہ دُجال سب کے سب تدوینِ حدیث کے دور کے بعد ظاہر ہوئے لہذا حدیث کے معتبر و ادین ان کی من گھڑت خرافات سے پاک ہیں۔ محدثین کا وہ زبردست معیار جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ صحیح حدیث ہے جو درج ذیل ہے۔ وفات سے کچھ دن پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

أَرَأَيْتُمْ لَيَلَنَتُمْ هَذِهِ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ  
مِنْهَا لَا يَبْقَى مِثْنٌ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ  
أَحَدٌ

(صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب ذکر الشاء العتمة) رہے گا۔

اس معیار پر مدعیانِ صحبتِ نبوی پورے نہیں اترے لہذا محدثین نے فوراً انہیں کذاب کہہ دیا۔ برق صاحب لکھتے ہیں:۔

علامہ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ ”بایارقن ہندی کی وفات ۶۳۲ھ  
۲۳۸ھ میں ہوئی تھی لیکن محدثین کی ایک خاص تعداد سے صحابی  
سمجھ کر اس کی احادیث روایت کرتی ہے۔ جب علامہ ذہبی نے بایارقن کی روایات  
کو جھوٹا قرار دیا تو قاموس کے مصنف علامہ مجدالدین فیروز آبادی (وفات ۸۱۴ھ) کو  
اس قدر صدمہ پہنچا کہ انہوں نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لیے۔“

(رد اسلام ص ۹)

یہ بات قطعاً صحیح نہیں کہ محدثین کی ایک خاصی تعداد بایارقن کو صحابی سمجھ کر اس کی احادیث روایت کرتی ہے ہاں ملفوظاتِ خواجگان کو اگر آپ کتبِ حدیث



سمجھ بیٹھے ہیں تو پھر بات ہی دوسری ہے۔ محدثین کے نزدیک تو یہ ملفوظات بھی خرافات سے مملو ہیں۔ پھر یہ ملفوظات بہت بعد کی پیداوار ہیں، محدثین سے ان کا کوئی تعلق نہیں بابا رتن خود دورِ تدوینِ حدیث کے بہت عرصہ بعد ظاہر ہوا تھا لہذا اس سے محدثین کا حدیثِ روایت کرنا عقلاً محال ہے۔ متاخرین نے جہاں ان لوگوں کی تردید کی ہے وہیں سے برق صاحب یہ افسانے نقل فرما رہے ہیں اور حیرت ہے کہ تردید کرنے والوں کو ان چیزوں کا ماننے والا سمجھ رہے ہیں پھر یہ بھی غلط ہے کہ علامہ مجدالدین نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لئے تھے برق صاحب نے بے حوالہ اس کو نقل کیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ علامہ مجدالدین نے بابا رتن کو صحابی تسلیم کیا۔ ایک طرف تو برق صاحب جامعینِ حدیث کا تذکرہ کرتے ہیں اور نام لیتے ہیں علامہ مجدالدین کا حالانکہ علامہ مجدالدین جامعینِ حدیث میں سے نہیں ہیں اور نہ تدوینِ حدیث سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ علامہ ذہبی نے رتن کے وجود پر تردد کا اظہار کیا تو علامہ مجدالدین نے اس تردد کا انکار کیا اور کہا ایسا شخص یقیناً ہوا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ علامہ مجدالدین نے اس کے دعویٰ صحابیت میں اس کو سچا سمجھا، تذکرۃ المصنوعات میں جہاں سے برق صاحب نے یہ چیزیں نقل کی ہیں، اس چیز کی وضاحت موجود ہے ملاحظہ فرمائیے:

قَالَ ابْنُ حَبَرٍ رَأَيْتُ شَيْخَنَا مَجْدَالِدِينَ  
صَلَحَتِ الْقَامُوسُ يُنْكِرُ عَلَى الذَّاهِبِي  
إِنْكَارًا وَجُودَ رَتْنٍ وَذَكَرَ أَنَّهُ دَخَلَ فِي  
ضَبْعَتَيْنِ فِي الْهِنْدِ وَوَجَدَ فِيهِمَا مَنْ لَا  
يُحْصِي كَثَرَةً يَنْقَلُونَ قِصَّةَ رَتْنٍ  
عَنْ آبَائِهِمْ وَأَسْلَفِهِمْ قُلْتُ هُوَ لَمْ  
يَجْزَمْ بَعْدَ مَرَبِلٍ تَزِدُّ دَقَالَ وَالظَّاهِرُ  
أَنَّهُ كَانَ طَوِيلَ الْعُمُرِ فَادْعَى وَتَمَادَى  
عَلَيْهِ حَتَّى اشْتَهَرَ وَلَوْ كَانَ  
صَادِقًا لَا اشْتَهَرَ فِي الْبَاعَةِ  
الثَّانِيَةِ أَوِ الثَّلَاثَةِ وَلَكِنْ لَوْ  
يُنْقَلُ عَنْهُ شَيْءٌ إِلَّا فِي أَحَدٍ  
الْبَاقِيَةِ لِشَادِسَةٍ ثُمَّ فِي آدِلِ  
السَّابِعَةِ قَبْلَ مَوْتِهِ

علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ ذہبی نے بابا رتن کے وجود کا انکار کیا تو ہمارے استاد مجدالدین نے اس انکار کی تردید کی۔ وہ کہتے تھے کہ میں ہندوستان کی ایک بستی میں گیا تو مجھے لا تعداد ایسے آدمی ملے جو اپنے آبا و اجداد سے رتن کا قصہ روایت کرتے تھے۔ ابن حجر کہتے ہیں میں کہتا ہوں علامہ ذہبی نے رتن کے وجود کا انکار نہیں کیا بلکہ تردد کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی عمر طویل تھی لہذا اس نے صحابی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ خبی کہ وہ مشہور ہو گیا۔ اگر وہ سچا ہوتا تو دوسری یا تیسری صدی ہجری میں بھی مشہور ہوتا لیکن اس سے کوئی چیز نقل نہیں ہوئی مگر چھٹی صدی کے آخر میں پھر ساتویں صدی کے شروع میں اس کی موت



(تذکرۃ الموضوعات ص ۱۰۶-۱۰۷) سے کچھ حصہ پہلے۔

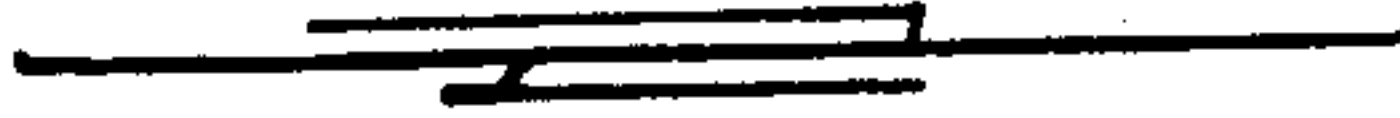
عبارت بالا سے ظاہر ہے کہ علامہ ذہبی نے ایک زبردست معقول دلیل سے بیارتن کے کذاب ہونے کا ثبوت دیا۔ علامہ نجد الدین کو غلط فہمی ہوئی کہ وہ یہ سمجھ گئے کہ علامہ ذہبی اس کے وجود کے منکر ہیں لہذا انہوں نے تردیداً کہا کہ وجود تو ضرور تھا اس لئے کہ لاتعداد لوگ اس کے وجود کی شہادت دیتے تھے۔

## خلاصہ باب سوئم

الغرض بعض جاہل ملاؤں نے ان مدعیان صحابیت کے دعویٰ کو سچ سمجھ لیا ہو تو دوسری بات ہے۔ شارحین حدیث اور محققین نے ان کی تکذیب کی اور ان پر سخت تنقید کی اور یہ برق صاحب کو بھی تسلیم ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”بحمد اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گئے تھے۔ جنہوں نے ایسے تمام واقعات پر سخت تنقید کی ہے فجرا احمد اللہ احسن الجزاء۔ (دو اسلام ص ۹)





## باب

# کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** ”حضرت عائشہ فرماتی ہیں، حضرت انس اور حضرت ابوسعید خدری حدیث

رسول سے محض ناواقف ہیں اس لئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی

میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔“ (دوا سلام ص ۹۴)

یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر افتراء ہے، اس کی سند منقطع ہے (جامع

**ازالہ** بیان العلم جلد ۲ ص ۱۵۴) دوم یہ کہ یہ عقلاً بھی محال ہے، اس لئے کہ ان ہر دو صحابیوں

کی عمر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یقیناً زیادہ تھی، لہذا وہ کم سنی کا اعتراض نہیں کر سکتیں۔

سوم یہ کہ ان دونوں صحابیوں کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ۲۰ سال

سے کچھ زائد ہی تھی اور یہ عمر اتنی کم نہیں ہے کہ احادیث کی حفاظت نہ ہو سکے، اس عمر میں آج کل،

ایم۔ اے اور ایم۔ ایس سی پاس کر لیتے ہیں اور سات آٹھ برس کے بچے پورا قرآن حفظ کر لیتے

ہیں تو اس زمانہ میں جب کہ حافظہ کئی گنا تھا، احادیث کو محفوظ کر لینا کیا بعید ہے، یہی حضرت

ابوسعید خدریؓ ہیں جن کو صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ حدیث کی تصدیق کرنے

کے لئے حضرت عمرؓ کی خدمت میں روانہ کیا تھا، اور یہ کہہ کر روانہ کیا تھا کہ ”ہماری قوم کا سب سے

چھوٹا آدمی اس کی تصدیق کرنے جاؤ گا“ اس نوجوان کو وہ حدیث معلوم تھی جو حضرت عمرؓ کو معلوم نہ

تھی، یہ وہ نوجوان ہے جس پر حضرت عمرؓ نے اعتماد کیا تھا اور اس کی شہادت کو تسلیم کیا تھا تفصیل کے

لیے باب اول ملاحظہ ہو، اور حضرت انسؓ وہ نوجوان صحابی ہیں جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

نے تحصیل دار بنا کر بحرین روانہ کیا تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، ان نوجوان صحابیوں پر حضرت



ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تو اعتماد کریں اور آپ ان پر اعتماد نہ کریں، یہ کس قدر حیرت کا مقام ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | ”ایک آدمی نے وتر کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث پڑھی،

ابن عمرؓ نے فرمایا کَذَبَ أَبُو هُرَيْرَةَ (ابوہریرہ جھوٹا ہے) ”دو اسلام ص ۹۵

کذب کے معنی اگر ”جھوٹ“ کے ہی لئے جائیں تو ”کذب ابوہریرہ“ کے صحیح معنی یہ ہوں گے  
ازالہ | کہ ”ابوہریرہ نے جھوٹ کہا“ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ”ابوہریرہ جھوٹا ہے“ محاورہ کے لحاظ سے  
ان دونوں جملوں میں بہت فرق ہے ”ابوہریرہ جھوٹا ہے“ یہ بہ نسبت ”ابوہریرہ نے جھوٹ کہا“ کے  
زیادہ قبیح ہے، معلوم نہیں غلط اور پھر زیادہ قبیح معنی کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ ہو سکتا ہے کہ  
غلط فہمی ہو گئی ہو۔

صدق اور کذب کا استعمال محض سچ اور جھوٹ ہی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ صدق کا استعمال صحیح نتیجہ  
پر پہنچ جانے کے لئے بھی ہوتا ہے اور کذب کا استعمال غلطی کر جانا، خطا کر جانا کے معنوں میں بھی ہوتا  
ہے، عرب کا محاورہ ہے کہ اگر تیر نشانہ پر بیٹھ جائے تو ”صدق“ استعمال کرتے ہیں اور اگر خطا کر جائے تو  
”کذب“ استعمال کرتے ہیں، لہذا ”کذب ابوہریرہ“ کے صحیح معنی یہ ہوئے کہ ”ابوہریرہ سے خطا ہو گئی“  
علامہ احمد عبدالرحمن البنا الشمیر بالساعاتی لکھتے ہیں :-

”وَمَعْنَى قَوْلِهِ كَذَبَ أَيْ أَخْطَأَ وَهُوَ  
لَعْنَةُ أَهْلِ الْحِجَازِ  
کَذَبَ کے معنی ”خطا کی“ اور یہ اہل حجاز  
کی لغت ہے۔

(بلوغ الامانی علی فتح الربانی (مسند احمد) ج ۳ ص ۳۰۲)

امام باجی کہتے ہیں :-

أَيْ وَهُوَ وَخَلَطَ (بلوغ الامانی ج ۳ ص ۲۷۴) یعنی وہم ہو گیا، غلطی ہو گئی۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں :-

كَذَبَتْ أَيْ أَخْطَأَتْ لِأَنَّ أَهْلَ الْحِجَازِ  
يُطْلِقُونَ الْكَذِبَ فِي مَوْضِعِ الْخَطَا  
كَذَبَتْ کے معنی ہیں ”تُو نے خطا کی“ یہ  
اہل حجاز کی لغت ہے۔

(فتح الباری شرح معجم بخاری جلد ۱۰، کتاب فضائل القرآن باب اتزل القرآن علی

سبعة احرف)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | جب حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث پڑھی

”صَلَاةُ الْبَيْتِ مَثْنِي مَثْنِي وَإِذَا خَشِيتُ الصُّبْحَ فَوَاحِدَةً“ یعنی رات کی نماز دو



رکعت ہے، اور جب صبح قریب آجائے، تو ایک رکعت (یعنی وتر) ادا کرو، تو آپ نے فرمایا "کذب ابن عمر" ابن عمر جھوٹا ہے، (دو اسلام ص ۹۵) یہاں بھی ترجمہ غلط کیا گیا ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ "ابن عمر سے خطا ہو گئی" حضرت عائشہ ازالہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے شایان شان یہی معنی ہیں، ایک اور موقع پر حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا تھا۔

يَغْفِرُ اللَّهُ لِإِبْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَمَّا أَنْتَ  
لَمْ يَكْذِبْ وَلَكِنْ نَسِيَ أَوْ أَخْطَأَ (صحیح)  
اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمن (یعنی ابن عمر) کو معاف فرمائے۔ جھوٹ تو وہ نہیں بولتے لیکن وہ بھول گئے یا ان سے خطا ہو گئی۔  
اسلامیاب الیت یعذب بکاء اہلہ علیہ)  
یہ حدیث بالکل صحیح ہے، اس میں حضرت عائشہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے جھوٹ نہ بولنے کی صراحت کر رہی ہیں، لہذا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ وہ کسی دوسرے موقع پر انہیں جھوٹا سمجھیں، لہذا برق صاحب کی وارد کردہ روایت محل نظر ہے۔

خود حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی یہ حدیث انہی معنوں میں مروی ہے، وہ فرماتی ہیں۔

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصَلِّي  
أَحَدًا عَشْرَةَ رَكْعَةً يَسْلَمُ  
بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُؤَنِّدُ بِوَاحِدَةٍ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رات کو گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے، آپ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے اور ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری، وصحیح مسلم)

اس حدیث کی موجودگی میں کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بیان کردہ حدیث کو غلط سمجھا۔ لہذا برق صاحب کی بیان کردہ روایت باطل ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی

جب حضرت عمر بن خطاب کی یہ حدیث "ان الیت لیعذب بکاء اہلہ علیہ" کہ میت پر رونے سے میت کو سزا ملتی ہے، حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا، اللہ عمر پر رحم کرے، کیا اس نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (بخاری و مسلم) مسلم نے یہ حدیث چھ مرتبہ، چھ صحابہ سے روایت کی ہے۔۔۔۔۔ حضرت عائشہؓ نے گویا سب کی تردید فرمادی (دو اسلام ص ۹۵)

ازالہ حضرت عائشہؓ نے تردید تو بے شک کی، لیکن کتنے پیارے انداز میں۔



کَتَابُ بَلْعَ عَائِشَةَ قَوْلَ عُمَرَ وَابْنِ  
عُمَرَ قَالَتْ إِنَّكُمْ لَتَحَدِّثُونِي عَنْ  
غَيْرِ كَاذِبِينَ وَلَا مَكْذُوبِينَ وَلَكِنْ  
السَّمْعُ يُحْطِئُ (صحیح مسلم)

جب حضرت عائشہؓ کو حضرت عمر اور حضرت ابن عمرؓ  
روایت کردہ حدیث پہنچی تو انہوں نے کہا تم ایسے  
آدمیوں سے حدیث بیان کر رہے ہو جو نہ جھوٹے ہیں  
نہ جھٹلائے جاسکتے ہیں مگر سننے میں غلطی ہو سکتی ہے

پھر فرماتی ہیں "یرحم اللہ عمر" اللہ عمر پر رحم فرمائے، عبد اللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا "یغفر اللہ  
لربی عبد الرحمان" اللہ ابن عمرؓ کو معاف فرمائے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے تردید میں صرف قرآن مجید کی آیت ہی پیش نہیں فرمائی، بلکہ  
حدیث بھی پیش کی۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ يُعَذِّبُ الْمُتَوَمِّلِينَ

بے شک اللہ متوہمین پر کسی دوسرے کے نوحہ کی وجہ سے

عذاب کرتا ہے

بِسَاءِ أَحَدٍ

بلکہ یہ فرمایا تھا۔

بے شک اللہ کافر پر اس کے اہل کے نوحہ کرنے

لَإِنَّ اللَّهَ يُزِيدُ الْكَافِرَ عَذَابًا بِبُكَاءِ

أَهْلِهِ عَلَيْهِ (صحیح مسلم)

کی وجہ سے عذاب زیادہ کر دیتا ہے

حضرت عائشہؓ نے جو کچھ سنا تھا، اس کو اپنی دلیل میں پیش فرمایا، اور پھر قرآن مجید  
کی آیت تلاوت فرمائی، کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، لیکن حضرت عائشہؓ  
نے جو حدیث پیش کی وہ بھی اس آیت کے خلاف ہے اور حضرت عمرؓ کی حدیث بھی اس  
آیت کے خلاف ہے، حدیث دونوں نے پیش کی، اور ایسی حالت میں پیش کی کہ وہ بظاہر  
قرآن مجید کی آیت سے ٹکراتی تھی، ان میں سے کسی نے بھی صرف قرآن مجید کی مخالفت کی  
وجہ سے حدیث کو مسترد نہیں کیا، اور نہ یہ صحابہ کرامؓ کا دستور تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کیا سمجھیں اور انہوں نے کیوں تردید کی، امام

نوی لکھتے ہیں۔

جمہور نے کہا ہے کہ یہ اہل عرب کی عادت تھی

کہ وہ اس کی وصیت کرتے تھے طرفہ بن عبد کا

قول بھی اسی قبیل سے ہے وہ کہتا ہے۔ جب

میں مرجاؤں تو مجھ پر ایسا نوحہ کرنا جس کا میں

اہل ہوں اور اے معبد کی بیٹی میرے غم میں

گر بیان چاک کرنا۔

وَقَالُوا كَانَ مِنْ عَادَةِ الْعَرَبِ الْوَصِيَّةُ

بِذَلِكَ وَمِنْهُ قَوْلُ طَرَفَةَ بْنِ الْعَبْدِ

إِذَا مِتُّ فَأَتِ عَيْنِي بِمَا أَنَا أَهْلُهُ وَشَقِي

عَلَى الْحَبِيبِ يَا ابْنَةَ مَعْبِدٍ

اسبوغ الامانی علی فتح

الربانی جزء صفحہ ۱۲۶



غرض یہ کہ حضرت عائشہؓ یہ سمجھیں کہ کافر کے متعلق تو میں نے یہ حدیث سنی ہے، کیونکہ ان کے ہاں نوحہ کی رسم ہے اور وہ اپنے اہل کو اس کی ترغیب دیتے ہیں، لہذا اس ترغیب کا عذاب ان کو ہوگا، لیکن مؤمن تو ایسا نہیں کر سکتا لہذا اس پر دوسروں کا بوجھ کیسے پڑے گا، مگر حضرت عمرؓ کی حدیث عام ہے، مؤمن ہو یا کافر جو شخص بھی اپنے ہاں نوحہ کی رسم کو جاری رکھے اس سے روکے نہیں، تو پھر مؤمن ہو یا کافر دونوں پر عذاب ہوگا، نہ حضرت عائشہؓ کی حدیث حقیقہ قرآن مجید کے خلاف ہے، نہ حضرت عمرؓ کی حدیث، ہاں حضرت عائشہؓ صدیقہؓ نے جو مطلب سمجھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی منشاء کے مطابق نہ تھا، وہ یہ سمجھتی رہیں کہ مؤمن ایسا کر نہیں سکتا، اس کو عذاب کیوں ہوگا، انہوں نے اس غلطی کو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا، اور حضرت عمرؓ و دیگر صحابہ اس کے حقیقی منشاء کو سمجھ کر اس کو روایت کرتے رہے۔ اس کی دلیل ان صحابہ کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبَعْضِ بَكَاءِ أَهْلِهِ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

یعنی میت پر ہر حالت میں عذاب نہیں ہوتا، بلکہ بعض حالات میں ہوتا ہے اور وہ بعض حالات یہی ہیں کہ اس میت کے ہاں نوحہ کی رسم ہو، اور اس نے اس رسم کو بند کرنے کی کوشش نہ کی ہو، یا اس رسم کی ترغیب دی ہو، تو پھر اس رسم کی وجہ سے جو نوحہ کیا جائے گا، اس کا عذاب میت پر بھی ہوگا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | اسی طرح جب حضرت عائشہؓ کے سامنے ابن عمرؓ کی یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضور نے مقتولین جنگ کی لاشوں کو جو ایک گڑھے میں پڑھیں دیکھ کر فرمایا، کیا اللہ تعالیٰ نے وہ مواعید پورے کر دئے ہیں، جو تم سے کئے گئے تھے، کسی نے کہا، آپ مردوں کو پکار رہے ہیں؟ فرمایا تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے، فرق یہ ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے، تو آپ نے فرمایا، حضور نے ان لاشوں کو دیکھ کر صرف اتنا فرمایا تھا أَنَّهُمْ لَيُعَذَّبُونَ الْآنَ مَا كُنْتُ أَقُولُ حَقًّا، ان لوگوں کو اب معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں کہا کرتا تھا وہ درست ہے، اور پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ تَمُورُونَ کو کوئی بات نہیں سنا سکتے۔ (دوا سلام ص ۹۶)



حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیث مذکور کے جو الفاظ سنے تھے، ان کے مطابق  
 ازالہ | حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کو نہ پایا۔ مزید برآں انہوں نے حضرت ابن عمرؓ کی حدیث  
 کو بظاہر قرآن مجید کی آیت کے خلاف سمجھا، لہذا اس پر شبہ کا اظہار فرمایا، انہوں نے فرمایا  
 قَدْ ذَهَلْ (صحیح مسلم کتاب الجنائز) ابن عمر سے خطا ہو گئی، وہ بھول گئے۔

پھر یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف اتنا فرمایا تھا۔  
 اَلَمْ تَرَ كَيْفَ عَلَّمُونِ الْاِنَّ اَنْ مَا كُنْتُمْ  
 اَقُولُ لَهَا مَحَقِّ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) ان لوگوں کو اب معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ  
 میں ان سے کہتا تھا وہ صحیح تھا۔

گویا حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیث کے صرف اتنے ہی الفاظ سنے تھے، یعنی انہوں  
 نے صرف وہ ہی الفاظ سنے تھے، جو آپؐ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمائے تھے، اور  
 وہ الفاظ نہیں سنے، جو اس کے بعد لاشوں کو مخاطب کر کے فرمائے تھے، لہذا حضرت  
 عائشہؓ نے اپنی سنی ہوئی حدیث اور پھر قرآنی آیت سے استشہاد کرتے ہوئے ابن عمرؓ  
 کی حدیث کو صحیح نہیں سمجھا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا وہ صحیح بھی ہو،  
 حضرت عائشہ صدیقہؓ میں تحقیق کی عادت زیادہ تھی، اگر وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی زبان فیض ترجمان سے بھی یہ الفاظ سنتیں تو خاموش نہ رہتیں، بلکہ اس کی تشریح کے  
 طالب ہوتیں، اور تعارض میں قرآن مجید کی آیت بھی پیش کر دیتیں، مثلاً ایک مرتبہ رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

مَنْ حُوسِبَ عُذِبَ  
 جس کا حساب لیا گیا اس پر عذاب ہوگا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فوراً عرض کیا، کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن مجید میں یہ فرماتا ہے۔  
 فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حِسَابًا يَّسِيرًا (الانشقاق :- ۱۸)  
 جس شخص کے سیدھے ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہوگا۔

حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ یہ حدیث تو قرآن مجید کے خلاف معلوم ہوتی ہے، رسول  
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آیت میں جس حساب کا ذکر ہے، وہ محض سرسری پیشی ہے،  
 لیکن جس کی چھان بین کی گئی، تو اس پر عذاب ہونا لازمی ہے (صحیح بخاری) الغرض رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غلط فہمی کو اس طرح دور فرمایا کہ آیت میں حساب سے مراد سرسری  
 پیشی ہے، اور حدیث میں حساب سے مراد چھان بین ہے، اگر اتفاقاً یہ تعارض اس وقت  
 رفع نہ ہو گیا ہوتا، اور یہ حدیث کسی دوسرے صحابی کی روایت سے حضرت عائشہؓ کو پہنچتی، تو  
 وہ اپنی سمجھ کے مطابق تعارض میں آیت کو پیش فرما دیتیں، اور بعد میں آنے والوں کے لئے



یہ واقعہ غلط فہمی کا ایک سبب بن جاتا، بعد والے یہ سمجھتے کہ انہوں نے حدیث کو آیت کے خلاف سمجھ کر رد کر دیا، حالانکہ ان کی غلط فہمی سے بعد والوں کا حدیث کو مسترد کر دینا کسی طرح بھی صحیح نہ ہوتا، اگر کوئی حدیث بظاہر قرآن مجید کے مخالف بھی ہو اور ہمیں کوئی صورت تطبیق کی بھی معلوم نہ ہو، تب بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم حدیث کو مسترد کر دیں، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں یا تو حدیث کا مطلب نہیں آیا یا ہم آیت کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے۔ اور یہ ہماری کم فہمی ہے۔

الغرض اگر کوئی صحابی یا صحابیہ یا کوئی اور آیت و حدیث میں تعارض سمجھے، تو اس کی غلط فہمی کی وجہ سے یہ لازمی نہیں کہ وہ تعارض حقیقتہً بھی ہو، اور نہ ہم پر یہ لازم ہے کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا وہی ہم بھی سمجھیں اور اپنی کم فہمی کی وجہ سے یا محض تقلیدِ حدیث کو مسترد کر دیں، حدیث کو پرکھنے کا یہ کوئی ٹھوس معیار نہیں، وہ حدیث جس کو برق صاحب نے پیش فرمایا ہے، اس کے سلسلہ میں ہم صرف اتنا بتائے دیتے ہیں کہ آیت میں مردوں کو سنانے کی نفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تو سنا سکتا ہے، اگر بطور معجزہ کے صرف اسی وقت آپ کی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے ان مردوں کو سنا دیا تو یہ بالکل ممکن ہے، یہ معجزہ آیت کے حکم عام کا مخصوص ہوگا، نہ کہ متعارض۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | عروہ بن زبیر مدنی (وفات ۹۴ھ) سے کسی نے کہا کہ بقول ابن عباس

رسول کریم صلعم نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ میں رہے تھے، تو عروہ بولے ابن عباس جھوٹ کہتا ہے " (دو اسلام ص ۹)

عروہ بن زبیرؓ کے قول کے صحیح معنی تو وہی ہیں، کہ "ابن عباس سے خطا ہو گئی" لیکن **ازالہ** | بفرض محال اس کے معنی وہی کئے جائیں، جو برق صاحب نے کئے ہیں، تو پھر یہ بتلیئے کہ واقعی حضرت ابن عباسؓ جھوٹے تھے؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ میں رہے، حضرت ابن عباسؓ نے تو سچ بیان کیا، اور وہ سچے ہی تھے، تو اب کوئی شخص غلط فہمی سے سچ کو جھوٹ کہہ دے، تو یہ اس کہنے والے کا قصور ہے، نہ کہ سچ کہنے والے کا، عروہ بن زبیرؓ بھی ایک حد تک معذور ہیں، اس لئے کہ انہوں نے ابن عباسؓ کی بات محض تقلیداً ماننے سے اعراض کیا، اور جو کچھ ان کو معلوم تھا اس کی بنا پر ابن عباسؓ کی بات کو تسلیم نہیں کیا، یہ آزادیِ رائے، اور تحقیق و تنقید ایک مستحسن فعل ہے، لیکن یہ بعد والے دیکھیں گے کہ تنقید صحیح بھی ہے یا نہیں، کون حق پر ہے، کون غلطی پر، اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ



ہی حق بجانب تھے، اور حضرت عروہ بن زبیرؓ سے خطا ہو گئی، لیکن نہ حضرت ابن عباسؓ پر اس سلسلہ میں کوئی حرف آتا ہے، نہ حضرت ابن زبیرؓ ہاں خطا کو جھوٹ کا جامہ پہنانے سے بے شک معاملہ بگڑ جاتا ہے اور یہاں برق صاحب کی غلط فہمی کا یہی موجب ہوا۔

برق صاحب کی پیش کردہ روایت صحیح مسلم کتاب الفضائل میں موجود ہے، اس میں یہ لفظ نہیں ہیں کہ "ابن عباس" جھوٹ کتا ہے۔ بلکہ صرف یہ لفظ ہے "فغفرہ" یعنی ابن زبیرؓ نے ابن عباس کے لئے مغفرت کی دعا کی، اس صحیح روایت کی موجودگی میں برق صاحب کی پیش کردہ روایت باطل ہے، جامع بیان العلم میں عروہ بن زبیرؓ کا یہ قول بے سند منقول ہے (جامع جلد ۲ ص ۱۵۵) لہذا اس کے جھوٹ ہونے میں کیا شبہ ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی**

"حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالبؓ سے کسی نے وشاہد و مشہود کی تفسیر پوچھی، جب آپ بیان کر چکے تو سائل نے کہا، کہ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ کی تفسیر کچھ اور ہے، فرمایا "قد کذباً" انہوں نے جھوٹ بولا ہے" (دوا اسلام ص ۹۷)

"قد کذباً" کا صحیح مطلب یہ ہے، کہ ان دونوں سے خطا ہو گئی، دوم یہ کہ لفظ "کذباً"

**ازالہ**

مشکوک ہے، اس لئے کہ تفسیر ابن جریر میں یہ لفظ نہیں ہے (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۴۹۲) سوم یہ کہ جامع بیان العلم میں یہ قول بے سند منقول ہے (جلد ۲ ص ۱۵۵) لہذا یہ روایت باطل ہے۔

حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مغیرہ بن شعبہ، عبادہ بن الصامت، اور ابو محمد

**غلط فہمی**

مسعود بن اوس انصاری بدری کی سب روایات جھوٹی ہیں (دوا اسلام ص ۹۷)

یہ روایت جھوٹی ہے، اور حضرت علیؓ پر اتہام ہے، جامع بیان العلم جہاں سے برق

**ازالہ**

صاحب نے یہ اقوال نقل کئے ہیں، اس میں یہ قول بھی بے سند ہے (جامع جلد ۲ ص ۱۵۵)

محمد بن جبیر بن مطعم کہتے ہیں، کہ میں نے امیر معاویہ کو عبد اللہ بن عمرؓ کی

**غلط فہمی**

ایک حدیث سنائی، جس پر معاویہ کو سخت غصہ آیا، اور لوگوں کو جمع کر

کے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ ایسی احادیث بیان کر رہے

ہیں، جو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اور نہ تعلیمات قرآن کے مطابق، خبردار تم ان

جاہلوں سے بچو، اور گمراہ کن آرزوؤں سے دور رہو" (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۷۱) اس

حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے زمانہ ہی میں احادیث کا چشمہ مکدر ہو

چکا تھا، اقوال رسول کو مسخ کیا جا رہا تھا اور اہل نظر صحابہؓ کا اعتماد اٹھ چکا تھا، ورنہ

امیر معاویہ ابن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو جاہل کیوں کہتے۔ (دوا اسلام ص ۹۷-۹۸)



برق صاحب نے امیر معاویہ کا پورا بیان نقل نہیں کیا، حضرت امیر معاویہ نے اس کے ازالہ بعد فرمایا۔

اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم یَقُوْلُ اِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قَرِیْنَتَیْنِ لَا یُعَادِیْہُمَا اَحَدٌ اِلَّا کَبَّہُ اللّٰهُ عَلٰی وَجْہِہٖ مَا اَقَامُوْا الدِّیْنَ (صحیح بخاری، کتاب الاحکام)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ حکومت قریش میں رہے گی جو شخص ان کی مخالفت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرے گا۔ جب تک قریش دین کو قائم رکھیں گے (یہ بات جاری رہے گی)۔

اس حدیث کی بنا پر امیر معاویہ سمجھے کہ حکومت قریش میں رہے گی، لہذا عبداللہ بن عمروؓ کی اس بات پر انہیں یقین نہ آیا کہ کسی وقت ایک بادشاہ قحطانی بھی ہوگا، کیونکہ عبداللہ بن عمروؓ کی یہ بات ان کی سنی ہوئی حدیث سے ٹکراتی تھی، لہذا انہیں اس پر تعجب ہوا، انہوں نے کہا کہ یہ بات اس لئے غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی نہیں، نہ یہ کتاب اللہ میں ہے، اور پھر اس حدیث کے بھی خلاف ہے کہ خلافت قریش میں رہے گی، امیر معاویہ کے یہ الفاظ، کہ :-

لَا تُؤْتُوْهُم مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم (صحیح بخاری باب الاحکام)

یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی۔

اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ امیر معاویہ یہ سمجھے کہ یہ عبداللہ بن عمروؓ کا قول ہے، لہذا انہیں غصہ آیا کہ عبداللہ بن عمروؓ ایسی بات کیوں کہتے ہیں جو حدیث میں نہیں، اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ عبداللہ بن عمروؓ اپنی طرف سے نہیں کہتے، بلکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سنا ہے، تو پھر وہ اس قسم کی تردید نہ کرتے۔ بے شک یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، کیونکہ یہ حدیث صحیح بخاری کتاب الفتن میں مذکورہ بالا حدیث سے کچھ پہلے ان الفاظ میں موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَخْرُجَ رَجُلٌ مِّنْ قَحْطَانَ یَسُوْقُ النَّاسَ بِعَصَاہُ (رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ رض)

قیامت قائم نہ ہوگی جب تک قحطان سے ایک شخص نہ نکلے گا وہ لوگوں کو اپنی لاٹھی سے ہانکے گا یعنی سختی کے ساتھ حکومت کرے گا۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا، کہ اس میں غلطی امیر معاویہ کی تھی، نہ کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی، امیر معاویہ نے بغیر تحقیق کے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی بات پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خود



اپنی بیان کردہ حدیث پر بھی غور نہیں فرمایا، ان کی حدیث میں بھی یہ چیز موجود تھی کہ حکومت قریش میں اس وقت تک رہے گی، جب تک وہ دین کو قائم رکھیں گے، اور جب وہ دین کو قائم نہیں رکھیں گے، تو پھر غیر قریشی حکمران ہوں گے، ان میں سے ایک قحطانی بھی ہوگا، امیر معاویہؓ نے بغیر کسی وجہ کے دونوں کو متعارض سمجھ لیا، بہر حال ان کی نیت بہت اچھی تھی۔ انہوں نے حدیث کے خلاف ایک بات سنی تو فوراً اس کی تردید کر دی، اگر حضرت عبداللہؓ کی بات بھی حدیث کی شکل میں ان کے پاس پہنچتی، تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے، بلکہ تطبیق کی کوشش کرتے۔

امیر معاویہؓ کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ صحابہؓ کے زمانہ میں احادیث کا چشمہ مکدر ہو چکا تھا، کسی طرح صحیح نہیں، اس لئے کہ صحابہؓ اپنی سنی ہوئی احادیث بیان کرتے تھے، نہ کہ غیر صحابی سے سنی ہوئی، پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ اقوال رسول کو مسخ کیا جا رہا تھا، آخر مسخ کرنے والے کون تھے؟ خود صحابہ کرام! صحابہ کرام کے متعلق برق صاحب یہ تحریر فرماتے ہیں :-  
صحابہ میں کافی تعداد ایسے حضرات کی موجود تھی، جو محرف احادیث بیان کرنے کے خوگر تھے (دو اسلام ص ۹۸)

معاذ اللہ اس غلط فہمی کی بھی کوئی حد ہے، صحابہ کرام اور جھوٹ! اور وہ بھی اس ہستی پر جس کا وہ کلمہ پڑھتے تھے۔ مزید برآں برق صاحب نے یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ اہل نظر صحابہ کا اعتماد اٹھ چکا تھا "گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ امیر معاویہؓ بمقابلہ عبداللہ بن عمرؓ اہل نظر تھے۔ یہ بھی قطعاً صحیح نہیں، امیر معاویہؓ خلیفہ اور سیاست دان سی، لیکن عبداللہ بن عمرؓ کی شخصیت بہت بلند و بالا ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ اہل نظر حضرات کی فرست میں حضرت عبداللہؓ کو شامل کیا جائے، اور امیر معاویہؓ اس میں شامل نہ ہوں، لیکن اس کا عکس تو کسی طرح صحیح نہیں۔  
برق صاحب کو کتنی بڑی غلط فہمی ہوئی کہ صحابہ کرام کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف میں فرماتا ہے :-

اَشَدَّ اَعْلٰی الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ  
تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجْدًا تَلْبِتُونَ  
فَضْلًا مِّنْ اِلٰهِ وَرِضْوَانًا سِجًّا لَهُمْ  
فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ  
ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِيْ التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ  
فِي الْاِنْجِيلِ

صحابہ کفار پر سخت ہیں۔ آپس میں رحم دل ہیں  
لے رسول آپ دیکھتے ہیں کہ وہ رکوع کرتے ہیں  
سجدہ کرتے ہیں، اللہ کا فضل اور خوشنودی تلاش  
کرتے ہیں ان کی علامت یہ ہے کہ سجدوں کی  
وجہ سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑھتے ہیں  
یہ وہ لوگ ہیں جن کے تذکار جلیلہ تواریث میں  
بھی ہیں اور انجیل میں بھی۔



برق صاحب کچھ تو بتائیے، کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے ناقابل اعتماد، محرف احادیث بیان کرنے والے، اپنے رسول کی طرف جھوٹ منسوب کرنے والے قابل تعریف ہو سکتے ہیں؟ کیا ایسے ہی لوگوں کا ذکر توریت میں ہے، انجیل میں ہے؟  
برق صاحب اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے۔

الَّذِينَ هُمْ عَنْهُ يُتَّقُونَ وَكَانُوا أَكْثَرًا

يَهْتَابُوا أَهْلَهُمَا (الفتح: ۲۶) وہ اس کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے کہ ان کے ہاتھ سے تقویٰ کا دامن نہیں چھوڑتا، اور آپ یہ سمجھیں کہ وہ جھوٹی احادیث بیان کرتے تھے، وہ ناقابل اعتماد ہو گئے تھے، وہ جاہل تھے، یہ کہاں تک صحیح ہے، اگر کسی صحابی نے بضرع محال کسی دوسرے صحابی کو جوش میں آکر یہ کہہ دیا ہے کہ وہ غلط کہتے ہیں، یا وہ جاہل یعنی نادان ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حقیقت میں بھی ایسے ہی ہیں، برق صاحب آپ نے تو صرف یہی کہا ہے کہ صحابہ کرام ناقابل اعتماد تھے، محرف احادیث بیان کرتے تھے، کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں، کہ صحابہ کرام مرتد ہو گئے تھے، قرآن مجید میں تحریف کرتے تھے، حتیٰ کہ موجودہ قرآن مجید انہی کا تحریف شدہ قرآن ہے، اصل قرآن نہیں ہے، نعوذ باللہ! برق صاحب پھر سوچیے، کہ آپ نے صحابہ کرام کے متعلق جو رائے قائم کی ہے، کیا وہ قرآن مجید کی روشنی میں صحیح ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی

”جب سمرہ کی یہ حدیث: ”كانت للنبي سكتان عند قراءته في الصلوة حضور قرأت نماز میں دو مرتبہ سکتہ (ٹھہرنا، وقفہ کرنا) فرمایا کرتے تھے“ حضرت عمران بن الحصین (وفات ۵۲ھ) نے سنی تو کہا ”کذب سمرہ“ سمرہ جھوٹا ہے۔“

(دو اسلام ص ۹۸)

ازالہ | یہاں بھی ”کذب سمرہ“ کا ترجمہ ”سمرہ جھوٹا ہے“ صحیح نہیں، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ ”سمرہ سے خطا ہو گئی“ کذب کے معنی ہر جگہ جھوٹ کرنا ہی تو اصلی غلط فہمی ہے، پھر اس حدیث کے صحیح الفاظ نقل نہیں کئے گئے، صحیح الفاظ درج ذیل ہے۔

إِنَّ سَمُرَةَ بْنَ جُنْدَبٍ وَعِمْرَانَ ابْنَ حَصِينٍ تَذَكَّرَا قَالِ سَمُرَةُ بْنُ جُنْدَبٍ حَفِظْتُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ دُوسَمَةً كَرْتِي تَحْتِي. ایک تکبیر تحریر

حضرت سمرہ اور حضرت عمرانؓ میں مذاکرہ ہوا سمرہؓ نے کہا مجھے یاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو سمرے دے سکتے کرتے تھے۔ ایک تکبیر تحریر



وَهَلْوَ كُتُبَيْنِ فِي الصَّلَاةِ سَكَنَتَهُ  
إِذَا كَبَّرَ إِلَّا مَا سَحَقِي يَقْرَأُ وَسَكَنَتَهُ إِذَا فَرَغَ  
مِنْ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُورَةٍ عِنْدَ الرَّكْعَةِ  
فَأَنْكَرَ عُمَرَانُ بْنُ مُصَيَّبٍ فَكَتَبُوا فِي  
ذَلِكَ إِلَى أَبِي بَنِي كَعْبٍ فَصَدَّقَ مَعْمُورَةً  
کے بعد اور دوسرا فاتحہ اور سورت کے بعد  
تو حضرت عمرانؓ نے اس کا انکار کیا۔ پھر انہوں  
نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو  
خط لکھا حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ  
عنہ نے سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصدیق  
کی۔ (ابن ماجہ، ملخص ص ۱۲۰)

اصل واقعہ تو اس طرح ہے، اور اس میں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، اگر حضرات عمرانؓ  
نے یہ کہہ بھی دیا کہ سمرہ غلط کہتے ہیں تو کیا ہوا، غلطی پر ایک ضرور تھا، اور یہاں غلطی پر وہ نکلے  
جو دوسرے کو غلطی پر سمجھ رہے تھے۔ لہذا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی صحابی کسی دوسرے صحابی کو  
غلطی پر سمجھے، اور ہو وہ خود غلطی پر، اس قسم کے اقوال سے کسی صحابی کی تکذیب نہیں ہوتی،  
نہ یہ کوئی دلیل ہے کسی شخص کی غلط فہمی کی بنا پر حق دالے کو نا حق سمجھنا تحقیق کا خون کرنا ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | حضرت امام مالک بن انسؒ کے متعلق محمد بن اسحاق کہتے تھے، کہ وہ  
جھوٹا ہے، اور امام مالک فرمایا کرتے تھے، کہ ابن اسحاق دجال ہے۔  
(دو اسلام ص ۹۹)

یہ دونوں قول جھوٹ ہیں۔ امام بخاری نے اس قول کی صحت کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ لکھتے ہیں  
ازالہ | موضح | اگر صحیح ہو، پھر صحیح فرض کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ مولوی شرف الدین صاحب  
لکھتے ہیں۔ "اول تو اس روایت کی شروع سے سند مذکور نہیں..... تا وقتہ کہ سند مذکور  
ہو کر صحت نہ ہو قابل وثوق نہیں" (برق اسلام ص ۱۲۹) غرض یہ کہ یہ قول بے سند ہے۔  
برق صاحب فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | "امام ابو حنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ جابر جعفی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے  
فرمایا "کذاب"۔ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔ (دو اسلام ص ۹۹)

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بے شک صحیح فرمایا، جابر الجعفی واقعی کذاب تھا۔  
ازالہ | حدیثیں گھڑتا تھا۔ برق صاحب نے شاید اس کو بھی محدث سمجھا۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | الاغش حدیث کا امام تھا، علی بن خشرم المروزی (وفات ۲۵۷ھ)  
فضل بن موسیٰ السینانی المروزی سے روایت کرتا ہے، کہ ایک مرتبہ الاغش بیٹا



پہلے تو فضل بن موسیٰ اور امام ابو حنیفہ اس کی عیادت کو گئے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا، اگر میرا آنا آپ کو ناگوار نہ گذرتا، تو میں ہر روز آتا۔ اعمش نے جھٹ کہا، مجھے تو تیرا اپنے گھر میں بھی رہنا گوارا نہیں۔

”الاعمش کے متعلق امام ابو حنیفہ کی رائے یہ تھی، کہ وہ نہ روزے رکھتا ہے، اور نہ جنابت کے بعد غسل کیا کرتا ہے، یعنی ایک فاسق اور نجس سا آدمی ہے“ (دو اسلام ص ۹۹) اول تو ترجمہ غلط کیا گیا ہے لیکن ہم ترجمہ کی صحت اور عدم صحت پر تو بحث جب کریں ازالہ جب یہ روایت ثابت بھی ہو، یہ روایت سرتاپا جھوٹ اور افتراء محض ہے، اس کی سند میں ایک تو سلمہ بن قاسم ضعیف العقل تھے، دوسرے محمد بن احمد بن فیروز مجہول ہیں، پھر احمد بن عیسیٰ نام کے کئی آدمی ہیں، نہ معلوم یہ کون صاحب ہیں، اور کیسے ہیں (برق اسلام ص ۱۵۲) غرض یہ کہ پوری سند داہی تباہی ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی ”سعید بن مسیب بن المدنی (وفات ۱۵۰ھ) اور حسن بھری، عکرمہ (وفات ۱۵۰ھ) کو جھوٹا کہا کرتے تھے، اور یہ ان کو کذاب سمجھتا تھا“ (دو اسلام ص ۹۹) یہ روایت بھی جھوٹی اور افتراء محض ہے، جامع بیان العلم میں اس کی کوئی سند منقول ازالہ نہیں (جامع جلد ۲ ص ۱۵۶) معلوم نہیں برق صاحب ایسی بے سند باتیں کیوں نقل کرتے ہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی ”قتادہ (وفات ۱۱۸ھ) یحییٰ بن ابی کثیر (وفات ۱۲۹ھ) کو جھوٹا سمجھتا تھا اور یہ اُسے“ (دو اسلام ص ۱۰۱)

یہ روایت بھی ثابت نہیں، جامع بیان العلم میں، اول تو یہ الفاظ نہیں، دوم اس ازالہ کی سند بھی منقطع ہے۔ (جامع جلد ۲ ص ۱۵۷)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی ”اصمعی کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ سلیمان التیمی (وفات ۱۴۲ھ) کے ہاں ابن عربہ کا ذکر چل پڑا، تو اصمعی نے کہا کہ ابن عربہ اور اس کے استاد قتادہ دونوں جھوٹے ہیں۔“ (دو اسلام ص ۱۰۱)

یہ روایت بالکل جھوٹی ہے، اس کا ایک راوی زہیر بن اسحاق ہے اور وہ ازالہ ضعیف ہے۔ (لسان المیزان)



**غلط فہمی** یحییٰ بن معین پہلا محدث ہے جس نے راویوں کے حالات قلمبند کئے تھے، آپ امام شافعیؒ کے متعلق فرماتے ہیں۔ ”ہولیس بثقة آپ کی روایات

قابل اعتماد نہیں“ (دو اسلام ص ۱)

**ازالہ** ابن معین نے ابراہیم بن محمد شافعی کو غیر ثقہ کہا ہے، نہ کہ امام محمد بن ادریس شافعیؒ کو (برق اسلام ص ۱۶) برق صاحب کو شافعی کے الفاظ سے بڑی زبردست غلط فہمی ہوئی۔ جس راوی سے ابن معین کا قول شافعی کے غیر معتبر ہونے کے متعلق نقل کیا گیا ہے، اسی راوی نے اپنی کتاب میں ابن معین کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ امام شافعی ثقہ ہیں۔ (جامع بیان العلم، جلد ۲ ص ۱۶)

**غلط فہمی** برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت امام مالک پر ابن ابی ذئب، ابراہیم بن سعد اور ابراہیم بن ابی یحییٰ نے سخت نکتہ چینی کی ہے۔“ (ص ۱)

یہ روایت بھی باطل ہے، اس لئے کہ بے سند ہے۔

**ازالہ** (برق اسلام ص ۱۵۹)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** ”الساچی کتاب العلل میں لکھتا ہے، کہ عبد العزیز بن سلمہ، عبد الرحمن

بن زید بن اسلم، ابن اسحاق، ابن ابی یحییٰ اور ابن ابی الزناد۔ امام مالک کی حدیث

کو اس لئے قابل اعتماد نہیں سمجھتے، کہ آپ نے ثور بن یزید اور سعد بن ابراہیم

جیسے جھوٹے راویوں سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔“ (دو اسلام ص ۱)

**ازالہ** یہ روایت بھی جعلی ہے، امام مالک نے موطا کو تمام ائمہ کے سامنے پیش فرمایا تھا، اور سب نے موافقت کی تھی، اسی لئے اس کا نام موطا رکھا گیا، اگر یہ ائمہ دین

امام مالک کی حدیث کو قابل اعتماد نہ سمجھتے، تو پھر یہ موطا کی صحت کی تائید بھی نہ کرتے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** امام ابو حنیفہ کے استاد حماد بن سلیمان سے کسی نے پوچھا، کہ حجاز کے محدثین

عطارد، طاؤس اور مجاہد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ تو کہا ”وصبیانکم اعلم

منہم“ تمہارے نادان بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں“ (دو اسلام ص ۱)

یہ روایت بھی باطل ہے، اس کی سند میں احمد بن فضل بن عباس جھوٹا ہے (برق اسلام

**ازالہ** صحیح ہو سہرا راوی محمد بن حمید رازی ضعیف ہے۔ (تقریب)



برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | ”امام شعبی کوئی کے ہاں امام ابراہیم نخعی کوئی (وفات ۹۵ھ) کا ذکر آیا، تو

کنے لگا، یہ یک چشم رات کے وقت ہر مسئلہ مجھ سے پوچھ جاتا ہے اور دن کے وقت لوگوں پر اپنی علمیت کا رعب کستار ہوتا ہے، نخعی کو یہ بات پہنچی، تو اس نے کہا ”ہو کذاب“ وہ مہما جھوٹا ہے“ (دو اسلام ص ۱۱۱)

**ازالہ** | یہ روایت بھی جھوٹی ہے، اس کی سند میں احمد بن فضل جھوٹا ہے، دوسرا راوی قاسم بن محمد بن ابی شیبہ مجروح و متروک ہے (برق اسلام ص ۱۲۹)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | ”جابر بن یزید کا قول ہے، کہ میرے پاس ستر ہزار احادیث ایسی ہیں، جن کا

راوی صرف ابو جعفر ہے۔“ (فتح الملہم ص ۱۳۵) (دو اسلام ص ۱۱۱)

**ازالہ** | مذکورہ بالا قول کا قائل جابر بن یزید ہے جو جابر جعفی کہلاتا ہے، یہ رافضی ہے اور مشہور کذاب ہے۔ اس کا یہ بیان امام ابو جعفر باقر پر اتہام ہے۔

برق صاحب لکھتے ہیں

**غلط فہمی** | ”ابو جعفر الهاشمی المدنی کی رائے یہ تھی، کہ عمرو بن عبیدہ جھوٹا ہے“ (دو اسلام

ص ۱۱۱ بحوالہ فتح الملہم ص ۱۳۷)

**ازالہ** | یہ قول حضرت ابو جعفر کا بالکل صحیح ہے اس لئے کہ عمرو بن عبیدہ واقعی جھوٹا، معتزلی اور متروک ہے۔ (تقریب)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | عبید اللہ بن زیاد عنبری کہتے ہیں، کہ میں نے شعبہ (وفات ۱۶۰ھ) کو

لکھا، کہ واسطہ کے قاضی ابی شیبہ کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ جواب میں

لکھا ”اس کی کوئی حدیث مت لکھو، اور میرا یہ خط ضائع کر دو۔“ (دو اسلام ص ۱۱۱)

بحوالہ فتح الملہم ص ۱۳۸)

**ازالہ** | قاضی ابی شیبہ واقعی کذاب ہے، وہ ائمہ حدیث میں سے نہیں ہے، برق صاحب نے بلاوجہ اس کو نقل کیا، ان کا مقصد تو محدثین پر جرح کرنا ہے، نہ کہ کذابین پر،

اور یہاں وہ منجملہ اور مقامات کے ایک کذاب پر جرح نقل کر گئے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | ”عقان کہتے ہیں کہ میں نے صالح المری کے سامنے حماد بن سلمہ بصری



(وفات ۶۷ھ) کی بیان کردہ احادیث پیش کیں، تو اس نے کہا وہ جھوٹا ہے“  
(فتح الملہم ص ۱۳۸) (دوا سلام ص ۱۲)

صالح المری خود ناقابل اعتماد بلکہ متروک ہے (قانون الموضوعات ص ۲۶۳)  
ازالہ | اس کی بات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی | ”یزید بن ہارون بیان کرتا ہے کہ زیاد بن میمون نے ایک ہی حدیث مجھے  
تین مختلف موقعوں پر سنائی اور ہر مرتبہ نئے راوی جرڈیئے، چنانچہ میں نے قسم کھالی  
کہ اُسندہ اس کی کوئی حدیث بیان نہیں کروں گا۔“ (فتح الملہم ص ۱۳۹) (دوا سلام ص ۱۲)  
ازالہ | زیاد بن میمون کذاب ہے (قانون الموضوعات لابن طاہر ص ۲۵۷) لہذا اس پر جرح  
کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، نہ معلوم محدثین کی فرست میں برق صاحب ان لوگوں  
کو کیوں لے آتے ہیں جو محدثین کے نزدیک کذاب ہیں، غالباً غلط فہمی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی | علی بن مسر کوئی کتا ہے، کہ میں نے اور حمزۃ الزیات نے ابان بن ابی عیاش  
سے تقریباً ایک ہزار احادیث سنی تھیں، حمزہ بیان کرتا ہے کہ ایک رات خواب میں  
حضور علیہ السلام کے دیدار نصیب ہوئے، میں نے وہ تمام احادیث آنحضرت کو  
سنائیں، حضور نے صرف پانچ یا چھ کو صحیح قرار دیا اور باقی کے متعلق فرمایا، کہ میں  
انہیں نہیں پہچانتا۔“ (دوا سلام ص ۱۲)

ابان بن ابی عیاش بے حد ضعیف، متروک، بلکہ کذاب ہے (قانون الموضوعات لابن طاہر)  
ازالہ | ص ۲۳۱ و تقریب، لہذا برق صاحب کا ابان بن ابی عیاش کو محدثین کی ذیل میں پیش کرنا  
زبردست غلط فہمی ہے، ان کے باب کی سرخی یہ ہے ”کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق“  
لیکن اکثر وہ ان راویوں پر جرح نقل کرتے ہیں جو ائمہ حدیث تو کجا معتبر بھی نہیں ہوتے، بلکہ کذاب  
و ضاع ہوتے ہیں۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

”ابو اسحق الفزاری فرماتے ہیں، کہ صرف مشہور اور معتبر راویوں کی احادیث  
بیان کرو، لیکن اگر اسماعیل بن عیاش مشہور راویوں سے بھی کوئی حدیث روایت کئے  
تو مت مانو، لیکن یحییٰ بن معین کہتے ہیں، کہ اسماعیل ثقہ (قابل اعتماد) ہے“ (دوا سلام ص ۱۲)  
ازالہ | اسماعیل بن عیاش شام کے محدث ہیں، علمائے شام کی احادیث انہوں نے بہت



اچھی طرح محفوظ کر لی تھیں اور اس میں غلطی نہیں کرتے تھے، اسی لئے امام بخاری فرماتے ہیں۔ ”حدیثہ عن الشامیہ۔“ صحیح، یعنی ان کی شایوں سے بیان کردہ احادیث صحیح ہیں، اور انہی معنوں میں یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے، مجاہد بن محمد بن یحییٰ کی روایت کو وہ اچھی طرح محفوظ نہ کر سکے، لہذا اس میں ان سے غلطی ہو جایا کرتی تھی، یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے ان کی اہل حجاز سے روایت کردہ احادیث کو صحیح نہیں سمجھا، قانونہ الموضوعات ص ۲۴، ان ہی معنوں میں ابو اسحاق فزاری نے ان کو ناقابل اعتماد قرار دیا، برق صاحب آپ کو محمد بن کوفہ و داد بنی چاہیے تھی، کہ ایک معتبر راوی کو بھی انہوں نے بعض حالات میں غیر معتبر قرار دیا، اور باریک بینی کی انتہا کر دی۔ اپنے کو دھوکہ سے محفوظ رکھا، اور حدیث کی حفاظت پر آپس نہ آنے دی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی محمد بن عبد الرحمن کے متعلق امام مالک کی یہ رائے ہے کہ وہ ثقہ نہیں، لیکن ابو زرہ اسے ثقہ سمجھتے ہیں۔ (دو اسلام ص ۱۰۲-۱۰۳) اس کے بعد برق صاحب نے چار نام اور دئے ہیں، جن کو کسی نے ثقہ کہا، اور کسی نے غیر ثقہ، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

”کہاں تک گنوں، سینکڑوں ایسے راوی ہیں، جنہیں ایک جماعت سچا سمجھتی ہے، اور دوسری جھوٹا..... کس کی سنیں اور کس کی نہ سنیں“ (دو اسلام ص ۱۰۳)

ازالہ محدثین اگر کسی شخص کی توثیق میں اختلاف کرتے ہیں، تو یہ مختلف حالات کے ماتحت ہوتا ہے، مثلاً (۱) ایک امام نے کسی راوی کو جوانی کی حالت میں دیکھا، حفظ و اتقان میں معتمد سمجھا، لہذا اس کو ثقہ کہہ دیا۔ دوسرے امام نے اس راوی کو بڑھاپے کی حالت میں دیکھا، حافظہ کمزور ہو چکا تھا، غلطی کرنے لگے تھے، لہذا اس امام نے اس کو غیر ثقہ کہہ دیا، اب اس کی جوانی کے ایام میں روایت کردہ حدیث قابل اعتماد ہو گی، اور بڑھاپے کی نہیں، تاوقتیکہ دوسرے قرائن سے اس کا ضعف دور نہ کر دیا جائے۔

(۲) ایک امام نے کسی راوی کے متعلق کہا کہ فلاں شخص کے حق میں ثقہ ہے، دوسرے امام نے اس کو کسی دوسرے شیخ کے حق میں غیر ثقہ قرار دیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے شیخ کے پاس وہ باقاعدگی سے احادیث حاصل کرتا رہا، برخلاف اس کے دوسرے شیخ کے پاس وہ کافی غرض نہ رہ سکا، جو کچھ اس سے حاصل کیا، وہ سرسری مطالعہ تھا۔

(۳) بعض راوی ایسے بھی ہیں، جن کا حافظہ ان کی کتابیں جل جانے کے صدمہ سے



غراب ہو گیا۔ اب اگر ایک محدث اس کو ثقہ کہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کتابیں جلنے سے پہلے وہ بالکل قابل اعتماد تھا اور اس زمانہ میں اس کی روایت کردہ احادیث صحیح تھیں، اور اگر کسی محدث نے اس کو ضعیف کہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کتابیں جلنے کے بعد وہ قابل اعتماد نہیں رہا، اس کی روایت کردہ احادیث مشکوک ہو گئیں۔ یہ اختلاف بھی کوئی وقیع اختلاف نہیں، تحقیق کرنے سے ہر بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے، اور کسی قسم کا دھوکا نہیں ہوتا۔

اگر کسی امام نے کسی راوی کو صادق کہا، دوسرے نے غیر ثقہ کہا، یہ بھی اختلاف نہیں ہے، اس لئے کہ محض صادق ہونے سے ثقہ ہونا لازم نہیں آتا، اس قسم کے اختلافات سے فن حدیث پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ یہ اختلاف وقیع ہے تو اس صورت میں تحقیق سے اس کا فیصلہ ہو گا کہ کس امام سے اس کی جرح یا تعدیل میں غلطی ہوئی، محض اس امام کی غلط فہمی یا غلط اطلاع پر فیصلہ نہ ہو گا۔ اگر فیصلہ کرنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو (حالانکہ یہ بھی مفروضہ ہے) تو پھر وہ حدیث ضعیف تصور کی جائے گی۔ اس کے ضعف سے صحیح، ثابت شدہ احادیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، دین کے لوازمات اسی حدیث سے ثابت ہوں گے جو صحیح و ثابت شدہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، لہذا جو چیز صحیح و ثابت ہوگی، وہی عند اللہ محفوظ ہوگی، اور جو چیز ضعیف ہوگی، وہ گویا غیر محفوظ ہوگی اور عند اللہ دین میں شامل نہ ہوگی، برق صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا کہ اگر بعض خبریں غلط ہوں، تو گویا سب ہی غلط ہیں، کسی طرح صحیح نہیں، اگر یہ مان لیا جائے، تو دنیا کا انتظام درہم برہم ہو جائے، جو غلط ہوگی وہ اس لئے غلط ہوگی کہ اس کا جھوٹ ہونا ثابت ہو جائے گا، اور جو صحیح ہوگی، وہ اس لئے صحیح ہوگی کہ اس کی صحت کے لئے شواہد ہوں گے۔ دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا خلاف عقل و تجربہ ہے۔

## خلاصہ باب چہارم

برق صاحب نے بعض ائمہ دین پر بعض ائمہ دین کی جرح نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نہ ائمہ کا اعتبار ہے، نہ ان کی جرح و تعدیل کا، یہ سارا علم ہی بے کار ہے، نہ کوئی عالم ہے، نہ کوئی علم، وہ دیکھتے ہیں:-

”ائمہ حدیث اور صحابہ کرام کے فتوے ایک دوسرے کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں تو جو احادیث ان صحابہ، ائمہ اور ان دلچسپ راویوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی



ہیں انہیں وحی سمجھ کر شور مچانا، کہ یہ اسوۂ رسول ہے، یہ مفصل ہے اور قرآن مجمل، یہ شارح ہے اور قرآن متن، کہاں تک جائز ہے“ (دو اسلام ص ۱۳۲)

صحابہؓ تو صحابہؓ ہیں، ان پر اعتماد نہ کرنا۔ یا ان کو کاذب، محرف احادیث بیان کرنے والا سمجھنا، قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف ہے، قرآن مجید کی یہ تصریحات اس باب میں اوپر گزر چکی ہیں، اوپر ہم یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ ائمہ دین کی ائمہ دین پر جرح کے جتنے اقوال ہیں، وہ سب جھوٹ ہیں، یہ بھی پہلے لکھا جا چکا ہے، کہ ان میں سے بعض کو برق صاحب نے ائمہ حدیث شمار کیا ہے، حالانکہ وہ ائمہ حدیث نہیں، بلکہ دشمنان دین، کذاب دو قطاع ہیں، تمام روایتیں جو ائمہ دین کے متعلق بیان ہوئی ہیں، وہ ان لوگوں کی مختصر ہے، جو حدیث اور ائمہ حدیث یعنی اسلام کے دشمن تھے، اور ائمہ حدیث کو بدنام کر کے دین کو بگاڑنا چاہتے تھے، برق صاحب نے ان تمام خرافات کو جمع کر دیا، اور یہ تحقیق نہیں کی، کہ ان اقوال کی سندوں میں کیسے کیسے دجال پوشیدہ ہیں، کاش برق صاحب نے لکھنے سے پہلے تحقیق کر لی ہوتی۔

مذکورہ بالا نتیجہ نکالنے کے باوجود برق صاحب نے اسی باب میں اعتراف کیا ہے کہ:-  
”ائمہ حدیث میں ایسے بزرگ بھی پائے جاتے ہیں، جن پر ملت اسلامیہ کو ہمیشہ ناز رہا ہے، ان کا علمی مقام اتنا بلند اور ان کے ثقافتی کارنامے اتنے عظیم ہیں، کہ ہمیں ان پر تنقید کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی“ (دو اسلام ص ۹۴)

برق صاحب یہی وہ ائمہ حدیث ہیں جو ہمارے نزدیک بھی ائمہ حدیث ہیں، اور یہ دلچسپ راوی نہیں ہیں، ان ہی کی روایت کردہ احادیث ہیں جن کو ہم مستند سمجھتے ہیں، اور ان ہی ائمہ کے واسطے سے جو دین پہنچا، اس کے متعلق اعلان کرتے ہیں کہ یہ وحی ہے، اسوۂ رسول ہے، یہ مفصل ہے، اور قرآن مجید مجمل، یہ شارح ہے اور قرآن مجید متن، اب بتائیے، ہمارا یہ کہنا صحیح ہے نہیں؟ آپ ہی جواب دیں گے کہ بے شک صحیح ہے، اس لئے کہ آپ کو خود اعتراف ہے۔

”حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں“ (دو اسلام ص ۱۳۳)  
”اس طرح کی ہزار ہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔“  
(دو اسلام ص ۱۳۴)

”یہ تمام تفصیل حدیث میں ملتی ہیں، اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پر ہم نازاں ہیں، اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں“ (دو اسلام ص ۱۳۳)۔





# باب

## حدیث پر ایک مکالمہ

اس باب میں برق صاحب نے ایک مکالمہ تحریر فرمایا ہے، برق صاحب نے اس مکالمہ میں اپنے لئے حرف ”ب“ استعمال کیا ہے اور جن مولوی صاحب سے یہ مکالمہ ہوا اُن کے لئے حرف ”م“ استعمال کیا ہے، معلوم نہیں، یہ مکالمہ فرضی ہے یا واقعی، اگر فرضی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کے جوابات بھی فرضی ہیں اور ان کا کمزور ہونا لازمی ہے اور اگر مکالمہ فرضی نہیں تو پھر جو مولوی صاحب برق صاحب کے ہاں تشریف لاتے تھے، وہ برق صاحب کی اصطلاح میں ملاہوں گے، نہ کہ عالم دین۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | ”برق :- وحی کے اصطلاحی معنی کیا ہیں؟  
م :- پیغام

ب :- بہت اچھا! جب قرآن بھی پیغام خدا ہے، اور حدیث بھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ نے قرآن کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کے لئے تمام تر انسانی وسائل اختیار کئے، لیکن حدیث کو نہ صرف نظر انداز کر دیا، بلکہ حضورؐ نے احادیث لکھنے سے منع فرمادیا، اور صدیق و فاروقؓ نے احادیث کو مٹانے اور جلانے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ حدیث اللہ کا پیغام ہو، اور صحابہؓ اُسے جلاتے پھریں، یعنی چہ؟“ (دوا سلام ص ۱۰۴-۱۰۵)

**ازالہ** | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے حدیث کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کے لئے بھی تمام انسانی وسائل اختیار کئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احادیث تحریر فرمائیں صحابہ کو لکھنے کا حکم دیا (مفصل جواب باب اول میں ملاحظہ فرمائیں)، احادیث کی حفاظت کے لئے احکام دئے۔ مثلاً ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-



اِحْفَظُوهُنَّ وَاَخْبِرُوهُنَّ مَنَ وَرَاءَكُم (مصحح بخاری، کتاب الایمان)  
ان کو محفوظ کر لو اور اپنے پیچھے رہنے والوں کو بھی مطلع کر دو۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:-  
وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدَ الْغَائِبَ فَإِنَّ الشَّاهِدَ  
شَدِيدُ أَنْ يُبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْخَى لَدُنْهُ  
(مصحح بخاری، کتاب العلم)  
حاضر غائب کو یہ احکام پہنچا دے، کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کو پہنچا یا اپنے وہ پہنچانے والے سے زیادہ محفوظ کر لیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو بعض لوگوں نے احادیث لکھنے سے منع کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی تو ارشاد فرمایا:-

أَكْتُبُ فَوَالَّذِي فَضِّلْتُ بِهِ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ  
الْأَخْيَرُ (ابوداؤد، ج ۲ ص ۵۸ اور جالند ثقافت)  
ضرور لکھا کرو۔ اس لئے کہ اللہ کی قسم اس منہ سے حق کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احادیث لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے، برق صاحب کو ایک روایت کی بنا پر یہ غلط فہمی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا، حالانکہ آپ نے قرآن مجید کے ساتھ مخلوط کر کے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا، (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو) یہ بھی صحیح نہیں کہ صحابہ کرام احادیث جلا یا کرتے تھے (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیں)۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”ہم:- فلاں عالم، فلاں مجتہد اور فلاں امام نے حدیث کو وحی خفی کہتے ہیں۔“  
غلط فہمی  
آپ کون ہیں جو انکار کرتے ہیں؟ (دو اسلام ص ۵۸)

مولوی صاحب کا یہ جواب مقلدانہ جواب ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ  
ازالہ  
مولوی صاحب جن سے برق صاحب کا مباحثہ ہوا عالم نہیں تھے بلکہ مقلد تھے۔  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”ب:- مجھے سچائی سے معاندت نہیں، بات کو واضح کیجئے اور میں ابھی آپ کا  
غلط فہمی  
ہم خیال بن جاتا ہوں۔ اگر حدیث وحی معنی تو اسے قرآن کے متن میں کیوں شامل نہ کیا گیا، وہ بھی اللہ کا پیغام، یہ بھی اللہ کا پیغام، پھر فرق کیا تھا؟“ (دو اسلام ص ۵۸)

قرآن متن ہے اور حدیث شرح ہے، متن اور شرح کو ایک کر دینا  
ازالہ  
مضحکہ خیز ہے، کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ تمام قوانین اور فرامین (ACTS AND ORDINANCES) کو دستور CONSTITUTION میں شامل کر دیا جائے؟ پھر



اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہوگی کہ تمام ذیلی قواعد و ضوابط (RULES AND REGULATIONS) کو جو کسی قانون (ACT) یا فرمان (ORDINANCE) کے ماتحت وضع کئے جائیں۔ دستور میں شامل کر لیا جائے، نہ ایسا ہوا ہے نہ ہوگا۔ قرآن مجید کی حیثیت بنیادی اصول کی ہے، اور حدیث اس کی عملی تشریح اور توضیح ہے، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”ب۔ اللہ نے یہ دو قسم کے پیغامات کا سلسلہ کیوں شروع کیا تھا، کیا غلط فہمی | اللہ کے خزانے میں الفاظ کی کمی ہوگئی تھی، یا کوئی خاص مصلحت اس

دورنگی کی متقاضی تھی“ (دوا سلام ص ۱۰۵-۱۰۶)

اللہ تعالیٰ کی مصلحت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، بہر حال کسی کتاب کی ازالہ | عملی تشریح کے لئے تشریح کے الفاظ کا مخصوص و متعین ہونا کسی کے نزدیک بھی ضروری نہیں، بس صرف اتنا کافی ہے کہ جو تشریح کی جائے وہ صحیح ہو، اور یہ کام اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

ارشاد باری ہے:-

ہم نے آپ کی طرف حق کے سانچہ کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کی روشنی میں جو اللہ آپ کو بتائے فیصلہ کریں۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ  
لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَادَكَ  
اللَّهُ (النساء: ۱۰۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وہ اللہ ہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اس کتاب میں بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیات کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ اس کے ذریعہ فتنہ برپا کریں اور ان کے معانی تلاش کریں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات کے معانی سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور جن لوگوں کو علم میں رسوخ ہے وہ اس طرح کہتے

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ  
آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ  
وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ  
فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا  
تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ  
ابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ  
إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ

يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ  
رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ

(ال عمران: ۷۰)

ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور عقلمندوں کے علاوہ دوسرے لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔



مندرجہ بالا آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید میں دو قسم کی آیات ہیں، محکم اور متشابہ محکم کے معنی لوگ جانتے ہیں۔ لیکن متشابہ کے معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو شخص ان آیات کے معنی کی جستجو کرتا ہے وہ فتنہ پرور ہے۔ اس کے دل میں کجی ہے۔ یہاں بھی سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کا دو قسم کی آیات بھیجنے سے کیا مقصد تھا؟ کیا اللہ تعالیٰ کے خزانے میں آیات محکمات کی کمی تھی۔ آخر کیا بات تھی جو اس قسم کی آیات نازل فرمادیں جو انسانوں کے کام کی نہیں، انسان ان کا مطلب نہیں سمجھتے، لہذا ان کے نزول سے فائدہ؟ ان سوالات کا جواب ایک ہی ہے، مگر ”ہم ان پر ایمان لاتے ہیں سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ان کے نزول میں کیا مصلحت ہے، مصلحت اللہ ہی جانتا ہے“ بالکل اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن وحی خلی ہے، اور حدیث وحی خفی، ہم دونوں پر ایمان لاتے ہیں دونوں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں ہم نہیں جانتے کہ حلی اور خفی کی تقسیم میں کیا مصلحت ہے مصلحت اللہ ہی جانتا ہے، اور بس۔ اگر اب بھی ہم مصلحت کی جستجو کے درپے ہوں گے تو پھر جو اعتراض حدیث پر ہے وہی قرآن مجید پر ہوگا۔ (نعوذ باللہ)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”قرآن کے متعلق اللہ کا یہ ارشاد موجود ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾  
یہ ذکر اور یہ ہدایت ہم نے نازل کی، اور ہم اس کی حفاظت کریں گے۔“ (دو اسلام ص ۱۰۰)

**ازالہ** | یہ ارشاد قرآن مجید کے متعلق نہیں، بلکہ ذکر کے متعلق ہے۔ ذکر کے معنی ہیں نصیحت کیونکہ نصیحت میں صیث بھی شامل ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ حدیث کا بھی تحافظ ہے۔  
**غلط فہمی** | قرآن کی ایسی حفاظت ہوئی کہ تمام عالم نے اس کتاب کی صحت پر شہادت دی، لیکن حدیث تو یہی بھلی، اس کا تو وہ ستیاناس ہوا کہ اس سے زیادہ محرف، بریدہ، تراشیدہ اور مسخ شدہ لٹریچر دنیا کے صفحے پر موجود نہیں۔ (دو اسلام ص ۱۰۸)

**ازالہ** | حدیث کی بھی ایسی ہی حفاظت ہوئی، اور تمام عالم نے اس کی صحت کی شہادت دی۔ ہاں اگر برق صاحب چند لوگوں کے اقوال سے معارضہ کریں تو پھر چند لوگوں کے اقوال سے ہم بھی معارضہ کر سکتے ہیں۔ معاندین کو چھوڑیے۔ خود کلمہ پڑھنے والوں کا ایک بہت بڑا فرقہ قرآن مجید میں تحریف کا قائل ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب فصل الخطاب فی اثبات تحریف کلام رب الارباب ص ۳ الفاظ یہ ہیں:-

قَدْ أَطْبَقُوا عَلَى صِحَّةِ الْخَبَرِ الْمُسْتَفِضَّةِ  
صحیح ہر طرح اور متواتر دلائل سے ثابت ہے



بَلِ الْمَوَدَّةِ الْأَوْثَرِ بَصِيرَتُهَا عَلَى وَقُوعِ  
التَّحْرِيفِ فِي الْقُرْآنِ (برق الاسلام: ص ۱۸۳)  
کہ قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے۔

اصول کافی میں ہے :-

إِنَّ الْقُرْآنَ الَّذِي جَاءَ بِهِ جِبْرِيلُ إِلَى  
مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَةَ عَشَرَ أَلْفَ آيَةٍ  
جو قرآن جبریل امین حضرت رسول خدا پر لے  
کر اترے اس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں۔

(اصول کاظمیہ جلد دوم کتاب فضل القرآن باب ۴ النواحد ص ۳۳۲ مطبوعہ مکتبہ اہل بیت کراچی)

ترجمہ کرنے کے بعد ظفر حسن لکھتے ہیں ”موجودہ قرآن میں آیات کی تعداد ۶۶۶۶ ہے“  
احادیث کے اولین محافظ خود صحابہ کرام ہیں، پھر ائمہ دین ہیں۔ احادیث کی حفاظت بالکل  
قرآن مجید کی طرح ہوتی رہی، بلکہ جن احادیث کا تعلق عمل سے ہے ان کی حفاظت تو قرآن مجید  
سے بھی زیادہ ہوئی اور وہ قرآن مجید سے زیادہ محفوظ ہیں۔ اس موضوع پر تمہید میں مفصل لکھا  
جا چکا ہے۔ وہیں ملاحظہ فرمائیں۔

محمد علی جوہر صاحب نے سچ فرمایا تھا کہ :-  
”قرآن پاک تو قرآن پاک ہے، دوسرے صحائف ہماری کتب حدیث کی تحقیق اور صحت  
وحفاظت کا مقابلہ نہیں کر سکتے“ (خالص اسلام ص ۱۲۵)

محدثین نے اس سلسلہ میں اس درجہ دیانت داری، حق گوئی اور تحقیق سے کام لیا کہ یہ کارنامہ  
آج اسلام کے مفاخر میں سے ہے، ولیم میور جیسا متعصب شخص بھی اس کی داد دے بغیر نہ رہ سکا  
جان ڈیون پورٹ، اپنی کتاب ”اپولوجی فور محمد“ میں لکھتا ہے۔

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام مقننین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس  
کے وقائع عمری محمد کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں“  
ریورنڈ اسمتھ لکھتا ہے :-

وہ کوئی شخص نہ اس میں دھوکہ کھا سکتا ہے نہ دوسرے کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ یہاں  
پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک پہنچ رہی ہے“ (تاریخ  
جمع القرآن والحدیث مولفہ ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی)۔

غرض کہ ایک عالم گواہ ہے کہ احادیث محفوظ ہیں اور اس عالم میں ہمارے برق صاحب بھی  
شامل ہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

۱۔ ”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“ (دوسلاوم ص ۳۳۱)



۲۔ ”دوم۔ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں“ (دو اسلام ص ۳۱)  
 ۳۔ ”اس طرح کی احادیث ہزار ہا ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں۔ بلکہ آنحضرت صلعم کی حیاتِ مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں“ (دو اسلام ص ۳۲)  
 ۴۔ ”یہ تمام تفصیل حدیث میں ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں“ (دو اسلام ص ۳۳)

برق صاحب! جس بیش بہا سرمایہ پر آپ نازاں ہیں اسی پر ہم نازاں ہیں۔ کیا یہ بیش بہا سرمایہ محفوف ہے، ہرگز نہیں قللہ الحمد۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** اللہ نے رسول کریم کو جو کتاب بذریعہ وحی عطا کی تھی اس کا نام قرآن ہے نہ کہ صحیح بخاری ملاحظہ ہوں یہ آیات :- اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ (یوسف) ہم نے جو کتاب بذریعہ وحی تم کو عطا کی ہے اس کا نام قرآن ہے (دو اسلام ص ۱۰)

**ازالہ** سورۃ یوسف کی مذکورہ بالا آیت آپ نے پوری نقل نہیں فرمائی، نہ ترجمہ ہی صحیح کیا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے۔

لَقَدْ نَقَصُ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ (یوسف ص ۲) ہم آپ کو بہترین قصہ سناتے ہیں۔ اس وحی کے ساتھ جو اس قرآن کی صورت میں بھیجی گئی ہے۔

اس آیت سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ قرآن مجید کے علاوہ ہے، البتہ قرآن مجید کے ساتھ اس کو بھی نازل کر دیا گیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے فرقہ مہمونہ، سورۃ یوسف کو قرآن مجید میں شمار نہیں کرتا، اس کے باوجود برق صاحب لکھتے ہیں کہ ایک عالم اس کی صحت پر گواہ ہے اگر بایں ہمہ قرآن مجید کے متعلق یہ بات کہی جاسکتی ہے تو حدیث کے متعلق بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ”صحیح بخاری“ کی صحت پر ایک عالم گواہ ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ قرآن مجید بذریعہ وحی نازل ہوا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ وحی نہیں آتی تھی۔

نہ مذکورہ بالا آیت کا یہ مفہوم ہے ”قرآن مجید وحی ہے“ اور ”قرآن مجید ہی وحی ہے“ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں جس سے ثابت ہو کہ ”قرآن مجید ہی وحی ہے“ اور جب یہ نہیں تو پھر قرآن مجید بھی وحی ہے اور دوسری چیز بھی وحی ہو سکتی ہے۔

**غلط فہمی** ”کیا سارے قرآن میں حدیث کا ضمیمہ بھی کہیں ذکر ہے۔ اگر نہیں تو آپ اسے ہمارے ایمان کا جزو کیسے بنا رہے ہیں“ (دو اسلام ص ۱۰۹)



**ازالہ** | حدیث کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ  
فَاتَّبِعُونِي (العنکبوت: ۲۲) کہہ دیجئے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو۔

۲۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا  
إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ (البقرة: ۱۴۴) اور جس قبلہ پر آپ ہیں وہ ہم نے اس لئے مقرر کیا ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ اتباع رسول کو جو کتنا پہلے قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں بھیر بھی اللہ تعالیٰ اس حکم کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس آیت میں حدیث کے منجانب اللہ ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ تجویز قبلہ کا حکم اس لئے دیا جا رہا ہے کہ متبعین ممتاز ہو جائیں۔ آیت سے اتباع رسول کی اہمیت ظاہر ہے یہی اتباع رسول ہے جس کو سنت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۳۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ  
حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

اگر یہ نمونہ قرآن مجید ہے تو پھر رسول اللہؐ کئے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھول سے قرآن مجید کی جگہ رسول اللہؐ کر دیا۔ نعوذ باللہ منہ۔

۴۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ  
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيكَ  
أَنْفُسَهُمْ حَزَاجًا مِمَّا قُضِيَتْ وَبَسَلَمُوا  
قَسْلِمًا (النساء: ۶۵) آپ کے رب کی قسم لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام اختلافات میں آپ کو حاکم نہ مانیں پھر جو فیصلہ آپ کریں اس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو بسر و چشم قبول کریں۔

اتباع سنت اور اطاعت رسولؐ کا اس سے زیادہ واضح حکم اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیا یہاں بھی ضمیر مخاطب سے مراد قرآن مجید ہے؟ اگر ہے تو پھر یہ کتنا حق بجانب ہے کہ اللہ تعالیٰ صاف صاف حکم دینے کے بجائے الجھن میں مبتلا کرتا ہے؟ نعوذ باللہ۔

۵۔ إِنْ شَاءَ كَانَ قَوْلُ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا  
إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ  
يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (النور: ۵) مومنین کا تو یہ قول ہونا چاہیے کہ جب انہیں اللہ اور رسولؐ کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے معاملات میں فیصلہ کرے تو کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

۶۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْزَلَ  
الرَّسُولَ رَأَيْتُ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ  
عَنْكَ صُدُودًا (النساء: ۶۱) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ شریعت کی طرف اور رسولؐ کی طرف آؤ تو آپ دیکھتے ہیں کہ منافق آپ سے منہ پھیر لیتے ہیں



اگر اس آیت میں "إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ" اور "إِلَى الرَّسُولِ" کے درمیان "وَإِذَا" تفسیری ہے تو معاملہ صاف ہے کہ "مَا أَنْزَلَ اللَّهُ" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں وہ سب "مَا أَنْزَلَ اللَّهُ" (اللہ کی طرف سے نازل شدہ) ہے اور اگر وہ عطف کے لئے ہے تو پھر "مَا أَنْزَلَ اللَّهُ" کی طرف بلانے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلانا یہی ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ کریں وہ بھی ماننا ہوگا اور اسی کا نام اتباع حدیث ہے۔

۷۔ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا

لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ

وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِي يُؤْمِنُونَ

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ

الْأُمِّيَّ (الاعراف: ۱۵۶، ۱۵۷)

اتباع سنت کی اس آیت میں کتنی واضح دلیل ہے۔

۸۔ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ

(النساء: ۱۱۳)

اس آیت میں کتاب کے علاوہ ایک اور چیز کے نزول کی خبر ہے، اور یہ حکمت یعنی سنت ہے جو لوگ یہاں "وَإِذَا" کو تفسیری کہتے ہیں، وہ صحیح نہیں کہتے اس لئے کہ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہونگے کہ اللہ نے آپ پر کتاب نازل کی، یعنی حکمت نازل کی یعنی وہ باتیں سکھائیں جو آپ نہیں جانتے تھے۔ بار بار اولیٰ تفسیری کا انابلغت کے منافی ہے۔ لہذا یہاں "وَإِذَا" برائے عطف ہے۔

ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے ہیں۔

رَبِّنَا وَانْعَشْ فَمِنْهُمْ رَسُولٌ لَقَدْهُمْ يَشْلُوا

عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرة: ۱۲۹)

اس آیت میں اگر وہ "وَإِذَا" کو تفسیری مانا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ بھی تفسیر کا محتاج ہے

اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ابراہیم علیہ السلام سمجھنے میں دھوکہ ہو سکتا تھا۔ لہذا ابراہیم علیہ السلام نے تفسیر کر دی، اور یہ قطعاً باطل ہے، پس ثابت ہوا کہ کتاب و حکمت دو چیزیں ہیں اور دونوں نازل ہوئی ہیں۔ پر دینیہ بھی جو بہت زیادہ اولیٰ تفسیری کی طرف مائل ہیں۔ اس آیت میں "وَإِذَا" کو تفسیری شمار نہیں



کرتے۔ ان کا ترجمہ درج ذیل ہے۔  
 ”اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل کر دی ہے اور وہ باتیں سکھادی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۱۸۴)

اگر بالفرض محال کتاب و حکمت ایک ہی چیز ہے تو پھر وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ کے دوسری چیز ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، اور یہی چیز حدیث ہے۔

۴۔ وَيُحِلُّ لَكُمْ الْطَيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ

رسول ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتا ہے

عَلَيْكُمْ الْخَبَائِثِ (الاعراف: ۳۵)

اور ان پر خبیث چیزوں کو حرام کرتا ہے۔

اس آیت میں تحریم و تحلیل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بتایا گیا ہے، نہ کہ قرآن کا، گائے کے پیشاب کو بعض لوگ اب بھی پاک سمجھتے ہیں، اسے پیتے ہیں، کیا ایسے لوگوں کو اگر وہ مسلم ہو جائیں، پیشاب پینے کی اجازت ہوگی۔ اگر نہیں تو کیا قرآن مجید سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ پیشاب حرام ہے۔ اگر نہیں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے حکم دیا پیشاب سے بچو، اور اس طرح پیشاب حرام کر دیا۔ گدھے، گتے، بلی وغیرہ مختلف جانوروں کو حرام قرار دیا، ورنہ قرآن مجید کی رو سے تو سب چیزیں حلال کی جاسکتی ہیں۔

کسی مؤمن مرد یا عورت کو زیہ یا نہیں کر جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو پھر بھی ان کو اس معاملہ میں اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

اللہ اور اس کے رسول، نبی اُمّی پر ایمان لاؤ جو خود بھی اللہ اور اللہ کے کلمات پر ایمان لاتا ہے اور اس کا اتباع کرو تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے۔

اتباع رسول کی کتنی واضح آیت ہے، اسی اتباع رسول کا نام اتباع سنت یا اتباع حدیث ہے

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم منہ موڑو تو رسول اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے اور تم اپنے فرائض کے ذمہ دار ہو، اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو تمہیں ہدایت مل جائے گی اور رسول

۱۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا (الاحزاب: ۳۶)

۱۱۔ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبَعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف: ۱۵۸)

۱۲۔ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا أَمْرَهُمْ مَا حَتَمُوا عَلَيْكُمْ مَا حَمَلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَمَا عَلَى الْمُنَافِقِينَ



(النور:- ۵۴) کے ذمہ کچھ نہیں سوائے صاف صاف پہنچانے کے۔

یہ آیت کتنی واضح ہے کہ ہدایت کا کوئی راستہ نہیں، سوائے اطاعت رسولؐ کے، اطاعت رسولؐ کر و گئے تو ہدایت یاب ہو گئے ورنہ نہیں۔ پھر شروع آیت میں اطاعت الہی اور اطاعت رسولؐ کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ آیت میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے مرکز ملت کی اطاعت مراد نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہاں اللہ و رسولؐ کے الفاظ ساتھ ساتھ آتے ہیں وہاں ان سے مراد مرکز ملت ہوتا ہے، پھر آیت مذکورہ میں آگے چل کر اطاعت الہی کو حذف کر کے پورا زور اطاعت رسولؐ پر دیا جا رہا ہے اور کیوں نہ ہو، جبکہ اطاعت رسولؐ ہی اطاعت الہی کی بنیاد ہو۔ اگر اطاعت رسولؐ نہیں تو اطاعت الہی بھی نہیں۔ اسی لئے فرمایا:-

مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللَّهَ (النساء:- ۵۸) جس نے رسولؐ کی اطاعت کی امانے اللہ کی اطاعت کی اگر رسولؐ کی اطاعت سے مراد قرآن مجید کی اطاعت ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو یہ دونوں الفاظ معلوم نہیں تھے کہ بار بار رسولؐ کا لفظ تو استعمال کرتا ہے اور جو اصل مطاع ہے اس کے نام کو ترک کر دیتا ہے۔ الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن سے اتباع رسولؐ لازمی ثابت ہوتا ہے اور یہ چیز ضمناً نہیں بلکہ صراحۃً ہے۔ اطاعت رسولؐ فرض ہے اور اطاعت اور اتباع کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کا موجود ہونا لازمی ہے۔ ورنہ بغیر اقوال اور افعال رسولؐ کے اطاعت اور اتباع ناممکن ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ اقوال اور افعال رسولؐ یعنی احادیث محفوظ ہیں اور ان کی اطاعت و پیروی از روئے قرآن مجید فرض ہے۔

اب برق صاحب ہمیں بتائیں کہ اتباع رسولؐ یعنی احادیث کو جزو ایمان ہم بنا رہے ہیں یا اللہ تعالیٰ اور خود برق صاحب بھی احادیث کے جزو ایمان ہونے کے قائل و معترف ہیں۔ لہذا اس بحث کا خاتمہ ان ہی کے الفاظ پر کیا جاتا ہے۔

برق صاحب فرماتے ہیں:-

”اقوال رسولؐ کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے۔ اگر اقوال رسولؐ مل جاتے تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں داخل ہو جاتا (دو اسلام ص ۱۱۱)

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ اقوال رسولؐ کو جزو ایمان بنانے میں برق صاحب بھی ہمارے ہمنا ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے نزدیک اقوال رسولؐ کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے اور ہمارے نزدیک بے حد آسان۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ اقوال رسولؐ کا دستیاب ہونا کس طرح آسان ہے اور وہ کہاں ملیں گے برق صاحب یہ اقوال رسولؐ جن کو آپ جزو ایمان بنانے کی فکر میں ہیں،



آپ سے دور نہیں۔ بلکہ آپ کے بہت ہی قریب ہیں۔ آپ ہی تحریر فرماتے ہیں۔  
 کہ ”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“ (دو اسلام ص ۳۴)

برق صاحب اب ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ یہ صحیح احادیث آپ کو کہاں سے مل گئیں۔ ان کا کوئی وجود تھا جب ہی تو آپ کو دستیاب ہو گئیں، اور جب دستیاب ہو گئیں تو اب ان کو جزو ایمان بنانے سے کیا امر مانع ہے۔ صحیح احادیث کے وجود کو آپ نے آگے چل کر مہر تسلیم کیا ہے۔  
 آپ لکھتے ہیں۔

”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں“ (دو اسلام ص ۳۴)  
 لیجئے اب تو فیصلہ ہو گیا، صحیح احادیث کے وجود کے آپ بھی معترف ہیں۔ لہٰذا یہ صحیح احادیث تو یقیناً بقول آپ کے دائرہ ایمان میں شامل ہو گئی ہوں گی۔  
 اس کے آگے برق صاحب رقمطراز ہیں۔

”صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں۔ اول یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہو، یعنی ہم یہ دلائل ثابت کر سکیں کہ یہ قول حضور کی زبان مبارک سے واقعی نکلا۔ ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں، البتہ ظن غالب یہ ہے کہ بعض اقوال صحیح ہوں گے۔ دوم کہ احادیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں“ (دو اسلام ص ۳۴)

اس عبارت میں برق صاحب نے صحیح احادیث کے وجود کو تسلیم کیا ہے بعض کو ظن غالب سے اور بعض کو یقیناً۔ کیونکہ اصل مطلوب مقصود تو مفہوم ہی ہے۔ جب مفہوم ثابت ہو گیا تو وہ مفہوم قرآن کریم کی تشریح ہو گیا اور اس اعتبار سے قرآن مجید پر ایمان لاتے ہی وہ مفہوم دائرہ ایمان میں شامل ہو گیا۔ برق صاحب نے مذکورہ بالا عبارت میں بعض احادیث کو باعتبار الفاظ یقیناً صحیح تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ظن غالب کے طور پر تسلیم کیا۔ اس چیز سے ہمیں متھوڑا سا اختلاف ہے، بعض نہیں، بہت سی احادیث باعتبار الفاظ کے بھی یقیناً صحیح ہیں اور ان کے صحیح ہونے پر فن حدیث میں کافی دلائل موجود ہیں۔  
 خلاصہ | مذکورہ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور خود برق صاحب کی تحریر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحیح احادیث جزو ایمان ہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی | اگر حدیث پر ایمان ایسا ہی ضروری تھا تو جس خدا نے لاکھوں انبیاء، سینکڑوں صحائف اور کروڑوں ملائکہ پر ایمان لانے کا بیسیوں مرتبہ حکم دیا تھا، کیوں حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ اگر اللہ نے اس چیز کو قابل ایمان نہیں سمجھا تو آپ کون ہیں ہمیں حدیثوں پر ایمان لانے کا حکم دینے والے“ (دو اسلام ص ۱۰۹)



**ازالہ** | اللہ تعالیٰ نے کتاب پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے اور کتاب میں قرآن مجید اور حدیث یعنی پوری شریعت شامل ہے۔ ان تمام آیتوں میں جن میں کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ قرآن مجید کا نام نہیں ہے بلکہ کتاب یا ما انزل اللہ کے الفاظ ہیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں۔

دوم۔ حدیثوں پر ایمان لانے کا حکم دینے والے ہم نہیں ہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے اور خود اس کے معترف ہیں یہ آپ ہی کے الفاظ ہیں:-

”قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے“ (دو اسلام ص ۱۱) اب آپ کے لئے صرف ایک ہی الجھن باقی رہ جاتی ہے کہ ایسے اقوال ملیں کہاں سے، تو یہ مشکل آپ نے خود ہی حل کر دی ہے اور ان احادیث کی نثاندہی فرمادی ہے تفصیل کے لئے ازالہ ماقبل ملاحظہ فرمائیے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | م:- اور آپ کے پاس ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ“ ..... کا کیا جواب ہے؟

ب:- آیت کا مفہوم نہایت صاف ہے، کہ قرآن رسولؐ کی خواہشات کا آئینہ دار نہیں، بلکہ وہ اللہ کا پیغام ہے مطلب یہ کہ قرآن رسولؐ کی تصنیف نہیں، کہ جو جی میں آیا اس کے مطابق آیت تیار کر لیں۔ (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ) بلکہ وہ ہمارا پیغام ہے، ہماری مشیت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ (اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ) (دو اسلام ص ۱۹) برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**ازالہ** | اگر اقوال رسولؐ مل جاتے، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے۔ (دو اسلام ص ۱۱) اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوئیں:-

اول۔ قول رسولؐ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا ہے۔

دوم۔ رسولؐ کا قول دائرہ ایمان میں شامل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک بشر کے اقوال کو یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس کا ہر قول قرآن حکیم کی تشریح ہو اور ایسا ہر قول دائرہ ایمان میں شامل ہو؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ وہ بشر اللہ تعالیٰ کا رسولؐ ہے۔ وہ جو کچھ تشریح کرتا ہے، من جانب اللہ وحی ہوتی ہے، یعنی یہ تشریح اس کی طرف سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، اور اسی لئے اس پر ایمان



لانا ضروری ہوتا ہے۔

لہذا برق صاحب کے تحریر کردہ اصول کی روشنی میں آیت کا یہ مفہوم ہوا کہ قرآن مجید کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہشات کی آئینہ دار نہیں بلکہ وہ اللہ کا پیغام ہے۔ مطلب یہ کہ تشریح قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں کہ جو جی میں آیا کہہ دیا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ۔ بلکہ وہ تشریح اللہ تعالیٰ کا پیغام ہوتی ہے جو مشیت الہی کی ترجمانی کرتی ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحٰی مثلاً قرآن مجید میں ہے کہ نماز پڑھو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز تم پر فرض ہے۔ فلاں وقت اتنی رکعت ہیں۔ ہر رکعت میں ایک رکوع ہے۔ دو سجدے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متصور نہیں ہوگی اس پر اسی طرح ایمان لانا ہوگا جس طرح قرآن مجید پر۔ اب اگر کوئی شخص نماز کی فرضیت کا تو اقرار کرے اور پانچ وقت کا انکار کرے تو وہ اسی طرح کافر ہوگا جس طرح نماز کی فرضیت کا انکار کرنے والا کیونکہ حکم الہی کے منشاء کا انکار خود اس حکم کا انکار ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی**

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحٰی﴾ اس آیت میں ”ہُو“ کا مرجع ہے قرآن جو وہاں محذوف ہے آپ کہیں گے محذوف کے لئے کوئی قرینہ چاہیئے۔ بھائی صاحب سینکڑوں آیات اس حذف کے لئے بطور قرینہ موجود ہیں (دو اسلام ص ۱۰۹)

ہُو کا مرجع قرآن مجید نہیں ہے بلکہ لفظی رسول یعنی قول رسول ہے جو اس سے پہلے کی آیت میں موجود ہے ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ“ یعنی رسول اپنی خواہش سے نہیں بولتا اس کا قول وحی ہوتا ہے۔ قریب ترین آیت میں ”ہُو“ کا مرجع موجود ہوتے ہوئے دور دراز کی آیتوں سے مرجع تلاش کرنا قرین انصاف نہیں یہ غلط فہمی صرف اس لئے پیدا ہوئی کہ برق صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ ”قرآن وحی ہے لہذا بروحی قرآن ہے“ بے شک پہلا جملہ ”قرآن وحی ہے“ بالکل صحیح ہے لیکن ”بروحی قرآن ہے“ صحیح نہیں اور نہ اس کا کوئی قائل ہے۔

برق صاحب رقم طراز ہیں:-

**غلط فہمی**

حدیث کا باطل نے وہ پلستر بگاڑا ہے کہ لاکھوں آفتاب، مابہتاب لے کر بھی ٹھونڈھو تو حقیقت کا سراغ نہ مل سکے اِلَّا مَا شَاءَ اللہ (دو اسلام ص ۱۱۰)

اس کے جواب میں برق صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت ہی کافی ہے۔

**ازالہ**

لیکن اس گلابیہ مطلب نہیں کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں..... حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزار ہا احادیث صحیح ہیں..... اس



طرح کی ہزار ہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں۔ جو نہ صرف تعلیماتِ قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں..... اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں۔ (دو اسلام ص ۲۲۱، ص ۲۲۲)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | م:- لیکن حدیث کی حُجَّت پر ایک اور آیت موجود ہے۔  
ب:- فرمائیے۔

م:- اَطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ (اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت کرو) اللہ نے قرآن دیا ہے اور رسول نے حدیث، اس لئے دونوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

ب:- آپ نے پوری آیت نہیں پڑھی ”وَأُولَا لَا مَرْنَكُمْ“ چھوڑ گئے ہیں۔ ساری آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہوا (اللہ، رسول اور حاکم وقت (جو تم میں سے ہو) کو مانو) اگر رسول کی اطاعت کا یہی مطلب ہے کہ آپ کے تمام اقوال پر ایمان لاؤ۔ تو پھر حاکم وقت کے اقوال پر بھی ایمان لانا پڑے گا کیونکہ اللہ نے اس کی اطاعت کا بھی ویسے ہی حکم دیا ہے۔ (دو اسلام ص ۱۱۱)

**ازالہ** | جی نہیں، اللہ نے حاکم وقت کے اقوال پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ اس کے آگے فرمایا ہے کہ:-

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ - (النساء: ۵۹)

اگر تم کسی معاملہ میں اختلاف کرو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی اُمت کو حاکم وقت سے اختلاف کا اختیار دیا۔ اس کے قول پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ اختلاف کر کے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا، گویا قول رسول خود سند ہے اس سے اختلاف کرنے کا نہ اختیار ہے، نہ کسی دوسری طرف رجوع کا حکم ہے۔ بلکہ صاف ارشاد ہے

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُوْمِنِينَ تُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء: ۵۵)

جو شخص ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسول کے خلاف چلے اور مومنین کے راستہ سے علیحدہ کوئی راستہ اختیار کرے تو ہم اس کو ادھر ہی جانے دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کر دیں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چلنا مومنین کا راستہ نہیں بلکہ کافروں کا راستہ ہے۔ دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف کرنے کے اختیار کو سلب کر لیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:-



وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونُوا لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا (الاحزاب: ۳۶)

کسی مؤمن مرد یا عورت کے لئے زیبا نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں پھر ان کو اس معاملہ میں اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

قول و فعل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف رکھنا تو بہت بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ بھی برداشت نہیں کرتا کہ کوئی شخص دل میں بھی کسی قسم کا اختلاف رکھے۔

ارشادِ باری ہے :-

فَلَا وَرَيْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء: ۶۵)

اپکے رب کی قسم لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام اختلافات میں آپ کو حکم نہ مان لیں پھر جو فیصلہ آپ نے کیا ہو اُس سے اپنے دل میں شکی محسوس نہ کریں بلکہ بسر و چشم اسے قبول کریں۔

کیونکہ ایمان کا اصلی تعلق دل سے ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دل میں اختلاف رکھنے کو بھی کفر بتایا، اور قسم کھا کر فرمایا کہ ایسا شخص مؤمن نہیں ہو سکتا، اسی بناء پر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا فرض ہے۔ اگر قول رسول پر ایمان لانا فرض نہ ہوتا تو اختلاف کی گنجائش نکل سکتی تھی اور کم از کم پوشیدہ طور پر تو اختلاف رکھا جاسکتا تھا۔ لیکن یہاں ان باتوں کی قطعاً گنجائش نہیں، بلکہ غیر مشروط طور پر سر جھکا دینا لازم ہے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، کہیں اللہ اور رسول کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں، اور کہیں صرف رسول کی اطاعت کا ذکر ہے مثلاً :-

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا أَمْرًا مِّنْ سُلْطَانٍ مِّنْ بَيْنِهِمْ (النور: ۵۶)

اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

امیر کی اطاعت کا حکم صرف ایک آیت میں ہے، پھر اس آیت میں بھی حکم امیر کو آخری سند کا درجہ نہیں دیا گیا، بلکہ اس سے اختلاف کی اجازت دی گئی اور آخری سند اللہ اور رسول کو بتایا گیا۔ اس وضاحت کے بعد یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حاکم وقت کی اطاعت کی نوعیت ایک ہی ہے۔ دونوں اطاعتوں میں بڑا فرق ہے۔ لہذا ان دونوں اطاعتوں کا مقابلہ غیر صحیح ہے۔ حاکم کی اطاعت کو کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت نہیں فرمایا مگر رسول کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت فرمایا۔



ارشادِ باری ہے :-

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء: ۸۰) جس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

پس ثابت ہوا کہ کجا اطاعتِ حاکم اور کجا اطاعتِ رسولؐ، پہر نسبت خاک را با عالم پاک۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

م :- تو کیا اقوالِ رسولؐ قابلِ ایمان نہیں ؟

ج :- کیوں نہیں بشرطیکہ ہمیں کہیں سے کوئی قولِ رسولؐ مل جائے۔ (دو اسلام ص ۱۱۱)

گزارش | اس عبارت میں برق صاحب نے اقوالِ رسولؐ کو قابلِ ایمان تسلیم کیا ہے۔ یہ حقیقتاً حق کا اعتراف ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ

ہمارا اور برق صاحب کا اختلاف ہی ختم ہو گیا، جو برق صاحب کا عقیدہ وہی ہمارا، لہذا اب برق صاحب سے ایک گزارش ہے، وہ یہ کہ براہِ کرم اپنے موجودہ رویہ میں کچھ اصلاح کیجئے۔ اس لئے جس چیز پر ایمان لانا ضروری ہو، اس کو ماخذِ قانون اور حجتِ شرعیہ تسلیم نہ کرنا نشانِ ایمان نہیں، پھر بقول آپ کے اقوالِ رسولؐ قرآنِ حکیم کی تشریح ہیں۔ اور دائرہِ ایمان میں شامل ہیں تو پھر ان کا من جانب اللہ تسلیم نہ کرنا کسی مومن کو تو زیب نہیں دیتا۔ پھر یہ کہ ابھی کسی طرح صحیح نہیں کہ جو تشریح من جانب اللہ ہو، جس پر ایمان لانا ضروری ہو۔ وہ غیر محفوظ ہو، گویا ایمان کے لوازمات خالی ہو گئے۔ قرآن مجید کے الفاظ تو موجود ہوں، لیکن یہ نہ معلوم ہو کہ قرآن مجید کے بھیجنے والے کا منشاء ان الفاظ سے کیا تھا، اور جو چیز منشاء الہی کو بتانے والی تھی وہ موجود نہیں، بتایے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دین کی حفاظت ہے۔ کیا یہ اہانتِ اسلام نہیں، حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید محفوظ ہے اور اس کی تشریح بھی محفوظ ہے اور یہ تشریح کہاں محفوظ ہے اس کے لئے بھی زیادہ دُرُجائے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی کتاب کا بیسواں باب (ص ۳۴۱، ۳۴۲) ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کی عبارتوں کے اقتباسات برق صاحب ہم اسی باب میں گذشتہ صفحات میں نقل کر چکے ہیں۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

اللہ تعالیٰ نے ہمیں قوانین کی ایک کتاب یعنی قرآن دے کر اپنے رسولؐ کو ہمارا امیر اور اولوالامر بنا دیا۔ تاکہ وہ ان قوانین کو نافذ کر سکے اور ہمیں حکم دے دیا کہ رسولؐ کی اطاعت کرو۔ رسول خدا جب تک بقیدِ حیات رہے صرف انہیں قوانین کی تعمیل کراتے رہے جن کی تفصیل قرآن مجید میں دی ہوئی تھی اور آج بھی ہم پر رسول خدا کی اطاعت قرآنی احکام کی حد تک فرض ہے



**ازالہ** | جب رسول ایسا حاکم نہیں جو خود حاکم بن بیٹھا ہو، یا لوگوں نے اس کو اپنا حاکم بنایا ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا حاکم ہے، تو پھر اس کی فرمانروائی منصب رسالت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا ہے حالانکہ ہر مقام پر امیر کی اطاعت کا حکم ہونا چاہیے تھا اس لئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تلاوت قرآن کی حد تک رسول ہیں، اور اس کے بعد وہ ایک عام حاکم کی طرح ہیں، تو پھر بار بار بلکہ ہر بار یہ کہنا کہ رسول کی اطاعت کرو، نعوذ باللہ دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر کلام میں وضاحت ہوتی ہے اور کوئی کلام مبہم اور گمراہ کن نہیں ہوتا۔ اس لئے یہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بہ حیثیت منصب رسالت ہے، نہ کہ بہ حیثیت حاکم، لہذا ایسا حاکم جس کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہو، جس کی حکمرانی منصب رسالت کے ساتھ وابستہ ہو، جب کوئی حکم نافذ کرے گا، یا کسی قانون کی تشریح کرے گا، تو اس کا وہ طریقہ نفاذ اور اس کی وہ تشریح من جانب اللہ ہی ہوگی، اور ہر لحاظ سے بالکل منشاء الہی کے موافق ہوگی، اور اگر ایسا نہ ہو تو کہا جائے گا کہ قانون الہی کے نفاذ اور اس کی تشریح میں روزاؤل ہی سے غلطی نے راہ پالی، اور کچھ نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں قانون کی تشریح کیا ہے، اور اس کو کس طریقہ سے نافذ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا۔

مَا صَلَّيْنَا صَاحِبَكُمْ وَمَا غَوَىٰ (انجم: ۲) رسول نہ کبھی گمراہ ہوا نہ کبھی بہکا۔

بَلْكَ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (انجم: ۲) اس کی زبان وحی الہی کی ترجمانی کرتی ہے۔

بھلا ایسے حاکم کی فرمانروائی کو دوسرے حاکموں کی فرمانروائی سے کیا نسبت؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قرآن مجید کی حد تک فرض ہے، اور اس کے علاوہ نہیں، تو پھر بلا وجہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ قرآن مجید کے بجائے رسول کا لفظ استعمال کر کے دنیا کو غلط فہمی میں مبتلا کیا، کیوں نہ ہر جگہ قرآن مجید کی اطاعت کا حکم دیا۔ کیا اللہ تعالیٰ بھی بھول جایا کرتا ہے، یا قصداً ایسا کرتا ہے، کہ کتنا کچھ چاہتا ہے اور کتنا کچھ ہے؟ نعوذ باللہ من ذلک۔

**غلط فہمی** | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

مر۔ آپ کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اگر رسول قرآنی احکام کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دے تو آپ اس کی تعمیل نہیں کریں گے۔

(ب) یہ آپ نے فرض ہی کیوں کیا، کہ رسول صلعم قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دینے کی بھی جرأت کر سکتے تھے، انہیں بار بار کہا جا رہا تھا۔ تَبْلِغُ مَا



”اُنْزِلَ اِلَيْكَ“ اسے رسول تم وہ احکام امت تک پہنچاؤ جو ہم تمہیں دے رہے ہیں، کیا رسول اکرم صلعم اس صریح حکم سے سرتابی کی جرأت کر سکتے تھے؟ لفظ رسول کے معنی ہی قاصد، ایچی اور چٹھی رساں ہیں، تو ایک قاصد خود کیسے آقا بن سکتا ہے؟ (دو اسلام ص ۱۱۱)

جی ہاں وہ خود آقا نہیں بن سکتا، بلکہ بنایا جاتا ہے، جس چٹھی کو وہ لے کر آتا ہے، ازالہ اسی چٹھی میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ چٹھی رساں کی اطاعت کرنا، یہ میرا تو چٹھی رساں ہے، لیکن تمہارا حکم ہے، اس کی اطاعت کرو، بس یہی میری اطاعت ہے، اس سلسلہ میں متعدد آیات اس چٹھی میں موجود ہیں، جن کو ادھر نقل کیا جا چکا ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود حاکم بن بیٹھا؟ ہرگز نہیں اگر رسول کی حیثیت اتنی ہی ہے کہ وہ چٹھی پہنچا دے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، تو پھر اس کا درجہ ہر انسان سے کم ہوا، اس لئے کہ چٹھی بھیجنے والے اور چٹھی وصول کرنے والے کے درمیان چٹھی رساں محض ایک ذریعہ ہوتا ہے، اہم شخصیتیں تو وہ ہیں جو چٹھی کو بھیجنے والی اور چٹھی کو وصول کرنے والی ہیں، چٹھی رساں کی حیثیت دونوں کے درمیان محض ایک ملازم کی سی ہوتی ہے اور بس، اگر یہی درجہ آپ رسول کو دینا چاہتے ہیں تو بس پھر ایمان کا اللہ ہی حافظ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (ال عمران: ۱۶۴)

تحقیق اللہ نے مومنین پر بڑا احسان کیا جب کہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کے قلوب کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ورنہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

برق صاحب کیا چٹھی رساں کے یہی فرائض ہوتے ہیں، ذرا غور کیجئے، مزکی و معلم انسانیت کو آپ چٹھی رساں بنا رہے ہیں، العیاذ باللہ، حقیقت تو یہ ہے کہ رسول کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جو کہ بادشاہ کی طرف سے کسی صوبہ کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے، بادشاہ کی طرف سے چند ہدایات اس کو دی جاتی ہیں، اور وہ ان کی روشنی میں اس صوبہ پر حکومت کرتا ہے وہ چٹھی رساں نہیں ہوتا، کہ چٹھی حوالہ کی اور چل دیا اسی طرح رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہوتا ہے، اور مطاع عالم بنا کر بھیجا جاتا ہے، وہ ہدایت کا نسخہ دے کر رخصت نہیں ہو جاتا بلکہ اپنی اطاعت اور فرمانروائی کا ڈنکہ بجاتا ہے، وہ آتا ہے، اور علی الاعلان کہتا ہے

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝ (الشعراء: ۱۰۸) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔



اطاعت اور فرمانروائی کا یہ منصب وہ اپنے لئے خود اختیار نہیں کرتا، بلکہ اس منصب پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فائز ہوتا ہے، ارشاد باری ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رُسُلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ﴿۱۶۳﴾ ہر رسول کی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جاتی ہے تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں، تمہید میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ سنت بھی وحی کے ذریعہ نازل ہوئی ہے، لہذا "تِلْكَ قُلُوبُ الَّذِينَ" میں وہ بھی شامل ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | ”آپ ایک چھوٹا سا نکتہ پیش نظر رکھیں، کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں

وہ پیغمبر بھی تھے اور بشر بھی، بہ حیثیت پیغمبر ہم ان کی اطاعت پر مامور ہیں، اور بہ حیثیت بشر اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی ہے، کہ ہم چاہیں تو کھانے پینے، چلنے، بولنے، بیٹھنے اور سونے میں حضور کی روش اختیار کریں یا حد و شریعت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی پسند، اپنے مذاق، اپنے ملک و ماحول اور اپنے رجحان سے کام لیں۔“ (دو اسلام ص ۱۱۲-۱۱۳)

**ازالہ** | اگر کھانے پینے سے یہ مراد ہے، کہ ہم اپنی پسند کی چیزیں کھائیں اور پئیں، اور ہم پر یہ لازمی نہیں کہ جو کی روٹی اور کھجور ہی کھائیں تو بے شک آپ نے ٹھیک فرمایا۔ ان چیزوں کے سنت دینی ہونے کا کوئی قائل نہیں لیکن کھانے پینے کے جو اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرمائے ہیں ان سے ہم تجاوز نہیں کر سکتے اور نہ اس معاملہ میں ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ خواہ ان اصولوں کے مطابق عمل کریں خواہ ان کو ترک کر کے دوسرے اصول اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی اور اصول و ضوابط مقرر فرمائے۔ ان اصول و ضوابط کی خلاف ورزی کرنا بے شک جرم ہے۔ مثلاً آپ نے ہم کو اٹھ لٹے ہاتھ سے کھانے پینے سے منع فرمایا، اب ہم اپنے ماحول یعنی مغربی تہذیب کے غلبہ سے متاثر ہو کر اٹھ لٹے ہاتھ سے کھانا پینا شروع کر دیں تو یہ کسی طرح جائز نہیں بلکہ اس سے مسلم معاشرہ کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس طرح اندھا دھند تقلید، نقالی اور احساس کمتری کے جراثیم اسلامی تہذیب کو فنا کر دیں گے۔ الغرض ایک تو ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی پسند و ایک ہوئی اصول و تشریعی پسند طبعی پسند کی مثال لو کی کھانا ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ لو کی کھائیں لیکن لو کی ہو یا کوئی دوسری چیز اس کے کھانے کے جو آداب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دیئے ہیں وہ ہمارے اسلامی تہذیب و شریعت کا جز و لاینفک ہیں۔ ان میں ہمیں اختیار نہیں کہ خواہ ان پر عمل کریں۔ خواہ اپنے ماحول یا اپنی پسند کے مطابق دوسری قوم کی نقالی کرتے پھریں۔ اسی



طرح زراعت و تجارت۔ جہاد و سفر۔ بین دین کے وہ تمام ذرائع جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھے یا جن کو خود آپ نے استعمال فرمایا سنت نہیں کہے جاسکتے۔ مثلاً جہاد میں بیروں کا استعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا لیکن دورِ حاضر میں اس کے استعمال کو سنت کوئی نہیں کہتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جہاد اور اسی طرح کے دوسرے معاملات کے متعلق جو اصول آپ نے مقرر فرمائے وہ چاہے ہم قبول کریں چاہے ان کی جگہ دوسرے اصول اپنی پسند و ماحول کے مطابق وضع کر لیں۔ یہ ہرگز جائز نہیں۔ یہ حدودِ شریعت ہیں اور غالباً اسی وجہ سے برق صاحب نے بھی ”حدودِ شریعت“ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اگر ان کا یہی منشاء ہے تو ہمیں ان سے اتفاق ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں، کہ بعض اوقات صحابہ نے آپ کے بشری ہدایات یا مشورہ پر عمل نہیں کیا تھا، مثلاً جب آپ کے غلام زید نے اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی، تو آپ نے فرمایا ”اُمِّسِکَ عَلَیْکَ زَوْجُکَ“ (طلاق مت دو) لیکن زید نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ اسی طرح جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصرار تھا، کہ انہیں قتل کر دیا جائے، لیکن حضورؐ نہ مانے، اور وحی نے عمرؓ کی تائید کر دی (ص ۱۱۳)۔

**ازالہ** برق صاحب نے جو مثالیں ذکر کی ہیں، یہ احکام، اصول اور ضوابط کی مثالیں نہیں ہیں، بلکہ بقول برق صاحب یہ مشورے ہیں، اور مشورہ ہوتا ہی اسی لئے ہے کہ جس کو مشورہ دیا جا رہا ہے وہ مانے یا نہ مانے، لہذا مشورہ کو حکم و ہدایت کے ذیل میں لانا بہت بڑی غلط فہمی ہے، مزید برآں جنگِ بدر کے قیدیوں کا معاملہ تو اس جگہ قطعاً بے محل ہے، اس لئے کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کر دینا۔ یہ اکثریت کی رائے تھی، اسی وجہ سے اس پر عمل کیا گیا، مشورہ سے جو معاملات طے ہوتے ہیں، وہ قانون اور ضوابط نہیں بنتے، قانون اور ضوابط تو صرف احکام الہی ہوتے ہیں، جو بذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں، اور کسی قانون و ضابطہ کے بنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا، مثلاً جب آپ نے اٹھ ہاتھ سے کھانا پینا منع فرمایا تو اس سے پہلے کوئی مجلس مشاورت قائم نہیں کی، بلکہ بغیر مشورہ کے اس ضابطہ کا اعلان فرمایا، لہذا اس ضابطہ کو ماننا ہم پر فرض ہے۔ اسی طرح ہر ضابطہ ماننا ہم پر فرض ہے۔ مشورہ ماننا فرض نہیں، مشورہ حکم کا درجہ اختیار نہیں کرتا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔



” حضور نے گیارہ نکاح کئے تھے، لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں“ (دو اسلام ص ۱۱۱)

**ازالہ** | یہ اختیار کی مثال نہ ہوتی، بلکہ جبر کی مثال ہوتی، یعنی ہم مختار نہیں، بلکہ مجبور ہیں، کہ چار سے زیادہ نکاح نہ کریں، حالانکہ قرآن مجید سے اس کی صریح ممانعت ثابت نہیں ہوتی پھر فعلی سنت بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ چار سے زیادہ نکاح کئے جاسکتے ہیں، لیکن قوی حدیث کے ذریعہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آزادی کو ہم سے سلب کر لیا، اور ہم کو چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت کر دی، الغرض ایک فعلی سنت سے روکنے والی دوسری قوی سنت ہے، ہمارے اختیار کو اس میں کہاں دخل ہے۔

برق صاحب آپ سے ایک سوال ہے، وہ یہ ہے کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت قرآن مجید میں ہے یا نہیں؟

(۱) اگر ہے، تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گیارہ نکاح کرنے کی اجازت قرآن مجید کی کس آیت میں ہے؟ اگر قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں تو پھر یا تو یہ اجازت کسی دوسری وحی میں آئی ہوگی، یا یہ کنا پڑے گا۔ کہ نعوذ باللہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے؟ کیونکہ قرآنی احکام کی خلاف ورزی آپ سے قطعاً ناممکن ہے، لہذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم قرآن مجید کے علاوہ بھی وحی کا آنا تسلیم کریں، اور اسی وحی کو حدیث کہتے ہیں۔

(۲) اگر قرآن مجید میں چار سے زیادہ نکاح کی ممانعت نہیں، تو پھر وہ ممانعت کس جگہ ہے ظاہر ہے کہ اس ممانعت کا مقام حدیث میں ہوگا، پس ثابت ہوا کہ حدیث بھی ماخذ قانون اور حجت شرعیہ ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | حضور نے ایک اندھے سے بے التفاتی فرمائی تھی، جس پر سورہ عبس

نازل ہوئی، اور ملک العرش نے اپنے محبوب کو ایک ہلکی سی ڈانٹ پلا دی (دو اسلام ص ۱۱۱)

برق صاحب کا منشا یہ ہے کہ اندھے سے بے التفاتی سنت ہے، لیکن اس سنت **ازالہ** | پر عمل کرنا منع ہے۔ یا یہ کہ اس سنت پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، گویا سنت کوئی واجب الاتباع چیز نہیں، بلکہ سنت کو کوئی دینی اہمیت حاصل نہیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لغزشیں ہوتی تھیں اور اللہ تعالیٰ تنبیہ نازل فرماتا تھا، برق صاحب نے درحقیقت سنت کا مطلب سمجھا ہی نہیں، سنت دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فعل یا قول ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا بھی صاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اور



حیات طیبہ میں جو اقوال و افعال آپ سے صادر ہوئے سب پر اللہ تعالیٰ کا صادر ہے۔ پوری زندگی میں یہ دو تین مثالیں ہی ایسی ملتی ہیں، جن سے معمولی سی غلطی کا ثبوت ملتا ہے اور یہی وہ مثالیں ہیں جو ہمارے لئے موجب اطمینان ہیں۔ انہی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال پر کس طرح اللہ تعالیٰ کی تنقیدی نظر پڑ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے "اِنَّكَ يَا عِیْنُ" آپ ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اول تو غلطی ہوتی نہیں، اور اگر کبھی ذرا سی بھی غلطی ہوتی ہے تو فوراً وحی الہی جنبش میں آجاتی ہے اور اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال پر اللہ تعالیٰ خاموش رہتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان افعال سے راضی ہے اگر ناراض ہوتا تو ضرور تنبیہ کرتا، جس طرح ان دو تین واقعات کے سلسلہ میں تنبیہ کا نزول ہوا، گویا اس اصلاح کے بعد اب پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی منظور و مقبول ہوتی، لہذا ثابت ہوا کہ جن اعمال سے اللہ راضی ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ہیں، اگر ان کی پیروی کرنی، تو اللہ راضی ہو جائے گا۔ اور یہی مؤمن کا مقصد حیات ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو اسوۂ حسنہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (الاحزاب-۲۱) اللہ تعالیٰ کی تنقید، پھر اصلاح، پھر منظوری پھر یہ آیت، کیا اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی پیروی میں ہی نجات ہے۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے، کہ آخر اللہ تعالیٰ کیوں ذرا ذرا سی بات پر تنبیہ کرتا ہے، کبھی اندھے سے بے التفاتی پر تنبیہ کرتا ہے۔ کبھی شہد نہ کھانے کے عہد پر تنبیہ کرتا ہے حتیٰ کہ بیویاں مال و دولت کی خواہش کرتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ مداخلت کرتا ہے آخر اس کی کوئی وجہ ہے، یا یہ سب کچھ یوں ہی ہو رہا ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل قانون کا درجہ رکھتا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ اصلاح فرما دیتا ہے تاکہ کوئی ایسا قانون نہ بن جائے جو اللہ تعالیٰ کی منشاء کے خلاف ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دو تین غلطیاں ہوئیں، ان کی اصلاح ہو گئی، لہذا اب ہم بے کھٹکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کو اپنے لئے ضابطہ حیات اور ماخذ شریعت تسلیم کرتے ہوئے اس کا اتباع کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے تنقیدی معیار پر پوری اترتی، لہذا اس نے حکم دے دیا کہ اب اس زندگی کی پیروی کرو گے تو ہدایت ملے گی ورنہ نہیں، ارشاد باری ہے۔



وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف: ۱۵۸) رسول کی پیروی کرو تاکہ تمہیں ہدایت نصیب ہو۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** ”قرآن کے گئے ہوئے چند سادہ سے ابدی احکام کے سوا ہم کسی اور ہنگامی حکم یا وقتی ہدایت کے لیے قطعاً مامور نہیں“ (رد اسلام ص ۱۱۲-۱۱۳)

**ازالہ** ایک طرف تو آپ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ اقوال رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) وقتی ہدایت ہیں اور ص ۱۱۳ پر آپ تحریر فرما چکے ہیں کہ ”اگر اقوال رسول مل جاتے، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا، اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے۔“ معلوم نہیں، ان میں سے کون سی تحریر صحیح ہے۔ وقتی ہدایت کس طرح دائرہ ایمان میں داخل ہو سکتی ہے، بات دراصل یہ ہے کہ سچی بات آپ کے قلم سے نکل گئی ہے اور وہ یہ کہ اقوال رسول دائرہ ایمان میں شامل ہیں۔

اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ قرآن مجید کے علاوہ جتنے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دئے، وہ سب ہنگامی تھے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پانچ وقت کی نماز بھی ہنگامی حکم تھا، اور اس میں تخفیف یا اضافہ کیا جاسکتا ہے، اٹھ بھتہ سے کھانے پینے کی ممانعت، سیدھے ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت وقتی ہدایات تھیں اور اب اگر ان پر عمل نہ کیا جائے، تو کوئی گناہ نہیں، گویا یہ تمام ہدایات ابدی حیثیت کی حامل نہیں کیا کوئی عقلمند انسان ایسی بات تسلیم کر سکتا ہے؟

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** اگر ہم ملا کا مذہب قبول کر لیں، تو پھر استنجا بھی اصول دین، منڈا ہوا

سر بھی رکن اسلام، ٹخنوں سے بالشت بھرا اونچی شلوار بھی مذہبی فرض،

منڈی ہوتی مونچھیں، لمبی داڑھی، مسلمان کیا ہوا ایک اچھا خاصا جوکر بن کر رہ

گیا۔ (رد اسلام ص ۱۱۴)

منڈے ہوئے سر کو تو رکن اسلام کسی نے نہیں کہا، بلکہ سر منڈانا مندرجہ ذیل

**ازالہ** دروجہ کی بنا پر اچھا نہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر پر بال رکھا کرتے تھے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر منڈانا خارجیوں کی نشانی بتائی تھی۔

استنجا بے شک اصول دین ہے، اس لئے کہ طہارت و نظافت کا ذریعہ استنجا ہی تو

ہے، اگر یہ نہ ہو تو وَثِيَا بَكَ فَطَهِّرْ (مائدہ: ۶) پر کیسے عمل ہو سکتا ہے، نہ معلوم برق صاحب



نو کیا سوچھی کہ استغفار نے کو قابلِ ملامت سمجھا، اگر ان کا مطلب اس استغناء سے ہے جو جاہل لوگ چلتے پھرتے کرتے ہیں، تو ہمیں بھی ان سے اتفاق ہے، یہ طریقہ بے شک جیسا سونہ اور خلافِ سنت ہے، بلکہ بدعت ہے۔

ٹخنوں سے اونچی شلوار یا پائٹجامہ، پست مونچھیں، اور لمبی وارٹھی اسلامی شعار سے یہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، صحابہ کرام ان پر عمل کرتے تھے، کیا آپ ان کو بھی اسی لفظ سے یاد کریں گے جس لفظ سے ملا کو یاد کیا ہے؟  
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** "اگر آپ کسی نو مسلم انگریز کا سر مونڈ کر اوپر ایک موٹا سا پگڑ باندھ دیں، مونچھیں مونڈ ڈالیں، وارٹھی ناف تک بڑھا دیں، نیچے ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار پہنا دیں، پگڑ میں مسواک، ٹانگ کے سامنے تسبیح باندھ دیں، اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اسے انگلستان بھیج دیں، تو وہی نتیجہ ہوں گے، یا تو انگریز اسے جن سمجھ کر مار ڈالیں گے، اور یا پھر چڑیا گھر میں بند کر دیں گے (دو اسلام ص ۱۱۴)

**ازالہ** | سر مونڈنے کو سنت کس نے کہا؟ بلکہ سر پر بال رکھنا سنت ہے، پھر بالوں کی تحسین و تزئین اور تکریم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص ہدایات دی ہیں۔ لہذا سر مونڈنے کو رکنِ اسلام سمجھنا برق صاحب کی بڑی زبردست غلط فہمی ہے "موٹا سا پگڑ، پگڑ میں مسواک، ٹانگ میں تسبیح" یہ چیزیں تو آج تک کسی ملا میں نہیں دیکھیں، معلوم نہیں برق صاحب کو ایسے ملا کہاں دستیاب ہوئے تھے۔

مونچھیں مونڈنا کوئی انوکھی چیز نہیں، اس کا تو رواج عام ہے، پھر یورپ میں اس پر تعجب کیوں ہوگا۔ رہا وارٹھی بڑھا نا، تو یہ بھی کوئی انوکھی چیز نہیں، اکثر پوری لمبی لمبی ڈاڑھیاں رکھتے ہیں۔

ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار بھی تعجب کی چیز نہیں، بھلا جن لوگوں کے ہاں گھٹنوں سے اوپر نیکر بلکہ نصف رانوں تک کی شورٹس (SHORTS) پہننے کا رواج ہو وہ کیسے ٹخنوں سے اونچی شلوار پر متعجب ہوں گے، متعجب تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں، امریکی لباس کو ملاحظہ فرمائیے، ٹخنوں سے اونچی پتلون، کمر تک بلکہ کمر سے بھی اونچی بش شرٹ یا کوئی اور چیز اور پھر اس پر فخر ڈھیلی اتنی کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پہلوان کی اترن ہے، لیکن بایں ہیئت کدائی انہیں اپنے لباس پر ناز ہے، اور مسلمانوں کو ان



کی نقالی پر فخر، اگر ایسی بش شرٹ پہنے ہوئے ہمارا کوئی بزرگ انہیں دیکھتا، تو یہ کہنے پر مجبور ہوتا، کہ اپنے چھوٹے لیکن بے حد موٹے بھائی کی بش شرٹ پہنے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے چھوٹی بھی ہے اور ڈھیلی بھی ہے۔

آنکھوں میں سرمہ لگانا بھی کوئی تعجب کی چیز نہیں، یہ تو خوبصورتی کے لئے لگایا جاتا ہے، برق صاحب سرنگین آنکھوں کو بھی بدتمیزی شمار کرتے ہیں، اور بدتمیزی شمار کرنے کو انگریزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، بھلا جن کے ہاں ہونٹوں پر سرخی لگانا زینت ہو، وہ سرمے کو عجوبہ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

برق صاحب اگر آپ اپنی عبارت کو اس طرح کر لیں تو مناسب ہے "اگر ہم کسی نو مسلم انگریز کے سر پر بال رکھ کر، ان میں تیل ڈال دیں، اور مانگ نکال دیں، پھر خوبصورت سا عمامہ باندھ دیں، عمامہ میں اوپر طرہ ہو اور پیچھے شملہ، موچھیں پست کر دیں، اور ڈاڑھی چھوڑ دیں، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنا دیں، یا تہ بند باندھ دیں، آنکھیں سرنگیں کر دیں، سفید جھک لبا کرتہ پہنا دیں، اور پھر اسے انگلستان بھیج دیں، تو لوگ اس کو فرشتہ سمجھیں گے اور ہر جگہ اس کا اکرام اور احترام کریں گے۔"

برق صاحب اصول دین تو یہ ہے "إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ" اللہ خوبصورت ہے خوبصورتی کو پسند کرتا ہے (الحديث رواه مسلم، لهذا بات اصول دین کے کیجئے، نہ کہ فرضی ملا کی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** اسلام میں یہی تو خوبی ہے کہ وہ صرف حقائق پر نظر رکھتا ہے، اور ان ظواہر و مناسک کو قابل التفات نہیں سمجھتا (دو اسلام ص ۱۱)

**ازالہ** اسلام میں تو یہ خوبی ہے، کہ وہ ظاہر و باطن کو یکساں دیکھنا چاہتا ہے، ظاہر باطن کی نمائندگی کرتا ہے۔ شریعت ظاہری باتوں پر نافذ ہوتی ہے، باطن کا حال سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اگر ظاہر بے کار چیز ہے، تو پھر بتایا جائے، کہ ہر ملک کی فوج کی وردی الگ الگ کیوں ہے؟ جھنڈا الگ الگ کیوں ہے؟ بیجینز (BADGES) علیحدہ علیحدہ کیوں ہیں؟ اگر ہم دشمن فوج کی وردی پہن کر لڑیں تو کیا حرج ہے؟ حقائق پر اس کا اثر کیا ہوگا۔

جماعت المسلمین اللہ کا لشکر ہے، اور اس کا بھی ایک طرز ہے جو اس کو غیروں سے ممتاز کرتا ہے، یہ شان امتیاز ہی تو ہے جس پر ہر قوم کو ناز ہوتا ہے، برق صاحب نہ معلوم



کیوں اس امتیازی شان کے خلاف ہیں، کیوں ان ظواہر و مناسک کو قابل التفات نہیں سمجھتے حالانکہ ان ظاہری مناسک کے ملنے کی دو عظیم الشان پیغمبر اس طرح دعا کرتے ہیں۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت ایسی بنا جو تیری مسلم ہو اور اے اللہ ہم کو ہمارے مناسک بتا دے اور ہم پر رحمت کے ساتھ توبہ ہو

(البقرة: ۱۲۸)

قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی ظاہری مناسک میں سے ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا وَجَّهُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ الْخَيْرُ الْخَيْرُ (البقرة: ۱۴۴)

آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا کوئی خاص نیکی کی چیز نہیں، محض ایک ظاہری چیز ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت ملاحظہ ہو، ارشاد باری ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى كَفْرِهِ الْكُفْرُ الْأَوَّلُ (البقرة: ۱۴۴)

اور جس قبلہ کی طرف آپ منہ کرتے ہیں اس کو ہم نے اس لئے قبلہ مقرر کیا ہے کہ ہم جانیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون کفر کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے۔

عَقَبِيَّة (البقرة: ۱۴۳)  
گویا ان ظاہری چیزوں سے اتباع رسول کے جذبہ کی جانچ ہوتی ہے، ان ظاہری چیزوں کو بے حقیقت سمجھنا گویا جذبہ اتباع رسول سے عاری ہونا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہم سے اسی کا مطالبہ کرتا ہے، اور ان ظاہری چیزوں کو مسلمین کے لئے طرہ امتیاز قرار دیتا ہے۔  
بظاہر عرفات سے طواف کے لئے جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ثُمَّ آفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ (البقرة: ۱۹۹)

پھر تم طواف کے لئے اسی جگہ سے چلو جہاں سے عام لوگ چلتے ہیں (یعنی قریش جس مقام سے چلتے ہیں) وہاں سے مت چلو،

(البقرة: ۱۹۹)

ایک اور ارشاد گرامی سنئے:-

وَلَا تَخْلِقُوا أَرْوَاسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ (البقرة: ۱۹۹)

اور تم لوگ اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی



الْهَدْيُ مَحِلُّهُ (البقرة: ۱۹۶) کا جانور اپنی جائے مقررہ پر نہ پہنچ جائے  
 سرکا منڈانا یا نہ منڈانا کتنی بے حقیقت چیز ہے، نہ یہ کوئی اسلام کے بنیادی احکام میں  
 سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس ظاہری اور غیر اہم چیز کا حکم دے رہا ہے، اور حکم ہی نہیں دے  
 رہا بلکہ اگر شرعی عذر کی وجہ سے سر منڈانا پڑ جائے تو اس کا جرم مانہ بھی مقرر فرما رہا ہے،  
 ارشاد ہے۔

(۶) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ  
 أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ  
 صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ (البقرة: ۱۹۶)  
 پھر جو شخص تم میں سے مریض ہو یا اس کے  
 سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ (سر منڈائے لیکن)  
 بطور فدیہ کچھ وزہ رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔  
 ایک اور جگہ ارشاد باری ہے۔

(۷) لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ (المائدة: ۹۵)  
 بتائیے اس حکم میں کون سے حقائق مضمون ہیں، محض ظواہر میں سے ہے لیکن حکم  
 اس شد و مد کے ساتھ ہے، آخر کیا بات ہے، اللہ تعالیٰ کیوں ظواہر کو اتنی اہمیت دے  
 رہا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد گرامی ہے۔

(۸) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ  
 الصِّيَامُ (البقرة: ۱۸۳)  
 اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کر  
 دئے گئے ہیں۔

روزہ بالکل ایک ظاہری چیز ہے، جس سے انسان فاقہ مستی اور نفس کشی سیکھتا ہے  
 اور بقول آپ کے اللہ تعالیٰ کبھی ایسے لغو کاموں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تو حقائق کو پسند کرتا  
 ہے، اس سے راضی ہوتا ہے دنیا کی تمام قومیں تو اپنی افواج کے لئے عمدہ سے عمدہ راشن  
 مینا کرتی ہیں، ان کی ہر قسم کی آسائش کا لحاظ رکھتی ہیں، تاکہ ان میں کسی قسم کی جسمانی کمزوری  
 پیدا نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہے، کہ اپنی فوج کو بھوکا رکھ کر اسے دشمن کے مقابلہ  
 میں کمزور دیکھنا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں اس ظاہری فاقہ مستی سے اللہ تعالیٰ کیوں خوش  
 ہے اس میں کیا مصلحت ہے؟ بہر حال ہم تعمیل کرتے ہیں، اگر ہم ہر چیز کو ظاہری ظاہری  
 کہہ کر چھوڑتے چلے جائیں تو بس پھر اسلام ختم ہو جائے گا۔

جادو کے متعلق ارشاد باری ہے۔

لَمَنْ أَشْتَرَادَ مَالًا فِي الْآخِرَةِ مِنْ  
 خَلْقٍ (البقرة: ۱۰۲)  
 جس نے جادو کو حاصل کیا اس کا آخرت میں کوئی ٹھکانہ نہیں



جادو ایک فن و ہنر ہے، لیکن کیا کیا جائے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا، محض ظاہری چیز پر اتنا زور دیا، اللہ تعالیٰ کو تو حقائق سے بحث کرنی چاہیے تھی، اور وہ یہ کہ ایسی چیزوں کے متعلق بس یہ حکم نافذ ہوتا کہ اگر نیک مقاصد کے لئے استعمال کی جائیں تو جائز ہیں ورنہ ناجائز لیکن ایسا نہیں ہے، تو پھر یہی کہا جائے گا کہ ظواہر اور مناسک پر قرآن مجید بھی زور دیتا ہے۔ اعتکاف کے متعلق حکم صادر ہوتا ہے۔

(۱۰) وَلَا تَبْتَاسُوا هُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِهُنَّ

جب تم مساجد میں اعتکاف کے لئے بیٹھو تو

فِي الْمَسَاجِدِ (البقرة: ۱۸۷)

عورتوں سے میل جول مت رکھو۔

یہ کیا راہبانہ زندگی کا سبق ہے؟ یہ کیا نفس کشی کی تعلیم ہے؟ کہا جاسکتا ہے کہ اصل حقیقت تو دل کا پاک و صاف ہونا ہے، محض ترک لذات سے کیا ہوتا ہے، اب اگر ایسا کہا جائے تو پھر یہ قرآن مجید پر اعتراض ہوتا ہے، نعوذ باللہ۔ پس ثابت ہوا کہ ظاہری مناسک بھی کوئی حقیقت رکھتے ہیں، ان کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ خرید و فروخت کے متعلق ارشاد ہے۔

(۱۱) وَأَشْهَدُوا إِذَا بَيَعْتُمْ (البقرة: ۲۸۲)

جب خرید و فروخت کیا کرو تو گواہ کر لیا کرو  
بھلا دو پیسے کا نمک خریدیں تو بھی گواہ کر لیا کریں، یہ کتنی بے حقیقت بات ہے، لیکن حکم بظاہر ہی ہے ہاں حدیث سے کچھ تخصیص ہوتی ہے، اور معاملات سہل ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

(۱۲) وَلَا يَبْدِينَ زِينَتَهُنَّ (النور: ۳۱)

عورتیں (غیر محرم کے سامنے) اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں  
یہ حکم بھی بظاہر بے حقیقت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اصل مقصد تو عفت و پاکدامنی ہے، اور وہ تزکیہ نفس سے حاصل کی جاسکتی ہے، تاہم اللہ تعالیٰ ظواہر پر زور دیتا چلا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے۔

۱۳ اَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ

شہر کے دروازہ میں جھک کر داخل ہو اور ”حطہ“

تُفِيزُكُمْ خَطَايَاكُمْ (البقرة: ۵۸)

کو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے، کہ جب قرآن مجید حقائق سے بحث کرتا ہے، ظاہر پرستی کو لغو سمجھتا ہے، تو پھر یہ کیوں نہیں کہتا، کہ خالص دل سے توبہ کرو، تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، اس ظاہری ہیئت پر کہ داخلہ کے وقت تم جھکے ہوئے ہو، کیوں زور دیا جا رہا ہے۔

الغرض اس قسم کے بیسیوں قرآنی احکام ہیں، جن میں ظواہر کی اچھی خاصی اہمیت پائی جاتی ہے، اب اگر اس قسم کے ظواہر احادیث میں ہوں، تو یہ کہنا کہ یہ ملا کی ایجاد ہے، کس حد تک



مبنی بر انصاف ہے، اگر قرآن مجید قبلہ کی طرف منہ کرنے، طواف کے لئے ایک خاص مقام سے سوانہ ہونے، قربانی سے پہلے سر نہ منڈانے، رمضان کے مہینہ میں نفس کشی، حالت احرام میں شکار نہ کرنے، نامحرم کے سامنے زینت چھپانے، شہر میں داخلہ کے وقت سجدہ کرنے کے ظاہری حکم دے سکتا ہے، اور ان کو دینی حقائق میں شمار کرتا ہے، تو پھر احادیث کے احکام مثلاً ڈاڑھی چھوڑنا، سیدھے ہاتھ سے کھانا پینا، ٹخنوں سے اونچا پا جامہ پہننا وغیرہ حقائق میں کیوں شمار نہیں ہو سکتے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** ”ملا سے میرا نزاع اس بات پر ہے، کہ وہ حدیث کو آگے لاکر بے شمار ظواہر کو جزو اسلام بنانا چاہتا ہے، اور میں قرآن کو پیش کر کے ملت کو ان ملائی قیود سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔“ (رد اسلام ص ۱۱۷)

برق صاحب! حقیقت میں یہ نزاع آپ کا ملا سے نہیں ہے، بلکہ اللہ کے رسول **ازالہ** صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس لئے کہ یہ سب باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نزاع گمراہی اور ضلالت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُسْلِمِينَ فَوَلَّيْنَا مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا	اور جو شخص رسول کے خلاف چلے بعد اس کے کہ اس کے پاس واضح طور پر ہدایت پہنچ چکی ہو اور مومنین کے راستہ کے علاوہ کوئی راستہ اختیار کرے تو ہم اس کو لوہر ہی جانے دیں گے جہنم وہ جا رہا ہے اور اس کو دوزخ میں داخل کر دیں گے وہ بہت بری جگہ ہے۔
(النساء: ۱۱۵)	

برق صاحب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ قیود سے آزادی گویا اسلام سے آزادی ہے پھر قرآن قرآن رہے گا۔ نہ اسلام اسلام رہے گا۔ قرآن بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ اگر ہم اقیما الصلوٰۃ کے معنی یہ کریں کہ رقص و سرود کی محفل قائم کرو تو ہمیں روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی رد کے تو ہم اسے ملا کہہ کر چپ کر دیں گے۔ اس لئے کہ وہ بلا وجہ حدیث کی رو سے پانچ وقت کی نماز کی پابندی لگا کر ہم کو قیود میں جکڑنا چاہتا ہے حالانکہ قرآن مجید ہمیں آزادی دیتا ہے کہ جو مناسب معنی ہوں وہ کر لے جائیں۔ اور اگر کہیں ”مکرزملت“ بھی ہمارے معنوں کی تائید کر دے تو بس پھر وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا۔ اب تو کسی کو چون و چرا کی گنجائش بھی نہ ہوگی، ایسے موقع پر سوائے انا اللہ پر ہٹنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے ہر شے



کے قیود اگر آپ پر بار گزرتے ہیں تو آخر قرآنی قیود کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ قرآن مجید بھی تو قیود و حدود سے مملو ہے۔ طلاق کے معاملہ میں قیود۔ نکاح کے قیود۔ نماز روزہ کے قیود و حج میں طرح طرح کے قیود، خاوند مر جائے تو عورت چار ماہ دس دن عدت میں بیٹھے، پھر نکاح کر سکتی ہے۔ آخر یہ قید کیوں لگائی گئی ہے؟ کیوں اُسے مرد کی طرح آزادی نہیں دی گئی کہ وہ جب چاہے نکاح کرے۔ غرض یہ کہ قرآن مجید کے قیود کو کہاں تک گنایا جائے۔ کیا ان قیود سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ حکومت وقت کتنے قواعد و ضوابط بناتی ہے جن کی خلاف ورزی جرم ہوتی ہے۔ آخر یہ قیود تسلیم کرنے پڑتے ہیں یا نہیں؟ طوعاً یا کرہاً۔ اور جب غیر کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط سے چھٹکارا نہیں تو نبی کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط سے نجات کی کیوں کوشش کی جاتی ہے؟ قواعد کی پابندی تو بہر حال کرنی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قواعد کی نہ سہی کسی اور کے سہی۔ اب یہ اپنی اپنی پسند ہے کہ کوئی کسی پابندی کو اچھا سمجھتا ہے اور کوئی کسی کو۔ مگر ایک مومن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے ضابطے ہی عین ایمان ہیں انہی سے نور ہدایت مل سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاحِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۚ وَذَاعِيَآ إِلَى اللَّهِ بِآذَانِهِ ۚ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۚ (الاحزاب: ۴۶)

ہم نے آپ کو شاہد، بشارت دینے والا، ڈرانے والا اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

برق صاحب کیا کسی چٹھی رساں میں بھی یہ خصوصیات ہوتی ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِوْضًا ۚ ضَلَّالٍ مُّبِينٍ (الجمعة: ۲)

وہی ہے جس نے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، ورنہ پہلے تو وہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

برق صاحب کیا کسی چٹھی رساں میں یہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، اچھا یہ بتائیے کہ چٹھی رساں، چٹھی یعنی قرآن مجید سے کر آیا، کیا وہ دے کر چلا گیا؟ اگر نہیں تو پھر وہ کیا کرتا رہا؟ کیا وہ ان پر نگران بنا کر بھیجا گیا تھا، کہ اس کی نگرانی میں قرآن مجید پر عمل کیا جاتا رہا؟ کیا کسی چٹھی رساں کے یہ فرائض ہوتے ہیں؟ قرآن مجید اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اس کا اتباع کیا جائے، اور یہ چیزیں



خود قرآن مجید میں بھی موجود ہیں، جب اصل اتباع قرآن مجید کا کرنا تھا، تو قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور اس کی اطاعت پر کیوں زور دیا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع صرف قرآن مجید کی حد تک کرنا تھا، تو پھر تو یہ اس حکم میں شامل تھا کہ ”قرآن کا اتباع کرو“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو علیحدہ ذکر کیا۔ اور بار بار ذکر کیا، حتیٰ کہ قرآن مجید کے اتباع کا ذکر اگر چند مقامات پر کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا ذکر بیسیوں مقامات پر کیا ہے، کیا یہ سب فضول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے مراد قرآن مجید کا اتباع تھا تو آخر قرآن مجید کا ذکر بار بار کرنے میں کون سا امر مانع تھا؟ آخر اس میں کیا راز ہے، کہ چٹھی میں کل ہدایات موجود ہیں اور کامل ہدایات موجود ہیں لیکن پھر بھی چٹھی میں یہ لکھا ہوا ہے کہ چٹھی رساں کی اطاعت کرنا، اس کی نافرمانی نہ کرنا، آخر یہ کیوں؟

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** | ب۔ روایت بالمعنی کی تشریح کیجئے۔

م۔ بالکل سادہ سا لفظ ہے، کہ احادیث میں رسول صلعم کے الفاظ منقول نہیں، بلکہ صرف مطالب منقول ہیں۔

ب۔ آپ کا مطلب یہ ہے، کہ مضمون حضور علیہ السلام کا ہوتا ہے، اور الفاظ راوی کے م۔ جی ہاں!

ب۔ تو آپ ہر حدیث میں یہ کیوں کہا کرتے ہیں۔ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ... اگر ہر حدیث راوی کا قول ہے، تو پھر وہ قول رسول نہیں ہو سکتی، یہ تو ناممکن ہے، کہ ایک ہی قول راوی کا بھی ہو، اور حضور کا بھی، مزید برآں اگر روایت بالمعنی تسلیم کی جائے، تو اس صورت میں حدیث کبھی وحی خفی نہیں بن سکتی، اس لئے کہ تمام احادیث راویوں کے اقوال ہیں، اور وحی حضور پر آیا کرتی تھی نہ کہ راویوں پر۔

(دو اسلام صفحہ ۱۱)

**ازالہ** | برق صاحب کے مخاطب مولوی صاحب بالکل ہی جاہل تھے، ورنہ ایسے جاہلانہ جوابات دے کر خاموش نہ ہوتے، برق صاحب آپ کے اس سوال کا جواب خود

آپ کی عبارت میں ملاحظہ ہو۔

”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں،“ صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں، اول یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلعم کی طرف صحیح ہو، یعنی ہم بہ دلائل ثابت کر سکیں کہ یہ قول حضور کی زبان مبارک سے واقعی نکلا، ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں، البتہ ظن غالب یہ ہے کہ



بعض اقوال صحیح ہوں گے، دوم یہ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں۔ (دو اسلام ص ۳۴)

لیجئے، آپ نے خود تسلیم کر لیا، کہ بعض احادیث ظنّ غالب ہے کہ صحیح ہوں گی، اور یہ بھی آپ نے تسلیم کر لیا کہ معنی تو ہزاروں صحیح ہیں۔

اچھا برق صاحب یہ بتائیے، کہ اگر کوئی اردو دان جس کو عربی نہ آتی ہو، یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نماز قائم کرو، کعبہ کی طرف منہ کرو، تو یہ صحیح ہو گا یا غلط؟ یقیناً صحیح ہو گا، وہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ادا نہیں کر رہا، بلکہ اس کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اس کے باوجود اگر وہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور یہ طریقہ صحیح ہو، تو پھر حدیث کی ادائیگی کے لئے یہ طریقہ صحیح کیوں نہیں۔

**روایت بالمعنی** | اگر کسی قرآنی حکم پر عمل کرنے کا طریقہ مختلف الفاظ میں بتایا جائے، اور معنی ان تمام الفاظ کے ایک ہی ہوں تو بتائیے قرآن مجید پر عمل کرنے کا طریقہ متعین ہو گیا، یا نہیں، اب یہی وہ طریقہ ہے جس کے متعلق ہم کہیں گے کہ وحی خفی نے اس کو متعین کیا تھا، یعنی یہی وہ طریقہ ہے، جو من جانب اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کیا گیا تھا، اگر کسی کام کا طریقہ متعین ہو جائے، تو اس سلسلہ میں الفاظ کے تعین کا اصرار خود آپ یعنی برق صاحب کے نزدیک بھی لغو ہو گا، ذرا علم کیمیا کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے کہ ایک ہی گیس کی تیاری کے لئے ہر کتاب والا ایک ہی طریقہ بیان کرتا ہے، لیکن ہر ایک اپنے الفاظ میں، تو کیا اس صورت میں یہ کہا جاسکتا ہے، کہ چونکہ ہر کتاب والے کے الفاظ علیحدہ علیحدہ ہیں، لہذا یہ طریقہ قابل اعتماد نہیں، یہ بات ہرگز نہیں کہی جاسکتی، بلکہ وہ طریقہ قابل عمل اور قابل اعتماد ہو گا، اور اس کو کسی بھی کتاب سے اخذ کیا جاسکے گا اور اس کے متعلق یقین سے کہا جاسکے گا، کہ یہی وہ طریقہ ہے جو اس سلسلہ میں بانی اول سے بتواتر منقول ہے اور یہاں یہی مطلوب ہے، نہ کہ الفاظ اور طریق بیان۔

اب رہی یہ بات کہ کیا کوئی قولی حدیث من وعن محفوظ ہے یا نہیں

**روایت بالالفاظ** | تو برق صاحب صرف اتنا تسلیم کرتے ہیں کہ بعض احادیث ایسی بھی ہیں، لیکن یقینی طور پر نہیں بلکہ ظنّ غالب ہے، کہ صحیح ہوں گی، اس سلسلہ میں ہمارا کہنا یہ ہے، کہ ظنّ غالب کا استعمال وہاں تو ممکن ہے جہاں کسی متن حدیث کی صرف ایک سند ہو لیکن جہاں دو دو، چار چار، دس دس اور بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ سندیں ہوں، اور الفاظ مشترک ہوں، تو پھر ظنّ غالب نہ ہو گا، بلکہ یقین ہو گا کہ واقعی یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اور اس قسم کی بہت سی احادیث موجود ہیں۔



بہت خوب پہلے تو رسول اللہ سے روایت بالمعنی کرتے ہیں، پھر راوی غلط فہمی | رسول سے روایت بالمعنی کی تکرار کرتا ہے، اگر اسی طرح ہر راوی "بالمعنی" کے مصرع کا تکرار کرتا رہے، تو آخری راوی تک پہنچ کر غریب "معنی" کا کچھ مرہ نکل جائے گا؟ ناظر ثانی (حاشیہ دو اسلام ص ۱۵)

معلوم نہیں کہ یہ ناظر ثانی کون صاحب ہیں، بہر حال اب ہمیں غلط فہمی ان کی دور ازالہ | کرنی ہے۔ ناظر صاحب سمجھتے نہیں، روایت بالمعنی سے "معنی" کا کچھ مر نہیں نکلے گا، اس لئے کہ معنی کی حفاظت تو ہر راوی کا مطمح نظر رہے گا۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے تھے کہ الفاظ کا کچھ مر نکل جائے گا، معلوم ہوتا ہے کہ ناظر صاحب کنایہ چاہتے تھے غلطی سے بجائے "الفاظ" کے "معنی" لکھ گئے۔

اس سلسلہ میں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ کسی راوی کا یہ منشا نہیں ہوتا کہ بس مفہوم ادا کر دو، حدیث کا حق ادا ہو گیا، نہیں بلکہ سو فیصدی ہر راوی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ ہی روایت کئے جائیں، حتیٰ کہ اگر کسی کو دوہم معنی الفاظ میں شک ہوتا ہے، کہ ان میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سا لفظ فرمایا تھا، تو وہ دونوں الفاظ کا ذکر کر دیتا ہے، اور یہ صاف بتا دیتا ہے کہ مجھے ان دونوں لفظوں کے معاملہ میں شک ہو گیا ہے، کتب حدیث پڑھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں، بتائیے، جہاں ہم معنی لفظوں کے سلسلہ میں اتنی سختی اور تشدد ہو، وہاں دوسرے الفاظ کے لئے نرمی، تساہل، مداہنت کا پایا جانا محال ہے۔ اگر کوئی راوی اضطراری طور پر روایت بالمعنی کر دیتا ہے تو اسے پسند نہیں کرتا بلکہ اپنے اختیار اور امکان کی صورت میں روایت بالمعنی سے احتراز کرتا ہے، پھر اگر کسی راوی میں روایت بالمعنی کی ذرا سی بھی عادت پائی جاتی ہے، تو محدثین اس کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور متن حدیث کی چھان بین میں لگ جاتے ہیں اور اس طرح تحقیق و تفتیش کے بعد حدیث کے اصلی متن کو صحیح حدیث کی شکل میں امت کے سامنے پیش کرتے ہیں، الغرض قولی احادیث میں الفاظ ہی کی حفاظت کی گئی ہے، اور اس کی حفاظت کے لئے پورا فن حدیث معیاری طور پر مرتب و مدون ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ فن حدیث کا پورا زور حفاظت الفاظ پر ہے نہ کہ حفاظت مفہوم پر ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی | "یہ وجہ بلا الفاظ میری سمجھ سے بالاتر ہے، وجہ کے معنی ہیں پیغام، اگر



اللہ کوئی پیغام بھیجے، اور الفاظ ساتھ نہ ہوں، تو وہ سمجھ میں کیسے آئے گا۔ (دو اسلام ص ۱۱۳)

یہ ضروری نہیں کہ وحی خفی ہمیشہ بلا الفاظ ہی آتی ہو، اور اگر ہر وحی خفی کو ہم بلا الفاظ **ازالہ** ہی سمجھ لیں تو بھی یہ سمجھ سے کوئی بالاتر چیز نہیں، اس لئے کہ خیال پہلے پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں الفاظ کی شکل اختیار کرتا ہے، خیال اور الفاظ کا ساتھ ساتھ پیدا ہونا لازمی نہیں، ایک ہی خیال اگر مختلف لوگوں کو پہنچا ہو تو الفاظ ہر شخص کے علیحدہ ہوں گے، صرف خیال میں وہ لوگ متحد ہوں گے لیکن جب وہ اس کو ادا کریں گے تو الفاظ علیحدہ ہوں گے، بلکہ اکثر کی زبان بھی علیحدہ ہوگی، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خیال دماغ میں گھومتا رہتا ہے لیکن اس کی ادائیگی کے لئے موزوں الفاظ دیر میں یاد آتے ہیں، وہ مفہوم جو ذہن میں ہو، لیکن ابھی الفاظ ذہن میں نہ آئے ہوں، تو وہ خیال و تصور بلا الفاظ ہوا یا نہیں، بس اسی پر وحی خفی کو سمجھ لیجئے بلکہ اصل بات تو یہ ہے، وحی خفی ہو یا جلی ہمارے سمجھنے کی چیز ہی نہیں، اور یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے تو پھر ”وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ“ (الاسراء: ۳۶) کی تعمیل میں ہمیں اس کی تاویل و تشریح سے باز رہنا چاہیئے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** ”مر۔ آپ وحی خفی کا مطلب ”سو جھنا“ سمجھ لیں، کہ حضور کو جب کوئی بات سوچھ جاتی تھی، تو وہ اسے اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے، سوچھتے ہمیشہ

خیالات ہی ہیں، اور یہی وحی خفی ہے۔

ب۔ اجمی حضرت! سو جھنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے، ایک فلسفی کسی نئی الجھن کو پہروں، ہفتوں بلکہ مہینوں سوچتا ہے، اور کسی نہ کسی دن اسے حل سوچھ ہی جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حل اس فلسفی کے دماغ میں اللہ نے ڈالا ہے، لیکن اسے وحی یا الہام نہیں کہتے، بلکہ القا کہتے ہیں۔ (دو اسلام ص ۱۱۶)

ہمیں اس سے کلیتہً اتفاق نہیں، کہ جو حل فلسفی کو سوچھا ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس **ازالہ** کے دماغ میں ڈالا تھا، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ڈالا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ ڈالا ہو، دونوں ممکن ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ہی نے ڈالا ہو تو اس کی بھی دو صورتیں ہوں گی، یا تو وہ ہدایت و حکمت پر مشتمل ہوگا، یا گمراہی اور ضلالت سے بھرپور، اگر ہدایت و حکمت پر مشتمل ہے، تو پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی ضرورت بھی ثابت ہوگی، اور اگر گمراہی اور ضلالت پر مشتمل ہے، تو اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون فطرت اور اس کے نتائج کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ ہی



کی طرف منسوب ہو گا لیکن اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی مرثبت نہ ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا۔ بد اعمالی، ضد ہمت و صرمی اور سرکشی کے نتائج اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں اب اگر کسی شخص کے دل میں بُرے خیالات آتے ہیں تو ان کا خالق تو بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن گنہگار وہی شخص ہے جس نے بُرے عمل کئے اور ان بُرے اعمال کو بُرے خیالات کا سبب بنایا۔ مندرجہ ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ  
الْأَوَّلِينَ ۚ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ  
إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۚ كَذَلِكَ  
نَسْلُكُكُمْ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۚ

(الحجر: ۱۰-۱۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی گزشتہ اقوام

میں نبی بھیجے تھے اور جب کبھی ان کے

پاس کوئی رسول آیا تو انہوں نے اس کا مذاق

ہی اڑایا۔ مجرمین کے دل میں یہ استہزاء اور

برق صاحب یہ آیت آپ کے سامنے ہے۔ رسولوں کی مخالفت اللہ تعالیٰ ہی مجرمین کے دلوں میں ڈالتا ہے، اب آپ بتائیے کیا اس مضمون کی آیت قرآن مجید میں ہو سکتی ہے؟ اگر یہی مضمون کسی حدیث میں ہوتا تو کیا آپ جلدی سے نہ کہہ دیتے کہ حدیث وضعی ہے، اب یہاں کیا کہیں گے؟ اگرچہ ہم نے آیت کو نقل کرنے سے پہلے اس الجھن کو دور کر دیا ہے، لیکن متن پر جو اعتراض ہو سکتا ہے، وہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اور آپ کے لئے داعی الی الانصاف ہے۔ اگر وہ حل اللہ تعالیٰ نے دماغ میں نہ ڈالا ہو تو پھر شیطان نے ڈالا ہوگا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہے۔

إِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ  
لِيُجَادِلُوكُمْ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ  
لَمُشْرِكُونَ ۚ (الأنعام: ۱۱۱)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ شیطان بھی دلوں میں بعض باتیں ڈالتا رہتا ہے۔ اور اللہ اس شیطانی وسوسہ کو بھی وحی کا نام دے رہا ہے۔ لہذا فلسفی جو کچھ سوچتا ہے۔ ہو سکتا ہے صحیح ہو اور ہو سکتا ہے کہ غلط ہو، بے شمار فلسفے ایسے ہیں جو پہلے قابل اعتماد تھے لیکن بعد میں آنے والوں نے اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ فلسفی اور نبی کے سوچنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نبی سوچتا ہے اور نورِ نبوت اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ اللہ کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تنقیدی نگاہیں اس پر پڑتی رہتی ہیں اور جہاں اس سے اس سوچ و اجتہاد میں غلطی ہوئی فوراً وحی آتی ہے اور اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ نبی کی ہر سوچ پر



اللہ تعالیٰ کی رضا کی ضرورت ہوتی ہے، نبی غلطی نہیں کر سکتا اور اگر غلطی کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ رسول احکام الہی پر عمل کرتا ہے اور اس عمل کا طریقہ (سنت) مقرر کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ سمجھتا ہے کہ اس طریقہ سے یہ عمل غلط ہے اور پھر بھی وہ خاموش رہتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ایسا معلم و مزیٰ بھیجا جو خود کتاب اللہ کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں غلطی کرتا ہے اس صورت میں اللہ تعالیٰ اور اس کی رسالت سب محل اعتراض بن جائیں گے اور یہ آیت بے معنی ہو جائے گی۔

اللَّهُ أَغْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (الانعام: ۱۲۴) اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کس کو دے۔

جس رسول کے طریقہ کو ہمارے لئے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہو اگر وہی غلطی کرے تو پھر وہ تمام لوگ جو اس کی اتباع کریں گے غلطی پر ہی رہیں گے اور اگر بالفرض وہ لوگ اپنے اجتہاد سے صحیح مطلب اخذ کر کے عمل کریں گے تو پھر یہ اعتراض لاحق ہو گا کہ عام لوگوں کی فہم و فراست رسول کی فہم و فراست سے بالاتر ہوتی اور یہ بھی ناممکن ہے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معمولی سی غلطیوں پر بھی چشم پوشی نہیں فرمائی بلکہ وحی جلی سے ان کی اصلاح کر دی تو بھلا بڑی بڑی غلطیوں پر جو اصول دین پر اثر انداز ہوتی ہیں کیسے خاموش رہ سکتا ہے، لہذا یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند ہے اور یہی وحی خفی کا اصلی مفہوم ہے۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ تمام احادیث قولی و فعلی اسی وحی خفی کے ضمن میں آئی ہوں، یہ تو محض ایک اصطلاح ہو گئی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سی احادیث وحی جلی کے ذریعہ نازل ہوئیں اور بالکل اسی کیفیت سے نازل ہوئیں جس طرح قرآن مجید نازل ہوتا تھا، احادیث میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** کیا لوگوں کو فکر و عقل کی دعوت دینے والا نبی..... خود نہیں سوچا کرتا

تھا اور اسے اپنے آپ پر اس قدر بے اعتمادی تھی کہ جب تک جبریل مشورہ نہ دیتا یا اللہ تعالیٰ رہنمائی نہ کرتا تو وہ دین دنیا کے کسی معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ وحی خفی کا شوشہ تعظیم رسول کے لئے نہیں بلکہ تنقیص رسول کے لئے چھوڑا گیا ہے۔ (دوا سلام ص ۱۱۶-۱۱۷)

قرآن مجید نے جہاں کہیں تدبیر و تفکر کی دعوت دی ہے تو اس تدبیر و تفکر کے ذریعہ **ازالہ** توحید اور آخرت کی طرف دعوت دی ہے، اور اس بات پر زور دیا ہے، کہ یہ وحی یہ مناظر قدرت، یہ کائنات، کیا تم کو اس بات کا یقین نہیں دلاتے، کہ جو ان کا خالق ہے، وہی



حقیقی آلہ ہے، وہی عبادت اور فرمانروائی کے لائق ہے۔ اب رہا قرآنی احکام پر عمل کرنے کا طریقہ، تو یہ قرآن مجید نے کہیں نہیں کہا کہ تدبیر و تفکر سے ان کا طریقہ تلاش کرو، مثلاً نماز پڑھنے کا طریقہ تدبیر و تفکر سے خود متعین کرو، اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو اس کا یہ قول عجوبہ روزگار ہے، وحی خفی کا شوشہ تفتیشِ رسول کے لئے نہیں، بلکہ تعظیمِ رسول کے لئے ہے، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا، اللہ تعالیٰ اس سے راضی تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس پر تنبیہ نہیں کی، پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تفکر و تدبیر اتنا صحیح ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ بھی اس پر گرفت نہیں کرتا تھا۔ اور پوری زندگی میں صرف دو تین موقعوں پر ہی اللہ کی طرف سے گرفت ہوئی، ورنہ ساری زندگی کے اجتہادات اللہ تعالیٰ کے معیارِ تنقید پر پورے اترے، یہ وحی خفی کا سلسلہ صرف ایک حد تک احادیث پر حاوی ہے ورنہ احادیث کا معتد بہ حصہ وحی جلی کے ذریعہ یعنی وحی مثل قرآن کے ذریعہ نازل ہوتا تھا، علم حدیث کے طالب علم اس سے بخوبی واقف ہیں اور قرآن مجید میں بصیرت رکھنے والے قرآنی آیات سے اس پر استدلال کر سکتے ہیں اور کہتے آئے ہیں۔ تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں۔

”برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** ہمارے بعض علماء تو عشقِ حدیث میں یہاں تک عقل و خرد گم کر چکے ہیں

کہ اللہ کے کلام کو نہ صرف احادیث کا محتاج ٹھہراتے ہیں، بلکہ یہ کہتے ہوئے بھی سنے جاتے ہیں کہ اگر اللہ کا کوئی قول رسول کے قول سے متضاد ہو جائے تو قول خدا کو منسوخ سمجھو (دو اسلام ص ۱۱۱) ادراغی مکحول کے اس قول کے راوی

ہیں کہ حدیث قرآن کی اتنی محتاج نہیں، جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے (دو اسلام ص ۱۱۸-۱۱۹)

برق صاحب ایسا ہوا تو نہیں ہے، کہ کسی حدیث سے قرآن مجید کا کوئی حکم کلیۃً منسوخ

**ازالہ** ہوا ہو۔ لیکن اگر ایسا بھی ہو جائے، تو بعید از عقل بھی نہیں ہے، غلط فہمی آپ کو صرف

اس وجہ سے ہوئی ہے کہ قرآن مجید کو تو آپ اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہیں، اور حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، حالانکہ یہ نظریہ ہی غلط ہے، قرآن مجید بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور حدیث بھی اللہ

تعالیٰ کا حکم ہے، **الفجوات** آئیہ کریمہ: **مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ** (النساء: ۸۰)

یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔ لہذا منسوخ حکم بھی اللہ تعالیٰ

کا ہے، اور منسوخ کرنے والا حکم بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں،

حدیث میں ہر چیز کی تفصیل ہے، اور تفصیل کے لئے اجمال کی ضرورت نہیں ہوا کرتی



ہاں اجمال کے لئے تفصیل و تشریح کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً حدیث میں ہے کہ نماز قائم کرو، اور اس، اس طریقہ سے اس وقت پڑھو، تو اب حدیث میں دو چیزیں آگئیں، اول قرآنی حکم کہ ”نماز قائم کرو“ اور پھر اس کی تشریح کہ اس طرح اور اس وقت پڑھو، تو آپ بتائیے حدیث میں قرآن کو سمودیا گیا، یا نہیں، حدیث کی تشریح کے لئے قرآن مجید کی کیا ضرورت ہے لیکن برخلاف اس کے اگر قرآن مجید کا حکم سنایا جائے کہ ”نماز قائم کرو“ تو پھر یہ سوال ہوگا، کہ کب اور کیسے؟ اور اب حدیث کی ضرورت ہوگی۔ یعنی قرآن مجید کی تشریح کے لئے حدیث کی ضرورت پیش آئے گی۔ مطلب یہ کہ قرآن مجید کی تشریح کے لئے حدیث کی احتیاج و ضرورت ہے اور یہی مطلب ہے امام مکحولؒ کے قول کا، کہ قرآن حدیث کا محتاج ہے۔ لفظ ”محتاج“ کا استعمال اردو میں کراہت پیدا کرتا ہے، لیکن عربی میں نہیں اور یہی وجہ ہے کہ برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی، اور اس لفظ کو قرآن مجید کے شایانِ شان نہیں سمجھا۔

یہ طریقت، رہبانیت اور جہاد اکبر کے راستے نکال کر خدائی پیغام کو

**غلط فہمی** | کس نے مسیح کیا تھا۔۔۔۔۔ (دو اسلام ص ۱۱۸)

برق صاحب آپ نے سچ فرمایا، یہ کام بے شک کسی ملانے کیا تھا یا کسی صوفی نے ازالہ | لیکن کسی عالم دین نے کبھی اس پر مہر تصدیق ثبت نہیں فرمائی، لہذا ہم بھی آپ کی تائید کرتے ہیں۔



## باب ۴

### تخریف احادیث کے اسباب

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** | تخریف احادیث کے کئی اسباب تھے۔ اول حضور علیہ السلام نے حدیث لکھنے سے منع فرمادیا تھا اور جو چیز لکھی نہ جائے اسے تخریف سے پہچانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ (دو اسلام ص ۱۳۱)

**ازالہ** | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے سے منع نہیں فرمایا تھا بلکہ قرآن مجید کے ساتھ ملا کر لکھنے سے منع فرمایا تھا متواتر احادیث سے کتابت کی اجازت و حکم ثابت ہے۔ (تفصیل کے لیے باب اول ملاحظہ ہو) حدیث لکھی گئی، مسلسل لکھی گئی لہذا بقول برق صاحب تخریف سے بچ گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی تحریر کردہ کتب احادیث کا بیان باب اول میں گذر چکا ہے۔ ان کے بعد تابعین و تبع تابعین کے دور میں تو کتب احادیث اتنی لکھی گئیں کہ ان کا شمار مشکل ہے تفصیل کے لئے مولوی عبدالرؤف صاحب جھنڈا انگری کی کتاب ”صیانتہ الحدیث“ ملاحظہ فرمائیں۔

**غلط فہمی** | ”چند روز کا ذکر ہے کہ پاکستان کے وزیراعظم لاہور تشریف لائے، یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک جلسہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں عبدالباری کی صدارت میں منعقد ہوا جب میاں صاحب تقریر کے لئے اٹھے تو مجمع سے یہ آوازیں بلند ہوئیں ”ہم خائون کے سردار کی تقریر نہیں سنا چاہتے۔ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ“ چنانچہ وہ بیٹھ گئے۔ نوائے وقت اور اس کے ہمنواؤں نے لکھا کہ شور مچانے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہیں تھی، لیکن ”زمیندار“ اور چند دیگر اخبارات کہہ رہے تھے کہ یہ جلسہ



میں شریک ہونے والے دو لاکھ انسانوں کی متفقہ آواز تھی، واقعہ دو دن کا ہے، دو لاکھ انسانوں نے اسے دیکھا، ہر اخبار کے نمائندے بھی وہاں موجود تھے، اور پھر اصل حقیقت نہیں کھلتی۔“ (ص ۱۲۲)

برق صاحب! یہاں دو سیاسی جماعتوں کے سیاسی فریب ہیں، جو اس خبر کی اشاعت ازالہ میں کام کر رہے ہیں، برخلاف اس کے احادیث کی روایت میں صحابہ کرام میں دو جماعتیں نہیں تھیں، کہ ایک جماعت دوسری جماعت کو گرانے کے خیال سے فریب دیتی، اور احادیث میں تحریف کرتی، یہ تو صحابہ کرام کے متعلق بڑی زبردست غلط فہمی ہے اور اس کا جواب باب چہارم میں دیا جا چکا ہے، پھر یہ تو بتائیے، اس اختلاف تعداد سے اصل واقعہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ میاں عبدالباری صاحب لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے تقریر نہ کر سکے تھے، یہ تو صحیح ہے یا نہیں کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ تعداد میں اختلاف ہے، لہذا یہ واقعہ ہوا ہی نہیں، یہ سارا واقعہ من گھڑت ہے! کیا کوئی فہیم انسان اسے تسلیم کرے گا؟ خود آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ ہوا اور اختلاف تعداد کے باعث اس واقعہ کو نہیں جھٹلاتے، تو پھر سی حال حدیث کا بھی ہے، مثلاً ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بھول گئے، آپ کو یاد دلا یا گیا۔ آپ نے کمی کو پورا کیا، اور بعد میں سہو کے دو سجدے کئے“ اب اگر اس حدیث میں فرض کیجئے، یہ اختلاف پیدا ہو جائے، کہ کوئی کہے، کہ آپ عصر کی نماز میں بھولے تھے، کوئی کہے کہ ظہر کی نماز میں بھولے تھے، تو بتائیے اس سے اصل واقعہ پر کیا اثر پڑے گا۔ ظہر یا عصر کی تصریح ہونا تو کوئی اہمیت کی چیز نہیں، اہمیت کی چیز یہ ہے کہ جب کبھی نماز میں بھول ہو جائے، تو بعد میں دو سجدے سہو کے کر لئے جائیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا، سہو کے مسئلہ پر ظہر یا عصر کا اختلاف بالکل اثر انداز نہیں ہوگا، بلکہ مسئلہ پوری طرح ثابت ہوگا، اور محفوظ ہوگا، اور چونکہ سجدہ سہو کا مسئلہ ہی دینی مسئلہ ہے، لہذا اس کے محفوظ ہونے سے دین محفوظ ہو گیا۔ اور ظہر یا عصر کی صراحت محفوظ نہ ہونے سے دین کی حفاظت متاثر نہ ہوگی، تمام احادیث میں یہی بات آپ کو ملے گی، جزئی اختلاف کے باوجود جب مسئلہ کی بات آئے گی، تو پھر صحیح احادیث میں ایک ہی بات ہوگی، اسی کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت کہتے ہیں، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ حفاظت پورا کیا۔

”احادیث کی تحریف میں انسان کے اس فطری خاصہ کا کافی دخل ہے، غلط فہمی | حضور علیہ السلام سے بات نکلی، ہزاروں نے سنی، برفہ رفتہ اس



میں روو بدل ہونے لگا، زمانہ گذرتا گیا، اور بات بگڑتی گئی، ہزاروں سے نکل کر لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں زبانوں تک پہنچی، جہاں کوئی حصہ بھول گیا، پاس سے بڑھایا، اصلی قول محفوظ نہیں تھا، کہ مقابلہ کر کے تصحیح کر لیتے، رادیوں میں اچھے بھی تھے اور برے بھی، مؤخر الذکر نے احادیث کو اپنے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا، اور بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ (ص ۱۲۳)

اس کے جواب میں برق صاحب آپ اپنی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں،  
**ازالم** | مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

”گذشتہ ۷۴ برس میں مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا، جو رنگ آمیزی، مبالغہ اور دیگر سخن گسترانہ عیوب سے پاک ہو، میں خود ان عیوب سے مبرا نہیں اور آج کہ میری عمر ۷۴ سال سے کچھ اوپر ہو چکی ہے، علم کے کئی منازل طے کر چکا ہوں، حقیقت اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں، پھر بھی داستان سرائی، مبالغہ اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں۔“ (دو اسلام ص ۱۲۱)

مندرجہ بالا غلط فہمی میں مبالغہ اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں۔

**انتباہ** | برق صاحب! آپ نے غور فرمایا، آپ کی عمر ۷۴ سال سے کچھ اوپر ہے، اور گذشتہ ۷۴ سال میں آپ کو ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا، جو رنگ آمیزی سے پاک ہو، ریاضی کا معمولی سا طالب علم بھی کہہ سکتا ہے کہ کم از کم پانچ سال تو ۷۴ سال کے عرصہ میں سے تفریق کر دینے چاہیئے تھے، اس لئے کہ ایام رضاعت اور ایام طفولیت کے پانچ سال اس قسم کے تجربات و مشاہدات کے لئے بنیاد نہیں بن سکتے، بہر حال اس غلطی کے باوجود برق صاحب کے اس مضمون میں کوئی غلطی نہیں کہ ”ان کو ایسے لوگ نہیں مل سکے جو مبالغہ آمیزی سے مبرا ہوں“ اگر ریاضی کی اس غلطی کے باوجود ان کا منشاء صحیح ہے تو یہی بات تو حدیث میں بھی ہوتی ہے کہ باوجود اس کے کہ بعض راوی بعض غلطیاں کر جاتے ہیں، لیکن منشاء میں کوئی غلطی نہیں کرتے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل منشاء کو کما حقہ اور بالکل صحیح ادا کر دیتے ہیں، آپ معمولی سے جزئی اور غیر اہم اختلاف کو مبالغہ سے اتنا عظیم بنا دیتے ہیں کہ ناواقف یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ جب اتنا اختلاف ہے تو اس کا اعتبار ہی کیا۔

**غلط فہمی** | حضور کا زمانہ تھا، خود سرور کائنات بقید حیات تھے، کہ حضرت زبیرؓ سے انکے بیٹے عبد اللہ نے پوچھا کہ آپ روایت احادیث سے کیوں اجتناب کیا کرتے ہیں، فرمایا اللہ کی قسم! احادیث میں اختلاف ہو گیا ہے، میں نے حضور کی زبان مبارک



سے یہ حدیث ان الفاظ میں سنی تھی۔

مَنْ كَذَبَ عَلَى فُلَيْتَبُو اَمَقْعَدَا مِنْ النَّارِ جو شخص کوئی غلط قول میری طرف منسوب کرے گا جہنم میں جائے گا  
لیکن لوگوں نے اس میں ”متعمداً“ کا لفظ (من کذب علی متعمداً) بڑھا لیا ہے۔

(دو اسلام ص ۱۲۳)

برق صاحب آپ کی عقل میں یہ بات کیسے آگئی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں  
ازالہ اور احادیث میں اختلاف ہو جائے، اختلاف دور کرنے والی ہستی موجود ہو، نہ وہ  
اختلاف کو دور کرے، نہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں اور اختلاف کو رفع کریں یہ کیسے ممکن  
ہے، آپ نے تو بڑی عجیب و غریب بات کہی ہے۔

برق صاحب! آپ کی وارد کردہ روایت بالکل بے سند ہے، لہذا بالکل جھوٹی ہے۔  
(خالص اسلام ص ۱۶۲) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے یہ سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال  
کے بعد کیا تھا، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں، روایت کے اصل الفاظ ملاحظہ  
فرمائیے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کہتے ہیں۔

مَا لِي لَا أَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا أَسْمَعُ  
ابْنَ مَسْعُودٍ وَقُلَانًا وَقُلَانًا قَالَ أَمَا  
إِنِّي لَمْ أَفَارِقْهُ مُنْذُ أَسَلَّمْتُ وَلَكِنِّي  
سَمِعْتُ كَلِمَةً يَقُولُ مَنْ كَذَبَ  
عَلَى مُتَعَمِّدًا أَفْلَيْتَبُو أَمْ قَعَدَا  
النَّارِ (رواہ ابن ماجہ ورواہ ثقات تقریب)

کیا بات ہے کہ میں آپ سے اس طرح حدیث نہیں  
سننا جس طرح ابن مسعود اور فلاں فلاں شخص سے  
سننا ہوں؟ حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ میں کبھی رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ نہیں ہوا جب سے میں نے  
اسلام قبول کیا لیکن ایک کلمہ میں نے آپ سے سنا ہے  
کہ جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے اس کو اپنا  
ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرنا چاہیے۔

یعنی حضرت زبیرؓ اس خوف سے احادیث بیان نہیں کرتے تھے، کہ کوئی غلطی نہ ہو جائے  
اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ”متعمداً“ کا لفظ حضرت زبیرؓ کی حدیث میں موجود ہے حضرت  
زبیرؓ کے علاوہ اس لفظ کو روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد دو سو تک بتائی گئی ہے، صرف  
کتب صحاح میں یہ لفظ چودہ صحابہ کی روایت میں موجود ہے (خالص اسلام ص ۱۶۲) پس ثابت ہوا  
کہ برق صاحب کی نقل کردہ روایت بالکل باطل ہے۔

اسی طرح جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے حضرت ابو ہریرہؓ کی کتنے والی  
غلط فہمی حدیث بیان کی گئی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مولشیوں کی رکھوالی اور کھیتی کی حفاظت  
کے لئے کتاب لانا جائز ہے، تو ابن عمرؓ نے فرمایا، کیوں نہ ہو، ابو ہریرہؓ کھیتوں کا مالک



جو ٹھہرا۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کھیت کے لئے کتابال رکھا تھا، اس لئے بقول ابن عمرؓ آپ نے ایک حدیث تراش کر کتابالنے کا جواز نکال لیا تھا۔ (ص ۱۲۳-۱۲۴)

**ازالہ** | بات صرف اتنی ہے، کہ عبداللہ بن عمرؓ کو کھیتی کی حفاظت کے لئے کتابالنے کی حدیث معلوم نہ تھی، حضرت ابو ہریرہؓ کو معلوم تھی، اور انہوں نے بیان کی، تو ابن عمرؓ نے کہا یہ حدیث انہیں معلوم ہونی ہی چاہیے، کیونکہ وہ کھیتی کرتے ہیں اور کتابالتے ہیں اگر انہیں معلوم نہ ہوتی، تو وہ ایسا کیوں کرتے نہ ابن عمرؓ کا اس میں کوئی طنز ہے، نہ ابو ہریرہؓ کی تکذیب، بلکہ ظاہر یہ کرنا تھا، کہ کوئی تعجب نہیں، اگر انہیں یہ حدیث یاد ہے، اور مجھے یاد نہیں، اس لئے کہ وہ اس کے ضرورت مند ہیں اور میں نہیں، برق صاحب کا ابن عمرؓ پر یہ بہتان ہے کہ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ابو ہریرہؓ نے حدیث تراش لی، حاشا وکلا، بلکہ اس کلمہ کو انہوں نے بھی یاد کر لیا اور اس کی روایت کی۔

عَنْ أَبِي الْحَكَمِ سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ يُحَدِّثُ  
عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ  
مَنْ أَخَذَ كَلْبًا إِلَّا كَلَبَ زَرْعٍ أَوْ غَنَیْ  
أَوْ صَبَدٍ يُنْقَدُ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ  
قِيَاطًا (صحیح مسلم، کتاب البیوع)

ابو الحکم کہتے ہیں میں نے ابن عمرؓ کو یہ کہتے سنا کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کھیتی  
یا بکری یا شکار کے کتے کے علاوہ کتابالا تو اس  
کے اجر میں سے ہر روز ایک قیراط کم ہو جائے  
گا۔

گویا حضرت ابن عمرؓ نے تو حضرت ابو ہریرہؓ کو سچا سمجھا، اور برق صاحب غلط فہمی سے کچھ اول  
سمجھ رہے ہیں۔ پھر یہ روایت دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے اور اس میں حضرت ابو ہریرہؓ کا انفرادہ نہیں  
الغرض دونوں صحابی اس بہتان عظیم سے بری ہیں، برق صاحب! اگر صحابہ کرام احادیث گھڑتے  
تھے، بدترین قسم کے کذاب و وضاع تھے تو پھر کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ ان لوگوں نے قرآن مجید  
میں بھی کوئی تحریف کی ہوگی، کیونکہ صحیفہ عثمانی و صدیقی کی ترتیب میں نعوذ باللہ ان کذابین کی  
جماعت شامل تھی، یہی وجہ ہے کہ ایک فرقہ موجودہ قرآن مجید کو محرف مانتا ہے (تفصیل کے لیے باب  
پنجم ملاحظہ ہو)

زمانہ گذرتا گیا، اللہ سے ڈرنے والے اور ذات رسول سے عشق رکھنے والے  
ختم ہوتے گئے، اور بعد میں آگئے ایسے مسلمان جو کعبہ کو گرانے، آل رسول کو  
ذبح کرنے، اور حرم نبوی کے معصوم بچوں کو گرم ریگستان میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنے  
میں بھی کوئی غار محسوس نہ کرتے تھے، کیا ان حضرات کے لئے احادیث میں ردو  
بدل کوئی بڑی بات تھی۔ (دو اسلام ص ۱۲۴)



**ازالہ** | برق صاحب بقول آپ کے صحابہ کرام تک احادیث میں تحریف کیا کرتے تھے، تو پھر بعد والوں پر تحریف احادیث کے سلسلہ میں تعجب کی بات ہی کون سی ہے۔ "ایں خانہ ہمہ آفتاب ست" جب قرآن مجید کے مخاطبین اولین ہی احادیث میں رد و بدل کر دیا کرتے ہوں، تو پھر بعد والے جتنا بھی کریں کم ہے، گویا جن صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معتمد اور محبوب سمجھتے ہوں، قرآن مجید جن کی تعریف کرتا ہو، وہ گویا سب کے سب الاما شاء اللہ منافق تھے، اس سے تو اس فرقہ کی تائید ہوتی ہے، جو کہا کرتا ہے کہ صرف تین صحابی (یا اس سے کچھ زائد) مسلم تھے باقی سب منافق، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

برق صاحب جن واقعات کی طرف آپ نے اپنی مذکورہ بالا عبارت میں اشارہ فرمایا ہے، ان میں سے اکثر بناوٹی ہیں، لیکن معلوم نہیں آپ نے بے تحقیق بے سند باتوں پر کیسے یقین کر لیا، محدثین کی معیاری اور باسند باتیں تو آپ کو تسلیم نہیں اور مورخین کی بے سند اور جھوٹی باتوں پر آپ یقین کر لیتے ہیں، تعجب ہے، اگر ہم ان واقعات کو صحیح مان لیں تو ہم آپ سے پوچھتے ہیں، کہ کیا محدثین کی جماعت مٹتی جو یہ کام کرتی تھی، کیا آل رسول کو محدثین نے ذبح کیا تھا کیا قاتلان حسینؑ اصحاب حدیث تھے، جو طلبائے حدیث کو احادیث املاء کراتے تھے؟ آخر کیا بات ہے؟ اللہ کے لئے انصاف کیجئے، محدثین کی جماعت ہمیشہ ان فتنوں سے علیحدہ رہی، وہ یکسوئی کے ساتھ صرف احادیث کی خدمت کرتے رہے، ان کی زندگی بے داغ اور اسلامی زندگی کا شاندار نمونہ تھی، محدثین کرام تو ان لوگوں کا اعتبار ہی نہیں کرتے تھے جو ان واقعات میں شریک ہوئے تھے۔

**غلط فہمی** | "ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ احادیث کو چھوڑ دو گے، تو نماز پڑھنے کا طریقہ کہاں سے سیکھو گے اور زکوٰۃ کی مقدار کہاں سے معین کرو گے؟

**جواب :-** اس سوال کے تین جواب ہیں :- اول :- اگر ہم احادیث کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دیں تو ہر مسجد کی نماز دوسری سے مختلف ہو جائے گی (رد و اسلام ص ۱۲۴) برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ اب تمام مسجدوں میں نماز کی ایک ہی صورت ہے۔ **ازالہ** | اگر حدیث کے مطابق پڑھیں گے، تو مختلف ہو جائے گی، برق صاحب نے یہ تو بڑی عجیب غریب بات کہی ہے، کیونکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، یعنی آج کل نماز کی ہیئت میں اختلاف ہے اور اس کی وجہ تقلیدی فرقہ بندی اور احادیث کی طرف سے غفلت ہے، اگر سب مل کر صحیح احادیث کے مطابق نماز پڑھنے لگ جائیں، تو یہ اختلاف مٹ جائے گا جو آج کل مسجدوں میں پایا جاتا ہے، کہ کوئی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے، اور کوئی ہاتھ باندھ کر کوئی سینہ پر



ہاتھ باندھتا ہے، اور کوئی ناف کے نیچے، کوئی بلند آواز سے آمین کہتا ہے، اور کوئی بلند آواز سے پڑھتا ہے، کوئی رنج یدین کو نماز کی زینت سمجھتا ہے، اور کوئی اس کو سرکش گھوڑوں کے دموں سے تشبیہ دیتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

**غلط فہمی** ”دوم۔ رسول اکرم صلعم کو لاکھوں مسلمانوں نے نماز پڑھتے دیکھا۔ انہیں کروڑوں نے، اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچ گیا، کیا ان ارب کھرب انسانوں کی شہادت کافی نہیں؟ کیا دیہاتی مسلمان صحیح بخاری سے نماز کا طریقہ سیکھا کرتے ہیں جس طریقہ سے ہمارے آباؤ اجداد نماز ادا کرتے رہے، ہم نے وہ سلسلہ جاری رکھا، اور اب ہماری نقل اتار رہی ہے، یہاں صحیح بخاری کی ضرورت ہی کہاں پیش آتی ہے۔ کشمیر کی ساری وادی میں غالباً صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہوگا، لیکن پھر بھی وہ نہایت صحت سے نماز پڑھتے ہیں“ (دوا سلام ص ۱۲۵)

**ازالہ** کے لئے لازمی شے نہیں، بلکہ حدیث پر جو عمل تو اترے ہر زمانہ میں ہوتا رہا۔ یہی اس کی اصل حفاظت ہے اور یہ ایسی حفاظت ہے کہ تقریباً پورا قرآن مجید اس حفاظت میں احادیث کی برابری نہیں کرتا، برق صاحب کی اس عبارت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صحیح بخاری ہو یا نہ ہو، احادیث عملاً محفوظ ہیں اور جس طرح آج تو اتر کی وجہ سے محفوظ ہیں۔ صحیح بخاری کی تالیف سے پہلے بھی تو اتر کی وجہ سے اسی طرح محفوظ تھیں، لہذا یہ اعتراض کہ صحیح بخاری کی تالیف سے پہلے ڈھائی سو سال گزر چکے تھے، اس طویل زمانہ میں حفاظت حدیث کا کوئی انتظام نہ تھا، اور یہ کہ تمام احادیث غیر محفوظ تھیں اس لئے ناقابل اعتماد ہیں۔ ”خود بخود کالعدم ہو جاتا ہے، اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ صحیح بخاری کی تالیف کے وقت بھی احادیث عملی تو اتر کی وجہ سے محفوظ تھیں۔ امام بخاری نے ان ہی محفوظ احادیث کو روایت اور سند بھی محفوظ کر لیا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ امام بخاری پہلے آدمی نہیں ہیں جنہوں نے احادیث کو لکھ کر محفوظ کر لیا بلکہ ہر دور میں یہ کام تو اتر سے ہوتا رہا، اور احادیث روایت بھی تو اتر کے ساتھ نقل ہوتی رہیں، الا ماشاء اللہ

**سوال** برق صاحب مالکی اور شیعہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں، اور باقی فرقے ہاتھ باندھ

علہ :- اصل کتاب میں عبارت اسی طرح ہے۔ غالباً عبارت یہ ہے ”اور اب ہماری اولاد ہماری نقل اتار رہی ہے۔“



کر نماز پڑھتے ہیں، مالکیوں اور شیعوں نے یہ طریقہ سلسلہ بہ سلسلہ اربوں، کھربوں انسانوں کے عملی تواتر سے اخذ کیا، اسی طرح باقی فرقوں نے بھی اپنا طریقہ عملی تواتر سے حاصل کیا، تو اب بتائیے، کونسا عملی تواتر صحیح ہے اور اگر ان میں سے ایک صحیح ہے، دوسرا غلط، تو کیا پھر تواتر کی اہمیت کچھ باقی رہ جائے گی؟ حالانکہ آپ نے اپنے اعتماد کی ساری عمارت تواتر کی بنیاد پر ہی کھڑی کی ہے، اگر آپ فرمائیں کہ دونوں تواتر صحیح ہیں، تو پھر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کبھی دوسرے تواتر پر بھی آپ نے عمل کیا، اگر نہیں کیا تو کیوں؟ کیا ایک طریقہ کو اختیار کرنا اور دوسرے کو مطلقاً چھوڑ دینا مناسب ہے؟

برق صاحب! پھر ان متواتر اعمال میں بعض ایسے بھی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، مثلاً ایک ہی چیز ایک فرقہ کے ہاں حرام ہے، دوسرے کے ہاں حلال، ایک ہی چیز ایک فرقہ کے ہاں پاک ہے دوسرے کے ہاں ناپاک، ایک فرقہ کے نزدیک زیور پر زکوٰۃ فرض ہے، دوسرے کے ہاں نہیں، تو اب بتائیے کیا دونوں تواتر صحیح ہیں، حلال بھی عملی تواتر سے ثابت ہے، اور حرام بھی عملی تواتر سے ثابت ہے، اور دونوں صحیح، یہ کس قدر مضحکہ خیز ہے، اس مضحکہ خیز اختلاف کو دور کرنے کا ایک طریقہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان احادیث کو دیکھا جائے جو روایتاً محفوظ اور منضبط ہیں کہ آخر وہ کس کی تائید کرتی ہیں، پس جس کی وہ تائید کریں وہ صحیح ہے، اور دوسرا غلط ہے، یہ ہے وہ مقام جہاں کتب حدیث کی ضرورت پڑتی ہے اور ان کے بغیر چارہ نہیں دوسری بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ عملی تواتر کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، مثلاً تعزیر پرست تعزیر کو عملی تواتر کا درجہ دیتے ہیں، وہ جب جواب دیتے ہیں، یہی جواب دیتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد سے ایسا ہوتا آیا ہے، لہذا ہم تو یہی کریں گے، خواہ آپ ان کے سامنے قرآن مجید کی آیات تلاوت کریں یا احادیث سنائیں، ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا، اور اگر ہوگا تو اس صورت میں ہوگا کہ وہ اپنے عملی تواتر کو مسترد کر دیں۔

برق صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ وادی کشمیر میں صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہیں، صحیح بخاری تو کیا وہاں کے کتب خانوں میں صحاح ستہ تک محفوظ ہیں، اور نہ صرف کتب خانوں میں، بلکہ بہت سے علماء کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں۔

پھر یہ خیال بھی صحیح نہیں، کہ کشمیری نہایت صحت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، نہایت صحت تو کجا سو میں سے ایک بھی بہ مشکل صحیح نماز پڑھ سکتا ہے، جہالت، تقلیدی بندشوں اور تغافل کا دور دورہ ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْا ۖ كَانُفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ۔

غلط فہمی | سوم۔ قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے، جس طرح ہم کسی تفسیر



تاریخ یا تصوف کی کتاب کو یہ منصب عطا نہیں کر سکتے، کہ وہ اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ کرے، اسی طرح ہم حدیث کو بھی یہ رتبہ نہیں دے سکتے، انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش کی وجہ سے اس کی حیثیت انسانی تصنیف کی ہو چکی ہے جس طرح بعض باقی انسانی تصانیف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآنی آیات و احکام کی تشریح بیان کریں، اسی طرح محدثین کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔  
(دوا سلام ص ۱۲۵)

**انزالہ** | برق صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے، کہ انسانی اقوال کی آمیزش کی وجہ سے حدیث کی حیثیت ایک انسانی تصنیف کی سی ہو گئی ہے، لہذا ایسی حدیث اسلام میں کسی نئے اصول یا حکم کا اضافہ نہیں کر سکتی، برق صاحب! ہمیں آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے، لیکن مطلب اس کا ظاہر ہے، کہ اگر انسانی اقوال کی آمیزش نہ ہو تو پھر حدیث انسانی تصنیف نہ ہوگی، اور یہی ہماری مراد ہے، اور یہی برق صاحب کا منشاء ہے، جب یہ بات تسلیم ہو چکی، کہ خالص حدیث انسانی تصنیف نہیں، تو پھر حدیث کا حجت شرعیہ ہونا بھی ظاہر ہے، کیونکہ اس سے اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ برق صاحب کے نزدیک بھی جائز ہے۔

برق صاحب محدثین کو قرآن مجید کی شرح کا حق دے رہے ہیں، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی صحیح نہیں۔ نہ محدثین خود کو شارح قرآن مجید سمجھتے تھے، نہ لوگوں ہی نے انہیں شارح قرآن مجید سمجھا، محدثین تو صرف صحیح خالص حدیث کو قرآن مجید کا شارح سمجھتے تھے، اور اسی شرح کو ہم تک پہنچاتے تھے۔ لہذا اس شرح کو ہر حال میں قبول کرنا ہوگا۔ یا پھر یہ کہہ دیا جائے کہ ہماری شرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح سے زیادہ صحیح اور منشاء الہی کے زیادہ مطابق ہے، نعوذ باللہ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ احادیث میں انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش ہے، محدثین نے تخلص حدیث کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا، متعدد دفنوں اور اصول حدیث اس پر شاہد ہیں۔

برق صاحب کا یہ فرمانا کہ اگر محدثین کوئی ایسی شرح پیش کریں، جو قرآن مجید سے متصادم نہیں ہوتی ہو اور تواتر عمل کے بھی خلاف نہ ہو تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے، ظاہر ہے کہ برق صاحب کی مراد اس سے محدثین کی اپنی شرح ہے، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح، کیونکہ اس کو تو ہر حال میں قبول کرنا ہوگا۔ ہاں محدثین کی اپنی شرح اس وقت قبول کی جائے گی، جب وہ قرآن مجید کے یا تواتر عمل کے خلاف نہ ہو، اور یہ تواتر عملی حدیث ہی تو ہے، اس کو آپ حدیث کا نام کیوں نہیں دیتے، برق صاحب کی عبارت اس طرح ہونی چاہیے تھی یعنی ”اگر محدثین اپنی طرف سے قرآن مجید کی شرح کریں، اور وہ شرح قرآن اور حدیث کے



خلاف نہ ہو، تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں عذر ہی کیا ہو سکتا ہے“ اور اس طرح ہمارا اور برق صاحب کا اتفاق ہو جائے گا۔

برق صاحب تو اتر عمل کو حجت تسلیم کر رہے ہیں۔ یعنی دوسرے معنوں میں حدیث کو حجت مان رہے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا صحیح ہونا یقینی ہو، نماز کا طریقہ تو اتر عمل یعنی یقینی احادیث ہی سے معلوم ہوتا ہے، ورنہ قرآن مجید تو اس معاملہ میں خاموش ہے اور صرف نماز ہی کا کیا ذکر ہے۔ قرآن مجید بہت سی باتوں کے متعلق خاموش ہے، بعض آیتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو حدیث کی روشنی میں نہ دیکھا جائے تو بالکل مہمل نظر آتی ہیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں ”قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے۔“ یہ ایک خوشنا جملہ تو ضرور ہے لیکن حقیقت کچھ بھی نہیں، نہ نماز کا طریقہ اس میں ہے، نہ کسی اور عمل کا، اور پھر بھی وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے! یہ عجیب بات ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی** | ”باقی رہا زکوٰۃ کا مسئلہ، تو اسے خود قرآن نے بھی واضح کر دیا ہے

زکوٰۃ ہے کیا چیز؟ اللہ کے راستہ میں مالی قربانی“ (دوا سلام ص ۱۲۶)

قرآن مجید میں کسی جگہ بھی زکوٰۃ کی تشریح نہیں دی گئی، برق صاحب کو اعتراف ازالہ ہے کہ زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی کے ہیں (دوا سلام ص ۱۲۶) تو پھر اس کے معنی مالی قربانی کرنا نہ قرآن مجید سے ثابت ہے نہ لغت سے، قرآن مجید میں جہاں کہیں مالی قربانی کا ذکر ہے، یہ کہنا کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے، زبردستی ہے، کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی مالی قربانی کے ہیں، نہ کہ زکوٰۃ کے۔

ہمارے فقہاء کہتے ہیں، کہ ادائے زکوٰۃ کے لئے ایک وقت (ماہ رجب)..... معین ہے۔ (دوا سلام ص ۱۲۶)

**غلط فہمی** | یہ قطعاً صحیح نہیں، ماہ رجب ادائے زکوٰۃ کے لئے مقرر نہیں، برق صاحب نے ازالہ حوالہ نقل نہیں کیا،

**غلط فہمی** | مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت نہیں، جب بھی ملت پہ ابتلا کا وقت آیا، مسلمان نے سب کچھ خدا اور رسول کی خدمت میں پیش

کر دیا (دوا سلام ص ۱۲۶)

برق صاحب! تاریخ سے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ہر مسلم نے ہر ابتلا کے وقت یا کسی خاص ابتلا کے وقت اپنا سارا مال اللہ اور اس کے رسول کی خدمت



میں پیش کر دیا ہو، تاریخ میں تو یہ ملتا ہے کہ جس شخص نے جتنا چاہا دیا، کسی پرزبردستی نہیں کی گئی، برخلاف اس کے جن لوگوں نے مقررہ شرح سے مقررہ میعاد میں زکوٰۃ دینے سے انکار کیا، ان سے زکوٰۃ جبراً وصول کی گئی، برق صاحب کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی حکمران ہر وقت ہر ضرورت کے وقت مسلمانوں سے چندہ کی درخواست کرتا رہے، بند باندھنا ہو تو چندہ مانگے، پل بنانا ہو تو چندہ مانگے، سرائے بنانی ہو تو چندہ مانگے، کسی اندھے کا وظیفہ مقرر کرنا ہو تو چندہ مانگے، اس کے پاس سالانہ مستقل آمدنی کی مدد کوئی نہ ہو، کہ وہ ان کاموں کے لئے اس مد میں سے صرف کر سکے، گویا اسلامی حکومت کی سالانہ آمدنی کی کوئی مد نہ ہو، نہ سالانہ اخراجات کا کوئی بجٹ۔

”اگر میری بات پر یقین نہ آئے۔ تو لیجئے اللہ کا فیصلہ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ غَلَطُ فہمی | صَدَقَةٌ تُطَهِّرُهُمْ بَنَاتُ تَزَكِيَهُمْ“ مسلمانوں سے صدقہ لے کر انہیں مطہر اور مزکی (پاک) بناؤ نیز کی کا ماخذ زکوٰۃ ہے، تو گویا اللہ کے ہاں ہر قسم کی قربانی زکوٰۃ شمار ہوتی ہے۔ (دو اسلام ص ۱۲۶-۱۲۷)

”تطہر“ کا ماخذ طہارت ہے، تو کیا اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر قسم کی مالی قربانی ”طہارت“ ازالہ | شمار ہوگی اور جہاں کہیں بھی قرآن مجید میں لفظ طہارت یا اس سے مشتق کوئی لفظ آئے گا، تو اس کے معنی مالی قربانی کے ہوں گے؟ ہرگز نہیں، لہذا زکوٰۃ کے معنی ہر مالی قربانی قرآن مجید سے ثابت نہیں۔

برق صاحب آپ کا کہنا تو یہ ہے کہ سب مال اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دے دو، لیکن آپ کی وارد کردہ آیت میں ”من اموال“ ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اموال میں سے کچھ لو، نہ کہ سب، گویا سارا مال دے دینا فرض نہیں ہے۔

کیا اہل سرمایہ کو ان تمام آرائش اور زاید از ضرورت املاک پر قابض ہونے غلط فہمی | کا حق حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے، ہرگز نہیں، سنو اللہ کا ازلی اور ازلے

فیصلہ ”يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ“ اے رسول لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ مالی قربانی کی حد کیا ہے۔ انہیں کہہ دو کہ ہر فالتوا اور زائد از ضرورت چیز خدا اور رسول کے سامنے پیش کر دو۔ (دو اسلام ص ۱۲۸)

ازالہ | برق صاحب نے آیت مذکورہ کا ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے۔

عہ دو اسلام میں اسی طرح ہے۔ صحیح یہ ہے ”تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا“



اے رسول! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا صرف کیا کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ فاضل مال صرف کیا کرو، اس سے ظاہر ہوا کہ مسلم اس مال کو جو ضروری اخراجات کے بعد بچ جائے۔ اللہ کے راستہ میں بقدر ضرورت خرچ کرتا رہے۔ خواہ مقررہ وقت میں مقررہ شرح سے یا ہنگامی حالات میں غیر مقررہ شرح سے۔ غرض یہ کہ جو مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیا جائے وہ زائد از ضرورت مال میں سے دیا جائے۔ نہ یہ کہ مہو کا اور رنگارہ کر سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

ارشاد ہے :-

وَلَا تَجْعَلْ بَيْنَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ  
فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا  
نہ ہاتھ کو بالکل روک ہی دو، اور نہ بالکل کھول  
ہی دو کہ بعد میں تم ملامت زدہ اور نادم  
ہو کر بیٹھ جاؤ۔

(بہی اسرائیل: ۲۹)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ضروریات زندگی کے لئے جس مال کی ضرورت ہے وہ خرچ نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ منشا نہیں کہ انسان خود محتاج ہو کر بیٹھ جائے اور سب کچھ دے دے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہے کہ بس جو بچ گیا وہ اللہ کے راستے میں خرچ کر دے، کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھے اگر ایسا ہوتا تو نہ ترکہ ہوتا نہ وارثوں میں تقسیم ہوتا۔ حالانکہ قرآن مجید نے اس تقسیم کو فرض کیا ہے اسی طرح نہ دولت مند ہوتے نہ فقراء، حالانکہ قرآن مجید کہتا ہے کہ فقراء کو صدقہ دیا کرو۔

برق صاحب نے آیت مذکورہ کو زکوٰۃ کی تشریح میں پیش فرمایا گویا ان کے نزدیک زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ ”ہر فاضل اور زائد از ضرورت چیز اللہ اور رسول کے سامنے پیش کر دینا“، لیکن برق صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کب پیش کی جائے البتہ اس سے پہلے وہ فرما چکے ہیں :-

”کہ زکوٰۃ کا کوئی خاص وقت معین نہیں“ (دو اسلام ص ۱۲)

دوسری جگہ برق صاحب فرماتے ہیں :-

”جس طرح جان سپاری کا کوئی وقت معین نہیں۔ جس وقت جنگ کا بگل بجا مسلمان سرکف حاضر۔ اسی طرح مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت معین نہیں۔ جب بھی ملت پر ابتلا کا وقت آیا۔ مسلمان نے سب کچھ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا“ (دو اسلام ص ۱۲)

برق صاحب کی ان عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ زائد از ضرورت مال صرف ہنگامی حالات میں پیش کر دینا ”زکوٰۃ“ ہے۔ اس سلسلہ میں ہم عرض کرتے ہیں کہ ہنگامی حالات کا مقابلہ تو اس مالی امداد سے



کر لیا جائے گا۔ لیکن روزمرہ کے سرکاری اخراجات کی کیا سبیل ہے؟ اس کی حالت میں فوج کے اخراجات اور اسلحہ کی فراہمی کا کیا ذریعہ ہے؟ دوسرے سرکاری اور رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟ کیا حکومت کا نہ کوئی سالانہ میزانیہ ہو گا نہ سالانہ تخمینہ اخراجات؟ کیا کوئی حکومت اس طرح چل سکتی ہے۔ سالانہ اخراجات کے لئے آمدنی کا ایک چھوٹا ذریعہ ہونا چاہیئے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ جو سالانہ وصول کی جاتی ہے، اور یہ چیز صرف حدیث سے ثابت ہے۔ قرآن مجید اس سے یکسر خاموش ہے ورنہ براوہم وہ آیت پیش کیجئے جس میں یہ ہو کہ ”زکوٰۃ زائد از ضرورت مال کو خرچ کر دینے کا نام ہے“ پھر یہ بھی ثابت کیجئے کہ عام اور غیر منگامی حالات میں بھی سرمایہ داری طبقہ سے سرکاری اخراجات کے لئے کچھ لیا جائے یا نہیں؟

برق صاحب! زکوٰۃ اگر زائد از ضرورت مال کے صرف کر دینے کا نام ہے تو پھر یہ بتائیے کہ ضرورت کا معیار کیا ہو گا؟ ہر ایک کا انفرادی معیار ہو گا یا حکومت ایک خاص معیار مقرر کرے گی، اگر انفرادی معیار ہو گا تو اس میں بڑی وقتیں پیش آئیں گی۔ زکوٰۃ دینے والوں اور وصول کرنے والوں کے درمیان ایک مسلسل اختلاف رونما ہو گا۔ اگر حکومت نے اس کا کوئی خاص معیار مقرر کر دیا تو یہ فطرت کے تقاضے کے خلاف ہو گا۔ اور اسلام فطری قانون کے خلاف تعلیم نہیں دیتا۔ پھر فطرۃ زیادہ کمانے کی خواہش مفقود ہو جائے گی اور کچھ عرصہ میں حکومت کا خزانہ خالی ہو جائے گا۔ اگر آپ روس کے اشتراکی نظام کی مثال پیش کریں تو وہ مثال یہاں صادق نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ روس میں ہر چیز حکومت کی ہوتی ہے۔ اور حکومت کے قبضہ میں رہتی ہے وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ضروریات زندگی کے لئے کچھ مال رکھ کر باقی سب حکومت کے حوالہ کر دو۔ نہ وہاں یہ ہوتا ہے کہ صرف منگامی حالات میں رعایا سے مال طلب کیا جاتا ہے۔ وہاں رعایا کے پاس ہوتا ہی کچھ نہیں کہ وہ اس میں سے چندہ دیں۔ ترکہ وارثوں میں تقسیم کریں۔ اقرباء اور فقراء کو دیتے رہیں۔ برخلاف اس کے قرآن مجید انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ رعایا سے مانگتا ہے۔ ترکہ کو تقسیم کرنا حکم دیتا ہے۔ اقرباء اور مساکین کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ روس کے اخراجات اس لئے چلتے رہتے ہیں کہ حکومت نے ہر چیز پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور اسلامی حکومت کے اخراجات اس لئے نہیں چل سکیں گے کہ اس نے پاس کچھ نہیں ہو گا جو کچھ ہو گا وہ رعایا کی ملکیت ہو گی۔ اور رعایا سے حکومت صرف منگامی حالات کے لئے ہی مانگ سکتی ہے۔ نہ کہ غیر منگامی حالات میں، برق صاحب! براوہم سوچیں یہ گنتی کس طرح سلجھے گی؟

برق صاحب! ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ منگامی حالات میں حکومت کے سامنے سب کچھ پیش کر دو اور دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ غیر منگامی حالات میں بھی سرمایہ داروں کو اپنے پاس مال رکھنا، زیادہ کمانا، عیش و راحت کی زندگی گزارنا قطعاً ناجائز ہے ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔



”اس دنیا میں ۴۴ فی صدی افراد کو عظیم الشان محلوں، موٹروں، باغوں اور پارکوں میں عیش اڑانے کا کیا حق حاصل ہے؟ انہوں نے سرمایہ کے بل بوتے پر غریبوں سے کیوں زمینیں چھینیں، ان کی کمائی پر کیوں ناجائز قبضہ کیا؟ کیا اہل سرمایہ کو ان تمام آرائشی اور زائد از ضرورت املاک پر قابض ہونے کا حق حاصل ہے؟ قرآن کہتا ہے، ہرگز نہیں سنو اللہ کا ازلی اور ازل فیصلہ“ (دوا سلام ص ۱۲۷-۱۲۸)

(اس کے بعد برق صاحب نے وہی آیت پیش کی ہے جو غلط فہمی کے عنوان سے اوپر درج کی جا چکی ہے)

اب بتائیے جائز طریقہ سے مال کمانے والا طبقہ کس طرح اپنی جائز آمدنی سے فائدہ اٹھانے سے روکا جا رہا ہے؟ آخر کیوں؟ کہیں تو برق صاحب فرماتے ہیں کہ ”ہنگامی حالات میں سب کچھ دے دو، اور یہاں یہ فرمایا کہ ہر حالت میں کچھ رکھو ہی نہیں جب سب کچھ بچتے ہی حکومت کے حوالہ کیا جا چکا تو بتائیے اب فقراء کو کیا دیا جائے۔ اقربا کو کیا دیا جائے، دارثوں میں کیا تقسیم کیا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ برق صاحب سے اللہ تعالیٰ کا منشاء سمجھنے میں غلطی ہو گئی انہوں نے ایک آیت کو سامنے رکھا اور پھر غلط فہمی سے کچھ کا کچھ نتیجہ نکال لیا۔ اللہ تعالیٰ کا ہرگز یہ منشاء نہیں کہ تمام دنیا کے انسان ایک حالت میں زندگی گذاریں اور معیشت کے لحاظ سے فرق مراتب مفقود ہو جائے۔ کاش برق صاحب مندرجہ ذیل آیت کو بھی سامنے رکھ لیتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ	کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے
نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ	ہیں۔ حالانکہ دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ	کو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیا ہے اور بعض
فَوْقَ بَعْضٍ وَرَجَعْنَا لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ	کو بعض پر درجات کی بلندی عطا فرمائی ہے تاکہ ایک
بَعْضًا سُلْطٰنًا ۙ يَا (الزخرف: ۳۲)	دوسرے سے خدمت لے سکے۔

اس آیت سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سرمایہ دار طبقہ کو اپنی جائز آمدنی سے جائز عیش و راحت سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ اور اس آمدنی کے وسیلہ سے اپنے لئے خادم و ملازم رکھنے کا حق حاصل ہے۔ ان کی یہ سر بلندی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اسی نے یہ فرق مراتب قائم کر رکھا ہے اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا نظام نہیں چل سکتا، رہا عرابا، خدام اور ملازمین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی ضروریات کا لحاظ تو وہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ دونوں کا علیحدہ علیحدہ محل ہے۔ بے شک غریب کی حسب ضرورت امداد ان پر فرض ہے لیکن سارا فاضل مال حکومت کے حوالہ کر دینا ان پر فرض نہیں۔ برق صاحب نے دونوں کو گڈ مڈ کر دیا اور اس وجہ سے مغالطہ پیدا ہو گیا۔



## غلط فہمی

”ہاں تو ہم عرض کر رہے تھے کہ اقوال رسول اڑھائی سو برس تک کروڑوں زبانوں پر گھومتے رہے۔ کہیں مجبوراً اضافے ہوئے اور کہیں عمداً، کہیں حافظہ سے اتر گئے، اور کہیں انسانی اقوال حضور کی طرف منسوب ہو گئے۔ دراصل اقوال رسول کی تعداد پانچ

سات ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی، لیکن جب امام بخاری کا زمانہ آیا تو ان کی تعداد چودہ لاکھ سے متجاوز ہو چکی تھی۔“ (دو اسلام ص ۱۳)

## ازالہ

اس کا جواب کئی مرتبہ گزر چکا ہے لیکن کیونکہ برق صاحب اسے بار بار دہرا رہے ہیں، تو ہم بھی پھر عرض کرتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے کہ اقوال رسول اڑھائی سو برس تک صرف کروڑوں زبانوں پر گھومتے رہے، نہیں بلکہ سینوں اور سفینوں میں محفوظ رہے۔ کیا امام مالک کی موطاء، امام شافعی کی کتاب الام، امام عبدالرزاق کی مصنف، امام احمد کی مسند وغیرہ وغیرہ۔ اڑھائی سو سال بعد کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، نہیں ہرگز نہیں، عہد رسالت سے لے کر امام بخاری کے عہد تک تدوین حدیث کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ہر زمانہ میں کتابیں لکھی گئیں، پہلی صدی کی تمام تصنیفات دوسری صدی کی تصنیفات میں سموی گئیں اور ان دوسری صدی کی تصنیفات سے منتخب کردہ اسناد کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کر دیا، پھر امام بخاری کی یہ تصنیف بھی اڑھائی سو سال بعد کی تصنیف نہیں ہے۔ امام بخاری کا انتقال ۲۵۶ھ میں ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ۲۴۶ سال بعد۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ صحیح بخاری دوسو پچاس سال بعد تصنیف ہوئی ہو۔ امام بخاری کی زندگی میں یہ کتاب ان سے لاکھوں طلباء نے نقل کی۔ امام بخاری کی پیدائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ۱۸۴ سال بعد ہوئی۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں انہوں نے صحیح بخاری کو تصنیف کیا۔ لہذا صحیح بخاری کی تصنیف کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تقریباً ۱۸۴ + ۲۰۴ = ۳۸۸ سال بعد قرار پاتا ہے۔ ۲۰۴ کو ۲۵۰ بنا دینا تحقیق کے یکسر منافی ہے۔

برق صاحب یہ بالکل صحیح ہے کہ اقوال رسول کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ صحیح احادیث کی تعداد ہزاروں ہی میں ہے یہ چودہ لاکھ جو برق صاحب نے نقل کی ہیں یہ احادیث نہیں ہیں بلکہ ان چند ہزار صحیح احادیث کی اسناد ہیں اور کیونکہ ہر سند کو ایک حدیث کا نام دے دیا گیا ہے لہذا غلط فہمی پیدا ہو گئی۔

برق صاحب فرماتے ہیں کہ اڑھائی سو سال تک اقوال رسول کروڑوں زبانوں پر گھومتے رہے اگر یہ صحیح ہے تو پھر احادیث کے متواتر ہونے میں کیا شبہ رہا اور متواتر کی صحت میں شبہ نہیں ہوتا، لہذا امام بخاری نے اگر ان متواتر غیر مشتبہ صحیح احادیث کو جمع کر دیا تو اعتراض کیا ہے۔ گویا برق صاحب کی اپنی عبارت سے احادیث متواتر ہونے کی وجہ سے محفوظ تھیں۔ اور انہیں محفوظ احادیث کو ضبط تحریر میں



لاکر قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا۔ فلنذہم۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

## غلط فہمی

”قرآن کا اسلام بڑا مشکل اسلام ہے۔ یہاں جان و مال کی قربانی کرنا پڑتی ہے“ (دو اسلام ص ۱۳)

قرآن کا اسلام تو ”بڑا آسان اسلام“ ہے مشکل تو اس کو ان قیود نے بنا دیا ہے جو احادیث میں مذکور ہیں۔ ورنہ

## ازالہ

۱۔ دعا مانگ لو صلوٰۃ ادا ہو گئی۔  
۲۔ پاکیزگی اختیار کر لو زکوٰۃ ادا ہو گئی۔

۳۔ صلوٰۃ میں ریاخ خارج ہو جائے۔ وضو سلامت رہے۔

۴۔ ناپچ ورنگ کی محفلیں قائم کرو۔ کوئی ممانعت نہیں۔

۵۔ فنون لطیفہ سے دلچسپی لو کوئی حرج نہیں۔  
۶۔ تماش و شطرنج سے لطف اٹھاؤ، کوئی مضائقہ نہیں

۷۔ قحبہ خانہ کھولو کوئی ممانعت نہیں ہاں کسی عورت کو زبردستی قحبہ خانہ میں مت بٹھاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔

راجا جان و مال کی قربانی کا مسئلہ تو یہ احادیث میں بھی موجود ہے ”شمشیر کے سایہ میں جنت“

کا جو محاورہ برق صاحب نے ص ۱۳ پر استعمال کیا ہے وہ حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔

برق صاحب نے ص ۱۳ سے ص ۱۶ تک کچھ گھڑی ہوئی احادیث قلم بند فرمائی

## غلط فہمی

میں اور ان احادیث کے گھڑنے کا الزام ملتا پر لگایا ہے۔

برق صاحب نے تمہید ہی میں ”مُلّا“ کی تعریف کر دی ہے اور ہم نے بھی اس اصطلاحی

## ازالہ

تعریف کو تسلیم کر لیا ہے (ملاحظہ ہو تمہید کتاب ہذا) اس تعریف کو مد نظر رکھتے ہوئے

ہم اتفاق کرتے ہیں کہ بے شک یہ احادیث ”مُلّا“ نے گھڑیں ”فلعنہ اللہ علی الکاذبین“ لیکن یہ بتائیے

کس عالم نے انہیں تسلیم کیا۔ محدثین نے ہمیشہ ان کو جھوٹی سمجھا اور موضوعات کی کتابوں میں ان کو

جمع کر کے ہمیشہ کے لئے ائمہ مسلمہ کو خبردار کر دیا۔ برق صاحب نے انہیں کتب موضوعات سے ان

موضوع احادیث کو نقل فرمایا تو بتائیے اس میں قصور کس کا ہے؟ ملّا کا یا ائمہ حدیث کا؟ جس ملّا کو آپ

ملزم ٹھہرا رہے ہیں۔ صدیوں پہلے ائمہ حدیث نے اس کو ملزم ٹھہرایا تھا، آپ نے انہیں کے قول کو دہرا

دیا ہے اور بس۔

## انتباہ

ائمہ حدیث کا عقیدہ ہے کہ ”قرآن غیر مخلوق ہے“ ان کی تائید میں کسی ملّا نے حدیثیں بھی گھڑ

دیں کہ ”قرآن غیر مخلوق ہے“ (ان احادیث کو برق صاحب نے بھی ص ۱۲ پر نقل کیا ہے) لیکن محدثین کی



دیانت داری کی وارد کیجیے کہ اپنی تائید میں احادیث انہیں ملتی ہیں تو بجائے خوش ہونے کے اعلان کرتے ہیں کہ یہ احادیث گھڑی ہوئی ہیں۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو بطور ہتھیار کے ان احادیث کو استعمال کر سکتے تھے اور خلیفہ موقت کے سامنے پیش کر کے بحث کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، صحیح احادیث میں گھڑی ہوئی احادیث کی آمیزش اس نازک زمانے میں بھی نہیں ہونے دی۔ تو کیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ حالات امن و امان میں انہوں نے اس آمیزش کو قبول کر لیا ہوگا۔ نہیں ہرگز نہیں، صحیح احادیث کا دامن تحریف سے بالکل پاک ہے۔ یہی نہیں بلکہ محدثین نے ان متام احادیث کو بھی جن میں ان کی اپنی فضیلت تھی اور جن کو برق صاحب نے ص ۱۳۸ تا ص ۱۵۵ پر نقل کیا ہے جھوٹی قرار دیا۔

## انتباہ

”حلو“ کے عنوان کے ماتحت برق صاحب نے چند احادیث نقل فرمائی ہیں۔ بے شک وہ

سب احادیث جھوٹی ہیں سوائے مندرجہ ذیل حدیث کے۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
مُحِبُّ الْحُلَاءِ وَالْحَصَلَ (صمیم بخاری) پسند تھا۔

معلوم نہیں برق صاحب کو اس حدیث میں کیا قباحت نظر آئی کہ گھڑی ہوئی احادیث کے ساتھ اسے شامل کر دیا اور پھر مزایہ کہ جہاں گھڑی ہوئی احادیث کے متعلق وہ ائمہ حدیث کی تصریح نقل کرتے ہیں کہ فلاں فلاں حدیث گھڑی ہوئی ہے اس حدیث کے متعلق ایسی کوئی تصریح بھی نقل نہیں فرمائی اور نقل فرماتے بھی کیسے اس لئے کہ یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

سوال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ تم صحیح و غلط کی الجھن میں کیوں پڑتے ہو جو  
حدیث قرآن کے مطابق ہو وہ لے لو، اور باقی سب کو مسترد کر دو

**غلط فہمی**

جواب: اس سوال کے کئی جواب ہیں اول جو حدیث قرآن کے مخالف ہے وہ بطریقہ کے ناں مردود ہے اور جو قرآن کے موافق ہے اس کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لئے کہ

قرآن کافی ہے (دو اسلام ص ۱۵۸)

ایسی کوئی حدیث نہیں جو صحیح ہو اور قرآن مجید کے خلاف ہو لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ جو شخص

**ازالہ**

اپنی رائے سے قرآن مجید کے ایسے معنی کرے جو صحیح حدیث کے مخالف ہوں تو ایسے معنی

مردود ہوں گے نہ کہ حدیث، مثلاً ایک صاحب نے ”صلوٰۃ“ کے معنی پر یڈ کئے ہیں اور دوسرے نے نظام ربوبیت، یہ دونوں معنی صحیح حدیث کے خلاف ہیں لہذا مردود ہیں۔



ایک بات یہ بھی یاد رکھیے کہ قرآن مجید کے خلاف ہونا اور بات ہے۔ اور قرآن مجید کی شارح ہونا اور بات ہے، یہ تو کسی حد تک صحیح ہے کہ موافق کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تشریح و توضیح کی بھی ضرورت نہیں۔ تشریح کی بے شک ضرورت ہے، اور بغیر تشریح کے قرآن مجید پر عمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے:-

۱۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ  
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ  
فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔  
اور اے رسول! جہاں کہیں آپ جا رہے ہوں  
اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیا کریں۔ اور اے  
مومنو! جہاں کہیں تم ہو اپنا منہ مسجد حرام کی  
طرف پھیر لیا کرو۔ (البقرہ: ۱۵۰)

کیا قرآن مجید میں کہیں تشریح ہے کہ مسجد حرام کی طرف منہ کس وقت کیا جائے قرآن مجید سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ چلتے پھرتے اور بحالت سکون و اقامت غرض ہر حالت میں منہ قبلہ کی طرف رہنا چاہیے۔ کیا اس گتھی کو قرآن مجید سے سلجھایا جاسکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پیشاب پاخانہ کرتے وقت منہ قبلہ کی طرف مت کیا کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) کیونکہ قرآن مجید سے ہر حالت میں قبلہ کی طرف منہ کرنا لازمی ثابت ہوتا ہے تو کیا یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے؟ ہرگز نہیں۔ ظاہر بینی سے اس قسم کی غلط فہمی ہو سکتی ہیں۔

۲۔ فَأَيُّمَا تَوَلَّوْا فَلْتَمَّ وَجْهُ  
اللَّهِ (البقرہ: ۱۱۵)  
تم جس طرف منہ کرو اسی طرف اللہ تعالیٰ  
کا منہ ہے۔

پہلی آیت سے قبلہ کی طرف منہ کرنا لازمی ہوا اور اس آیت نے اس فرضیت کو ساقط کر دیا۔ کیا قرآن مجید سے آپ بتا سکتے ہیں کہ ان دونوں پر عمل کرنے کی کیا صورت ہے؟ بلکہ قرآن مجید تو اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتا ہے:-

۳۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ  
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ  
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ (البقرہ: ۱۷۷)  
مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنا یہ کوئی نیکی نہیں  
بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے  
وغیرہ وغیرہ۔

اب ان تینوں آیات کا مطلب کوئی کیا سمجھے۔ جب تک معلم کتاب و حکمت نہ سمجھائے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:-

۴۔ وَالَّذِينَ يَتُوفُونَ مِنْكُمْ يَذَرُونِ  
أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِمْ أَرْبَعَةَ  
أَشْهُرٍ وَعَشْرًا۔ (البقرہ: ۲۳۲)  
جو مرد تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں  
تو ان کی بیویوں کو چار مہینے اور دس  
عدتیں، بیٹھنا چاہیے۔



کیا آپ قرآن مجید سے بتا سکیں گے کہ یہ دس کیا ہیں؟ سال یا مہینے، ہفتے یا دن؟ گھڑیاں یا گھنٹے؟ بس یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وضاحت کے لئے حدیث کی ضرورت ہے (تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ ہو)۔  
**غلط فہمی** (دوا سلام ص ۱۵۸)

**ازالہ** نہ ہماری تجویز یہ ہے اور نہ ہم وضعی حدیث پر کسی تجویز کی بنیاد رکھ سکتے ہیں، ہمارے ہاں تو ایسی کسی حدیث کا ذکر ہی نہیں جو قرآن مجید کے خلاف ہونے کی وجہ سے مسترد کر دی گئی ہو۔ اور جو حدیثیں قرآن مجید کے خلاف ظاہر ہوئیں وہ صحت کے درجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی زائل ثابت ہوئیں۔ ہماری تجویز تو یہ ہے کہ قرآن مجید کے معنی وہ کر جو صحیح حدیث میں ہوں۔ نہ کہ اپنی رائے سے ایسے معنی گھڑ لو جو صحیح حدیث کے خلاف ہوں۔ صحیح حدیث تو قرآن مجید کے معنی کو مستقیم کرتی ہے اگر یہ نہ ہو تو قرآن مجید ”شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ما“ کا مصداق بن جائے گا۔

**غلط فہمی** مطلب یہ کہ اگر کوئی رتن سنگھ یہ کہہ دے کہ دواوردو چار بنتے ہیں اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دے تو قبول کر لو۔ اس لئے کہ یہ قول خلاف حقیقت نہیں۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تجویز بری نہیں۔ لیکن اس راہ میں بھی بڑی مشکلات ہیں اس لئے کہ بعض ایسی احادیث بھی جو تعلیم قرآن کے عین مطابق اور حدیث کی اہم کتابوں میں شامل ہیں محققین کے ہاں جعلی ہیں (دوا سلام ص ۱۵۹)

**ازالہ** برق صاحب محدثین یہ نہیں دیکھتے کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے وہ حقیقتہً ”صحیح“ ہے یا غلط۔ بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ بات حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح منسوب ہے یا نہیں، کیا وہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے ہیں یا نہیں؟ یہاں سائنس یا ریاضی کے مسلمہ اصول کی تالیف مقصود نہیں ہوتی، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال، آپ کا طور و طریق، طرز گفتگو، طرز اداء، اسوۂ حیات مقصود ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ حدیث گھڑ دے کہ پانی، ٹائیڈر و جن اور آکسیجن کا مرکب ہے تو یہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ فی الواقع یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ فی الواقع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے یا نہیں۔؟ پانی کے آکسیجن اور ٹائیڈر و جن کا مرکب ہونے سے یہ بات لازم نہیں آئے گی کہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی فرمایا تھا کیا آپ اس بات کو قبول کر لیں گے کہ یہ جملہ ”دواوردو چار ہوتے ہیں“ قرآن مجید کے متن میں شامل کر دیا جائے کیونکہ یہ خلاف حقیقت نہیں۔ لہذا اسے قرآن مجید کی حیثیت سے قبول کرنے میں کیا امر مانع ہے؟ بقول آپ کے یہ تجویز بری نہیں تو پھر قرآن مجید کے لئے بھی اس کو برا نہ ہونا چاہیے۔ رہا یہ کہ بعض احادیث تعلیم قرآن کے عین مطابق ہیں، لیکن پھر بھی جعلی ہیں تو مکرر عرض ہے



کہ کسی حدیث کا مضمون صحیح ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ فی الواقع وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی حدیث ہے، اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو پھر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ طبیعیات، کیمیا، حیاتیات ریاضی وغیرہ علوم و فنون کے تمام مسلمات و حقائق حدیث ہیں اس لئے کہ وہ صحیح ہیں۔ برق صاحب جہاں حدیث کو تحریف سے بچانا مقصود تھا، یہ بھی مقصود رہا کہ صحیح اور ثابت مضمون کے لئے بھی وہی لفظ محفوظ کئے جائیں جو صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے۔ آپ نے جو احادیث ص ۱۵۹-۱۶۰ پر نقل فرمائی ہیں، اگرچہ مضمون کے لحاظ سے صحیح سہی، لیکن الفاظ کے لحاظ سے صحیح نہیں، اس لئے کہ یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔ یہاں ایک بات اور بھی ثابت ہوئی کہ محدثین نے صرف مضمون کی حفاظت نہیں کی، بلکہ الفاظ حدیث کی بھی حفاظت کی اور اسی وجہ سے ان الفاظ سے وارد شدہ احادیث کو گھڑی ہوئی قرار دیا۔ محدثین کا یہ کارنامہ ہمارے لئے باعث صد افتخار ہے اور اس پر ہم نازاں ہیں فلہذا الحمد، یہاں ایک بات اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ برق صاحب نے مذکورہ بالا صفحات پر جو جعلی حدیثیں نقل فرمائی ہیں وہ ان الفاظ سے حدیث کی کسی اہم کتاب میں شامل نہیں ہیں۔

برق صاحب لکھتے ہیں:-

**غلط فہمی**

”حدیث طلب العلم فریضة علی کل مسلم... کو ابن راپور“

سناوی، ابوعلی، نیشاپوری اور بیہقی نے موضوع قرار دیا ہے (دو اسلام ص ۱۶)

برق صاحب نے تذکرۃ الموضوعات کا حوالہ دیا ہے اور اس کتاب سے نقل کرنے میں ان سے غلطی ہوئی ہے ان چاروں اماموں میں سے کسی نے بھی اسے موضوع نہیں کہا

**ازالہ**

امام سناوی کے الفاظ یہ ہیں:-

رَوَى عَنْ أَنَسٍ بِطَوَقٍ كُلِّهَا  
مَعْلُولَةٌ وَ أَهْيَةٌ  
یہ روایت حضرت انسؓ سے بہت سی سندوں سے مروی ہے جن میں ہر ایک معلول و کمزور ہے۔

مطلب یہ کہ کوئی سند درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں:-

لَا يَثْبُتُ فِي هَذَا الْبَابِ شَيْءٌ  
اس باب میں کوئی سند ثابت نہیں۔

آگے لکھتے ہیں:-

وَهَذَا قَالَ ابْنُ رَافٍ وَ ابْنُ أَبِي عَرَبٍ  
النَّيْسَابُورِيُّ  
یہی ابن راہویہ اور ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے۔

یعنی ان تینوں میں سے کسی نے اس کو موضوع قرار نہیں دیا، نہ اس کے واضح کا نام بتایا، نہ اتنا بتایا کہ ہر سند میں کوئی نہ کوئی صنف ہے۔ کوئی سند محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہوتی۔ اب رہ جاتی ہے محدثین کی ایک اصطلاح جو وہ ہے ”حسن لغیرہ“، یعنی جب سندیں زیادہ ہوں، راوی کذاب نہ ہوں تو پھر



محض حافظہ کی وجہ سے جو شبہ ہے وہ زائل ہو جائے گا اور سند کے لحاظ سے نہیں بلکہ قرائن کے لحاظ سے وہ حدیث ثابت ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی محدث نے اسے موضوع نہیں کہا۔ برق صاحب نے امام بیہقی کی طرف جو اس کا موضوع قرار دینا منسوب کیا ہے، وہ بھی صحیح نہیں، امام بیہقی فرماتے ہیں:-

مَنْ مَشْهُورٌ وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ وَ  
أَبُو عَاتِكَةَ مِنْ رِجَالِ التَّمِيزِ  
لَمْ يَجْعَلْ بِكَذِبٍ وَلَا تَهْمَةً وَقَدْ  
وَحَدَّثَ لَهُ مُتَابِعًا عَنْ أَنَسٍ وَ  
نُصْفُهُ الثَّانِي لِابْنِ مَاجَةَ وَلَهُ  
طُرُقٌ كَثِيرَةٌ عَنْ أَنَسٍ يَصِلُ  
مَجْمُوعُهَا هَرَبَةً الْحَسَنِ -  
رتذکرۃ الموضوعات ص ۱۸۰

یعنی یہ متن مشہور ہے اسناد اس کی ضعیف ہے ابو عاتکہ ترمذی کے رجال میں سے ہے کسی نے اس پر اس قسم کی جرح نہیں کی کہ وہ جھوٹ بولتا ہے نہ کسی نے اس پر جھوٹ کی ہمت لگائی پھر اس کے کئی متابع ہیں جو اس کو حضرت انس سے روایت کرتے ہیں اور آخری حصہ (یعنی طلب العلم فریضہ ملی کل مسلم) ابن ماجہ میں موجود ہے اور حضرت انس سے کثیر تعداد میں اس کے طرق ہیں جن کا مجموعہ اس کو حسن بنا دیتا ہے۔

یہ ہے امام بیہقی کا بیان! انہوں نے کہاں کہا، کہ یہ موضوع ہے؟

ائمہ فن کی تصانیف میں اس طرح کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ حدیث کا مضمون درست، تعلیم قرآن کے عین مطابق، اور پھر بھی غلط۔ اب ذرا یہ احادیث کو

**غلط فہمی**

جانچنے کے لئے پیمانہ کہاں سے لائیں؟ (ص ۱۶۱)

اس کے متعلق اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مضمون صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی الواقع وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ محدثین نے معانی کے ساتھ الفاظ کی بھی حفاظت کی۔ لہذا اب یہ کہنا کہ پیمانہ کہاں سے لائیں کس قدر عجیب ہے۔ ہر وہ بات جو فی الحقیقت صحیح ہو، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوئی چاہیے کیا یہ بھی کوئی پیمانہ ہے؟ عمدہ عمدہ اقوال گھڑو اور کہہ دو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ آپ اس جھوٹ کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن محدثین نے اس کے پر خچے اڑا کر رکھ دیے ہیں اور کسی بات کو بھی خواہ وہ کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور محض اجازت ہی نہیں دی بلکہ منسوب کرنے والے کو کذاب کہہ کر پھر اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کیا۔ اس طرح متن حدیث کو بالکل خالص طریقہ سے محفوظ رکھا۔ اگر عمدہ عمدہ اقوال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی اجازت دے دی جاتی یا اس سلسلہ میں ذرا سی بھی مداخلت برتی جاتی تو پھر وہ کون سی بدعت حسنة ہے جس کی پشت پر سنت کی سند نہ ہوتی۔ کونسی

**ازالہ**



عمدہ رستم ہے جو دین میں داخل کر کے جزو دین نہ بنا دی گئی ہوتی۔ ان بدعات کا وہ کوہِ گراں ہمارے سر پہ ہوتا کہ۔ **الْأَمَانُ وَالْحَفِیْظُ**۔ اس کے نیچے دبے ہوئے اصل دین کا معلوم کرنا قطعاً ناممکن ہوتا، یہ محدثین ہی کا کارنامہ ہے کہ اصلی دین محفوظ ہے اور بعد والوں کی آمیزش اور اضافہ سے اس کو پاک کر دیا گیا ہے۔

برق صاحب! پیمانہ کا سوال کرنا آپ جیسے شخص کی طرف سے عجیب معلوم ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہم سے کہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان پر پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے۔ تو کیا ہم اس کو تسلیم کریں یا نہیں؟ اگر تسلیم نہیں کریں تو پھر تین صورتیں ہوں گی۔

## پہلی صورت

ہم یہ کہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا فرمایا تو ہے لیکن ہم نہیں مانتے اس لئے کہ قرآن مجید میں پانچ وقت کی تصریح نہیں اور ہم کو صرف قرآن مجید پر ایمان لانے کا حکم ملا ہے نہ کہ حدیث پر“۔ اب بتائیے کہ ایسا کہنے کے بعد ایمان بالرسول باقی رہے گا اور اگر باقی رہے گا تو سوال پیدا ہوگا کہ وہ شخص جو اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتا ہے رسول بھی ہو سکتا ہے اور کیا اس کی لائی ہوئی کتاب صحیح ہو سکتی ہے، اگر وہ جھوٹ بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر سکتا ہے تو کیا یہ شبہ نہیں کہ اس نے یہ بھی جھوٹ بولا ہو کہ یہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اگر باوجود اس کے جھوٹ بولنے اور اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے کے قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ہی کتاب ہے تو پھر یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پہنچانے کے لئے ایسا آدمی منتخب کیا ہے جو جھوٹ بولتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتا ہے۔ کیا حدیث کا انکار تکذیب رسول اور تکذیب قرآن مجید نہیں ہے؟

## دوسری صورت

اگر ہم یہ کہیں ”اے ابو بکر، آپ غلط بیانی کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا اور آپ قرآن مجید سے زائد کچھ فرمایا نہیں سکتے“ تو کیا اس صورت میں یہ لازم نہیں آئیگا کہ ہم ایک صادق کو کاذب سمجھ رہے ہیں اور محض اپنے مفروضہ عقیدہ کی خاطر ایک صادق القول کی بات کو تسلیم نہیں کرتے اگر یہ بات ہرٹ دھری نہیں تو ہرٹ دھری پھر کس کا نام ہے؟

## تیسری صورت

مذکورہ بالا دونوں باتیں تو یقیناً ہم نہیں کہہ سکتے اب رہ جاتی ہے تیسری صورت اور وہ یہ کہ ہم کہیں



”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا ہوگا بلکہ آپ کا مطلب کچھ اور ہوگا، اے ابو بکر! آپ کو غلط فہمی ہو گئی، ویسے ہم آپ کو جھوٹا تو نہیں کہتے لیکن بہر حال آپ انسان ہیں اور انسان سے غلطی یا غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے لہذا ہم اس شبہ کی بنا پر آپ کی بیان کردہ بات کو حدیث رسول تسلیم نہیں کرتے“ اس صورت میں ہمیں اپنے متعلق یہ یقین کر لینا چاہیے کہ ہم ضرورت سے زیادہ دہی ہیں یا علم و فن میں ہم چنیں دیگے نیست کامصدق ہیں کہ کسی کی بات نہیں مانتے۔ خواہ وہ غلط سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن ہم اسے اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ ہماری عقل و سمجھ کے خلاف ہے اور کیونکہ وہ ہماری عقل و فہم کے خلاف ہے لہذا بیان کرنے والا ضرور غلط سمجھا ہے یہ ایمان کی علامت نہیں، ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ تیسری بات بھی ہم علم و فہم، حفظ و اتقان، صدق و دیانت والے لوگوں کے متعلق نہیں کہہ سکتے بلکہ صادق، حافظ، ضابط، علیم و فہیم شخص کی بات کو تسلیم کرنے میں ہم کو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے خصوصاً ایسی صورت میں کہ ایسے بیان کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ میں دو دو، تین تین، چار چار، دس دس، بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو۔

## خلاصہ

لہذا اب حدیث کو پرکھنے کا معیار خود بخود نکل آیا کہ جو حدیث بھی صادق، حافظ، ضابط، علیم و فہیم شخص یا اشخاص کے ذریعہ ہم تک پہنچے وہ صحیح ہوگی خواہ ہماری نگاہ میں وہ بظاہر قرآن مجید سے ٹکرائے یا ہماری عقل سے ٹکرائے۔ ہم اپنی عقل اور فہم کو قصور وار ٹھہرا سکتے ہیں نہ کہ صادق القول، حافظ و ضابط اشخاص کو۔



# باب

## موطا پر ایک نظر

**غلط فہمی** | اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ امام مالک کا کردار تقدس اور خلوص تمام شبہات سے ورادہ تر تھا اور کہ انہوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرنے کے لئے تمام انسانی ذرائع استعمال کئے ہوں گے۔ لیکن پونے دو سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھیں اس ذخیرے میں سے قول رسول تلاش کرنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ (دو اسلام ص ۱۶۲)

**ازالہ** | امام مالک کی ولادت ۳۱ھ میں ہوئی اور یہی سنہ پیدائش برق صاحب نے بھی ص ۱۶۲ پر نقل فرمایا ہے گویا امام مالکؒ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے صرف ۸۳ سال بعد پیدا ہوئے۔ تقریباً سترہ سال کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ گویا موطا کی تصنیف کے وقت صرف سو سال گزرے تھے، نہ کہ پونے دو سو برس۔

برق صاحب کا فرمانا کہ ”احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھیں“ کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ امام مالکؒ اور صحابی کے درمیان ان کی اکثر روایتوں میں صرف ایک ہی راوی ہوتا ہے مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایتوں میں صرف امام نافعؒ ہوتے ہیں۔ نافع ایک بہت بڑے عالم اور حضرت ابن عمرؓ کے بہت ہی قابل شاگرد تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی تمام مرویات امام نافع کو لکھوا دیں اور ان سے امام مالک نے نقل کر لیں۔ لہذا ان روایات کو بگڑنے کا کوئی موقع ملا یہی حال دوسری مرویات کا بھی ہے۔ مثلاً امام مالک کے دوسرے بہت بڑے استاد امام محمد بن مسلم زہری ہیں ان کی پیدائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے ۴۰ سال بعد ہوئی۔ امام زہریؒ نے



صحابہ کرام سے احادیث کو حاصل کیا اور یہ سرمایہ احادیث امام مالک کو پہنچا دیا۔  
 اسی طرح دیگر تابعین ائمہ حدیث نے حدیث کو صحابہ کرام سے براہ راست حاصل کیا، اور یہی وہ  
 محفوظ و مکتوب سرمایہ حدیث تھا، جو امام مالک کو ملا، اور اس سرمایہ کو امام مالک کے شاگردان عظام  
 سے امام بخاری نے نقل فرمایا، لہذا بڑھنے اور بگڑنے کا سوال صرف وہم ہی وہم ہے، اور بس۔  
 برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**غلط فہمی** ”ہم موطا کی تعظیم ضرور کرتے ہیں، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے، کہ اس کے  
 مندرجات واقعی اقوال رسول ہیں، اور خصوصاً ان حالات میں کہ اس کی بعض روایات محل  
 نظر ہیں، مثلاً موطا میں درج ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے  
 وضو ضروری ہے، اور اِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ کی تفسیر ای من المضاجع دی ہوئی ہے۔  
 لیکن صحیح بخاری (کتاب الوضوء) میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے  
 یہ حدیث دی ہوئی ہے، کہ رسول اللہ رات کو جاگے، صلوٰۃ تہجد ادا کی ....  
 پھر بستر پر دراز ہو گئے، پھر سو گئے، یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی، اس کے بعد  
 نماز کے لئے بلانے والا آیا، آپ اٹھ کر اس کے ساتھ چلے گئے، اور وضو کئے بغیر نماز  
 پڑھ لی“ (دوا سلام ص ۱۶۲، ص ۱۶۳)

**ازالہ** موطا کی جو روایت برق صاحب نے نقل کی ہے، وہ حدیث نہیں ہے، بلکہ حضرت زید بن  
 اسلم تابعی کا قول ہے، لہذا قول تابعی اور حدیث رسول کو تعارض کی مثال میں پیش کرنا صحیح نہیں  
 ہے اور نہ اس سے موطا پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے، کسی شخص کا قول خواہ وہ صحیح ہو یا غلط نقل کر دینا  
 کتاب کے لئے موجب نقص نہیں ہوتا، ہاں یہ واضح رہے کہ زید بن اسلم کا قول غلط نہیں ہے، اور نہ وہ  
 صحیح بخاری کی حدیث کے متعارض ہے، محض سونا ناقض وضو نہیں، ریاخ کے خارج ہونے سے وضو  
 ٹوٹ جاتا ہے۔ اور چونکہ بستر پر لیٹ کر سونے سے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں، اور ریاخ خارج ہونے کا  
 قوی احتمال ہوتا ہے لہذا جب سو کر اٹھے تو وضو کرنا چاہیئے۔ یہ ہے زید بن اسلم کے قول کا مطلب، اور  
 یہ مندرجہ ذیل حدیثوں کے بالکل مطابق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

(۱) اِنَّ الْعَيْنَ وَكَأَمَّ السَّرْفِ مَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ  
 (رواہ احمد و ابوداؤد و سندہ حسن بلوغ جز ۱ ص ۳۳)

(۲) لَيْسَ عَلَى مَنْ نَامَ سَاجِدًا وَضُوءٌ حَتَّى  
 يَنْطَلِعَ فَإِنَّهُ إِذَا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَشَ  
 مَفَاصِلُهُ (رواہ احمد و سندہ حسن بلوغ الامانی)

جو سجدہ میں سو جائے اس پر وضو لازم نہیں جب  
 تک لیٹ کر نہ سوئے، کیونکہ جب لیٹ کر سو جائے  
 تو جوڑ ڈھیلے ہو جائیں گے۔



لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ مخصوص تھا۔ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں دل نہیں سوتا تھا، فرشتوں کا مندرجہ ذیل مقولہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔  
 إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبُ يَقْظَانُ  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ سوتی ہے۔  
 اصحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة) دل جاگتا رہتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند میں اتنے غافل نہیں ہوتے تھے کہ آپ کو خبر ہی نہ ہو کہ ریاخ خارج ہوا ہے یا نہیں، پس اس یقین کی بنا پر آپ سو کر اٹھتے تو بغیر تازہ وضو کئے نماز پڑھ لیتے تھے، لہذا زید بن اسلم کے قول میں اور صحیح بخاری کی حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اگر برق صاحب تحقیق کر لیتے تو یہ الجھن پیدا نہ ہوتی، خود امام مالک نے اپنی موطا میں مندرجہ ذیل حدیث نقل کر کے اس الجھن کو دور کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

قَالَتْ عَائِشَةُ نَقَلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ  
 اتَنَا مَرَّةً قَبْلَ أَنْ تُتَوَقَّعَ يَا عَائِشَةُ  
 إِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي  
 (موطا ص ۴۲)  
 حضرت عائشہ کہتی ہیں، میں نے کہا، اے اللہ کے رسول آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ بیشک میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں، لیکن میرا دل نہیں سوتا۔

**غلط فہمی** ”چند اور احادیث ملاحظہ ہوں۔

مَنْ قَبْلَ امْرَأَةٍ أَوْ جَسَدًا بِيَدِهِ  
 فَعَلِيهِ الْوَضوءُ (موطا ص ۳۳)  
 لیکن اسی صفحہ پر یہ حدیث بھی موجود ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ قَبْلَ بَعْضِ  
 نِسَائِهِ ثُمَّ خَدَجَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ  
 يَتَوَضَّأْ۔  
 حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج میں سے کسی کے بوسے لئے اور پھر وضو کئے بغیر نماز ادا فرمائی۔

حضور کا حکم وہ، اور عمل یہ۔ کس کی اقتدا کریں؟ (دوا سلام ص ۴۶۳)

**انزالہ** موطا کی جس روایت کو برق صاحب حدیث سمجھ رہے ہیں، وہ حدیث نہیں ہے، بلکہ ایک صحابی کا قول ہے، برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی کہ اسے حدیث سمجھ لیا، لہذا برق صاحب کا یہ سوال صحیح نہیں کہ ”حضور کا حکم وہ عمل یہ، کس کی اقتدا کریں؟ حدیث صرف دوسری ہے، اور اسی پر عمل کرنا چاہیے۔“

**غلط فہمی** صحیح مسلم (جلد اول مع فتح الملہم طبع مجتہبی ص ۴۸۵) میں درج ہے..... ابی بن کعب



کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے شخص کے متعلق فتویٰ پوچھا کہ جو اپنی بیوی کے پاس بغرض مجامعت گیا، کام شروع کیا، لیکن انزال سے پہلے ہی اس کی شہوت ختم ہو گئی، فرمایا، وہ تمام نجاستوں کو دھو لے، اور پھر وضو کر کے نماز پڑھ لے..... اسی مسئلہ پر اب موطا کا فیصلہ سنئے..... عبدالرحمن بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کس صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے کہا جب آئہ تناسل کا سرعورت کی شرمگاہ کے ابتدائی حصہ میں داخل ہو جائے، تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ (دوا سلام)

جن احادیث کا ترجمہ برق صاحب نے نقل کیا ہے، ان احادیث کا متن بہت ہی مخفی، **ازالہ** اور حیا دار الفاظ کا مجموعہ ہے، معلوم نہیں برق صاحب نے اتنا عریاں ترجمہ کیوں کیا، خیر۔ برق صاحب نے صحیح مسلم اور موطا میں تضاد سمجھا، ان کے خیال میں صحیح مسلم سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں غسل واجب نہیں، اور موطا سے ثابت ہوتا ہے، غسل فرض ہے، چونکہ برق صاحب نے اس باب میں موطا پر اعتراض کئے ہیں، اور اس کی بعض احادیث کو محل نظر سمجھا ہے، لہذا ہمارا گمان ہے کہ برق صاحب کے خیال میں ایسی حالت میں غسل واجب نہیں، بلکہ ان کی بیان کردہ صحیح مسلم کی حدیث پر عمل ہونا چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ برق صاحب کو یہاں بھی غلط فہمی ہو گئی، حالانکہ جو کچھ موطا میں ہے وہی صحیح مسلم میں بھی موجود ہے، امام مسلم کی اپنی صحیح میں پہلے یہ باب ہے۔

باب انما الماء من الماء

اور اسی عنوان کے ماتحت وہ حدیث ہے، جو برق صاحب نے نقل کی ہے، پھر اس باب

کے بعد دوسرا باب ہے۔

باب نسخ الماء من الماء

وجوب الغسل بالتقاء

المختانین

برق صاحب نے شاید اگلا باب نہیں دیکھا، اس باب میں امام مسلم نے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، ان میں سے ایک حضرت عائشہؓ کی حدیث بھی ہے، غرض کہ حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث موطا میں بھی ہے اور صحیح مسلم میں بھی، لہذا دونوں کتابوں میں کوئی تعارض نہیں اور نہ موطا کی حدیث محل نظر ہے، برق صاحب نے ایک کتاب سے نسخ اور دوسری سے نسخ حدیث دیکھی، اور اس طرح انہیں غلط فہمی ہو گئی۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے، کہ اس زمانہ میں سینکڑوں صحابہ مدینہ میں موجود تھے،

اور عبدالرحمن بن عوف خود بھی فقیہ صحابہ میں شمار ہوتے تھے، اس مضمون پر احادیث

**غلط فہمی**



بھی لوگوں کو یاد ہوں گی، بایں ہمہ انہوں نے یہ کمال کیا، کہ ایک نہایت نازک مسئلہ حضور علیہ السلام کی سب سے کم عمر زوجہ مطہرہ سے جا پوچھا، کیا مدینہ بھر میں اس چھوٹی سی بات کو جاننے والا کوئی مرد موجود نہیں تھا، کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے، اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ ابن عوف یہ غلطی کر بیٹھے تھے تو حضرت عائشہ کو چاہیے تھا کہ ابن عوف کو اس جسارت پر ڈانٹتیں، کہ تم کو حرم نبوی سے ایسا عریاں سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی (دو اسلام ص ۱۶۵)

یہ صحیح ہے کہ سینکڑوں صحابہ مدینہ میں موجود تھے، اور اس مضمون پر احادیث بھی لوگوں کو یاد آ رہی ہیں، مثلاً حضرت ابی بن کعبؓ جن سے صحیح مسلم کی روایت برق صاحب نے اوپر نقل کی ہے فرماتے ہیں۔

إِنَّمَا كَانَتِ الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ رُخْصَةً  
فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ ثُمَّ نَهَى عَنْهَا (رداہ  
الترمذی وغیرہ سندہ صحیح معراجہ ص ۲۹۸)  
مرف انزال کے بعد نہانا یہ رخصت شروع،  
اسلام میں تھی، پھر اس سے روک دیا گیا، اور حکم دیا  
گیا، کہ انزال نہ ہو، تب بھی غسل کریں۔

وفی رواية ثم أمر بالاعتسال (رداہ ابوداؤد ورواہ ثقات، تقریب)  
حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ہی یہ مسئلہ کیوں پوچھا گیا؟ اس کا جواب بھی صحیح مسلم میں موجود ہے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں۔

اِخْتَلَفَ فِي ذَلِكَ رَهْطٌ مِنَ  
الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ فَقَالَ  
الْأَنْصَارِيُّونَ لَا يَجِبُ الْغُسْلُ  
إِلَّا مِنَ الدَّفْقِ أَوْ مِنَ الْمَسَاءِ وَ  
قَالَ الْمُهَاجِرُونَ بَلْ  
إِذَا خَالَطَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ  
قَالَ قَالْنَا أَشْفِيكُمْ  
مِنْ ذَلِكَ فَقُمْتُ فَأَسْتَاذَنْتُ  
عَلَى عَائِشَةَ فَأَذِنَ لِي فَقُلْتُ لَهَا  
يَا أُمَّاهُ أَوْ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ  
أَسْأَلُكَ عَنْ شَيْءٍ وَإِنِّي أَسْتَحْيِيكَ  
فَقَالَ لَا تَسْتَحْيِي أَنْ تَسْأَلَ لِي عَمَّا

وجوب غسل کے سلسلہ میں مہاجرین اور انصار  
کی ایک جماعت میں اختلاف ہوا، انصار نے کہا کہ  
بغیر انزال کے غسل فرض نہیں ہوتا، مہاجرین نے  
کہا غسل فرض ہو جاتا ہے، میں نے کہا، میں اس کا  
تصفیہ کرتا ہوں، میں اٹھا، اور حضرت عائشہ کے پاس  
گیا اور ان سے اجازت چاہی، انہوں نے مجھے  
اجازت دی، میں نے کہا، اے اماں جان، میں آپ  
سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن آپ سے  
پوچھتے ہوئے شرم آتی ہے، حضرت عائشہؓ نے  
فرمایا، شرم و نہیں، جو چیز تم اپنی ماں سے جس  
نے تم کو جنا تھا پوچھ سکتے ہو، وہی مجھ  
سے بھی پوچھ سکتے ہو کیونکہ میں بھی تمہاری



کُنْتُ سَائِلًا عَنْهُ أَمَّا الْبُخَارِيُّ فَلَدَّكَ فَإِنَّمَا  
 أَنَا أَمَّا قُلْتُ فَمَا يُوجِبُ الْغُسْلُ قَالَتْ  
 عَلَى الْخَبِيرِ سَقَطَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ  
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ بَيْنَ شُعْبَيْهَا  
 الْأَرْبَعِ وَمَسَّ الْحِثَّانِ الْخِثَّانَ فَقَدْ  
 وَجِبَ الْغُسْلُ (صحيح مسلم)

ماں ہوں۔ میں نے کہا غسل کب فرض ہوتا  
 ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ تم باخبر کے پاس  
 آئے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
 ہے کہ جب مرد عورت کی چاروں شاخوں کے  
 درمیان بیٹھ جائے، اور ختنہ ختنہ سے مل جائے  
 تو غسل فرض ہو گیا۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اس مسئلہ میں صحابہ کے درمیان اختلاف ہو گیا تھا۔ حضرت ابوسلمہ  
 بن عبد الرحمن بن عوف کو شبہ ہو گیا، لہذا وہ اپنی تسلی کے لئے حضرت عائشہؓ کے پاس تحقیق کرنے چلے گئے  
 اور اپنی ام محترمہ ام المؤمنینؓ سے مسئلہ پوچھ کر چلے آئے۔

الغرض اس اختلاف کے دوران ہی ان دونوں کو اس سوال کے پوچھنے کی جرأت ہوئی، ابوسلمہ بن  
 عبد الرحمن بن عوف نے انفرادی طور پر پوچھا، اور حضرت ابوموسیٰؓ نے صحابہ کرام کے نمائندہ کی حیثیت  
 سے پوچھا، اور ان سب کو مطلع کر دیا۔

برق صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے حضرت عائشہؓ سے سوال  
 انتباہ کیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ سوال کرنے والے حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کے  
 صاحبزادے ابوسلمہ تھے۔

کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت  
 کر سکتا ہے اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ ابن عوفؓ یہ غلطی کر بیٹھے تھے  
 تو حضرت عائشہؓ کو چاہیے تھا کہ ابن عوفؓ کی اس جسارت پر ڈانٹتیں، کہ تم کو حرم نبویؐ سے  
 ایسا عریاں سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی، یا خاموشی اختیار فرما لیتیں، اور اگر خواہ مخواہ  
 کوئی جواب دینا ہی تھا، تو کنایہ واستعارہ سے کام لیتیں "یہ آلہ تناسل کا سر شرمگاہ میں  
 داخل ہونا" ایسے الفاظ ہیں جو ایک جیادار اور شریف خاتون اپنے شوہر کے سامنے بھی  
 منہ سے نہیں نکال سکتی، چہ جائیکہ غیر مردوں کے سامنے (دو اسلام ص ۱۶۵)

یہ تو اوپر بتایا جا چکا ہے، کہ کن حالات میں یہ مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی، بات تو ضرور  
 انزالہ شرم کی تھی لیکن مسئلہ کی تحقیق اس سے زیادہ اہم تھی، سوال جس سے پوچھا گیا، وہ بے شک  
 معزز خاتون ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ ماں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ (الاحزاب: ۶) نبی کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں۔

برق صاحب قرآن مجید کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔



حدیث تعلیم و تعلم کے ذیل میں آتی ہے، پھر الفاظ لگتے پوشیدہ ہیں، کہ عریائیت کا ستابہ بھی اس میں



نہیں پایا جاتا، ترجمہ صرف اتنا ہے، کہ ”جب ختنہ سے ختنہ مل جائے، تو غسل فرض ہو جاتا ہے“ بتائیے کتنا چارہ جملہ ہے، اور پھر مطلب بھی پورا ہو گیا، ختنہ کا لفظ کتنا مشہور اور زبان زد خاص و عام ہے؟ حجام کی دکانوں کے بورڈ پر بھی لکھا ہوتا ہے، نہ اس میں کوئی عریانیت ہے نہ بے شرمی، حضرت عائشہؓ نے تو درحقیقت کنایہ ہی سے مطلب ادا کیا تھا۔ اور انہی الفاظ میں ادا کیا تھا جو الفاظ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے تھے۔ برقی صاحب کتنا اچھا ہوتا اگر آپ عریاں ترجمہ نہ کرتے۔

برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی** چونکہ یہ حدیث ہمارے مشاہدہ، عام تجربہ، عورت کے مسلمہ کیفیات نفسی، اور حضرت

عائشہؓ کے بلند مقام سے متصادم ہو رہی ہے، نیز صحیح مسلم کی دو احادیث اس کی تردید کر رہی ہیں۔ اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ اس قول کو حضرت عائشہؓ کی

طرف منسوب کرنا درست نہیں (دو اسلام ص ۱۶۵)

مذکورہ بالا بحث اور قرآنی آیات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس حدیث میں کوئی بات

**ازالہ** قابل اعتراض نہیں، نہ صحیح مسلم کی احادیث اس کی تردید کرتی ہیں، بلکہ صحیح مسلم کی ناسخ حدیثیں

اس کی تائید کرتی ہیں، جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔

”ملا کہتا ہے، کہ میری حدیث کا ہر لفظ محفوظ رہے، اسلام رہے یا نہ رہے، حضور

**غلط فہمی** کی منزلت زیادہ ہو یا کم، لوگ اسلام پر ہنسیاں یا روئیں، میری بلا سے“ (دو اسلام ص ۱۶۶)

**ازالہ** اس عبارت میں رنگ آمیزی کے سوا اور کچھ نہیں، اگر کسی ملانے ایسا کیا ہو تو ہم بھی اس پر

لعنت بھیجتے ہیں، لیکن کسی عالم دین محدث نے تو ایسا کبھی نہیں کیا، ہر خلاف اسلام موضوع حدیث

کے پرچے اڑا کر رکھ دئے۔ حتیٰ کہ اسلام کی تائید میں جو خوش آئند حدیثیں گھر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

طرف منسوب کر دی گئی تھیں، ان کی غلط نسبت کو بھی واشگاف کر دیا، اور اپنی کامل دیانتداری کا ثبوت

دیا، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ ان صحیح واقعات کو بھی جھٹلا دیتے جن سے بظاہر اسلام پر اعتراض

وارد ہو سکتا تھا، اگر وہ ایسا کرتے، تو پھر یہی رویہ ان کا قرآن مجید کے ساتھ بھی ہونا چاہیے تھا، کیونکہ

قرآن مجید میں بھی ایسی آیات پائی جاتی ہیں جن سے بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منزلت کو بہت

بڑا دھکا لگتا ہے۔ مثلاً

(۱) اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا

تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (الفتم: ۲۴) آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دے۔

اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیات سے مترشح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ

گناہ گار تھے؟



(۲) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ  
تَبَتَّخِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ  
(التحریم - ۱)  
اے نبی آپ ان چیزوں کو کیسے حرام کرتے ہیں  
جن کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کر دیا، آپ  
تو اپنی بیویوں کی رضا کے جو یا ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ شریعت الہیہ میں تبدیلی کر دیا  
کرتے تھے، اور وہ بھی محض اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لئے۔

(۳) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى  
يُفْتَنَ فِي الْأَرْضِ (الأنفال - ۶۷)  
نبی کے لئے یہ زیبا نہیں، کہ اس کے پاس قیدی ہو  
جب تک کہ وہ زمین میں خوب خونریزی نہ کرے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اسلام خونریزی کو بہت پسند کرتا ہے۔  
کیا ان آیات سے دشمنان اسلام کو اسلام پر ہنسنے کا موقع نہیں ملتا؟ برق صاحب کیا آپ کے  
مذکورہ بالا عبارت میں "حدیث" کی جگہ "آیت" کا لفظ چسپاں نہیں ہو سکتا؟ اگر احادیث کو اس معیار پر  
رکھ کر رد کر دینا جائز ہے، تو آیات کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہیے یا نہیں؟ اگر نہیں تو آخر اس  
فرق کی کیا وجہ ہے؟ تفصیل کے لیے بیسواں باب ملاحظہ ہو۔

لیلۃ القدر کی تردید کرتے ہوئے برق صاحب لکھتے ہیں۔  
غلط فہمی | اس میں کلام نہیں، کہ قرآن حکیم میں لیلۃ القدر کا ذکر آیا ہے۔ "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ  
الْقَدْرِ" ہم نے یہ قرآن لیلۃ القدر یعنی فیصلہ کن رات میں اتارنا شروع کیا (دو اسلام ص ۱۶)

برق صاحب لیلۃ القدر کے معنی آپ نے "فیصلہ کن رات" کے کس طرح کر دیئے، اس کے  
انزالہ | لئے آپ نے کوئی دلیل نہیں دی، پھر "انزلنا" کے معنی "اتارنا شروع کیا" کیسے ہو گئے؟ حالانکہ  
اس کے صرف یہ معنی ہیں، کہ "ہم نے اتارا" کیونکہ آپ ایک اعتراض سے بچنا چاہتے تھے، جو بغیر حدیث کے  
حل نہیں ہو سکتا اس لئے آپ نے معنوں میں مقوڑا سا تصرف کر دیا، برق صاحب آخر اس تصرف سے کیا فائدہ؟  
کیونکہ نہ حدیث کی روشنی میں ترجمہ کر دیا جائے۔ نہ اعتراض رہے نہ تصرف کی ضرورت، بہر حال اتنا ضرور ثابت  
ہوا کہ قرآن مجید پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ مفہوم قرآن میں تصرف کر بیٹے ہیں، لیکن حدیث کے لئے  
آپ اس کو بھی گوارا نہیں فرماتے، کاش آپ غور فرمائیں۔

مزید برآں آپ کی تحریر سے روز روشن کی طرح یہ بات ظاہر ہے کہ لیلۃ القدر وہ رات ہے جس  
رات کو قرآن اتارنا شروع ہوا تھا، وہ رات گذر گئی، اور اب کبھی نہیں آتی، حالانکہ اس نظریہ کی تردید خود  
قرآن مجید میں موجود ہے، ارشاد باری ہے۔

تَنْزِيلُ الْمَلَكِ وَالرُّوحُ فِيهَا نَزِيلٌ  
رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ آفُقٍ (القدر - ۴)  
اس رات کو فرشتے اور روح الامین اپنے رب  
کے حکم سے تمام احکام لے کر اترتے ہیں۔



بقول برق صاحب اگر یہ رات گزر گئی، تو الفاظ اس طرح ہونے چاہیئے تھے "اس رات کو فرشتے اترے تھے۔" تنزیل، مضارع کا صیغہ ہے، لہذا اس کے صحیح معنی "اترتے ہیں" ہوئے، لہذا یہ رات بار بار آتی ہے، اور یہی حدیث کا مقصد ہے، قرآن و حدیث میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اگر واقعی لیلۃ القدر ہر رمضان میں آتی ہے، تو وہ گزشتہ تین سو برس میں شب بھر جاگنے والے چوکیداروں، ریلوے ملازموں، ملاحوں، ہوا بازوں اور مورچے میں

غلط فہمی | ڈٹے ہوئے فوجیوں کو کیوں نظر نہ آئی (دو اسلام ص ۱۶۸)

مذکورہ بالا قرآنی تشریح کے بعد ان الفاظ میں کوئی جان نہیں ہے، مادی باتوں سے روحانیات ازالہ | کا مذاق نہیں اڑایا جاسکتا، جب قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ یہ رات بار بار آتی ہے، تو اب اس اعتراض کا رخ قرآن مجید کی طرف مڑ جاتا ہے، معاذ اللہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (النجم: ۳۹) انسان کو وہی ملتا ہے، جو اس نے کوشش کی ملاحوں نے اور چوکیداروں نے اس رات کے لئے محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر کوئی کوشش نہیں کی، لہذا ان کو وہ رات کیسے مل سکتی تھی، محض اس رات کو جاگنا، اس رات کو پانا نہیں، بلکہ اس رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کو راضی کر لینا درحقیقت اس رات کو پانا ہے، یعنی اس رات کی فضیلت سے فیضیاً ہونا ہی حقیقت میں رات کو پانا ہے، لیکن اس کے لئے بھی محض اس رات کی عبادت اور رکوع و سجود کوئی وقعت نہیں رکھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

كَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَدَا مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا بَهْتٌ سَمَ نَمَازٍ پڑھنے والے ایسے ہیں کہ ان کو السَّهْمُ (رواہ الدارِمی وسندہ صحیح) سوائے جاگنے کے اور کچھ نہیں ملتا۔

فہوہ الحاکم وسندہ صحیح۔ مرعاة جلد ۳ ص ۲۴۹

برق صاحب! چوکیدار اور ملاح تو کجا نماز میں شب گزارنے والوں کو بھی اس رات کا فیض حاصل نہیں ہوتا، اس کے لئے تو حیدر خالص، انا بت الی اللہ، تقویٰ اور خشیت الہی کی ضرورت ہے۔

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (بآئۃ: ۲۷) اللہ تو صرف اہل تقویٰ کے اعمال قبول کرتا ہے۔

حدیث کا جواب اوپر نقل کیا گیا، باقی رہے لوگوں کے من گھڑت افسانے، احوال و مشاہدات تو

ان کے ہم ذمہ دار نہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

غلط فہمی | بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے، کہ چند آیات پہلے قرآن میں موجود تھیں، لیکن بعد میں

نکال دی گئیں، مثلاً :-

لَوْ لَا أَن يَقُولُ النَّاسُ زَادَ عَمْرُو فِي الْكَلَامِ مَجْهِي يَهْ نَهْ كُنْتُمْ كَمَا عَمْرُو بِنَ خَطَابٍ نَهْ قُرْآن



کتاب اللہ لکبتہا الشیخ والشیخہ  
 اذ ازنیہا فارجمو ہما فان قد  
 قرأناھا (موطا :- ۳۲۸)  
 میں اضافہ کر دیا، تو میں یہ آیت اس میں شامل کر دیتا ایشیخ  
 والشیخہ.... کہ جب کوئی بوڑھا اور بڑھیا زنا کے مرتکب  
 ہوں، تو انہیں سنگسار کر دو، ہم یہ آیت قرآن میں پڑھتے رہے  
 اگر پڑھتے رہے تو نکالی کس نے؟ اور اگر نکال دی گئی تھی، تو اللہ کا وعدہ حفاظت قرآن کیا ہوا؟  
 (دو اسلام ص ۱۶۸)

اس حدیث کو حضرت عمرؓ سے روایت کرنے والے سعید بن مسیب ہیں، اور انہوں نے حضرت  
 ازالم | عمرؓ سے اس حدیث کو نہیں سنا، علامہ ابن القطان لکھتے ہیں۔

إِنَّ سَعِيدَ الْمَيْمَنِيِّ يَسْمَعُ مِنْ عُمَرَ بْنِ الْوَلَدِ بْنِ  
 النُّعْمَانِ بْنِ مُقَرِّنٍ قَالَ وَمِنْهُمْ مَنْ  
 أَنْكَرَهُ مُطْلَقًا رَنَسِبَ الرَّايَةَ لِاحَادِيثِ  
 سعید نے حضرت عمرؓ سے کچھ نہیں سنا، سوائے نعمان بن  
 مقرن کے انتقال کی خبر کے، بلکہ بعض تو مطلق سننے  
 کا انکار کرتے ہیں۔  
 الہدایۃ کتاب الجنایات - ج ۲ ص ۳۲۹

لہذا سند حدیث منقطع ہے، اور یہ حدیث ضعیف ہے، اور ضعیف حدیث کے ہم جواب دہ نہیں،  
 ضعیف حدیث پر اعتراض کرنا بھی فضول ہے۔  
 غلط فہمی | اس موضوع پر ایک حدیث بخاری میں بھی موجود ہے۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ  
 بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ  
 أَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ فِيهَا أَنْزَلَ  
 آيَةَ الرَّجْمِ  
 عمر بن خطاب فرماتے ہیں، کہ اللہ نے محمد صلی اللہ  
 علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا، اور ان پر ایک  
 کتاب نازل فرمائی، جس میں آیت رجم بھی  
 موجود تھی۔

یعنی امام بخاری نے بھی تسلیم کر لیا، کہ قرآن میں آیت رجم موجود تھی، لیکن یہ نہیں بتایا وہ کئی کہاں؟  
 (دو اسلام ص ۱۶۹)

اس سے پہلے کہ ہم صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث کا جواب دیں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے  
 ازالم | کہ زنا کی سزا کا پس منظر اور اس کی تاریخ پر ایک ملکی سی روشنی ڈالیں، اس سلسلہ کی سب  
 سے پہلی سزا قرآن مجید کی اس آیت میں ہے۔

وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ  
 فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ  
 فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي  
 جو عورتیں زنا کریں، ان پر چار گواہ پیش کرو،  
 پس اگر وہ شہادت دیں، تو ان کو گھروں میں  
 قید رکھو، یہاں تک کہ موت ان کا کام



النَّبِيُّوتِ حَتَّى يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ  
أَوْ يَجْلَّ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا  
تمام کر دے۔ یا اللہ ان کے لئے  
کوئی اور سبیل یعنی سزا مقرر فرما  
(النساء: ۱۵)

کیونکہ زنا عموماً عورت کے حق میں زیادہ معیوب سمجھا جاتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ جب تک عورت کی طرف سے رضامندی نہ ہو، مرد کی تمام کوششیں بے کار ہو جاتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے عورت پر سزا نافذ کی گئی، تاکہ عصمت کے قلعہ کو زیادہ محفوظ و مضبوط بنا دیا جائے، ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد سزا کی حدود کو اور زیادہ بڑھا دیا گیا ہو اور یہ آیت نازل کی گئی ہو جو مندرجہ ذیل ہے، اور جس کا ذکر موطا کی روایت میں موجود ہے، (بشرطیکہ برق صاحب کی وارد کردہ اس روایت کو صحیح مان لیا جائے)۔

الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا ذَنِبَا فَا رَجُمُوهُمَا  
بوڑھا اور بوڑھی جب زنا کریں، تو  
انہیں سنگسار کر دو۔

کیونکہ بوڑھے اور بوڑھی کا زنا کرنا بہت زیادہ قبیح تھا، لہذا پہلے ان پر سزا کو نافذ کیا گیا، جو ان اور کنواری عورتوں کے متعلق ابھی تک کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور وہ بدستور مجبوس رہا کرتی تھیں، اسی طرح جو ان مردوں کے متعلق بھی کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں آخری حکم نازل فرمایا، جس کا ذکر مندرجہ ذیل حدیث میں ہے۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ  
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا انْزَلَ  
عَلَيْكَ كَرْبٌ لَكَ وَتَرَبَّدَ لَكَ وَجْهُكَ  
قَالَ فَانْزِلْ عَلَيْهِ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَقِي  
كَذَلِكَ فَلَمَّا سَرَى عَنْكَ قَالَ خُذُوا  
عَنِّي فَقَدْ جَعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا...  
...الَّتِي بَ جَلْدُ مِائَتَيْنِ ثُمَّ رَجُمُ  
بِالْحِجَارَةِ وَالْبِكْرُ جَلْدُ مِائَةٍ ثُمَّ  
فَتْحُ سُنَنِ (صحيح مسلم كتاب الحدود)

حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی، تو آپ مشقت  
محسوس کرتے تھے، چہرہ متغیر ہو جاتا تھا، ایک دن آپ  
پر وحی نازل ہوئی، اور یہی کیفیت ہو گئی، پھر جب وہ  
کیفیت زائل ہو گئی، تو آپ نے فرمایا، مجھ سے یہ احکام  
سیکھ لو، بے شک اللہ نے ان کے لئے سبیل (سزا)  
مقرر کر دی..... شادی شدہ کو سو کوڑے مار کر  
رجم کر دیا جائے، اور کنواری کو سو کوڑے  
مار کر ایک سال کے لئے جلا وطن کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں سو کوڑے کی سزا شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کے لئے مشترک تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سزا کو قرآن مجید کی آیت کی صورت میں نازل فرما کر مصحف میں شامل کر دیا۔ اور غیر مشترک سزا کو احادیث کی صورت میں رہنے دیا گیا۔

اب رہ گیا برق صاحب کا یہ اعتراض کہ وہ آیت کہاں گئی، جس کا ذکر حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا روایت



میں ہے، تو اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا پورا بیان درج ذیل کیا جاتا ہے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ  
الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ آيَةً  
الرَّجْمِ فَقَرَأْنَا هَا وَعَقَلْنَا هَا  
وَوَعَيْتَاهَا رَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ  
فَأَخْشَى أَنْ يَأْتِيَ بِنَا فِي زَمَانٍ أَنْ  
يَقُولَ قَائِلٌ وَاللَّهِ مَا نَجِدُ آيَةَ الرَّجْمِ  
فِي كِتَابِ اللَّهِ فَيَضِلُّوا بِتَرْكِ  
فَرِيضَتِهِ أَنْزَلَهَا اللَّهُ وَالرَّجْمُ  
فِي كِتَابِ اللَّهِ حَقٌّ عَلَى مَنْ  
زَنَى إِذَا أُحْصِنَ

(صحیح بخاری، وصحیح مسلم)

برق صاحب اب بتائیے، حدیث پر کیا اعتراض ہے، اعتراض اس لئے پیدا ہوا کہ آپ نے کتاب اللہ کے معنی قرآن کہہ دیئے، اور پھر ہم سے سوال کرنے لگے کہ قرآن مجید میں بھی تو کہاں گئی؟ یہ آیت قرآن مجید میں بھی ہی نہیں، حدیث میں بھی، اور بقول حضرت عمرؓ حدیث میں اب بھی موجود ہے، اور جو آیت قرآن مجید میں بھی، یعنی ”بوڑھے اور بوڑھی کو سنگسار کرنے کی آیت“ وہ منسوخ ہو گئی اور اب قرآن مجید میں نہیں ہے، یہ جواب برق صاحب کی وارد کردہ روایت کو صحیح مان کر دیا گیا ہے، ہاں اگر یہ تعجب ہو کہ قرآن مجید میں نسخ کیسا، تو یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں، یہ بات تو خود قرآن مجید سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا لَأَنْتَ  
بِخَيْرِ مَنِهَا أَوْ مِثْلَهَا

(البقرة: ۱۰۶)

جب ہم کوئی آیت منسوخ کر دیتے ہیں یا اس کو مبدل

دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری

آیت نازل کر دیتے ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید کی آیات میں نسخ ہوا ہے۔

(۲) وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ  
أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ  
مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا

اور جب کبھی ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت

بدل دیتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ نازل

کرتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ خود گھڑنے والے



يَعْلَمُونَ ۝ (النحل: ۱۰۱) ہیں، بات یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے ہی

(۳) إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَجِيبُ أَنْ يُصْرَبَ مَثَلًا مَا نہیں، بے شک اللہ نہیں شرماتا، کہ مچھر کی مثال

يَعُوْذَةُ فَمَا فَوْقَهَا (البقرة: ۲۶) بیان فرمائے یا اس سے بھی ادنیٰ تر مخلوق کی۔

کفار نے اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی شان سے بعید ہے کہ وہ مچھر جیسی حقیر مخلوق کی مثال بیان فرمائے۔  
اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ آیت اتاری، لیکن وہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے مچھر کی مثال بیان فرمائی  
تھی، اور جس پر کفار نے اعتراض کیا تھا، قرآن مجید میں نہیں ہے، لہذا ثابت ہوا کہ بعض آیتیں ضرور منسوخ  
ہوتی ہیں۔

(۴) سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى ۝ إِلَّا مَآ شَاءَ

اِلهُ (الاعلیٰ: ۷۶) ہم آپ کو پڑھائیں گے لہذا آپ نہیں بھولیں

گے، سوائے اس کے جو اللہ ہی بھلانا چاہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے، کہ ضرور کچھ نہ کچھ بھلانا اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے میں تھا، ورنہ اس

استثناء کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ان آیات کی روشنی میں اگر کسی حدیث میں یہ ملتا ہے، کہ فلاں آیت منسوخ ہو گئی، تو آخر اعتراض کی کون

سی بات ہے، جو اعتراض حدیث پر ہوگا، وہی پھر قرآن پر بھی ہوگا۔ (معاذ اللہ)

آج اعدائے اسلام یہی احادیث پیش کر کے ہمیں کہتے ہیں، کہ تمہارے قرآن میں رد و بدل

غلط فہمی ہوتا رہا اور اس کی آیات انسانی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں، کوئی بتاؤ کہ ہم اس

انزام کا کیا جواب دیں (ص ۱۶۹)

برق صاحب یہ کس حدیث میں ہے کہ قرآنی آیات انسانی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں، یہ

انزالہ کس حدیث میں ہے کہ انسان آیات میں رد و بدل کرتے رہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا رد و بدل کرنا

بھی انسانی رد و بدل کہلا سکتا ہے؟ آخر کچھ تو انصاف کیجئے، قرآنی آیات انسانی دست برد سے بے شک

محفوظ رہیں، دست برد کرنے والی دہی ہستی ہے جس نے اس کو اتارا تھا، اس کو بے شک اختیار ہے کہ جس

حکم کو چاہے بدل دے اور جس حکم کو چاہے باقی رہنے دے، دین کی تکمیل سے پہلے رد و بدل ہوا، لیکن

جب یہ آیت نازل ہوئی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر

دیا، تو پھر اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوا، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تھا آج

تک ویسا ہی ہے، اعدائے اسلام یہ بتائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کون سی تبدیلی

ہوئی، اور پھر اعتراض کریں، برق صاحب اعدائے اسلام کے اعتراض سے آپ مرعوب نہ ہوں، کیا

آپ کو خبر نہیں کہ اعدائے اسلام نے قرآن مجید کے متن پر سینکڑوں اعتراض کئے ہیں، تو کیا ہم قرآن مجید

کے متن کا انکار کر دیں؟ کیا ان آیات کا بھی انکار کر دیں جن سے نسخ آیات ثابت ہوتا ہے اور جو



اور نقل کی جا چکی ہیں؛ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ آپ آیات کا مفہوم بدلتے چلے جائیں، اس طرح سے بظاہر آپ مطمئن ہو جائیں گے لیکن ضمیر کی آواز اس سے کچھ مختلف ہی ہوگی، مثال کے طور پر ایک اعتراض نقل کرتا ہوں، حروف مقطعات مثلاً **اَلْقَـٰلَمِ**۔ **كَهَيِّعَصَ** وغیرہ کے کیا معنی ہیں؟ اگر کچھ معنی ہیں، تو لغت عرب محاورات اہل زبان سے ان کے معانی کو ثابت کیجئے، تاکہ ہر عربی دان مسلم ہو یا غیر مسلم ان کو تسلیم کر لے، اگر کچھ معنی نہیں ہیں، تو کیا یہ حروف انسانی درست برد کا نتیجہ ہیں؟ بتائیے اس اعتراض کا کیا جواب دیں۔

**غلط فہمی** | تحریف کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ حضرت علقمہ فرماتے ہیں۔ کہ میں شام میں حضرت ابو دردا سے ملا، تو آپ نے پوچھا، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود واللہ کی تلاوت کیسے کرتے ہیں، تو میں نے کہا اس طرح **وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّجْمِ اِذَا تَجَلَّىٰ** آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ آیات بالکل اسی طرح سنی ہیں، اور میں اسی طرح پڑھوں گا (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۶۲)

تو گویا تین جلیل القدر صحابہ نے شہادت دی کہ یہ آیات مذکورہ بالا صورت میں نازل ہوئی تھیں، لیکن آج قرآن شریف میں یوں درج ہیں **وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّجْمِ اِذَا تَجَلَّىٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثَىٰ** اب کس کو صحیح تسلیم کریں! ان صحابہ کو؟ صحیح مسلم کو؟ یا قرآن شریف؟ لازماً یہی کہنا پڑے گا، کہ ہمارا قرآن صحیح ہے، اور یہ حدیث غلط (دو اسلام ص ۱۷)

**انزالہ** | برق صاحب انفرادی غلطی اور لاعلمی سے مسلمات کو جواب نہیں دیا جاسکتا، اگر تین صحابیوں سے غلطی ہو گئی تو ہو جائے، ہزار ہا صحابہ جس طرح تلاوت کرتے رہے، قرآن مجید تو درحقیقت وہی ہے، ان تین صحابیوں کی لاعلمی یا بھول کی وجہ سے قرآن مجید کے متن پر کوئی اعتراض نہیں آتا، لہذا حدیث قابل اعتراض ہی نہیں، اگر یہ اعتراض ہو، کہ یہ تین صحابی کیسے بھول گئے، تو اول تو یہ تین نہیں دو ہیں، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو درداؓ، آپ نے علقمہ تابعی کو بھی غلطی سے صحابی سمجھ لیا، وہ تو ان دونوں صحابیوں کی غلطی کے راوی ہیں، اب رہا بھول کا اعتراض، تو کیا بھول بھی کوئی قابل اعتراض چیز ہے، انسان سے بھول ہو ہی جایا کرتی ہے، وہ بھول جاتا ہے، اور سمجھتا یہ ہے کہ جو کچھ مجھے یاد ہے وہ صحیح ہے، یہ واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ اور وزمرہ کے تجربات میں سے ہیں، کیا محض ان دو صحابیوں کو بھول کے نقص سے بچانے کے لئے ایک مسلمہ حقیقت کا انکار کر دیا جائے، وہ یہ کہ علقمہ نے ان دونوں صحابیوں سے ایک آیت غلط طریقہ سے سنی تھی۔ اور اس کو انہوں نے بیان کر دیا، لہذا قرآن مجید بھی صحیح، حدیث بھی صحیح، البتہ ان دو صحابیوں سے بھول ہو گئی۔

اس اعتراض کا ایک اور جواب بھی ہے، ممکن ہے، کہ یہ آیت پہلے اسی طریقہ سے نازل ہوئی ہو، جس طریقہ سے ان دونوں صحابہ کو یاد تھی، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں **وَمَا خَلَقَ** کا اضافہ کر دیا،



اور ان دونوں صحابیوں کو اس کا علم نہ ہو سکا، اور یہ اُسی سے طریقہ پڑھتے رہے، قرآن مجید پر حال  
جمہور صحابہ کی قرأت کے مطابق شائع ہوا۔ لہذا اس میں ان صحابیوں کی لاعلمی کی وجہ سے کوئی نقص  
نہیں آتا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

**غلط فہمی**

”حضور نے اصحاب صفہ میں سے چند حضرات کو اہل نجد کے پاس تبلیغ اسلام کے  
لئے بھیجا، جب وہ بیر معونہ (مکہ اور عسفان کے درمیان ایک مقام) میں پہنچے تو عامر  
بن طفیل، رعل، ذکوان وغیرہ نے انہیں قتل کر ڈالا، حضرت انسؓ سے روایت ہے، کہ ان  
لوگوں کے متعلق مندرجہ ذیل آیت اتری تھی، جو بعد میں منسوخ ہو گئی۔ بلغوا قومنا  
انا قد لقینا ربنا فرضی عنا ورضینا عنہ۔ ہماری قوم کو کہہ دو، کہ ہم اللہ سے اس حال  
میں ملے، کہ وہ ہم سے خوش تھا، اور ہم اس سے (بخاری جلد ۲ ص ۹۲ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۳) اگر یہ آیت  
واقعی نازل ہوئی تھی، تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اس کا باقی رہنا ضروری تھا (دو اسلام ص ۱۷۱)  
آیت کے منسوخ ہونے کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے، منسوخ کرنے میں کیا مصلحت تھی، اس کا علم  
ازالہ | تو اللہ ہی کو ہے، ہاں ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے جو آپ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں پائی جاتی ہے  
”قرآن شریف میں غزوات اور اس قسم کے دیگر واقعات کے متعلق بیسیوں آیات نازل ہوئیں  
جو بعینہ محفوظ ہیں“ (دو اسلام ص ۱۷۱)

گویا ان آیات کی موجودگی میں اس آیت کی ضرورت نہ سمجھی گئی، پیغام پہنچا دینے کے بعد اس کو منسوخ التلاوت کر  
دیا گیا، اور حوصلہ افزائی کے لئے باقی آیات کو کافی سمجھا گیا۔

چونکہ اس قسم کی احادیث سے قرآن کی قطعیت پر چوٹ پڑتی ہے، اس لئے ہمارے لئے

**غلط فہمی**

محفوظ ترین راستہ یہی ہے، کہ ہم اس قسم کی تمام احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دیں

(دو اسلام ص ۱۷۱-۱۷۲)

نسخ کا جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے، نسخ سے قطعیت قرآن مجید مجروح نہیں ہوتی، پھر قرآن مجید

**ازالہ**

کی قطعیت پر تو قرآن کی آیات سے بھی چوٹ پڑتی ہے۔ لہذا حدیث کا فکر چھوڑ کر، پہلے ان کا

جواب سوچنا چاہیئے، مستحیاء محمد پر کاش وغیرہ کتابیں ملاحظہ فرمائیں، دو ایک اعتراض اوپر نقل کئے جا  
چکے ہیں، مثلاً ”چھر کی مثال والی آیت کہاں گئی؟ حروف مقطعات قرآن مجید میں کہاں سے آگئے؟“

”میری ذاتی رائے یہ ہے، کہ دشمنان اسلام ایک خاص سازش کے ماتحت اس قسم

**غلط فہمی**

کی احادیث معتبر راویوں کے نام سے وضع کرتے رہے، تاکہ مسلمان کا ایمان

قرآن کے متعلق متزلزل ہو جائے اور چونکہ ائمہ حدیث صرف اسناد کو دیکھتے تھے، اس

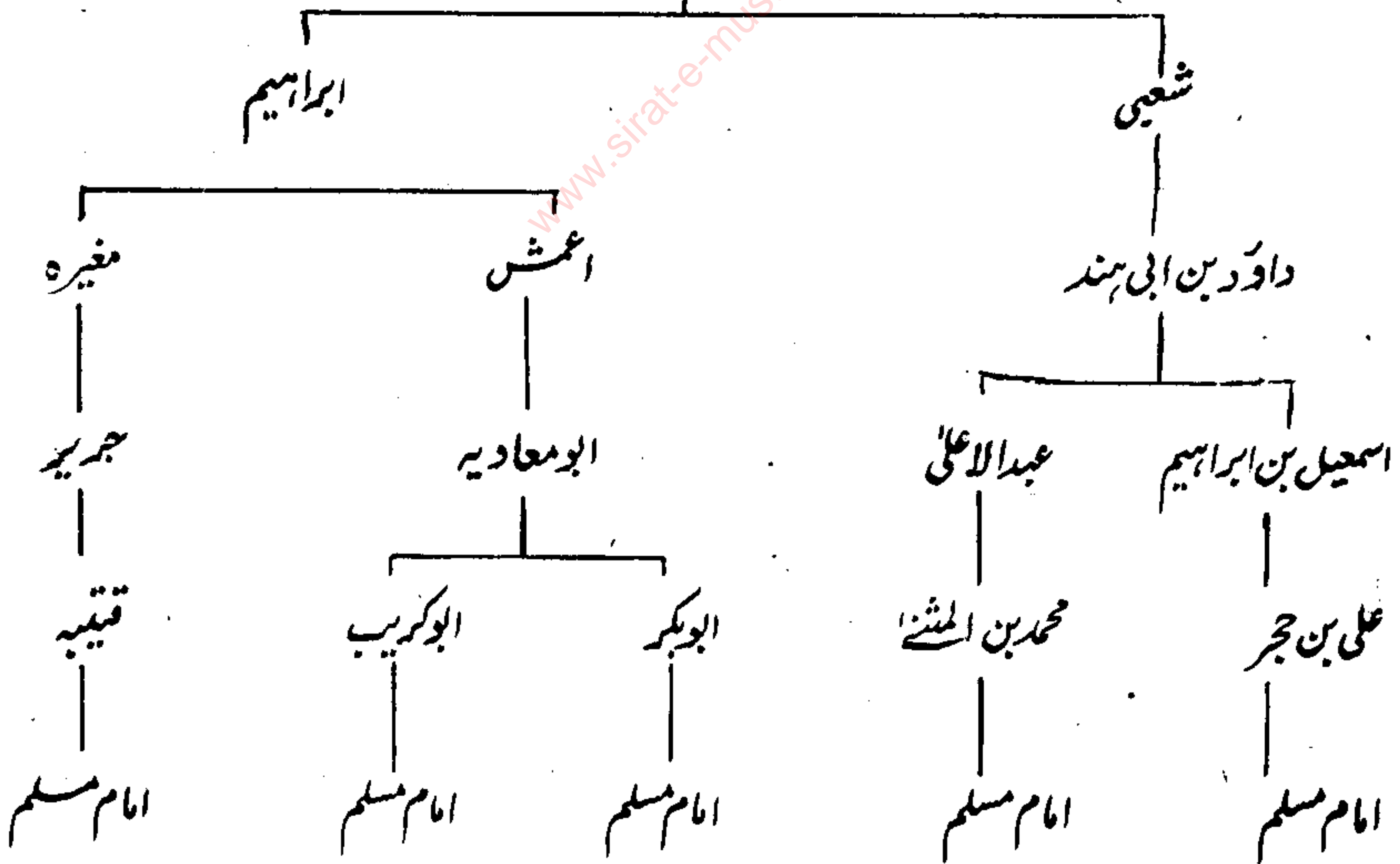


یہ مسلم جیسے محقق بھی اس چال کے شکار ہو گئے، اور انہوں نے اس روایت کو اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا " (دوا سلام ص ۱۴۲-۱۴۳)

یہ تو تسلیم کیا جاسکتا ہے، کہ دشمنانِ اسلام اس قسم کی احادیث وضع کرتے تھے، یہ بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے، کہ معتبر راویوں کے نام ان کی اسناد میں لگا دیا کرتے تھے، لیکن براہِ کرم یہ تو سوچئے کہ محققین کے پاس وہ احادیث کس سند سے پہنچتی تھیں، کیا ان اسناد میں ان دشمنانِ اسلام کے نام نہیں ہوتے تھے، ضرور ہوتے تھے، تو پھر جو حدیث دشمنانِ اسلام کا نام آتے ہی موضوع ہو جاتی تھی، محققین کے نزدیک صحیح کیسے ہو گئی، معتبر راویوں کے نام تو ان دشمنانِ اسلام کے اوپر ہوں گے، لہذا اوپر کے راویوں کے معتبر ہونے سے حدیث مستند کیسے ہو جائے گی جب کہ نیچے کے راوی کذاب ہوں، برق صاحب یہ بات آپ نے سوچ سمجھ کر نہیں لکھی۔ والیل کی قرأت کے متعلق جو حدیث برق صاحب نے نقل فرمائی ہے، صحیح مسلم میں اس کی یہ اسناد ہیں۔

عبداللہ بن مسعود والبودرداء

علقمہ



(صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب ما يتعلق بالقراءات)

اس اسناد میں ہر ایک مسلمہ امام ہے، بتائیے کس کو دشمنِ اسلام سمجھیں؟ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ امام علقمہ تابعی کو دشمنِ اسلام قرار دے دیا جائے، جو کہ عبداللہ بن مسعود کے اصحابِ کبار میں شمار ہوتے ہیں، کیونکہ صرف ان کو دشمنِ اسلام قرار دے کر باقی کو اس الزام سے بچایا جاسکتا ہے۔ اگر ان کو صادق سمجھا جائے تو پھر دو اماموں کو یعنی امام شعبی اور امام ابراہیم نخعی کو دشمنانِ اسلام



بانا پڑے گا، اور اگر یہ بھی صادق سمجھ جائیں، تو پھر متعدد ائمہ دین کو دشمنان اسلام کی فہرست میں شامل کرنا ہوگا اور یہ کبھی بھی قرین قیاس نہیں ہو سکتا کہ اتنے زیادہ آدمی اس حدیث کے بنانے میں شریک ہوں اور کسی کے متعلق ادنیٰ سا بھی وہم نہ امام مسلم کو ہوا، نہ کسی اور محدث کو، حالانکہ صحیح مسلم کی احادیث کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے، امام مسلم خود لکھتے ہیں۔

لَيْسَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدِي صَحِيحٌ وَضَعْتُ

میں صحیح مسلم میں ہر وہ حدیث نہیں لکھتا جو

هَمْنًا إِنَّمَا وَضَعْتُ هَمْنًا مَا أَجْمَعُوا

میرے نزدیک صحیح ہے، صحیح مسلم میں تو صرف

عَلَيْهِ (صحیح مسلم باب التَّهْدِي فِي السُّلُوكِ) وہ حدیث لکھتا ہوں، جس کی صحت پر اجماع ہے۔

اب بتائیے یہ کیسے ممکن ہے کہ تمام محدثین ان تمام دشمنان اسلام سے بے خبر رہے، بلکہ ان کو ائمہ دین شمار کرتے رہے، ظاہر ہے، کہ یہ مفرد منہ ہی غلط ہے، برق صاحب صحیح مسلم کی یہ اسناد آپ کے سامنے ہیں، آپ اس شخص یا ان اشخاص پر انگلی رکھیے، جو اس حدیث کے گھڑنے والے تھے، لیکن مشکل یہ ہے کہ کس کس کو کذاب کہا جائے، صرف صحیح مسلم کی سند کا یہ حال ہے، تمام کتب حدیث میں اس کی سند کا ایک جال بچھا ہوا ہے، ناگن ہے، کہ ان تمام کے تمام ائمہ حدیث و فن کو دشمن اسلام قرار دیا جائے، پھر یہی کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے، اور صرف گنتی کے چند افراد کو مسلم چھوڑ گئے، باقی سب کے سب منافق تھے، ان کی نسل سے بھی منافق پیدا ہوتے رہے، ان کے شاگرد خاص بھی منافق تھے، غرض یہ کہ امت مسلمہ سب کی سب ان منافقوں پر مشتمل تھی، نہ کوئی مسلم تھا، نہ کوئی حق گو، اور اگر کوئی تھا بھی تو وہ کہیں گوشہ عافیت میں زندگی گزار رہا تھا، نہ اس سے کوئی واقف تھا، نہ وہ کسی سے واقف، دور دورہ انہیں منافقوں کا تھا، جو علم و فن کے آفتاب و ماہتاب تھے، عمل صالح، اور تقویٰ و طہارت کے پیکر تھے، ائمہ دین کہلاتے تھے، لیکن تھے منافق، اور دشمن اسلام، نفوذ باللہ، قطعاً ناممکن ہے کہ یہ لاتعداد ائمہ دین سب کے سب منافق ہوں، لہذا ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ ہمارے لئے سب سے آسان بات یہ ہے، کہ ہم ان تمام ائمہ کو دشمنان دین کہنے کے بجائے امام علقمہ کو دشمن دین کہیں لیکن یہاں بھی ایک بڑی مشکل ہے، وہ یہ کہ علقمہ معمولی آدمی نہیں بلکہ صحابہ کرام کے شاگرد خاص، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مشہور اصحاب کبار میں سے ہیں، ائمہ دین اور محدثین کے مسلمہ استاذ ہیں، لہذا اس مشکل کا حل سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم صحت حدیث کے معترف ہوں، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو درداءؓ کی اس قرأت کو قرأتِ شاذہ میں شمار کریں اور یہ کہیں کہ غالباً یہ قرأت ادنیٰ اسلام میں کبھی جائز تھی، اب منسوخ ہے۔

سرور عالم صلعم اور ان کے صحابہ گوشت کو ایک نعمت سمجھ کر کھایا کرتے تھے،

غلط فہمی | لیکن موطا کی ایک حدیث ہمیں گوشت جیسی نعمت سے اجتناب کا حکم دیتی ہے



عن عبد بن الخطاب قال اياكم واللحم فان امر عمر فاروق فرماتے ہیں کہ گوشت خوردی سے بچو۔

خراوة كضراوة انحر  
اس نے کہ شراب کی طرح اسکی عادت پڑ جاتی ہے۔

اگر ایک اچھی چیز کی عادت بھی پڑ جائے، تو ہرج کیا ہے۔ (دو اسلام ص ۱۶۲-۱۶۴)

**ازالہ** | امام مالک نے اس قول کو متصل سند سے بیان نہیں کیا، لہذا یہ قول ضعیف ہے، اور اس پر اعتراض اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے، اعتراض جب ہوتا کہ امام مالک اس کو متصل سند سے بیان کر کے اس پر اعتماد کرتے، پھر ہرق صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ہر اچھی چیز کی عادت اچھی ہوتی ہے، کھانے پینے کی چیزوں میں سے کسی چیز کی عادت پڑ جانا یقیناً تکلیف کا باعث ہوتا ہے اگر کبھی وہ چیز میسر نہیں ہوتی، تو طبیعت مکرر رہتی ہے، آدمی اس کا غلام بن جاتا ہے، اور اس کو بغیر اس چیز کے چین نہیں آتا اور ہو سکتا ہے کہ جب بے صبری زیادہ بڑھ جائے تو وہ اس کے حصول کے لئے کوئی ذلیل قسم کی حرکت کر بیٹھے، ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اگر یہ قول حضرت عمر کی طرف صحیح منسوب ہے، تو یہی وہ حرج ہے، جس کی طرف ان کے اس قول میں اشارہ ہے، کثرت کسی چیز کی بھی اچھی نہیں ہوتی، حتیٰ کہ عبادت کی کثرت بھی نامحود ہے، تو پھر گوشت خوردی کی کثرت کیوں نہ نامحود ہو، یہی وہ رمز ہے جو اس قول میں پوشیدہ ہے، فلتد الحمد۔



## باب

### صحیح بخاری پر ایک نظر

**غلط فہمی** | اس میں کلام نہیں کہ امام بخاری (وفات ۲۵۵ھ) نے صحیح احادیث کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کئے، اور سالہا سال کی مسلسل جستجو و تگاپو کے بعد اپنا مجموعہ تیار کیا ”ردو اسلام ص ۱۱۱“ اس کے یہ معنی نہیں کہ امام بخاری سے پہلے کوئی مجموعہ احادیث نہیں تھا، بہت سے تھے لیکن ان مجموعوں میں کچھ ضعیف احادیث بھی شامل تھیں، بعض میں کسی قسم کا شبہ تھا، بعض کے متعلق اختلاف رائے تھا، امام بخاری نے ان کتب احادیث کو پڑھا، اور ان میں سے ان احادیث کا انتخاب کیا جو ہر قسم کے شبہ سے بالاتر تھیں، اور جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق تھا، ان منتخب کردہ احادیث کو اپنی جامع میں جمع کر دیا، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔

وَجَاءَ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيُّ  
إِمَامَ الْحَدِيثَيْنِ فِي عَصْرِ فَخْرٍ  
أَحَادِيثَ السُّنَّةِ عَلَى أَهْلِهَا فِي مُسْنَدٍ  
الصَّحِيحِ وَاعْتَقَدَ مِنْهَا مَا أَجْمَعُوا عَلَيْهِ  
دُونَ مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ثُمَّ جَاءَ الْمُسْلِمُ  
بُنِ تَجَّاجِ الْقَشِيرِيُّ فَأَلْفَ مُسْنَدًا  
حَدَّثَ فِيهِ حَدَّثَ الْبُخَارِيُّ فِي قَلِيلٍ  
لِلْجَمْعِ عَلَيْهِ (مقدمہ ابن خلدون ص ۳۸۶)  
محمد بن اسماعیل بخاری جو اپنے زمانہ میں محدثین  
کے امام تھے آئے، اور انہوں نے ابواب  
کے ماتحت اپنی صحیح کو مرتب کیا، اور صرف  
انہی حدیثوں پر اعتماد کیا جن کی صحت پر  
اجماع تھا اور ان کو چھوڑ دیا جن میں اختلاف تھا  
پھر امام مسلم آئے، انہوں نے بھی امام بخاری  
کی طرح ان ہی احادیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا  
جن کی صحت پر اجماع تھا  
برق صاحب کے ممدوح امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔



وَمَا صَحَّحَاهُ كَانَ قَبْلَهُمَا عِنْدَ آيَةٍ  
 الْحَدِيثِ صَحِيحًا فَتَلَفَى بِالْقَبُولِ كَذَلِكَ  
 فِي عَصْرِ هِمَّا وَكَذَلِكَ بَعْدَهُمَا فَلَمْ  
 يَخْفِزْ إِلَّا بِرِوَايَةٍ وَلَا بِصَحِيحٍ  
 رَمَاهُ السَّنَدُ جلد ۴  
 صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث ان دونوں  
 امانوں سے پہلے بھی ائمہ حدیث کے نزدیک  
 صحیح تھیں اور ان دونوں کے زمانہ میں بھی صحیح  
 مانی گئیں اور ان کے بعد کے زمانہ میں بھی صحیح  
 تسلیم کی گئیں، پس نہ روایت میں یہ مفرد ہیں  
 نہ تصحیح میں ان دونوں کا انفراد ہے۔ (۵۹)

لیکن اس قدر محنت اور احتیاط کے باوجود اس مجموعہ میں چند ایسی احادیث موجود ہیں،  
**غلط فہمی** جو یا تو تعلیم قرآن سے متصادم ہوتی ہیں، یا آپس میں ٹکراتی ہیں، یا مسلمانوں کو بے کار، اپانچ  
 اور بے عمل بناتی ہیں اور یا ان سے حضور علیہ السلام اور ان کی ازواج مطہرات کی توہین کا پہلو  
 نکلتا ہے (دو اسلام ص ۱۵۰)

برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، صحیح بخاری میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جس میں مذکورہ  
**ازالہ** بالا باتیں پائی جاتی ہوں، اگر بظاہر کوئی بات پائی بھی جائے تو وہ حقیقتہً ایسی نہیں ہوتی  
 اگر حدیث کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو وہ غلط فہمی خود بخود دور ہو سکتی ہے، اور اگر محض ظاہری معنوں  
 سے اس قسم کے اعتراضات کئے جاسکتے ہیں تو پھر ایسے اعتراضات سے قرآن مجید بھی نہیں بچ  
 سکتا، جہاں برق صاحب احادیث سے اس قسم کی مثالیں پیش کریں گے، وہیں اللہ کے مماثل ہم  
 قرآنی آیات پیش کریں گے۔

صحیح بخاری کی احادیث کی صحت پر جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ علمائے سلف و خلف کا اجماع ہے تو  
 کیا یہ سب دشمن دین و پیغمبر تھے یا اسلام کے نادان دوست تھے، کوئی ان میں محب رسول اور اسلام  
 کا دانا و سمجھ دار دوست تھا ہی نہیں؟ برق صاحب آخر کچھ تو انصاف چاہیے، اگر ان سب نے  
 مل کر کسی حدیث کو قرآن مجید کے خلاف نہیں سمجھا، اور ہم اس کو قرآن مجید کے خلاف سمجھیں، تو کیا  
 یہ ہماری سمجھ کا قصور ہے، یا ان سب اگلے پچھلے محدثین کی سمجھ کا قصور ہے۔

”امام بخاری کی نظر زیادہ تر اسناد پر رہی، انہیں جس حدیث کے وضعی ہونے پر  
**غلط فہمی** کوئی تاریخی شہادت نہ مل سکی، اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر دیا۔“ (دو اسلام ص ۱۵۱)

یہ قطعاً صحیح نہیں، اسناد کے ساتھ تمام فنون حدیث پر امام بخاری کی نظر تھی، موضوع حدیث  
**ازالہ** تو کجا انہوں نے تو ضعیف و مشکوک اور مختلف فیہ احادیث بھی نقل نہیں کیں، بلکہ صحیح احادیث  
 میں سے بھی بہت سی احادیث کو اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ احادیث ان کی سخت شرائط کے معیار کے  
 مطابق نہیں تھیں، بھلا جو شخص صحیح احادیث اپنے سخت شرائط کی بنا پر چھوڑ دیتا ہو، وہ ضعیف بھی نہیں



بلکہ موضوع حدیث نقل کرے گا، حاشا وکلاً۔

برق صاحب کا یہ جملہ ”جس حدیث کے وضعی ہونے پر کوئی تاریخی شہادت نہ مل سکی، اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔“ درحقیقت معکوس جملہ ہے، اس جملہ کو اس طرح ہونا چاہیے تھا ”جس حدیث کے صحیح ہونے پر تمام ضروری تاریخی شہادتیں پیش نہیں، ان احادیث کو امام بخاری نے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔“ محدث تو صحت احادیث کے لئے تاریخی شہادت متیا کرتے تھے، اور جہاں یہ تاریخی شہادت نہ ہوتی تھی، اس کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے لیے تاریخی شہادت نہ مل سکے، اور پھر بھی وہ حدیث صحیح بخاری میں شامل ہو جائے۔

”گذشتہ صفحات میں آپ دیکھ چکے، کہ احادیث کا کیا حال ہو چکا تھا، راویوں کے حالات غلط فہمی | کس بے احتیاطی سے قلمبند ہوئے تھے، اور وہ ایک دوسرے کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے“ (دو اسلام ص ۱۷۶)

ان غلطیوں کے ازالہ کے لئے گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے، اعادہ کی ضرورت انہیں، متعلقہ ابواب ملاحظہ فرمائیں۔

”احادیث کی حیثیت محض تاریخ کی ہے، تاریخ میں غلط باتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور صحیح بھی، فرق صرف اتنا ہے، کہ ایک مورخ تدوین تاریخ میں اس قدر خلوص اور محنت سے کام نہیں لے سکتا، جتنا کہ امام بخاری نے لیا“ (دو اسلام ص ۱۷۷، ۱۷۸)

جب کوئی مورخ تدوین تاریخ میں اس قدر خلوص سے کام نہیں لے سکتا، جتنا امام بخاری نے لیا۔ پھر بھی حدیث کو تاریخ کی حیثیت دینا عجیب ہے، بے شک تاریخ میں غلط باتیں ہوتی ہیں جیسا کہ برق صاحب کو اعتراف ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے، کہ وہاں واقعہ کی تنقید کے لئے نہ کوئی محسوس معیار ہوتا ہے، نہ مؤرخین اس کی کوئی ضرورت ہی سمجھتے ہیں، جو سنا لکھ لیا، خواہ وہ واقعہ فرضی ہی کیونہ ہو، لیکن احادیث کا معاملہ بالکل الگ ہے، یہاں ہر واقعہ، ہر قول و فعل کی سند ہوتی ہے، پھر ایک سند نہیں ہوتی، بلکہ متعدد سندیں ہوتی ہیں، پھر ہر زمانہ میں سند پر بھی بحث ہوتی ہے، اور متن پر بھی، تمام فنون حدیث سے اسے پرکھا جاتا ہے، جب وہ تمام مراحل تنقید کو طے کر لیتی ہے، تو قابل اعتماد کہلاتی ہے، اس کو صحیح کہا جاتا ہے، یہاں نہ جانبداری ہوتی ہے، نہ بغض و تعصب، نہ مداخلت نہ تعسف، بلکہ پوری ہوشیاری، تندہی، ایمان و دیانت داری سے ہر حدیث کو پرکھا جاتا ہے، لہذا اس تنقید کے بعد جو حدیث صحیح کہلائے، اور تمام ناقدین کے نزدیک صحیح کہلائے اس کو تاریخ کا درجہ دینا بڑی زبردست غلط فہمی ہے۔

غلط فہمی | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خسرو پرویز شاہ ایران..... اور ہر قل قیصر روم..... کی طرف



خطوط بھیجے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی، ہر قتل نے قاصد رسول کی بڑی تعظیم کی، لیکن کسری (شاہ ایران) نے خط پھاڑ ڈالا، اور قاصد کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیا، جب حضور کو اس سلوک کی اطلاع ملی، تو آپ نے ایک پیشین گوئی کی، قیصر کے حسن سلوک، اور کسری کی بدتمیزی کا تقاضا تو یہ تھا، کہ حضور صرف نسل کسری کے خاتمہ کی پیشین گوئی فرماتے اور ہر قتل کے لئے اسی طرح محبت کا اظہار کرتے، جس طرح وہ نجاشی سے کیا کرتے تھے، لیکن جو پیش گوئی بخاری میں موجود ہے، وہ ہماری اس تمنا کو پورا نہیں کرتی۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
قال اذا هلك كسری فلا کسری  
بعدہ واذا هلك قیصر فلا قیصر  
ابو ہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ  
آپ نے فرمایا، کسری کے تباہ ہونے کے بعد  
کوئی اور کسری نہیں ہوگا، اور نہ قیصر کے  
بعدہ (دوسلاص ص ۸۱۱) بعد کوئی اور قیصر۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی گئی، کہ کسری نے آپ کا نامہ مبارک چاک کر ڈالا تو  
انزالہ آپ نے یہ پیشین گوئی نہیں فرمائی، جو برق صاحب نے نقل کی ہے، بلکہ آپ نے اس وقت صرف  
یہ دعا فرمائی تھی۔

اَنْ يُّمَزَّزَ اَكْلَ مَمَّتِي (صحیح بخاری کتاب العلم) کہ وہ پارہ پارہ ہو جائیں۔

کیونکہ خسرو نے انتہائی ذلیل و گستاخانہ حرکت کی تھی، لہذا اس کے حق میں یہ بد دعا فرمائی، جس کے  
نتیجے میں وہ اور اس کی سلطنت دونوں کے پہنچے بہت جلد اڑ گئے۔ اس واقعہ کو اس پیشین گوئی سے جس کو  
برق صاحب نے نقل فرمایا ہے، کوئی تعلق نہیں، برق صاحب نے غلط فہمی سے اس پیشین گوئی کے  
پس منظر میں اس واقعہ کو پیش کر دیا۔

برق صاحب کا یہ فرمانا کہ ہر قتل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح محبت کا اظہار کرتے  
جس طرح نجاشی کے لئے کیا کرتے تھے، کسی طرح بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ نجاشی مسلم ہو گئے تھے  
اسلام اور مسلمین کی خدمت کیا کرتے تھے، برخلاف اس کے ہر قتل مسلم نہیں ہوا، بلکہ اسلامی فوجوں  
کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہا، بھلا دونوں بادشاہوں کو ایک پلڑے میں کیسے رکھا جاسکتا ہے اس  
کے معنی یہ ہیں کہ دوست و دشمن، وفادار و باغی، کفر و ایمان برابر ہیں، اور ان میں کوئی فرق نہیں  
ایک بادشاہ وفادار، اطاعت گزار، دوسرا نافرمان، باغی، اور دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کا مطالبہ  
کیا یہ تعجب نہیں؟ قابل اعتراض بات تو برق صاحب خود کہ بیٹھے، اور غلط فہمی سے صحیح بخاری  
پر اعتراض کر دیا۔

ایک غلط فہمی برق صاحب کو یہ بھی ہوئی کہ وہ بد دعا اور پیشین گوئی کو ایک سمجھ بیٹھے، قیصر کے



حق میں جو الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے، وہ پیشین گوئی تو کہے جاسکتے ہیں، لیکن بددعا سے ان کا کوئی تعلق نہیں، لہذا برق صاحب کا یہ فرمانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے باادب شخص کے لئے بددعا کیوں کی، صحیح نہیں، آپ نے بددعا نہیں کی، بلکہ ایک پیشین گوئی فرمائی تھی، اور پیشین گوئی باادب کا فرق تو کچھ، مسلم، وفادار، اطاعت گزار کے لئے بھی کی جاسکتی ہے، جیسا کہ مسلمین کے زوال کے متعلق مختلف پیشین گوئیاں احادیث میں موجود ہیں۔

”کسری کے متعلق یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، آنحضرت کی رحلت سے صرف غلط فہمی | دس برس بعد ۶۲۲ء میں جنگ نہاوند نے ساسانی خاندان کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ کچھ عرصہ بعد آخری کسری (یزدگرد) قتل ہو گیا، اور اس کے بعد آج تک پھر کوئی کسری پیدا نہ ہوا، چاہیے تو یہ تھا، کہ قیصر کے متعلق بھی یہ پیش گوئی اسی طرح پوری ہوتی، لیکن اے کاش کہ ایسا نہ ہوا“ (دوا اسلام ص ۱۷۸)

کسری کے متعلق اگر یہ پیش گوئی اس طرح پوری ہوئی، کہ خسرو مارا گیا، اور سلطنت ختم ہو گئی، تو ازالہ | یہ صحیح نہیں، خسرو کے بعد بھی کئی بادشاہ ہوئے، اسی طرح ہر قل سوم کے بعد بھی کئی بادشاہ ہوئے، اگرچہ زیادہ ہوئے، پیش گوئی میں یہ نہیں ہے، کہ ایسا کب ہوگا، پیشین گوئی صرف اتنی ہے، کہ جب یہ دونوں سلطنتیں اپنے آخری حکمران کے ساتھ ختم ہو گئیں، تو پھر دوبارہ ان کی حکومتیں قائم نہیں ہوں گی۔ برق صاحب آپ کو یہ تو اعتراف ہے، کہ کسری کے متعلق یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اور حرف بحرف پوری ہوئی، لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ یہ پیشین گوئی بھی پوری نہیں ہوئی، اس لئے کہ آپ نے تو یہ فرمایا تھا کہ کسری (یعنی خسرو پرویز) ہلاک ہو گیا، تو پھر کوئی کسری نہیں ہوگا، لیکن باوجود اس کے کہ خسرو ہلاک ہو گیا، مگر کسری پھر بھی ہوئے، آخر اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ خسرو کی ہلاکت کے بعد اگر ایک کسری بھی بادشاہ ہوتا، تو بھی یہی اعتراض ہوتا کہ پیشین گوئی صحیح نہیں نکلی، لیکن آپ فرماتے ہیں کہ حرف بحرف پوری ہوئی، جو تو جیسے اس کی آپ فرمائیں گے، وہی قیصر کے متعلق بھی سمجھ لیجئے گا۔

کسری خاندان اس لئے جلد ختم ہو گیا کہ اس کے حق میں اس کی ذلیل حرکت کی وجہ سے بددعا کی گئی تھی، قیصر خاندان اس لئے دیر میں ختم ہوا کہ اس نے کوئی ذلیل حرکت نہیں کی، بلکہ بقول آپ کے قاصد رسول کی بڑی تعظیم کی (دوا اسلام ص ۱۷۸) اسی شریفانہ حرکت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بددعا نہیں کی،

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝ (الْاَنْبِيَاء: ۱)

لوگوں کے حساب کا وقت قریب آگیا، اور وہ ابھی تک غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کر رہے ہیں۔



اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے، کہ حساب کا وقت قریب آگیا، لیکن زمانہ شاید ہے، کہ تقریباً ایک ہزار چار سو سال گزر چکے، وقت حساب ابھی تک نہیں آیا، یہ کیسا قرب ہے؟ بات یہ ہے کہ ہم جس کو بعید سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ قریب ہے، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم جس مدت کو دراز سمجھ رہے ہوں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ قصیر ہو، اگر ہم لفظوں پر اس طرح اڑ جائیں، تو پھر قرآن مجید کو بھی اعتراض سے بچانا مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَتْرَبُّدُونَ اَنْ تَهْدُوْا مِّنْ اَهْلًا

کیا تم اس شخص کو راہ راست پر لانے کا ارادہ

اللہ (النساء: ۸۸) کر رہے ہو جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا۔

کیا اللہ کا کام گمراہ کرنا بھی ہے؟ کیا بغیر تاویل کے آپ اس آیت کی صفائی کر سکتے ہیں، اس قسم کی ایک دو نہیں سینکڑوں آیات ہیں، جن کی صفائی بغیر تاویل کے ناممکن ہے۔

”آٹھ سو برس قوموں کی قدرتی عمر ہے، اتنی لمبی زندگی کے بعد اگر کوئی سلسلہ منقطع

بھی ہو جائے تو کوئی عقلمند یہ باور نہیں کرے گا، کہ اس کا خاتمہ کسی پیشین گوئی کی وجہ

سے ہوا تھا“ (ص ۱۷۹)

برق صاحب کو یہاں پھر غلط فہمی ہوئی، وہ بددعا اور پیشین گوئی کو ایک سمجھ رہے ہیں، کسی ازالہ کے خاتمہ کا سبب بددعا کو تو کہا جاسکتا ہے، لیکن پیشین گوئی کو اس خاتمہ کا سبب نہیں کہا جاسکتا۔ پیشین گوئی تو صرف اس بات کا نام ہے، کہ واقعہ کے ظہور سے پہلے اس واقعہ کی خبر دے دی جائے، اگر کسی واقعہ کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہ ہو، تب بھی وہ واقعہ تو ظاہر ہو کر رہتا ہے، اس کے وقوع میں پیش گوئی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

”اگر حضور نے واقعی یہی فرمایا تھا، کہ قیصر کے بعد کوئی اور قیصر نہیں ہوگا، تو آپ کا غلط فہمی اشارہ اس قیصر کی طرف ہوگا، جو اس وقت تخت نشین تھا“ (دو اسلام ص ۱۷۹)

اسی اصول پر اس پیشین گوئی کو بھی پرکھئے، کہ کسری کے بعد اور کوئی کسری نہیں ہوگا، تو آپ ازالہ کا اشارہ اس کسری کی طرف ہوگا جو اس وقت تخت نشین تھا، تو پھر ظاہر ہے، کہ خسرو کی ہلاکت کے بعد کوئی اور بادشاہ نہیں ہونا چاہیے، لیکن ایک نہیں کئی ہوئے، تو پھر پیشین گوئی کا یہ حصہ بھی حرف بحرف پورا نہیں ہوا، لیکن برق صاحب تسلیم کرتے ہیں، کہ کسری والی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی تو پھر بتائیے کہ قیصر والی پیشین گوئی کو حرف بحرف پورا ہونے میں کیا امر مانع ہے؟ اگر برق صاحب تقویٰ سی تاویل کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں، تو حدیث کے دوسرے معانی بھی ہو سکتے ہیں، اور ان معانی کی صورت میں نہ کسری والی پیشین گوئی میں اشکال وارد ہوگا، نہ قیصر والی پیشین گوئی میں۔

کسری اور قیصر دونوں نکرہ واقع ہوئے ہیں، لہذا نہ کسری سے خسرو مراد ہے، نہ قیصر سے ہرقل



سوم کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسری اور قیصر نکرہ ہیں، لہذا ان دونوں سے مراد حکومت و سلطنت ہے، اور اس لحاظ سے پیشین گوئی میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ان سلطنتوں کی تباہی کے بعد آج تک کسری اور قیصر کی حکومتیں پھر دوبارہ قائم نہیں ہوئیں۔

**غلط فہمی** | اگر کوئی غیر مسلم ہم سے پوچھ بیٹھے، کہ کیا تمہارے نبی (علیہ السلام) کی تمام پیش گوئیاں ایسی ہی ہوا کرتی تھیں، تو ہم اس طنز کا کیا جواب دیں گے، بغیر اس کے اس حدیث میں قیصر والا حصہ بعد کا اضافہ تسلیم کریں (دو اسلام ص ۱۸۱)

**ازالہ** | برقی صاحب آپ خاطر جمع رکھیے، غیر مسلم احادیث کی طرف رخ نہیں کرے گا، الا ما اشار اللہ وہ تو قرآن مجید پر اعتراض کرے گا، آپ قرآن مجید پر سے اعتراض کو دور کرنے کے لئے تیار رہیے، مثلاً قرآن مجید میں پیشگوئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (البقرة: ۶) یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس پیشین گوئی میں اس بات کی صراحت ہے، کہ کافر ایمان نہیں لائیں گے، لیکن زمانہ اور تاریخ شاہد ہیں، کہ ایک دو نہیں لاکھوں کافروں نے اسلام قبول کیا، ایمان لائے، تو کیا اس شہادت کی موجودگی میں یہ کہا جاسکتا ہے، کہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اگر کوئی غیر مسلم ہم سے پوچھ بیٹھے، کہ کیا تمہارے قرآن میں ایسی پیشین گوئیاں مندرج ہیں، تو ہم اس کا سوائے تاویل کے اور کیا جواب دے سکتے ہیں، رہی حدیث زیر بحث تو اس کا جواب اوپر دیا ہی جا چکا ہے۔

مذکورہ بالا آیت پر اعتراض کرتے ہوئے دیانند لکھتے ہیں۔

”اور جو جھوٹے راستہ پر ہیں، ان کو یہ قرآن راستہ نہیں دکھلا سکتا، پھر کس کام کا رہا“ اور اس سے اگلی آیت کے متعلق لکھتے ہیں۔

”اگر خدا ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہے، اور اس لئے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا بھی قصور نہیں، یہ قصور بھی خدا ہی کا ہے“ (ستھیار تھہ پر کاش باب ۱۴ ص ۶۹، ۷۰) اب بتائیے اس قسم کی طنزوں کا سوائے تاویل کے اور کیا جواب ہے، جس طرح یہاں تاویل کی ضرورت ہے، اسی طرح بعض احادیث کی بھی تاویل کرنی پڑتی ہے، سوائے تاویل کے نہ وہاں چارہ ہے نہ یہاں، اور اگر تاویل نہ کریں، تو کیا نعوذ باللہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت انسانی اضافہ ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں تو بس پھر انصاف کی ضرورت ہے۔

**غلط فہمی** | حضرت سلیمان نے اللہ تم میں مسجد اقصیٰ کی بنیاد ڈالی تھی، اگر عام تاریخوں پر اعتبار کرتے ہوئے ہم حضرت ابراہیم کی تاریخ وفات اندازاً ۲۰۰۰ ق م قرار



دیں، اور مکہ کی تعمیر ۲۰۷۰ کے قریب فرض کریں، تو تعمیر مکہ اور تعمیر بیت المقدس کے درمیان ۱۰۵۹ برس کا زمانہ بنتا ہے..... لیکن بخاری کی ایک حدیث کے مطابق یہ زمانہ صرف چالیس سال بنتا ہے..... ہے کوئی محدث جو اس صریح تاریخی غلط بیانی کی کوئی تاویل پیش کر سکے۔  
(دو اسلام ص ۱۸۳-۱۸۴)

**ازالہ** | برق صاحب صحیح بخاری کا تو اعتبار کیا جاسکتا ہے، یہاں ہر چیز باسند ہے، رہی تاریخ تو اس کا اعتبار کیسے ہو سکتا ہے، وہاں الا ماشاء اللہ ہر چیز بے سند، من گھڑت، لہذا ہم تو یہ کہتے ہیں کہ صحیح بخاری کی مدت صحیح ہونی چاہیے، اور تاریخ کی غلط، لیکن بات درحقیقت یہ ہے کہ نہ صحیح بخاری کی مدت، غلط ہے نہ تاریخ کی، برق صاحب کو غلط فہمی ہوگی، تاریخ میں بنائے ابراہیم علیہ السلام اور بنائے سلیمان علیہ السلام کی درمیانی مدت کا ذکر ہے اور صحیح بخاری میں ان دونوں کی بنائے اولین کی درمیانی مدت کا بیان ہے۔

**غلط فہمی** | اگر حقیقتہً مسجد اقصیٰ ایک مرتبہ پہلے بن چکی تھی تو تاریخی ثبوت لایئے، کوئی کتاب سند یا روایت پیش کیجئے۔ (دو اسلام ص ۱۸۴)

**ازالہ** | تاریخی ثبوت کی ہمیں کیا ضرورت؟ تاریخ کا کیا اعتبار؟ کتاب جو پیش کی جا رہی ہے، وہ صحیح بخاری ہے، سند جو پیش کی جا رہی ہے، وہ ٹھوس و مستند ہے، کتاب بھی اصح الکتاب بعد القرآن، مقبول انام، اور سند بھی ٹکسالی، بھلا اس کو تقویت دینے کے لئے کسی تاریخ کے ضعیف، غیر مستند حوالہ کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ فلاں تاریخی واقعہ کے لئے صحیح بخاری سے تائید کوئی روایت پیش کیجئے، لیکن اس کا عکس بالکل نامناسب اور لایعنی ہے۔

### حدیث زیر بحث اور تاریخ

ہمیں ضرورت تو نہیں کہ صحیح بخاری کی تائید میں کوئی کتاب یا روایت پیش کریں، لیکن برق صاحب کی خاطر یہ مطالبہ بھی پورا کئے دیتے ہیں، امام قرطبی فرماتے ہیں۔

قَدْ رَوَى أَنَّ أَوَّلَ مَنْ بَنَى الْبَيْتَ آدَمُ

(حاشیہ ناسی مرتبہ اشفاق الرحمان صاحب مطبوعہ مکتبہ جیمیہ دہلی) پہلے آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔

عطاء، سعید بن مسیب، عمرو بن دینار اور معمر کہتے ہیں کہ کعبہ کو سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ (مصنف عبدالرزاق جلد ۵ ص ۹ تا ۹۴)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

ذَكَرَ ابْنُ هِشَامٍ فِي كِتَابِ التَّيْجَانِ ابْنُ هِشَامٍ نَعَى كِتَابَ التَّيْجَانِ فِي لُكْهَاتِهِ



جب آدم علیہ السلام کعبہ تعمیر کر چکے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیت المقدس کی طرف جانے کا حکم دیا، اور اس کو بنانے کا حکم دیا، پس آدم علیہ السلام نے اس کو بنایا، اور اس میں عبادت کی،

إِنَّ آدَمَ مَرَّ لَمَّا بَنَى الْكَعْبَةَ أَمَرَكَ  
اللَّهُ تَعَالَى بِالسَّيْرِ إِلَى بَيْتِ الْمُقَدَّسِ  
وَأَنْ يُبْنِيَهُ فَبَنَاهُ وَفَسَكَ فِيهِ  
فَتَحَ الْبَارِئُ كِتَابَ بَدْعِ الْخَلْقِ  
جزء ۱ ص ۲۱۹

لہذا حدیث زیر بحث میں جن عمارتوں کا ذکر ہے، وہ آدم علیہ السلام کی تعمیر کردہ عمارتیں ہیں، نہ کہ ابراہیم اور سلیمان عمارتیں، لیجئے اب تو تاریخ سے بھی حدیث کی تائید ہو گئی، برق صاحب ذرا تحقیق سے کام لیتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی، اس کی مزید تائید کے لئے مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

یعنی حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کرتے وقت وادی عسفان سے گزرے، تو آپ نے دریافت فرمایا، اے ابوبکر یہ کون سی وادی ہے، انہوں نے عرض کیا یہ وادی عسفان ہے، آپ نے فرمایا، یہاں سے ہود اور صالح بھی سرخ اونٹنیوں پر گزرے ہیں، ان کے ازار عبا تھیں اور ان کی چادریں نمود کی تھیں وہ لبیک کہتے تھے اور اس بیت عتیق (یعنی کعبہ) کا حج کرتے تھے۔

(۱) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا مَرَّ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَادِي  
عُسْفَانَ جِئْنِ حَجَّ قَالَ يَا أَبَا بَكْرٍ أَعَلَى  
وَادِي هَذَا قَالَ وَادِي عُسْفَانَ قَالَ لَقَدْ  
مَرَّ بِهِ هُودٌ وَصَالِحٌ عَلَى بَكَرَاتٍ  
حُمْرٍ حَطَمُوا إِلَيْكَ أَرْزُهُمُ الْعَبَاءُ  
وَأَرْزُهُمُ الْيَمَارُ يَلْبَتُونَ يَحْجُونَ  
الْبَيْتَ الْعَتِيقَ (مسند امام احمد  
وسندہ حسن فتح ربانی ج ۲ ص ۴۲)

کیونکہ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہے لہذا کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی موجود تھا۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اللہ نے جبریل کو آدم کے پاس بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کو بنائیں، پس آدم نے اس کو بنایا۔

بَعَثَ اللَّهُ جَبْرِيْلَ إِلَى آدَمَ فَأَمَرَهُ  
بِبِنَاءِ الْبَيْتِ فَبَنَاهُ آدَمُ  
رواہ البیہقی فی الدلائل وسکت علیہ الحافظی

فتح الباری کتاب بدع الخلق جزء ۱ ص ۲۱۱

حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں۔

جب طوفان (نوح علیہ السلام) کا زمانہ آیا تو کعبہ کو اٹھایا گیا۔

(۳) لَمَّا كَانَ زَمَنُ الطُّوفَانِ رُفِعَ الْبَيْتُ  
(تفسیر ابن ابی حاتم) سکت علیہ الحافظ



## حدیث زیر بحث اور صحیح بخاری

صحیح بخاری کی حدیث مذکورہ مع اپنے سیاق و سباق کے خود اس کی تشریح کے لئے کافی ہے، حضرت ابو ذرؓ کا سوال ملاحظہ فرمائیے۔ وہ پوچھتے ہیں :-

أَيُّ مَسْجِدٍ وَضِعَ فِي الْأَرْضِ أَوَّلُ  
 (صحیح بخاری کتاب بد الخلق) روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی۔

کیا اس سوال کے بعد بھی کہا جاسکتا ہے کہ سوال سے مراد بنائے ابراہیمی ہے، کیا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے مساجد نہیں تھیں، ضرور تھیں، لہذا سوال اپنی جگہ پر واضح ہے، کہ انسانی آبادی کے بعد جو مسجد سب سے پہلے بنائی گئی وہ کون سی تھی، اور یہ وہی مسجد ہو سکتی ہے جس کو آدم علیہ السلام نے بنایا ہو، لہذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے۔

## حدیث زیر بحث اور قرآن مجید

برق صاحب تو حدیث کی تائید میں تاریخی حوالہ کا مطالبہ کرتے ہیں ہم حدیث کی تائید میں قرآن مجید کی آیات پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي  
 بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ

سب سے پہلا گھر جو انسانوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور عالمین کے لئے ہدایت۔

(الاعمال: ۹۶)

اگر اس سے مراد بنائے ابراہیمی ہے، تو جو اعتراض حدیث پر تھا، وہی قرآن پر ہوگا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے سینکڑوں پیغمبر دنیا میں تشریف لائے، کیا کسی نے مسجد نہیں بنائی؟ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے مسجد بنائی، یہ بات بالکل قرین قیاس نہیں، برق صاحب بات دراصل یہ ہے کہ آپ تو خیر صحیح حدیث کو مانتے تو ہیں، کہیں کہیں آپ کو غلط فہمی ہو جاتی ہے، بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو قطعاً حدیث کو نہیں مانتے، حدیث پر لغو قسم کے اعتراض کرتے رہتے ہیں، معلوم نہیں کس وجہ سے وہ اس قسم کا اعتراض قرآن مجید پر نہیں کرتے، اور پھر اس کی صحت کا انکار نہیں کرتے، غالباً اس کی وجہ یہی ہوگی کہ وہ اپنے گمان میں یہ سمجھتے ہیں کہ پھر ہمیں مسلم کون کسے گا، حدیث کی مخالفت اور قرآن مجید کے موافقت سے بہر حال نادان لوگ ہمیں مسلم تو سمجھ لیتے ہیں، اور ہماری بات سن لیتے ہیں، اور مان لیتے ہیں، اگر قرآن مجید کا انکار کریں، یا اس پر اعتراض کریں، تو کوئی کچھ سننے گا ہی نہیں حالانکہ وہ غلط فہمی میں



بتلا ہیں، وہ مسلم رہ کر بھی قرآن مجید کا انکار کر سکتے ہیں، وہ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں، قیامت پر، فرشتوں پر، کتب سماوی پر اور رسولوں پر ہمارا ایمان ہے، لیکن یہ قرآن وہ قرآن نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا، اس میں تحریف ہو چکی ہے، اور مسلمانوں کا ایک حجم غصہ اس تحریف پر ایمان رکھنا ہے، اور خود قرآن مجید کی عبارت بھی اس کی شاہد ہے، وہ یہ کہ از روئے قرآن مجید روئے زمین پر سب سے پہلی مسجد بنائے ابراہیمی ہے، یہ ایک تاریخی غلطی ہے، جو کسی دشمن اسلام نے پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے قرآن مجید میں داخل کر دی ہے، وغیرہ وغیرہ، کاش یہ لوگ حدیث کا انکار کرنے سے پہلے قرآن مجید پر بھی نظر ڈال لیتے۔

## حدیث زیر بحث کی تائید میں ایک اور قرآنی شہادت

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ  
الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا  
إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝  
(البقرة: ۱۲۷)

اور وہ وقت یاد کرو جب حضرت ابراہیم اور  
حضرت اسماعیل علیہما السلام کعبہ کی بنیادوں کو اٹھا  
رہے تھے، اور وہ دعا کر رہے تھے کہ ہمارے رب  
اس خدمت کو ہم سے قبول فرما بیشک تو سمیع و علیم ہے۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: اول :- بنیادیں پہلے سے موجود تھیں، جن کو اٹھایا جا رہا تھا،  
یعنی کعبہ پہلے کبھی تعمیر ہو چکا تھا، جس کی بنیادیں باقی رہ گئی تھیں، حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں۔

وَفِي هَذَا السِّيَاقِ مَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ  
قَوَاعِدَ الْبَيْتِ كَانَتْ مَبْنِيَّةً قَبْلَ  
إِبْرَاهِيمَ (تفسیر ابن کثیر ج اول ص ۱۴۹)

اس سیاق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ  
کی بنیادیں تعمیر ابراہیم علیہ السلام سے پہلے  
موجود تھیں۔

دوم: کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی شریک تھے، دوسری آیت میں ارشاد باری ہے۔

رَبَّنَا آتِنَا ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ  
غَيْرِ ذِي زُرْعَةٍ غِنَىٰ عَنِ الْخَرْمِ  
(ابراہیم: ۳۷)

ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں اے ہمارے رب  
میں نے اپنی اولاد کو اس بنجر وادی میں تیرے  
با حرمت گھر کے پاس آباد کر دیا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ اسماعیل علیہ السلام کے آباد کرنے سے پہلے وہاں کوئی با حرمت مسجد  
موجود تھی، جس کا قرب حاصل کرنے کے لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وہاں آباد کیا گیا، آباد کرنے کا  
واقعہ اسماعیل علیہ السلام کی شیر خوارگی کے زمانہ میں واقع ہوا تھا، ظاہر ہے کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام  
کی تعمیر کردہ کعبہ کی عمارت وہاں موجود نہ تھی، کیونکہ وہ تو بعد میں بنی، اور اسماعیل علیہ السلام کی جوانی کے زمانہ



الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي هُوَ  
بَارَكْنَا خَوْلَهُ (بنی اسرائیل: ۱)  
کعبہ سے بیت المقدس، وہ بیت المقدس جس کے  
آس پاس کے علاقے کو ہم نے بابرکت بنایا ہے۔  
غرض یہ کہ بیت المقدس اور اس کے آس پاس کا علاقہ مقدس و بابرکت تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے  
موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کہ جو تیاں اتار دو، دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَانْتَقَبْنَا مِنْهُمْ فَأَخَذْتُهُمْ فِي الْيَمِّ  
بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا  
غَافِلِينَ ۝ وَأَوْثَقْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ  
كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ  
وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ  
كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ  
(الاعراف: ۱۳۶، ۱۳۷)  
پھر ہم نے قوم فرعون سے انتقام لیا، اور ان کو  
دریا میں غرق کر دیا، اس وجہ سے کہ انہوں نے  
ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، اور اس سے غفلت برتی  
تھی پھر ہم نے اُس قوم کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس سرزمین کے مشرق  
و مغرب کا وارث بنا دیا، جہاں کہ ہم نے برکت  
رکھی تھی، اور (اس طرح) بنی اسرائیل پر آپ کے  
رب کی نعمت پوری ہو گئی۔

اس آیت میں بھی شام و فلسطین کی برکت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ہجرت کر کے  
وہیں چلے گئے تھے، اور یہ برکت اس سرزمین میں موسیٰ علیہ السلام سے قبل ایک زمانہ سے چلی آرہی تھی۔  
ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے۔

يَقُولُ مِمَّا دَخَلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ  
الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ (المائدة: ۲۱)  
(حضرت موسیٰ نے فرمایا) اے قوم اس ارض مقدس  
میں داخل ہو جاؤ، یہ اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا اس سرزمین کو مقدس فرمانا، اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب وہ زمین پہلے  
سے مقدس چلی آرہی ہو، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک وہاں کوئی بیت المقدس نہ ہو محض زمین مقدس  
نہیں ہو سکتی۔ پس ثابت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے صدیوں پہلے اس سرزمین میں بیت المقدس  
تعمیر ہو چکا تھا، قرآن مجید سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بیت المقدس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر  
کیا، ہاں یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے بیت المقدس کو تعمیر کیا گیا تھا، اور  
اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کو بنایا تھا، تو یہ بنائے ثانیہ ہوگی، نہ کہ  
بنائے اولین، اس لئے کہ بنائے اولین تو موسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے بن چکی تھی۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث زیر بحث میں کعبہ اور بیت المقدس کی اولین تعمیر کا ذکر ہے، ہو  
ابراہیم علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے بنائی گئی تھیں، اور ان دونوں تعمیر کی درمیانی مدت  
چالیس سال تھی، کاش برق صاحب قرآن مجید کا غور سے مطالعہ فرماتے تو ان دونوں عمارتوں کی بنائے اولین کا  
ثبوت انہیں قرآن مجید ہی میں مل جاتا، اور یہ غلط فہمی نہ ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ حدیث فہمی میں غلطی ہوتی



ہی اس وقت ہے جب کہ اس ضمن میں قرآن مجید سے پوری طرح واقفیت نہیں ہوتی۔

**غلط فہمی** | اگر ہم یہ کہہ دیں، ممکن ہے، کہ امریکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا، تو کیا آپ مان لیں گے۔ (دو اسلام ص ۱۸۴)

**ازالہ** | یہ بات اگر آپ اپنی طرف سے کہیں گے، تو ہم نہیں مانیں گے، اگر آپ آیت یا حدیث پیش کریں گے تو ہم ضرور مان لیں گے، آیت اور حدیث کا تعلق ایمان سے ہے، ہمارا ایمان ہے، کہ آیت یا حدیث کی خبر غلط نہیں ہو سکتی، اس کا صحیح ہونا یقینی ہے، لہذا یقینی چیز کو تاریخی خرافات کے بل بوتے پر ہم ہرگز نہیں چھوڑ سکتے، مثلاً ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید کے مطابق سب سے پہلی مسجد کعبہ ہے، لیکن کعبہ تاریخی روایات کی بنا پر اور خود قرآن مجید کی تصریح کی بنا پر ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے، لہذا اس کے سب سے پہلی مسجد مان لینے سے یہ اشکال پیدا ہوگا کہ گویا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کوئی مسجد بنی ہی نہیں اور یہ ناممکن ہے، لہذا اس اشکال کو دور کرنے کے لئے ہم یہی کہیں گے کہ ممکن ہے کہ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے اس کو بنایا ہو، اور ابراہیم علیہ السلام نے صرف تجدید کی ہو، لیکن اس اشکال کی وجہ سے ہم کبھی یہ نہ کہیں گے کہ یہ آیت ہی محل نظر ہے، ممکن ہے انسانی اضافہ ہو، برق صاحب کا یہ کہنا کہ ”ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔“ یا ”تاویل کرنا“ اسی لئے ضروری ہوتا ہے کہ یقینی چیز پر شک نہیں کیا جاسکتا۔

**غلط فہمی** | سیرت کی تمام کتابیں اس حقیقت میں متفق ہیں کہ حضور علیہ السلام کی عمر تریسٹھ برس تھی، حضرت عائشہؓ کی روایت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔

عن عائشۃ ان النبی صلعہ توفی کہ نبی کریم صلعہ نے تریسٹھ سال کی عمر  
وہو ابن ثلاث وستین میں رحلت کی (بخاری جلد ۲ ص ۱۷۵)

لیکن حضور کے خادم خاص حضرت انس جو ۱۲۶۸، احادیث کے راوی بھی ہیں، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعہ کی عمر ساٹھ برس تھی..... (دو اسلام ص ۱۸۵)

”بے شمار کتب سیرت کی شہادت اور ابن عباسؓ و عائشہؓ کی روایت کی روشنی میں حضرت انسؓ کی روایت قطعاً غلط ہے۔ حیرت ہے کہ امام بخاری نے اس غلط روایت کو اپنی ”صحیح“ میں کیوں جگہ دی اور زیادہ حیرت اس امر پر کہ جس انس کو اپنے آقا، رہبر اور پیغمبر کی عمر تک معلوم نہیں تھی اس کی باقی ۸۳ روایات کو امام بخاری نے کیسے صحیح سمجھ لیا۔“ (دو اسلام ص ۱۸۶)

**ازالہ** | برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، حضرت انسؓ نے وہابیوں کا ذکر کیا ہے، اور تین سال کی مدت کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، یہ نہیں کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر معلوم نہیں تھی، معلوم تھی اور ضرور معلوم تھی، حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔

قُضِيَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ برس



میں بنائی گئی وہ بھی اس تعمیر میں شریک تھے، اگر آباد کرنے کا واقعہ بعد کا واقعہ ہے، تب تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کرنے کے بعد اس باحرمیت گھر کی قربت و برکت حاصل کرنے کے لئے حضرت اسمعیل علیہ السلام کو وہاں آباد کیا، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ آباد پہلے کیا گیا اور کعبہ بعد میں بنایا گیا آباد اس لئے کیا گیا کہ وہاں اللہ تعالیٰ کا باحرمیت گھر تھا، ورنہ اس بے آب و گیاہ ریگستان میں آباد کرنے کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا، کسی دوسری اچھی جگہ بھی آباد کیا جاسکتا تھا، اور وہاں مسجد تعمیر ہو سکتی تھی، لہذا ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے ہو چکی تھی، مرویام سے یا طوفان نوح علیہ السلام میں اس کی غارت منہدم ہو گئی تھی، صرف بنیاد باقی رہ گئی تھی، اور اسی بنیاد پر ابراہیم علیہ السلام نے از سر نو کعبہ کی تعمیر کی تھی، اس کی مزید تائید میں قرآن مجید کی یہ آیت ملاحظہ فرمائیے اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیتا ہے۔

وَاذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (الحج: ۲۷) اور حج کرنے کے لئے لوگوں میں اعلان کر دو۔

پھر فرمایا:۔

ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلِيُوفُوا  
نُذُورَهُمْ وَيُطَوِّفُوا بِالْبَيْتِ  
الْعَتِيقِ (الحج: ۲۹) کریں اور اس بیت قدیم کا طواف کریں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حج کا حکم دیا، تو اس کعبہ کو بیت قدیم کہا تھا، اگر یہ ابراہیم علیہ السلام ہی نے بنایا ہوتا، تو بیت جدید کہنا چاہیے تھا، بیت قدیم کہنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ گھر بہت پرانا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے صدیوں پہلے بنایا گیا تھا۔ اب بیت المقدس کے متعلق قرآن مجید کا فیصلہ سنئے، جب آگ کی تلاش میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچے، تو آواز آئی۔

إِنِّي أَنَارُكَ فَاحْلَمْ تَعْلِيكَ إِنَّكَ  
بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ حَطَوَى (طہ: ۱۲) اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں تم اپنی جوتیاں اتار دو، تم مقدس میدان میں ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ طور پہاڑ اور اس کا میدانی علاقہ پہلے سے مقدس تھا، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب وہاں پہلے سے کوئی بیت المقدس چلا آ رہا ہو، جس کی وجہ سے اس پاس کا علاقہ بھی محترم قرار دے دیا گیا ہو، پس اس آیت سے ظاہر ہوا کہ سلیمان علیہ السلام تو کجا موسیٰ علیہ السلام سے بھی بہت پہلے یہاں کوئی بیت مقدس موجود تھا، جس کی وجہ سے تمام قرب و جوار کا علاقہ بابرکت و باحرمیت تھا، اسی برکت اور حرمت کا ذکر قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بھی موجود ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ  
الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى (البقرہ: ۱۲۵) پاک ہے وہ جو نے گیارہ رات اپنے بندے کو



وہو ابن ثلاث وستین (صحیح مسلم) کی عمر میں ہوئی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ کو اصل عمر بھی معلوم تھی، اور کبھی اکائیوں کو حذف بھی کر دیا کرتے تھے اور صرف دہائیوں کا ذکر کر دیتے تھے، لہذا صرف دہائیوں کی روایت بھی بالکل صحیح ہے اور اسی وجہ سے امام بخاری نے اس کو اپنی صحیح میں شامل کر لیا، حضرت انسؓ سے شمائل نبوی کے ضمن میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا علیہ اور اخلاق ہمارے سامنے آجاتا ہے، برق صاحب کی وارد کردہ مذکورہ بالا روایت ہی میں حضرت انسؓ کے یہ الفاظ بھی ہیں۔

وَلَيْسَ فِي رَأْسِهِ وَلِحْيَتِهِ عَشْرُونَ شَعْرَةً يَبْصُرُ  
وفات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی  
ڈاڑھی اور سر میں بیس بال بھی سفید نہیں تھے۔

غرض حضرت انسؓ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا، حتیٰ کہ سفید بالوں کی تعداد کے متعلق بھی معلومات فراہم کر دیں۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا، کہ یہ بال کہاں کہاں تھے۔ (صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ ه (الصافات: ۱۴۷)  
اور ہم نے یونس کو رسول بنا کر بھیجا، ایک لاکھ  
آدمیوں کی طرف یا اس سے کچھ زیادہ کی طرف۔

کیا اس آیت سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صحیح تعداد معلوم نہ تھی، پہلے ایک لاکھ کہا پھر فرمایا ”یا کچھ زیادہ ہوں گے“ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ بھی خوب ہے جس کو صحیح تعداد بھی معلوم نہ تھی، پھر کیا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر بات کا علم ہے، اس کو تعداد کے متعلق شک ہونا ناممکن ہے لہذا یہ آیت ہی محل نظر ہے؟ کسی دشمن اسلام یہودی کا کارنامہ ہے؟ نعوذ باللہ من ذلک، اللہ تعالیٰ کا یہ ایک طرز بیان ہے، اس میں شک کی گنجائش نہیں، اسی طرح حضرت انسؓ کا ایک طرز بیان ہے (یعنی اکائیوں کا حذف) اور شک کی اس میں گنجائش نہیں۔

**غلط فہمی** | عطاء بن یسار کہتے ہیں، کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا، کہ کیا تورات میں حضور کے متعلق کوئی آیت موجود ہے، کہا کیوں نہیں، آپ کے متعلق یہ آیت تورات میں موجود ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَحُزًّا إِيَّا مِثْلَ مَا تَعْلَمُ  
لے رسول ہم نے تمہیں شاہد، بشیر، نذیر، اور  
ان پڑھ عربوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے، تو  
میرا بندہ اور رسول ہے..... تو نہ ترش  
مراج ہے اور نہ تند طبع الخ  
لیس بلفظ ولا غلیظ

تورات کو ”الف“ سے ”یا“ تک پڑھ جاؤ، یہ الفاظ کہیں نہیں ملیں گے۔ (دوسلاام ص ۱۸۶-۱۸۷)



## ازالہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے اصل الفاظ یہ ہیں :-  
 وَاللّٰہُ اِنَّہٗ لَمَوْصُوْفٌ فِی  
 التَّوْرَۃِ بِبَعْضِ صِفَتِہٖ فِی الْقُرْآنِ .  
 اللہ کی قسم آپ کی بعض صفتیں جو قرآن مجید میں  
 ہیں ، تورات میں بھی ہیں ۔  
 (صحیح بخاری کتاب البیوع)

اس کے آگے وہ الفاظ ہیں جو برق صاحب نے تحریر کئے ہیں یہ حدیث صرف عبداللہ بن عمرو رضی  
 سے مروی نہیں ہے ۔ بلکہ تورات کے مشہور عالم حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے بھی مروی ہے (دارمی ص ۵۱)  
 تورات کے دوسرے مشہور عالم کعب اجبار بھی یہ صفات بیان کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زائد (دارمی ص ۵۱)  
 حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا جب  
 وہ بیمار ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کو گئے ، اس لڑکے کا باپ اس کے سر ہانے بیٹھا ہوا تھا  
 اور تورات پڑھ رہا تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قسم دے کر پوچھا کہ کیا میری صفت تورات  
 میں ہے ؟ اس نے کہا نہیں لڑکے نے بترمرگ پر کلمے شک آپ کی صفت تورات میں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں  
 کہ اللہ کے سوا کوئی آلہ نہیں اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ۔ رواہ البیہقی فی دلائل النبوة مشکوٰۃ باب اسماء  
 النبی صلی اللہ علیہ وسلم :-

اسی طرح ایک روایت حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک  
 یہودی کے مقروض تھے ۔ اس نے آپ کے ساتھ کچھ زیادتی بھی کی اور بعد میں مسلم ہو گیا ، پھر کہا  
 وَاللّٰہِ مَا فَعَلْتُ بِکَ الَّذِیْ فَعَلْتُ  
 بِکَ اِلَّا اَنْظُرُوْا اِلٰی نَعْتِکَ فِی  
 التَّوْرَۃِ ۔  
 میں نے جو کچھ آپ گمے ساتھ کیا اس لئے کیا کہ  
 میں آپ کی صفات کو جو تورات میں ہیں دیکھنا  
 چاہتا تھا ۔

پھر اس شخص نے بھی آپ کی صفات میں تورات کے وہی الفاظ نقل کئے جو برق صاحب کی نقل کردہ  
 حدیث میں ہیں (رواہ البیہقی فی دلائل النبوة مشکوٰۃ باب فی اخلاقہ)

الغرض تورات میں آپ کی توصیف ہونا یہ ایک مسلمہ امر ہے جو بتواتر ثابت ہے لیکن برق صاحب کو  
 اس سے انکار ہے ۔ برق صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو توصیف تورات میں ہے اس کا ذکر تو  
 قرآن مجید میں بھی ہے تو کیا قرآن مجید کا بھی انکار کیا جاسکتا ہے ۔ قرآن مجید میں ہے :-

الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ  
 الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَہُمْ  
 فِی التَّوْرَۃِ وَالْاِنْجِیْلِ  
 جو لوگ رسول ، نبی ، امی کی پیروی کرتے  
 ہیں ۔ جس کے اوصاف کا ذکر تورات اور انجیل  
 میں وہ لکھا ہوا پاتے ہیں



دوسری جگہ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے :-

لَعِبْرَةُ فُؤَادِهِ كَمَا يَجِي فُؤَادُ ابْنَاءِهِمْ

اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح

پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو۔

(البقرة : ۱۴۶)

تیسری جگہ ارشاد ہے :-

مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ

صحابہ کی یہ صفات تورات و انجیل میں بھی

موجود ہیں۔

فِي الْإِنْجِيلِ (الفقرہ : ۲۹)

لیجئے اب تو قرآن سے ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات تورات میں موجود ہیں۔ اب کیا قرآن مجید کی آیات بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ موجودہ تورات میں آپ کی کوئی صفت موجود نہیں۔

”ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ اجی صاحب! تورات میں تو اس قدر تحریف

ہو چکی ہے کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی یہ آیت ملے تو کہاں سے؟

اس کے دو جواب ہیں اول اگر تحریف ہو چکی تھی تو ابن عمر نے وہ آیت کہاں سے دیکھ

لی تھی“ (دو اسلام ص ۱۸)

**غلط فہمی**

بے شک ہم یہی کہتے ہیں کہ تورات محرف ہو چکی ہے لہذا یہ عبارت اس میں نہیں، اب

سوال یہ ہے کہ پھر عبد اللہ بن عمروؓ کو کہاں سے معلوم ہوا۔ اس کے دو جواب ہیں :-

اول :- یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماء مرفوع ہے اس لئے کہ عبد اللہ بن عمروؓ اس قسم کی خبر

خود نہیں دے سکتے۔ بلکہ انہوں نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی اور پھر اس کو بیان

کیا ہوگا یہ حدیث اخبار غیب میں سے ہے اور اس کی تصدیق ایمان بالرسول کا نتیجہ ہے اس کی تکذیب رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ اور ایمان بالرسول کا تقاضا یہ ہے کہ اس حدیث کی روشنی میں موجود

تورات کو محرف سمجھا جائے۔

**ازالہ**

دوم :- اناجیل کے اس وقت چار متداول نسخے ہیں جو عیسائی دنیا میں مستند مانے جاتے ہیں

حالانکہ حقیقتہً انجیل کے یہی چار نسخے نہیں اور بھی نسخے ہیں ان میں سے بعض نسخے ابھی مل جاتے ہیں

جو کہیں کہیں کسی کتب خانے میں دبے پڑے ہیں ان میں سے ایک نسخہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے متعلق فارقلیط والی پیشین گوئی موجود ہے لیکن ان چار مشہور نسخوں میں سے یہ پیشین گوئی خارج کردی گئی

ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تورات کے بھی ایک سے زیادہ نسخے عہد رسالت میں پائے جاتے ہوں اور کسی غیر مشہور

نایاب نسخہ میں حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے یہ صفحات دیکھ لئے ہوں۔

سوم :- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں توریت کے جو نسخے پائے جاتے تھے ان میں آپ کی



یہ صفات یقیناً موجود تھیں جب ہی تو حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب اجبار وغیرہ لوگوں نے ان صفات کو بیان کیا اور قرآن مجید نے بھی ان صفات کا ذکر کیا۔

## عجیب و غریب

برق صاحب نے تاریخی حوالے اور مسیحی مصنفین کی تصریحات کا تذکرہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تورات میں تحریف ہوئی لیکن ان تمام تاریخی مندرجات اور محققین کے فیصلوں کو صحیح تسلیم نہیں کیا بلکہ قرآن مجید کی روشنی میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تورات میں تحریف نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ اب بھی ویسی ہی موجود ہے جیسے نازل ہوئی تھی۔ ہم بھی برق صاحب کی خاطر اسے تسلیم کئے لیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی ہی کتاب کے صفحہ ۳۴۷ پر لکھتے ہیں کہ ”ہر وہ حدیث بلا دروغ ٹھکرا دی جائے جو مسلمہ تاریخی واقعات کی تردید کرتی ہو“ (دوا سلام) تو اب ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ تحریف تو مسلمہ تاریخی واقعہ ہے۔ لہذا جس آیت سے تحریف کی تردید ہوتی ہو وہ قابل رد ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر مسلمہ تاریخی واقعہ کے خلاف آیت صحیح ہو سکتی ہے تو حدیث کیوں نہیں ہو سکتی یا پھر یہ کیسے کہ یہ معیار ہی غلط ہے اس لئے کہ اس معیار پر تو قرآن مجید بھی پورا نہیں اترتا۔ تفصیل کے لئے آخری باب ملاحظہ فرمائیں۔

**غلط فہمی** | آخر یہودیوں میں بھی ایسے ہزار ہا اشخاص موجود ہوں گے جنہیں اپنی کتاب سے اسی طرح محبت ہوگی جس طرح ہمیں قرآن مجید سے۔ (دوا سلام ص ۱۸۸)

**ازالہ** | جی ہاں! انہیں ایسی ہی محبت ہوگی جیسی ایک عظیم نام نہاد مسلم فرقہ کو قرآن مجید سے ہے جو قرآن مجید کو محرف خیال کرتا ہے یا جس طرح ہمارے پیٹ پرست علماء کو معنوی تحریف کے باوجود قرآن مجید سے محبت ہے۔

**غلط فہمی** | دوم۔ حضرت مسیح نے اعلان کیا تھا ”جب تک زمین و آسمان نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا شوشہ تورات سے ہرگز نہیں ملے گا“ اگر تورات محرف ہو چکی تھی تو حضرت

مسیح اتنے زور سے یہ اعلان کیوں کرتے (دوا سلام ص ۱۸۸)

**ازالہ** | برق صاحب گویا آپ کے نزدیک موجودہ اناجیل میں جو کچھ ہے سب صحیح ہے، حالانکہ یہ اناجیل تحریف شدہ بلکہ وضع کردہ کتب ہیں ان کے مضامین میں تناقض و تضاد ہے قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری سابق جج ریاست پٹیالہ تحریر فرماتے ہیں۔

”ان میں اتنا تناقض موجود ہے کہ تطبیق دینا سخت دشوار ہے، آدم کلارک، نورٹن اور ٹارن صاحب انجیل کے مشہور شارح ہیں۔ تینوں کا متفقہ قول ہے کہ تطبیق کی کوئی صورت



موجود نہیں، پادری فریچ کو اقرار ہے کہ ان انجیلوں کی چار پانچ آیتوں میں تحریف بھی ہوئی ہے، نیز وہ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ ان میں جھوٹی موٹی تیس ہزار غلطیاں موجود ہیں (رحمتہ للعالمین جلد ۳ ص ۳۱۶-۳۱۷)

برق صاحب آپ نے انجیل کی اصل نازل شدہ عبارت نقل نہیں کی بلکہ صرف ترجمہ کا ترجمہ نقل فرمایا ہے لہذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ نقطہ یا شوشہ سے کیا مراد ہے اگر اس سے رسم الخط مراد ہے تو برق صاحب وہ تو معدوم اور ناپید ہے جس زبان میں تورات نازل ہوئی اس زبان میں تورات کہیں نہیں اور اگر اس سے احکام مراد ہیں تو یہ بھی ٹل گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے احکام کو بدل دیا، قرآن مجید میں ہے:-

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ  
وَلِأَنَّهُ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ  
عَلَيْكُمْ۔ (آل عمران: ۵۰)

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور میں اس لئے آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام کی گئی ہیں ان کو حلال کر دوں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے احکام کو بدل دیا تھا۔ ورنہ توریت کی موجودگی میں انجیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لہذا توریت کا شوشہ تک نہ بدلتا حمل ہے۔ یا پھر نزول انجیل لغو و عبث فعل ہے۔ الغرض یہ قول جو برق صاحب نے نقل کیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف غلط منسوب ہے۔

**غلط فہمی** ”حضرت مسیح کے عہد تک توریت اپنی اصلی حالت میں باقی تھی اور نجات لغو وغیرہ کی حکایات فرضی ہیں“ (دوا سلام ص ۱۸۹)

**الزوالہ** گویا موجودہ انجیل صحیح ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذکورہ بالا قول نقل کیا گیا ہے اور نجات لغو کا حملہ جو ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے غلط ہے۔ اگر یہ معیار صحیح ہے تو ہمیں بھی کہنے دیجئے کہ جو حدیث صحیح ہے وہ صحیح ہے اور جو تاریخی واقعات اس کے خلاف ہیں وہ فرضی ہیں۔ برق صاحب آپ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ کی صرف اس لئے تکذیب کر رہے ہیں کہ وہ آپ کے اس مفروضہ کے خلاف ہے۔ کہ ”انا جیل اپنی اصلی حالت میں باقی ہیں“ حالانکہ انا جیل اربعہ میں تناقض اور تضاد خود اس بات کی اندرونی شہادت ہے کہ موجودہ انا جیل سب جعلی ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی جعلی ہے۔

**غلط فہمی** ”سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہمیں سابقہ اہکام کی مخالفت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اگر وہ کتابیں محرف ہو چکی ہوتیں اور غلط سلط متھیں۔ تو ان پر ایمان لانے کا مقصد“ (ص ۱۸۹)



## ازالہ

برق صاحب! کتب سابقہ پر ایمان لانے کا حکم اب بھی باقی ہے یا اب نہیں ہے  
 صرف عہد رسالت تک تھا؟ اگر اب ایمان لانے کا حکم نہیں ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ  
 کہ یہ آیتیں منسوخ ہیں۔ اگر یہ حکم صرف عہد رسالت میں تھا تو کیا اس زمانہ میں تمام کتب سماویہ غیر محرف طور  
 پر موجود تھیں؟ اگر تھیں تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام انہیں پڑھا کرتے تھے۔ اگر جواب اثبات  
 میں ہے تو براہ کرم اس کا ثبوت دیجیئے۔

اگر یہ کتب سماویہ عہد رسالت میں تھیں اور بعد میں ضائع ہو گئیں تو کیا قرآن مجید کی طرح ان کی  
 حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا تھا؟ ان کتب سماویہ سے تو احادیث ہی اچھی رہیں، کہ ان کی حفاظت بہ  
 تمام و کمال ہوئی۔ اگر ان کتب سماویہ پر ایمان لانا اب بھی فرض ہے تو کیا یہ کتب سماویہ اب غیر محرف موجود  
 ہیں؟ کیا کتاب نوح علیہ السلام، کتاب ہود علیہ السلام، کتاب صالح علیہ السلام کہیں موجود ہیں؟ کیا  
 صحف ابراہیم علیہ السلام، صحف لوط علیہ السلام، صحف یوسف علیہ السلام کہیں سے دستیاب ہو سکتے  
 ہیں؟ اگر ہو سکتے ہیں تو براہ کرم ان کا پتہ بتائیے اور اگر کہیں نہیں، ضائع ہو گئے تو پھر ان پر ایمان لانے  
 کا مقصد بتائیے۔ جو مقصد آپ کے ذہن میں آجائے اسی کو اپنے سوال کا جواب سمجھ لیجئے وہی تورات و انجیل  
 پر ایمان لانے کا مقصد ہوگا۔

”کیا خدا کو علم نہیں تھا کہ توریت میں تصرف ہو چکا ہے اگر علم تھا تو تصدیق  
 کیوں کی۔ کیا کوئی مجسٹریٹ کسی جعلی دستاویز کی دیدہ دانستہ تصدیق  
 کر سکتا ہے؟“ (دوا سلام ص ۱۹)

## غلط فہمی

اللہ تعالیٰ نے موجودہ تورات کی تصدیق کہیں نہیں کی۔ جو آیات آپ نے نقل کی ہیں ان  
 کا جواب آگے آ رہا ہے۔

## ازالہ

آپ کہیں گے کہ اللہ نے اصلی تورات کی تصدیق کی تھی نہ کہ صحیفہ راسخہ کی  
 بہت اچھا، تو پھر قرآن نے یہ کیوں کہ دیا۔

## غلط فہمی

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ  
 اے رسول اہل کتاب سے کہہ دو کہ جب تک  
 وہ تورات و انجیل پر عمل نہیں کریں گے، ان کی  
 بڑوسی کبھی نہ بن سکے گی۔

اگر یہ کتابیں انسانی دست بڑوسے ناپاک ہو چکی تھیں تو اہل کتاب کو ان پر عمل کرنے  
 کی دعوت کیوں دی؟؟؟ (دوا سلام ص ۱۹)

اصلی تورات اور اصلی انجیل پر عمل کرنے کی دعوت بے شک دی گئی ہے لیکن اس سے  
 یہ کہاں ثابت ہوا کہ موجودہ تورات و انجیل پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر

## ازالہ



برق صاحب نے پوری آیت بھی نقل نہیں فرمائی جو اس تمہید کی غرض و غایت ہے اور وہ یہ ہے:-

وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ  
وَلَا يَزِيدَنَّ كِتَابًا مِّنْهُم مَّا أُنْزِلَ  
إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا هـ  
(المائدہ: ۶۸)

تمہاری بگڑی کبھی نہیں بن سکتی جب تک کہ تم (تورات  
اور انجیل) اور اس چیز پر عمل نہ کرو جو تمہارے رب کی  
طرف سے تمہاری طرف نازل ہوئی ہے اور اے رسول جو  
چیز آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اس سے ان میں سے  
بہت سے لوگوں کی سرکشی اللہ کفر میں ضرور زیادتی ہوگی۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور بغیر اس کے فلاح نہیں اور اکثر  
اہل کتاب اس کے قائل نہیں ہیں، بلکہ قرآنی آیات سے ان کی سرکشی اور کفر زیادہ ہوتا تھا۔ برق صاحب  
آپ تو اہل کتاب کو مسلم سمجھتے ہیں خواہ وہ قرآن مجید پر ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ قرآن مجید پر عمل کریں یا نہ کریں۔  
لیکن اس آیت میں اس کی تردید ہے۔ قرآن مجید پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے تورات و انجیل کی  
طرف ضمناً دعوت ہے اس لئے کہ ان کتابوں کی دعوت ہی ہے کہ آنے والے رسول پر ایمان لایا جائے۔ اور  
اس کی شریعت پر عمل کیا جائے تو جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی کتاب کا انکار کرتا ہے وہ گویا  
تورات و انجیل کو بھی نہیں مانتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دعوت دی کہ تورات و انجیل کو پوری طرح مانو، یعنی  
ان کی ہدایت کے مطابق قرآن مجید کو مانو۔ اور اس پر عمل کرو۔

**غلط فہمی** ”وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ“ اور ان کے پاس توراۃ موجود ہے  
جس میں اللہ تعالیٰ کا حکم درج ہے، یہ نہیں فرمایا کہ درج تھا۔ بلکہ درج

ہے۔ نحو کا مشہور قاعدہ ہے کہ جہاں جار مجرور کا تعلق مذکور نہ ہو وہاں موجود یا کائن  
محذوف و مضمر کر لیا اس قاعدہ کی رو سے آیت کے معنی ہوں گے۔ تورات میں اللہ کا حکم  
موجود ہے“ (دوا سلام صفحہ ۱۹۱-۱۹۲)

**ازالہ** یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ ساری تورات محرف ہے بے شک موجودہ تورات میں بھی اللہ  
تعالیٰ کے بعض احکام من وعن محفوظ ہیں، شان نزول کے لحاظ سے یہ ارشاد باری ایک  
خاص حکم کے متعلق تھا جو تورات میں اس وقت بھی موجود تھا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے واحد کا صیغہ ”حکم“  
استعمال فرمایا ہے۔ پوری تورات کے محفوظ ہونے کی صراحت نہیں کی۔ پوری آیت درج  
ذیل ہے:-

وَكَيْفَ يُحْكِمُ اللَّهُ لَكُمْ التَّوْرَةَ  
فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ  
ذَلِكَ - (المائدہ: ۴۳)

یہ لوگ آپ کو کیسے حکم تسلیم کر سکتے ہیں حالانکہ ان  
کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے  
باوجود اس کے یہ لوگ اس سے بھی منہ موڑ لیتے ہیں۔



یعنی جس کتاب پر ایمان ہے اس سے منہ موڑ لیتے ہیں، تو آپ پر تو ایمان بھی نہیں۔ آپ کو کیسے ”حکم“ مان سکتے ہیں۔ یہ چیز بعید از قیاس ہے اگر آپ کو حکم مان لیں تو پھر تورات کا حکم مانتے سے کیا امر مانع ہو سکتا ہے حالانکہ دونوں جگہ حکم ایک ہی ہے۔ انہیں تو وہ حکم ماننا ہی نہیں لہذا وہ آپ کو بھی ”حکم“ نہیں بتا سکتے، آپ کا حکم ماننا گویا پھر تورات کے اسی حکم کو مان لیتا ہے جس سے اعراض کر چکے ہیں (نخوی قاعدہ کا جواب آگے رہا ہے)

**غلط فہمی** | ”إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ“ (قرآن) ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور موجود ہے (دوسلام ص ۱۹۱)

**ازالہ** | نخو کے جس قاعدہ کی رو سے آپ نے مندرجہ بالا ترجمہ کیا ہے اور جس قاعدہ کا ذکر آپ اوپر کر چکے ہیں اس قاعدہ کے لحاظ سے صرف لفظ ”موجود“ آپ لگا سکتے ہیں، زمانہ کا تعین اس قاعدہ سے نہیں ہوگا، لہذا ”موجود تھا“ اور ”موجود ہے“ دونوں کا احتمال ہے اور محض احتمال سے آپ اپنے مطلب کو ثابت نہیں کر سکتے۔

**غلط فہمی** | ”میک املایت ملا حظہ ہو: وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكْفَرُوا مِنْ فَوْقِهِمْ..... الخ

اگر یہود و نصاریٰ ان کتابوں پر ایمان لا کر نیک بن جاتے جو ان پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں تو وہ ہمارے انعامات کے مستحق بن جاتے۔

اس آیت میں اہل کتاب کو تورات و انجیل پر ایمان لا کر نیک بننے کی ترغیب دی ہے، اگر یہ کتابیں غلط تھیں تو اللہ نے ان پر ایمان لانے کا حکم کیوں دیا؟ (دوسلام ص ۱۹۱)

**ازالہ** | برق صاحب نے نہ تو آیات کو پورا نقل کیا ہے اور نہ ہی ترجمہ صحیح کیا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے:-

اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے، اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہوں کو معاف کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کر دیتے اور اگر اہل کتاب تورات کو، انجیل کو اور اس چیز کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے قائم کرتے تو ان کو اوپر سے بھی رزق ملتا اور

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكُنَّا نَعْتِمُهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا مُخْلَافَةَ لَهُمْ فِي نِعْمَتِ النِّعِيمِ وَلَوْ أَنَّهُمْ آتَمَوْا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكْفَرُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ۔

(المائدہ: ۶۵، ۶۶)

نیچے سے بھی۔

پہلی آیت میں صاف طور سے اہل کتاب کو ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اور یہ جیب ہی ہو سکتا ہے



کہ پہلے وہ کافر تسلیم کر لئے جائیں۔ دوسری آیت میں تورات اور انجیل کی طرف توجہ مبذول کر کے قرآن مجید پر عمل کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ برق صاحب آپ تو نیک اہل کتاب کو خواہ وہ قرآن مجید پر ایمان لائیں یا نہ لائیں یٹھن سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید اہل کتاب کے متعلق کیا کہتا ہے۔ سنئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ  
وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ  
بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَاِنَّهُ  
مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ  
الظَّالِمِينَ (المائدة: ۵۱)

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست  
نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست  
ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے  
تو وہ انہیں میں سے ہے۔ بے شک اللہ ظالموں  
کو ہدایت نہیں دیتا۔

تمام یہود و نصاریٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے کہ وہ سب ظالم ہیں۔ ان کو دوست نہ  
بنا یا جائے۔

”ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ جب تورات و انجیل اصلی حالت میں موجود تھیں  
تو پھر قرآن اتارنے کی کیا ضرورت تھی اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں لیکن میں

**غلط فہمی**

صرف قرآن کا جواب پیش کروں گا۔

وَهَذَا كِتَابٌ مِّمَّا رُكِّعَ أَنْزَلْنَاهُ فَاتَّبِعُوهُ  
وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ أَنْ تَقُولُوا  
إِنَّمَا أَنْزَلَ الْكِتَابَ عَلَى طَائِفَتَيْنِ  
مِنْ قَبْلِنَا وَإِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ  
لَغَافِلِينَ (انعام)

ہم نے تمہیں یہ مبارک کتاب (قرآن) عطا کی  
ہے۔ اسے مانو اور گناہ سے بچو تاکہ تم ہماری رحمت  
کے مستحق بن سکو اب تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے کہ ہم  
سے پہلے دو امتوں (یہود و نصاریٰ) پر کتابیں تو  
نازل ہوئیں تھیں لیکن وہ اجنبی زبان میں تھیں اور  
ہم انہیں سمجھ نہیں سکتے تھے۔

یعنی نزول قرآن کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی کہ پہلی کتابیں مسخ ہو چکی تھیں۔ بلکہ یہ کہ وہ ایسی زبان  
میں تھیں جس سے عرب نا آشنا تھے کیا تورات کی صحت پر اس سے بڑی شہادت پیش کی  
جاسکتی ہے؟ (دو اسلام ص ۱۹۱-۱۹۲)

برق صاحب آپ نے قرآن مجید میں صرف ایک ہی وجہ کو ملاحظہ فرمایا حالانکہ اس کی  
ایک اور بھی وجہ قرآن مجید میں موجود ہے، سنئے۔

**ازالہ**

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا  
يَبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ  
أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ

اے اہل کتاب بے شک تمہارے پاس ہمارا  
رسول آگیا، جو ایسے وقت میں تمہارے لئے  
شریعت کے احکام بیان کرتا ہے جبکہ رسولوں کی آنا



وَلَا نَذِيرٌ فَقَدْ جَاءَكُمْ لَبِئْسُ  
وَنَذِيرٌ ۝

ایک عرصہ سے موقوف مقامیہ رسول اس لئے آیا  
کہ کہیں تم یہ نہ کہہ دو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر و نذیر

(المائدہ: ۱۴)

نہیں آیا پس تمہارے پاس بھی بشیر و نذیر آگیا۔  
اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن صرف عرب کے لئے نازل نہیں ہوا۔ بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی  
نازل ہوا، جن کے پاس بقول برق صاحب کتاب الہی موجود تھی۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کے لئے بھی رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اور یہ کہ قرآن مجید اہل کتاب کی ہدایت  
کے لئے بھی نازل کیا گیا ہے۔

## دوسرا جواب

برق صاحب اگر آپ کی بات تسلیم کر لی جائے کہ قرآن مجید صرف عرب کے لئے نازل ہوا تو پھر سوال  
یہ ہے کہ انجیل کیوں نازل کی گئی؟ کیا بنی اسرائیل کے پاس بھی انجیل سے پہلے کوئی کتاب نہیں آئی تھی اور اگر  
آئی تھی تو کیا وہ اجنبی زبان میں تھی؟

## تیسرا جواب

کیا اسی اصول پر یہ ضروری نہیں کہ ہماری زبان میں بھی کوئی کتاب نازل فرمائی جائے۔ بلکہ ہر ملک  
میں اس ملک کے باشندوں کی زبان میں کتاب کے نزول کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں سینکڑوں  
زبانیں بولی جاتی ہیں اور ایک خطہ کی زبان دوسرے خطہ کے لئے اجنبی ہے تو کیا ہندوستان کے لئے سینکڑوں  
کتابوں کا نزول لازمی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کیونکہ قرآن کی زبان اکثر ممالک کے لئے اجنبی ہے لہذا ہر ایسے ملک کے  
لئے اس ملک کی زبان میں کتاب کا نزول ضروری ہے برق صاحب کیا آپ کا یہی خیال ہے؟

## چوتھا جواب

برق صاحب ایک بات اور حل طلب ہے۔ قرآن مجید کی ابتدائی بلکہ متعدد آیات کی رو سے تمام کتب سلامیہ  
پر ایمان لانا ضروری ہے اور بقول آپ کے یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام کتب محفوظ ہوں ورنہ ایمان لانے کا  
مقصد درود اسلام ص ۱۸۹ ملخصاً اور قرآن مجید ہی سے یہ ثابت ہے کہ۔

وَأَنَّ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝

یعنی ہر امت میں ڈرانے والا آیا ہے۔

(فاطر: ۲۴)

اور جب ڈرانے والا آیا ہے تو کتاب بھی ضرور آئی ہوگی اور یہ بھی قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ہر قوم پر



کتاب الہی اس قوم کی زبان ہی میں نازل ہوتی رہی لہذا ہمارے ملک میں ہماری زبان میں ضرور کوئی کتاب نازل ہوتی ہوگی۔ بتائیے وہ کس خزانہ میں محفوظ ہے کیوں نہ ہم اس کا سراغ لگا کر اس پر عمل کریں اور قرآن مجید کو جو کہ اجنبی زبان میں ہے چھوڑ دیں۔ آخر غیر ملکی زبان کو اپنی زبان پر ترجیح کیوں دیں۔ یہ تو غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری ہے۔ پھر عربی کے مقابلہ میں ہم پاکستانی انگریزی زبان سے زیادہ قریب ہیں۔ بلکہ انگریزی زبان سے کوئی اجنبیت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ تو کیا ہمارے لئے یہ بہتر نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کے بجائے انجیل پڑھنی شروع کر دیں اور سب عیسائی ہو جائیں۔

اور سنئے:-

## غلط فہمی

سارے اہل کتاب بڑے نہیں۔ ان میں ایسے نیک اور پرہیزگار بھی موجود ہیں، حضرات کو اللہ کی آیات (تورات و انجیل) پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کی ترغیب دیتے ہیں برائی سے روکتے اور نیک کام کی طرف بے تابانہ بڑھتے ہیں۔ یہ لوگ صالح ہیں۔

لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ  
الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ  
اللَّهِ أَنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ  
يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يَأْتُونَ  
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ رُسُلُهُمْ  
فِي الْخُيُوتِ ذَٰلِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ  
(آل عمران)

اس آیت میں تورات و انجیل کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے۔ اگر تورات مجھڑ چکی ہوئی، تو اللہ اس کے احکام کو آیات کیوں کہتا۔ اور اس پر عمل کرنے والوں کو صالحین میں کیوں شمار کرتا۔ (دوسرا سلام ص ۱۹۲-۱۹۳)

آیت مذکورہ میں آیات سے مراد تورات اور انجیل کی آیات نہیں ہیں بلکہ قرآن مجید کی آیات مراد ہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

## ازالہ

تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بہت سے لوگ کافروں کو دوست بناتے ہیں بے شک انہوں نے جو اعمال کئے وہ اس لحاظ سے بہت برے ہیں کہ ان کے نتیجے میں اللہ ان سے ناخوش ہے اور یہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اور اگر وہ اللہ پر نہی پر، اور اس کتاب پر جو اس پر نازل ہوئی ہے ایمان لے آتے تو کبھی کافروں کو دوست نہ بناتے مگر ان میں بہت سے فاسق ہیں۔

تَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ  
كَفَرُوا وَالْبَيْسَ مَا قَدْ صَدَّقَتْ  
لَهُمُ الْفُسْهُمُ أَنَّ سَخَطَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ  
وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ وَلَوْ  
كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ مَا اخْتَدَوْهُمْ  
أُولَٰئِكَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ  
(المائدة: ۸۰-۸۱)



اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی ایک خصوصیت بیان فرمائی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان نہ لانے کے سبب اس مرض میں مبتلا ہیں اگر ان پر ایمان لے آتے تو کبھی کافروں کو دوست نہ بناتے۔ گویا کفر سے بیزاری کا ذریعہ یہ ہے، کہ اللہ، رسول اور قرآن مجید پر ایمان لایا جائے یہاں نبی سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں ورنہ اپنے نبی پر تو ان کا ایمان پہلے سے موجود تھا ایک اور جگہ ارشاد باری ہے:-

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۚ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۚ

جو لوگ اس وحی پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ پر اتری اور جو آپ سے پہلے اتری، اور قیامت پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ یہی لوگ ہدایت پر ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں، جو فلاح پائیں گے۔ (البقرة ۵، ۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہدایت و فلاح کے لئے قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے۔

”آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ صورت حال ہے تو پھر مسلمان بننے کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے عیسائی رہ کر بھی نیک عمل کئے جاؤ۔ نہ قرآن پر ایمان

لانے کی ضرورت اور نہ رسول پر، سارے اسلام سے چھٹی مل گئی۔ یہ سوال اسلام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اسلام کسی زبانی اقرار کا نام نہیں۔ بلکہ نیکی کا نام ہے اگر ایک عیسائی نیکی کر رہا ہے تو وہ قرآن کی رو سے مسلمان ہے۔ رسول و قرآن کا صحیح پیرو ہی ہے۔“ (دوا سلام ص ۱۹۳)

اس کے جواب میں کچھ آیات اور نقل ہوئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے اگر ایک شخص نیکی تو کرتا ہے لیکن قرآن مجید کے متعلق کتا ہے کہ (غوف باللہ) ایک شخص نے اسے گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کر دیا تو کیا وہ شخص مسلم ہو سکتا ہے ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ أَلَّا سُبْحَانَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا مَوْسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أَدْرَاكَ النَّاسُ مِنْ دُونِهِمْ لَا تُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۚ فَإِنْ

(اے ایمان والو! اہل کتاب سے کہہ دو) کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل ہوا ہم پر اور جو ابراہیم، اسمعیل، اسحق اور یعقوب اور اسباط پر نازل ہوا اور جو صالح، موسیٰ اور عیسیٰ اور عجلہ انبیاء کو دیئے گئے ان پر بھی ہم ایمان لائے ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے



أَمْثَلُ بِمَثَلٍ مَا أَمْنُكُمْ فَقَدْ أَهَنْدُوا  
فَإِنْ تَوَلَّوْا فَرَأَيْنَاهُمْ فِي شِقَاقِ  
فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ  
الْعَلِيمُ

اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پس اگر وہ اس طرح  
ایمان لے آئیں جس طرح ایمان لائے ہو تو وہ  
ہدایت یاب ہو گئے اور اگر منہ موڑیں تو وہ شقاق  
میں مبتلا ہیں ان سب کے خلاف آپ کے لئے اللہ کافی

(البقرہ ۱۲۶-۱۲۷)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ جب تک وہ مسلمین کی طرح قرآن مجید پر ایمان نہ لائیں ہدایت نہیں

پاسکتے، دوسری آیت ملاحظہ فرمائیے۔

قُلْ أَمَّا بِلِلَّهِ وَمَا أُتِرَ عَلَيْنَا وَمَا  
أُنْزِلَ عَلَيَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَ  
إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ  
مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِنْ  
رَبِّهِمْ لَا تَفْرَقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَ  
نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ وَمَنْ يَبْتَغِ  
غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَ  
هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ

اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان  
لائے اور جو ہم پر نازل ہوا اس پر ایمان لائے  
اور اس پر بھی ایمان لائے، جو ابراہیم، اسماعیل  
اسحاق، یعقوب اور اسباط پر نازل ہوا، اور  
موسیٰ اور عیسیٰ اور جملہ انبیاء پر نازل ہوا۔ ہم ان  
میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے  
مسلم ہیں اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار  
کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت  
میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔

(آل عمران ۸۴، ۸۵)

اس آیت میں پھر بڑے زور کے ساتھ اہل کتاب کو قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی  
ہے، قرآن مجید اور جملہ کتب سادہ پر ایمان لانے کی دعوت دے کر فرمایا، یہ ہے اسلام، اب جو شخص اس  
کو اختیار نہیں کرے گا وہ تباہ و برباد ہوگا۔ اور اس کا دین قبول نہیں ہوگا اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام  
قرآن مجید پر ایمان لانے، اور قرآن مجید پر عمل کرنے کا نام ہے نہ یہ کہ قرآن مجید کی تکذیب کرے اس کا مذاق  
اڑائے، پس نیکی کرتا رہے تو وہ مسلم ہو گیا ہرگز ایسا نہیں۔ ارشاد باری ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَ  
رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى  
رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ  
مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ فَعَلَيْكَتِهِ  
وَكُتْبُهُ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا

اے ایمان والو! اس خطاب میں اہل کتاب بھی  
آگے کیوں کہ برقی صاحب کے نزدیک وہ بھی مومن  
ہیں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس  
کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل  
کی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو اس سے پہلے نازل  
کیں اور جو انکار کرے اللہ کا، فرشتوں کا، اس کی



بَقِيَّةُ ۱۵

کتابوں اور رسولوں کا اور قیامت کے دن کا

وہ گمراہی میں بہت دور جا پڑا۔

(النساء: ۱۳۶)

اس آیت میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں کہ رسول سے مراد کوئی اور رسول ہو۔ رسول سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن مجید پر ایمان نہیں لاتا وہ بہت بڑا گمراہ ہے اللہ تعالیٰ ایک جگہ اور ارشاد فرماتا ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ يُكْفِرُونَ بِاللهِ وَرُسُلِهِ  
وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللهِ وَرُسُلِهِ  
وَيَقُولُونَ نَحْنُ مُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ وَتَكْفُرُ  
بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ  
سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا  
وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا (النساء: ۱۵۰، ۱۵۱)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں  
اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق  
کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر تو ایمان  
لائے اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور بیچ میں  
ایک راستہ نکال چاہتے ہیں، یہی لوگ حقیقی کافر  
ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت کا عذاب  
تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ بالکل کافر ہے لہذا جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، مطلقاً کافر ہے۔ برق صاحب سچے نبی کو نبی نہ مانتا اور جھوٹے نبی کو نبی مان لینا یہ بڑا اہم معاملہ ہے اگر عمومی طور پر ہر رسول پر ایمان لانے کا یہ منشاء ہے کہ جو شخص بھی رسول ہونے کا دعویٰ کرے اس کو رسول مان لیا جائے تو پھر تو ہر شخص کو مرزا غلام قادیانی پر ایمان لانا ہوگا، حالانکہ ہم قطعاً اس پر ایمان نہیں لاتے بلکہ اسے کذاب و جال سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بعض وہ لوگ بھی ہیں جو باوجود نیک ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں تو کیا وہ مسلم ہیں، اگر جھوٹے نبی کا اقرار کفر ہے تو سچے نبی کا انکار بھی کفر ہے اور سینے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ  
فَاتَّبِعُونِي (آل عمران: ۳۱)

کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو  
میری پیروی کرو۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام محبت کرنے والوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو فرض قرار دیا ہے اب اگر نیک اہل کتاب جو اللہ سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں کرتے بلکہ اس سے منہ موڑتے ہیں تو کیا وہ فلاح پائیں گے۔ ہر محبت اللہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع فرض ہے اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہے وہ کافر ہے بیورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-



وَاَكْتُبْ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً  
وَفِي الْآخِرَةِ اِنَّ هَذَا نَا إِلَيْكَ قَالَ  
عَذَابِيْ اَصْلَبُ مِنْ شَاءَعٍ وَ  
رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ نَسَاكُتْهُمَا  
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُوْتُوْنَ الزَّكَاةَ  
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ه  
الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ  
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهُ مَكْتُوبًا  
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْانْجِيلِ  
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ  
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ  
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ  
عَنْهُمْ اَمْرَهُمْ وَالْاَعْلَالَ الَّتِي  
كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَاَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهِ  
وَعَزَّوْا وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ  
الَّذِيْ اُنْزِلَ مَعَهُ اُولٰٓئِكَ هُمُ  
الْمُقْسُوْنَ

رموسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے  
رب! ہمارے لئے دنیا اور آخرت میں بہتری  
لکھ دے ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ اللہ  
نے فرمایا میں عذاب کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں  
اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔ وہ  
رحمت میں ان لوگوں کے لئے لکھوں گا، جو  
پربیزگاری کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری  
آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جو لوگ رسول، نبی  
امی کی پیروی کرتے ہیں، جس کا ذکر وہ اپنے  
میں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو ان  
کو بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے ان کو روکتا  
ہے، ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتا ہے، ناپاک  
چیزیں ان پر حرام کرتا ہے، ان کے بوجھ اور ان  
کے طوق جو ان پر تھے ان پر سے اتارتا ہے،  
پس جو لوگ اس رسول پر ایمان لائے، اس کا  
احترام کیا اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع  
کیا جو اس پر نازل کیا گیا ہے تو یہی لوگ

فلاح پانے والے ہیں۔

(الاعراف ۱۵۷)

ان آیات سے ثابت ہوا کہ اہل کتاب کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر موجود  
تھا۔ وہ ان اوصاف مذکورہ کے باعث آپ کو پہچانتے تھے، لیکن ایمان نہیں لاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے  
فرمایا کہ :-

۱۔ رحمت ان ہی کے حصہ میں ہے جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں۔

۲۔ وہ رسول ان پر پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے، ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے، ہر دم و رواج کے  
بوجھ اور وہ طوق و سلاسل جو گذشتہ کتب الہیہ میں ان کی بد اعمالی کی سزا کی وجہ سے ان پر ڈال دیے گئے  
تھے ان پر سے الگ کرتا ہے۔

۳۔ اس رسول پر ایمان لانا والے، اس کا احترام کرنے والے، اس کی مدد کرنے والے اور اس کی لائی  
ہوئی شریعت کا اتباع کرنے والے ہی نجات کے مستحق ہیں۔



کیا ان آیات کی موجودگی میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن مجید کا اتباع نہ کرنے والے بھی تم میں ہیں۔ ان ہی آیات کے مفضل اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ الْبَشَرِ الْأُنثَىٰ الَّذِي يَخْتَارُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

(الاعراف: ۱۵۸)

اس آیت میں دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تم سب کے لئے رسول ہیں ان کا اتباع کرو گے تو ہدایت مل سکتی ہے اس خطاب عام میں اہل کتاب خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں کیونکہ اوپر سے انہی کا ذکر چلا آ رہا ہے پس ثابت ہوا کہ اہل کتاب کے لئے لازمی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں آپ کی پیروی کریں ورنہ وہ ہدایت نہیں پاسکتے اور نہ نجات، مزید سنئے:-

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۚ فَإِنْ جَاؤُكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۖ فَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ءَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَاللَّهُ يَهْدِي مَن يَإِيبَادِ ۝

(آل عمران: ۱۹، ۲۰)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

اس آیت میں بھی اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے ان کو ہدایت کی طرف بلایا جا رہا ہے



اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی پیروی کرنے والوں کو اہل اسلام بتایا جا رہا ہے۔

وَاتِّمِّنْ أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَاسِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝

بے شک بعض اہل کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی۔ اور اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ان پر نازل ہوئی وہ لوگ اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کے عوض متاعِ قلیل حاصل نہیں کرتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے بے شک اللہ عجل حساب

لینے والا ہے۔

(آل عمران: ۱۹۹)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ان اہل کتاب کے لئے اجر ہے کہ جو قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں اور یہی وہ اہل کتاب ہیں جن کی تعریف میں قرآن مجید کی بعض آیات نازل ہوئی ہیں برقِ صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ ہر نیک عمل اہل کتاب کی تعریف میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ کاش وہ ان آیات کو ان آیات کی روشنی میں مطالعہ فرماتے اللہ تعالیٰ نے تو ایسے اہل کتاب کی مذمت فرمائی ہے جو قرآن مجید پر ایمان نہ لائیں مثلاً:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ آمِنُوا بِمَا أُنْزِلَ اللَّهُ قَالُوا نُوْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَنَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَ لَا وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۝

اور جب ان سے کہ جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی ہے تو کہتے ہیں ہم اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی اور اس کے علاوہ دوسری کتاب کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

(البقرة: ۹۱)

دوسری جگہ ارشادِ باری ہے:-

وَلَا آمِنُوا بِمَا أُنْزِلَتْ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ۝

(البقرة: ۴۱)

اے بنی اسرائیل اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی ہے اور جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کے ساتھ اولین انکار کرنے والے

نہ بن جاؤ۔

ان دونوں آیات میں بھی اہل کتاب کو قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اہل کتاب ایمان لے آئے اگر قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری نہ ہوتا تو انہیں مسلم ہونے کی کیا ضرورت تھی وہ نیک بن جاتے پس ان کے لئے یہی کافی تھا، بلکہ وہ لوگ جو ایمان لائے مثلاً حضرت عبداللہ



بن سلام، حضرت سلمان فارسی وغیرہ پہلے ہی سے نیک تھے لیکن یہ سب ان کے لئے کافی نہیں سمجھی گئی اور انہیں اسلام قبول کرنا پڑا اور سنئے ارشاد باری ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا  
بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ  
قَبْلِ أَنْ نَطْغَسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا  
عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا  
أَصْحَابَ السَّبْتِ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ  
مَفْعُولًا (النساء: ۴۷)

اے اہل کتاب اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے  
نازل کی ہے اور جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی  
ہے۔ قبل اس کے کہ چہرے مٹا دیے جائیں اور  
ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیا جائے یا ہم لعنت کریں  
ان پر جیسا کہ ہم نے ہفتہ والوں پر لعنت کی تھی  
اور اہل کتاب کا کام تو ہو کر رہتا ہے۔

اس آیت میں بھی اہل کتاب کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور ایمان نہ لانے کی صورت  
میں عذاب الہی کی دھمکی دی گئی ہے۔

غلط فہمی | اِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ  
الْأُولَىٰ صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ  
وَمُوسَىٰ

یہ قرآن مجید ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں  
میں بھی موجود ہے۔

اس لئے کتاب موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے۔ (دو اسلام ص ۱۹۲)  
برق صاحب نے اوپر سے آیات نقل نہیں کیں اور ”بذا“ کا مرجع قرآن مجید کو سمجھ  
لیا۔ آیات محولہ اس طرح ہیں:-

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ . وَذَكَرَ اسْمَ  
رَبِّهِ فَصَلَّىٰ . بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ  
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ خَيْرًَٰ ۚ إِنَّ  
هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۚ صُحُفِ  
إِبْرَاهِيْمَ وَمُوسَىٰ .

بے شک اس شخص نے نجات پائی جس نے  
اپنے آپ کو پاک کر لیا۔ جو اپنے رب کے نام کا  
ذکر کرتا رہا اور جس نے دنیا پر دھی مگر تم لوگ تو  
دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے  
اور باقی رہنے والی ہے یہ بات پہلے صحیفوں میں بھی موجود

(الاعلیٰ: ۴ تا ۱۹)

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ ”بذا“ کا مرجع قرآن مجید نہیں ہے۔ بلکہ نجات اخروی کے اصول ہیں جو پہلی  
کتابوں میں بھی موجود تھے۔

اگر برق صاحب کے مطلب کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن مجید تورات میں موجود  
ہے یعنی پورا قرآن مجید تورات میں موجود ہے اور بقول برق صاحب کے تورات اس وقت بھی غیر محرف موجود  
ہے تو کیا قرآن مجید کو تورات میں دکھایا جاسکتا ہے، برگز نہیں۔ پھر اسی اصول پر ذرا اور آگے چلیے تو یہ کہنا



صحیح ہوگا کہ انجیل بھی تورات میں موجود ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-  
 وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ ۚ وَالْإِنْجِيلَ ۚ (آل عمران: ۴۸)  
 تورات اور انجیل کی تعلیم دے گا۔

اب اگر انجیل تورات میں موجود تھی تو انجیل کی ضرورت ہی کیا تھی کیوں دونوں کی تعلیم عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی پھر ایک سوال اور ہے کہ اگر قرآن مجید تورات میں موجود ہے تو تورات اصل چیز ہوئی اور قرآن تورات کا ایک حصہ ہوا۔ بلکہ تورات میں کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ لہذا تورات قرآن مجید سے افضل اور زیادہ کامل ہوئی۔ اس کی موجودگی میں قرآن مجید کا نزول لا حاصل ہے تورات اور اس کے تراجم کی اشاعت کافی تھی۔

برق صاحب! آپ تحریر فرماتے ہیں کہ کتاب موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے کیا یہ حقیقت ہے؟ کیا دونوں کتابوں میں تضاد نہیں ہے؟ کیا ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ دو الٰہی قانون چل سکتے ہیں؟

## انتباہ

پہلے نبی صرف اپنی اپنی قوم کی طرف مادی بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ اس نبی کی پیروی صرف اس قوم ہی پر فرض ہوتی تھی نہ کہ دوسری قوموں پر مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-  
 وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ (آل عمران: ۴۹) وہ بنی اسرائیل کے لئے رسول تھے۔

لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے۔

ارشاد باری ہے :-

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ  
 بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا: ۲۸)

اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

دوسری آیت میں ہے :-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ  
 إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف: ۱۵۸)

کہہ دیجیے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

لہذا ایسے رسول پر جس کا دائرہ قوم و ملک کے ساتھ محدود نہ ہو بلکہ ”للعالمین نذیراً“ کے بمصداق جس

کی رسالت تمام اقوام عالم کی طرف ہو، ایمان نہ لانا اور اس کی پیروی نہ کرنا کسی طرح صحیح نہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمادیا۔

قُلْ لِلَّهِ دِينُ الْأَدْنَىٰ أَدْنَىٰ الْكِتَابِ  
 وَالْأَمِينِ ۚ أَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَتَيْتُمْ إِلَّا بِدِينِ الْأَدْنَىٰ

آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب اور اے اہل عرب  
 کیا تم اسلام قبول کرتے ہو پس اگر وہ اسلام قبول



اِهْتَدُوا۔ (آل عمران: ۲۰) کر لیں تو ہدایت پر آجائیں گے۔

اس آیت میں تمام اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے اور ان کے لئے بھی اس کے بغیر چارہ نہیں رہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نباشی اور ہرقل جیسے نیک عیسائی بادشاہوں کو دعوت اسلام دی اور صاف کہہ دیا کہ اسلام قبول کر دو گے تو سلامتی کے حق دار ہو گے، ورنہ نہیں۔

اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے:-

**غلط فہمی**

وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ ہم ان اہل کتاب کے کسی نیک عمل کو ضائع نہیں جانے

فَلَنْ يَكْفُرُوْهُ (آل عمران) دیتے (دو اسلام ص ۱۹۳-۱۹۴)

یہ ان اہل کتاب کے لئے ہے جو مسلم ہو گئے تھے، ارشاد باری ہے:-

**ازالہ**

الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ ۚ

وَاِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِمْ سَآءٌ مِّنْ اَمْرٍ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِيْنَ ۚ

ایمان لائے تھے اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے تھے، یہ سب یہ ہمارے رب کی طرف سے

حق ہے ہم تو اس سے پہلے ہی مسلم تھے۔ (القصاص: ۵۲، ۵۳)

یہ اہل کتاب نزول قرآن مجید سے پہلے مسلم تھے اور قرآن مجید کے نزول کے بعد فوراً اس

ایمان لے آئے اور اس کا انکار نہیں کیا۔ دوسری آیت سنئے:-

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ ۚ

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ

بِهٖ ۚ وَرَمٰنْ هُوَ لَا اَمْرٍ مِّنْ يُؤْمِنُ بِهٖ

وَمَا يَجْحَدُ بِآيٰتِنَا اِلَّا الْكَافِرُونَ ۚ

اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری ۚ پس جو اہل کتاب ہیں وہ اس پر ایمان لے آتے

میں اور دوسرے لوگوں میں سے بھی بعض لوگ ایمان لے آتے ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار کوئی نہیں کرتا

سوائے کافروں کے۔ (العنکبوت: ۲۴)

یہ ہیں وہ اچھے اور نیک عمل اہل کتاب جو قابل تعریف ہیں صرف اس وجہ سے کہ وہ قرآن مجید پر ایمان

لاتے ہیں اور جو اس کا انکار کرتے ہیں وہ کافر ہیں:-

اور سنئے ان اچھے اہل کتاب کے متعلق ارشاد باری ہے:-

وَمَا كُنَّا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَاءَنَا

مِّنَ الْحَقِّ وَنُطْمِعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا

رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۚ

اور ہم کیوں اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف حق کے سامنے نازل ہوئی ایمان نہ لائیں ہمیں تو یہ امید ہے کہ ہمارا رب ہم کو صالحین میں داخل کر دے گا۔ (المائدہ: ۸۴)



یہ ہیں وہ اہل کتاب جن کی تعریف اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں کرتا ہے یہ ایمان لاتے ہیں اور طبع کرتے ہیں کہ انہیں صالحین میں جگہ مل جائے یہ ہیں وہ اہل کتاب جو قرآن مجید کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ ہم ساری طرف بھی حق کے ساتھ نازل ہوا ہے یعنی وہ قرآن مجید سے بے پردا ہو کر اپنے کو اہل ایمان اور صالحین میں شمار نہیں کرتے، قرآن مجید پر ایمان لانے کو وہ اللہ پر ایمان لانا سمجھتے ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید پر ایمان لا کر ہی صالح بنا جاسکتا ہے اور حقیقت اب قرآن کی پیروی ہی عمل صالح ہے اور اس سے انکار اور اس سے لاپرواہی فلاح کے منافی ہے۔

ان تفصیل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تورات اصلی حالت میں موجود تھیں اور وہی تورات ہم تک پہنچی ہے۔ اس تورات میں ابن عمرؓ کی ذکر کردہ آیت کہیں موجود نہیں اس لئے یہ حدیث ایک تاریخی غلط بیانی ہے اور جعلی ہے (صفحہ ۱۹۴)۔

ان تفصیل کا جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے۔ برق صاحب آپ کو تورات دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ورنہ موجودہ تورات تو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ تحریف شدہ ہے۔ مثال کے طور پر ہم موجودہ تورات کے چند اقتباسات آپ کے ملاحظہ کے لئے تحریر کرتے ہیں، سنئے:-

۱۔ خدا انسان نہیں جو جھوٹ بولے نہ آدمی زاد ہے کہ پشیمان ہو (گنتی ۲۳/۱۴) گویا ہر انسان جھوٹ بولتا ہے خواہ نبی ہو یا صدیق، کیا یہ آیت صحیح ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں:-

۲۔ خدا پشیمان ہوا (خروج ۳۲/۳۲) یہ آیت پہلی آیت کے خلاف و متضاد ہے۔

۳۔ خدا دلگیر ہوا (پیدائش ۴/۶)

۴۔ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پھٹا یا اور نہایت دلگیر ہوا (پیدائش ۴/۶)

۵۔ (خدا نے) ساتویں دن آرام کیا (خروج ۳۱/۱۷)

برق صاحب ان آیات سے ثابت ہوا کہ موجودہ تورات میں تضاد بھی ہے اور اللہ جل جلالہ کی توہین بھی، آپ حدیث کے لئے معیار مقرر کرتے ہیں کہ ایسی نہ ہو ورنہ نہ ہو۔ کیا یہ شرائط تورات کے لئے مندرجہ نہیں اگر تورات میں اس قسم کی باتیں پائی جائیں تب بھی وہ من و عن تسلیم کی جائے لیکن حدیث کو غیر محفوظ کہا جائے کیا یہ انصاف ہے، اور سنئے:-

۶۔ پھر جب اس (لوطؑ) نے ان سے بہت منت کی، تب وہ (فرشتے) اس کی طرف پھرے،

اور اس کے گھر گئے۔ اور اس نے ان کی مہمانی کی اور نظیری روٹی ان کے لئے پکائی اور انہوں نے کھائی۔

(پیدائش ۱۹/۱۹) فرشتے بقول آپ کے نورانی مخلوق ہیں ان کو روٹی سے کیا غرض، لیکن بایں ہمہ یہ چیز تورات میں

ہے اور آپ تورات کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔



۷۔ اور خداوند نے ان کے بچھڑے بنانے کے سبب جسے ہارون نے بنایا تھا لوگوں پر مری بھیجی، (خروج ۳۲) قرآن مجید میں ہے کہ بچھڑے کو سامری نے بنایا تھا اور تورات میں ہے کہ ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ کس کو صحیح سمجھیں اور کس کو غلط، پھر ایسے شرکیہ کام کی نسبت اللہ کے مقدس نبی کی طرف کس قدر شرمناک ہتان ہے اور نبی معظم علیہ السلام کی صریح توہین ہے۔ انصاف سے بعید ہے کہ حدیث کے لئے یہی معیار، معیار کذب ہو اور تورات کے لئے معیارِ صحت ہو۔

۸۔ نبوت ملنے کے بعد بھی ساؤل داؤد کا دشمن رہا، اور انہیں مارنے کی فکر میں رہا (اسموایل باب ۱) کیا نبوت کی یہی شان ہے کہ نبی، نبی کا دشمن ہو۔

۹۔ داؤد علیہ السلام نے دنیا کی (۲ اسموایل۔ باب ۱۱)

۱۰۔ داؤد، جالوت کے بادشاہ اکیس سے ڈرے اور اس کے سامنے اپنی وضع بدلی۔ اور ان کے بیچ اپنے کو دیوانہ بنایا اور مچانک کے پلوں پر واپس بات لکھنے لگا اور اپنے متحک کو اپنی ڈاڑھی پر بہنے دیا۔ تب اکیس نے اپنے چاکروں سے کہا یہ آدمی تو مٹری ہے (۱ اسموایل ۱۷)

۱۱۔ فوج مے پی کر نشہ میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا (پیدائش ۱۶)

۱۲۔ اور لوط ضغر سے اپنی دونوں بیٹیوں سمیت نکل کر پہاڑ پر جا رہا۔ کیونکہ ضغریہیں رہنے سے اسے دہشت ہوئی اور وہ اور اس کی بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب بلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندر آئے، آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم بستر ہوئیں، تاکہ اپنے باپ سے نسل برقرار رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور بلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ پر اس نے اس کے لیٹتے اور اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا، اور دوسرے روز ایسا ہوا کہ بلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی آؤ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کے اس سے ہم بستر ہو کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات کو بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی اٹھ کے اس سے ہم بستر ہوئی۔ اور اس نے اس کے لیٹتے اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا۔ سولوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی ایک بیٹیا جنی اور اس کا نام موآب رکھا۔ وہ موآبوں کا جو آج تک ہیں باپ ہوا۔ اور چھوٹی بھی ایک بیٹیا جنی۔ اس کا نام بن عمی رکھا وہ بنی عمون کا جو اب تک ہیں باپ ہوا۔ (پیدائش ۱۹-۲۰)

الغرض ان عبارات سے روز روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ تورات تحریف شدہ ہے، لہذا حضرت ابن عمروؓ کی بیان کردہ حدیث بالکل صحیح ہے اور مزور اس حدیث میں بیان کردہ صفات نبوی اصلی تورات میں موجود تھیں۔

ﷲ الحمد



## غلط فہمی

قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ لکھ سکتے تھے اور نہ لکھی ہوئی چیز پڑھ سکتے تھے لیکن بخاری میں ہے وہ لکھ سکتے

تھے، حدیث یوں چلتی ہے کہ حضور ذی قعدہ میں عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو اہل مکہ نے کچھ پابندیاں عائد کر دیں۔ اور اس سلسلہ میں ایک تحریری معاہدہ ہے جسے محمد رسول اللہ تسلیم کرتے ہیں، کفار مکہ نے رسول اللہ کے الفاظ پر اعتراض کیا.... آپ نے حضرت علی سے فرمایا کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو... علی نے جواب دیا خدا کی قسم میں آپ کے نام سے رسول کا لفظ کبھی جدا نہ کروں گا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کاغذ اٹھالیا اور اس پر لکھ دیا۔ یہ وہ فیصلہ ہے (دو اسلام ص ۱۹۲-۱۹۵)۔

## ازالہ

صحیح بخاری کی ایک مختصر حدیث لے کر برق صاحب نے اعتراض کیا حالانکہ اس میں کچھ عبارت محذوف ہے جو دوسری سند میں بالصرایت مذکور ہے جس کا حوالہ برق صاحب نے خود دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

”بخاری کی ایک اور روایت (ج ۲ ص ۱۳۵) بتلاتی ہے کہ حضور نے رسول اللہ کا لفظ کھرچ ڈالا تھا اور کاتب نے ابن عباس کے الفاظ کا اضافہ کر دیا تھا، اسی حدیث پر باقی محدثین اعتماد کرتے ہیں۔ اور تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے“ (دو اسلام ص ۱۹۵-۱۹۶)

لہذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ کھرچنے کے لئے اٹھایا پھر اس نے (یعنی دوسری حدیث کی صراحت کے مطابق کاتب نے) لکھا، نہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا۔ برق صاحب کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ”کاتب“ کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھ لیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا حدیث اعتراض سے پاک ہے۔ ایک حدیث کیس مختصر ہوتی ہے اور کیس مفصل۔ صرف مختصر کو دیکھ کر اعتراض کر دینا مناسب نہیں۔



## باب ۹

### ”آنحضرت کی تصویر حدیث میں“

بخاری میں ہے :-

**غلط فہمی**

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام روزہ رکھ کر اپنی ازواج کے بوسے لیتے اور ان سے مباشرت فرمایا کرتے تھے (دوسلام ص ۲۱)

عن عائشة قالت  
كان النبي صلى الله عليه وسلم يقبل ويباشر  
وهو صائم

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

**ازالہ**

ان احادیث سے روزہ کا فلسفہ واضح ہو گیا، یعنی پورے تیس دن تک قہرم کی بدزبانی، بدکاری اور شہوت رانی سے دور رہ کر اپنے اخلاق اور روحانیت کو بلند کرنا اور اپنے آپ کو جفاکش بنانا (ص ۲۱)

یہ ہے فلسفہ صوم، اب برق صاحب بتائیں کہ حدیث مذکور میں کون سی چیز ایسی ہے جو اس فلسفہ کے منافی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لفظ مباشرت سے غلط فہمی ہو گئی ہو تو اس کے متعلق عرض ہے کہ مباشرت کے معنی عربی زبان میں وہ نہیں جو عام اُردو اصطلاح میں لئے جاتے ہیں عین المبعود شرح ابوداؤد میں ہے

مَعْنَى الْبَاشَرَةِ هَهُنَا الْمَسُّ بِالْيَدِ  
مِنْ التِّقَاءِ الْبَشَوَتَيْنِ (خالص)

یعنی مباشرت سے یہاں صرف ہاتھ سے  
چھونا اور دو جسموں کا ملنا مراد ہے۔

اسلام ص ۲۳۹

بلکہ عربی زبان میں اس کے اصلی معنی بدن سے بدن ملانے کے ہی ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے امام شوکانی فرماتے ہیں :-

إِنَّ الْبَاشَرَةَ فِي الْأَصْلِ التِّقَاءُ  
الْبَشَوَتَيْنِ (نیل الاوطار باب  
یعنی مباشرت اصل میں دو جسموں کے  
ملنے کو کہتے ہیں۔)



تقبیل الماثم

مزید برآں مباشرت کے معنی بالمشافہ، بلا واسطہ، رو برو کے بھی ہوتے ہیں اور ان معنوں میں یہ بکثرت استعمال ہوتا ہے مثلاً علامہ احمد محمد شاہ لکھتے ہیں :-

وَيَحْتَمِلُ كَمَا قَالَ ابْنُ التُّرْكُمَانِي  
أَنْ يَكُونَ سَمِعَ هَذَا الْحَدِيثَ  
مِنْ عَمٍّ مُبَاشَرَةً وَسَمِعَهُ عَنْهُ  
بِالْوَاسِطَةِ .

یعنی احتمال ہے جیسا کہ ابن ترکمانی نے کہا  
ہے کہ راوی نے اس حدیث کو حضرت عمرؓ  
سے ”مباشرتہ“ (بلا واسطہ، بالمشافہ) بھی  
سنا ہوا اور بالواسطہ بھی سنا ہو۔

(ترمذی جزاؤں مع شرح احمد محمد شاہ مطبوعہ مصر ص ۳۱۸)

لہذا حدیث زیر بحث کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحالت روزہ اپنی بیوی کے پاس اٹھتے، بیٹھتے تھے، ہاتھ لگاتے تھے اور پیار بھی کر لیا کرتے تھے۔ بتائیے ان معنوں پر کیا اعتراض ہے۔

”اس حدیث میں مباشرت سے کیا مراد ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی  
سنیئے۔ آپ صحیح مسلم کی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فتح الملہم میں  
فرماتے ہیں :-

المباشرة فوق السرة وتحت  
الركبة بالذكور والقبلة او المعانقة  
او اللبس وغير ذلك حلال  
بإتفاق المسلمين .

یعنی آپ روزہ رکھ کر عورت کے ساتھ  
ناف سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے مباشرت  
کر سکتے ہیں یعنی اسے چھو سکتے ہیں۔ چوم سکتے  
ہیں گے لگا سکتے ہیں اور آلہ تناسل کا استعمال

کر سکتے ہیں“ (رد اسلام ص ۲۱۰)

”مباشرت کے معنی آلہ تناسل کا استعمال اور روزہ میں اسے حلال سمجھنا“ یہ صحیح نہیں  
اللہ تعالیٰ ایسے مضمون سے محفوظ رکھے۔

ازالہ

اس حدیث کے متعلق برق صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں :-

”یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے اول روزہ کا مقصد شہوات کو ترک

غلط فہمی

کرنا ہے نہ کہ بوس و کنا اور گھٹنوں سے نیچے آلہ تناسل کا استعمال“ (رد اسلام ص ۲۱۰)

حدیث مذکور میں شہوات کا کوئی ذکر نہیں بلکہ اس کی تردید ہے آپ نے پوری حدیث نقل

نہیں فرمائی اس کے آگے حدیث میں یہ بھی ہے ”كَانَ أَمْلَكُكُمْ لِزَيْبٍ“ یعنی رسول اللہ

ازالہ

صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہشات پر تم سب سے زیادہ قابو رکھتے تھے۔ مطلب ظاہر ہے کہ بغیر شہوات کے کبھی



اپنی بیوی کو پیار کر لیا کرتے تھے اور آپ میں اتنی قوت ضبط تھی کہ شہوت غالب نہیں ہو سکتی تھی اور شہوت رانی کا کوئی خطرہ نہیں تھا، حدیث کا مطلب صرف اتنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس اٹھتے بیٹھتے تھے اور پیار بھی کر لیا کرتے تھے۔ اچھا اب ہم آپ سے ایک سوال کرتے ہیں وہ یہ کہ کیا روزہ میں بیوی کو پیار کرنے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

۱۔ اگر ٹوٹتا ہے تو قرآن مجید سے دلیل دیجیئے۔

۲۔ اگر نہیں ٹوٹتا تو کس دلیل سے؟

اگر آپ یہ فرمائیں کہ نہیں ٹوٹتا تو پھر ہم بھی تو یہی کہتے ہیں اور دلیل میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں جس پر آپ کو اعتراض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فعل سے ثابت کر دیا کہ پیار کرنا مقصدِ صوم نہیں۔ اب کوئی تقویٰ و طہارت کا مدعی یہ کہے کہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ ایسا نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ یہ کام اس نے کیا ہے جو سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ مقدس تھا۔

برق صاحب کو اس حدیث پر دوسرا اعتراض یہ ہے جو درج ذیل ہے۔

دوم۔ یہ حدیث اوپر والی دو حدیثوں سے متضاد مہوتی ہے“ (دو اسلام ص ۲۱)

**غلط فہمی**

ان دو حدیثوں میں شہوت رانی، جھوٹ اور غلط کاریوں سے بچنے کو روزہ کا مقصد بتایا

گیا ہے اور اس حدیث زیر بحث میں ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں۔ لہذا تضاد مہوتی

**ازالہ**

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تیسرا اعتراض برق صاحب کے الفاظ میں یہ ہے۔

”سوم۔ یہ حدیث قرآن سے ٹکراتی ہے قرآن کہتا ہے کہ ماہِ رمضان

**غلط فہمی**

میں رات کے وقت ہم تمہیں بیویوں سے متمتع ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔۔۔ ہم ان سے

مباشرت کر سکتے ہو۔ (بقرہ) یعنی رات کے وقت مباشرت کی اجازت ہے لیکن یہ حدیث

کھلی چھٹی دیتی ہے کہ دن ہو یا رات کام چلائے چلو“ (دو اسلام ص ۲۲)

آیت ”أَجَلٌ لَّكُمْ لَيْلَةُ الْقِيَامِ الرَّفَثُ“ میں جماع کے لئے رفث کا لفظ

**ازالہ**

استعمال ہوا ہے نہ کہ مباشرت کا لفظ۔ برق صاحب مباشرت کو جماع کے ہم معنی

سمجھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ”کام چلائے چلو“ جیسا طنزیہ فقرہ استعمال کر رہے ہیں آیت میں جماع

جماع کی طرف اشارہ فرمایا وہاں رفث استعمال فرمایا اور جب مباشرت کا لفظ استعمال فرمایا تو وہاں

جماع کے لئے دوسرے الفاظ میں اشارہ کیا۔ برق صاحب نے پوری آیت نقل نہیں فرمائی حالانکہ

اس کے آگے یہ لفظ ہیں۔

بَاشِرُ وَهْنٍ وَابْتِغَاءُ مَا كَتَبَ یعنی رمضان کی راتوں میں عورتوں سے مباشرت کرو



اللَّهُ لَكُمْ - (البقرة: ۱۸۷)

اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے  
اس کے لئے جہد و جہد کرو۔

یعنی آیت بالا میں لفظ مباشرت کے بعد ”اولاد کی تلاش“ سے جماع کی طرف اشارہ کیا  
لفظ مباشرت کو جماع کے لئے استعمال نہیں فرمایا۔

**غلط فہمی** ”گناہ اور محرکات گناہ ہر دو سے بچنا ضروری ہے“  
برق صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا، لیکن اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں  
”کیا رمضان میں بوس و کنار جماع کا شدید محرک نہیں، اپنے آپ کو دیکھو، کسی سے پوچھو،  
اور انصافاً کہو کہ کیا آج تک کوئی شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے اور گلے لگانے کے بعد  
جماع سے بچ سکا ہے، روزے میں بوس و کنار کی ترغیب دینا اور پھر اس کے نتائج  
پر قابل عقوبت ٹھہرانا عجیب قسم کا مذاق ہے“ (دوا اسلام ص ۲۰۲)

**ازالہ** برق صاحب ایک بات انصافاً بتائیے۔ کیا جوان بیوی کا اسی گھر میں رہنا جہاں  
روزہ دار خاوند رہتا ہو جماع کا محرک نہیں ہو سکتا یقیناً ہو سکتا ہے تو پھر اس بیگمانی  
کو بھی محرک گناہ سمجھ کر کیوں نہ حرام قرار دے دیا جائے کیوں نہ بیوی سے کہا جائے کہ وہ رمضان  
کے مہینہ میں کسی اور جگہ چلی جائے۔ ایک محرک سے بچنا اور دوسرے کو کھلی چھٹی دینا کون سا انصاف  
ہے۔ برق صاحب آپ نے جو سوال کیا ہے کہ کیا کوئی شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے کے بعد  
جماع سے بچ سکا ہے اس کا جواب اتنا ہی کافی ہے کہ ہاں بچ سکا ہے یہ کوئی مشکل کام نہیں  
ہے یہ اجازت ایسی ہے کہ مسلم ہمیشہ سے اس پر عمل پیرا ہیں لیکن کسی کے لئے یہ بات محرک  
جماع ثابت نہیں ہوئی۔ روزہ کا تقدس و احترام ہی اتنا قوی جذبہ ہے کہ کسی مسلم کو جماع کا خیال  
بھی نہیں آتا۔ اور اگر آ بھی جائے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا۔  
برق صاحب حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے قرآن مجید کا بھی مطالعہ کر لیا کیجیے  
تاکہ حدیث پر اعتراض کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ارشاد باری ہے:-

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ  
أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا  
عَنكُمْ فَالْتَمِنْ بِأَشْرَوْهَاتِ  
وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ  
وَكُلُوا وَاشْرَبُوا۔

اللہ کو معلوم ہے کہ تم لوگ روزے کی  
حالت میں اپنے حق میں خیانت کرتے تھے تو  
اللہ نے تم پر مہربانی کی اور تم کو صاف  
کر دیا لہذا اب تم رات کے وقت اپنی  
بیویوں سے مل سکتے ہو اور جوا و لاد اللہ نے



ہمارے مقدر میں لکھ دی ہے اس کے لئے

جدوجہد کر سکتے ہو۔ اور صبح صادق ہونے تک

کھاپی بھی سکتے ہو۔

برق صاحب نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آغاز اسلام میں رات کے وقت بھی بیویوں سے اختلاط منوع تھا۔ بعض صحابہ رک نہ سکے تو یہ پابندی دور کر دی گئی (دو اسلام ص ۲۲)

برق صاحب نے بعض صحابہ کو اس فعل کا مرتکب تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی آیت میں تمام صحابہ کو اس فعل کا مرتکب بتایا ہے۔ برق صاحب براہ کرم بتائیے یہ لفظ ”بعض“ کس قرآنی لفظ کا ترجمہ ہے اگر کسی قرآنی لفظ کا نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر انصافاً بتائیے کہ قرآنی آیت پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ کو لفظ ”بعض“ کا اضافہ کرنا پڑا تو کیا کسی حدیث پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ ایسا اضافہ نہیں کر سکتے۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ حدیث کے سلسلہ میں بھی آپ کا یہی رویہ ہونا چاہیئے اس طرح حدیث کے متعلق آپ غلط فہمی سے بچ جائیں گے۔

برق صاحب کیا بمصدق آیت بالا تمام صحابہ یا بقول آپ کے بعض صحابہ اللہ تعالیٰ سے اتنا بے خوف ہو گئے تھے کہ جماع سے نہ بچ سکے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اتنا مہربان تھا کہ بجائے سختی کرنے کے رحمت کے ساتھ متوجہ ہوا گناہ کو معاف کر دیا اور اپنے حکم کی سختی کو محسوس کر کے اس حکم میں تخفیف کر دی۔ گویا نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کو پہلے اس تکلیف اور سختی مالا بطلاق کا علم نہ تھا بعد میں علم ہوا تو ترمیم کر دی۔

برق صاحب اس آیت سے نہ صرف صحابہ یا بعض صحابہ کی توہین ہوتی ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی بھی توہین ہوتی ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ منکرین حدیث قرآن مجید کی اس عبارت پر تو خاموش ہو جاتے ہیں اور حدیث میں جہاں کہیں ایسی بات آتی ہے تو اسے لے اڑتے ہیں۔ مذاق اڑاتے ہیں۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی حدیث سے اللہ تعالیٰ کی یا صحابہ کی توہین ہوتی ہو تو وہ نہ نیت جعلی ہے۔ لیکن اگر کسی آیت میں اللہ تعالیٰ یا صحابہ کرام کی توہین کا مفہوم پایا جاتا ہے تو وہ قطعی النعت ہے۔

برق صاحب !

آپ نے غور فرمایا یہ کیا طرفہ ماجرا ہے اور یہ کہاں کا انصاف ہے۔؟



برق صاحب کا خیال ہے کہ روزہ کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بیوی سے مباشرت کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے اور کیونکہ حدیث زیر بحث میں یہ فعل آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے لہذا یہ حدیث صحیح نہیں ہو سکتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ :

اول تو اس میں توہین کا کوئی پہلو ہی نہیں اس لئے کہ مباشرت کے معنی جو برق صاحب سمجھ رہے ہیں وہ سرے سے غلط ہیں۔ مباشرت کے معنی پاس اٹھنے بیٹھنے کے ہیں اور پاس اٹھنے بیٹھنے سے توہین نہیں ہوتی۔ دوم باب ہشتم میں ہم نے تورات کے متعدد اقتباسات نقل کئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی توہین کا پہلو نکلتا ہے انبیاء علیہم السلام کے متعلق ہے کہ وہ شراب پیتے تھے۔ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں سے زنا کیا۔ داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا وغیرہ وغیرہ۔ کیا ان باتوں سے اللہ تعالیٰ و انبیاء کی توہین نہیں ہوتی۔ اگر آپ فرمائیں کہ نہیں ہوتی تو پھر روزے میں پاس اٹھنا بیٹھنا جو اتنا قبیح بھی نہیں اس سے توہین کیسے ہوتی ہے۔ اور اگر آپ فرمائیں کہ توہین ہوتی ہے تو پھر فرمائیے کہ اس توہین شدید کے باوجود آپ کے نزدیک تورات محفوظ اور قطعی الصحت ہو تو حدیث کیوں نہ ہو؟ آخر شراب خوری، زنا کاری، جیسے شدید گناہوں کے باوجود جو انبیاء علیہم السلام کی نسبت تورات میں بیان ہوئے ہیں آپ تورات کے مخرف ہونے کے قائل کیوں نہیں؟ بات درحقیقت یہ ہے کہ آپ نے مقابلہ نہیں کیا۔ غور نہیں فرمایا ورنہ یہ غلط فہمیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ یہ تو تھقی تورات کی بات اب قرآن مجید کی باتیں سنئے، قرآن مجید میں ہے۔

يَقَوْمٌ هَوْلًا لَّآءٍ بَنَاتٍ هُنَّ اُطْلُمُو  
لَكُمْ (هود: ۷۸)

لوط علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے زیادہ پاک ہیں

پھر ارشاد فرمایا :-

هَؤُلَاءِ بَنَاتِي اِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ  
(الحج: ۷۱)

یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو ان سے کرو۔

کیا بظاہر ان آیات سے نبی کی توہین نہیں ہوتی کہ اپنی کافر بدکار خلاف وضع فطری عمل کرنے والی قوم کو اپنی بیٹیاں پیش کر رہے ہیں اور یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ یہ تمہارے لئے زیادہ پاک ہیں۔ یعنی پاک تو وہ نوجوان مرد بھی ہیں لیکن یہ زیادہ پاک ہیں اگر اس آیت سے واقعی توہین رسول ہوتی ہے تو پھر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت بھی کسی تحریف کا نتیجہ ہے (معاذ اللہ) آخر اس تفریق کی بھی کوئی وجہ ہے؟ کیا غیر مسلم ایسے قرآن اور ایسی تورات کو تسلیم کرے گا اور اگر کوئی غیر مسلم ایسی آیتوں کو تسلیم کرے گا اور ان پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کرے گا تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ وہ حدیث زیر بحث کو بھی تسلیم کرے گا اور اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کرے گا۔ اگر آپ کے نزدیک زنا کاری،



شراب خوری قابل عفو ہے تو اپنی منکوحہ بیوی کے پاس اٹھنا بیٹھنا اور اس کو پیار کرنا کون سا ناقابل معافی جرم ہے۔

نوٹ: ہمارے نزدیک حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں یا قوم کی بیٹیوں کو پیش کرنے سے منشاء یہ تھا کہ ان سے نکاح شرعی کر لیا جائے۔ ظاہری الفاظ سے اعتراض کا پہلو نکلتا ہے لیکن منشاء کے اعتبار سے اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں جو لوگ ظاہری الفاظ پر اعتراض کرتے ہیں انہیں اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

اور سنئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا  
أَمْرًا أَنُوحًا وَآمْرًا لَّوُطًا كَانَتَا تَحْتَ  
عَبْدَيْنِ مِّنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ  
فَخَانَتَهُمَا (التحریم: ۱۰)

اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے نوح اور لوط کی بیویوں  
کی مثال بیان فرماتا ہے وہ دونوں ہمارے صالح  
بندوں کی بیویاں تھیں۔ پھر ان دونوں نے اپنے  
شوہروں کی خیانت کی۔

شوہر کی خیانت سے بظاہر زنا ہی مراد ہو سکتا ہے اور اس پر ایک قرینہ بھی ہے، اس لئے کہ  
اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَسَرَّيْمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي  
أَخْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم: ۱۲)

اور مسلمین کے لئے اللہ مریم بنت عمران کی مثال بیان  
فرماتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی۔

حضرت مریم کے سلسلہ میں شرمگاہ کی حفاظت کا ذکر کرنے اور اوپر کی آیت میں شوہر کی  
خیانت کا ذکر کرنے سے کیا یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ شوہر کی خیانت سے کنایہ بدکاری مراد ہے  
اب فرمائیے کیا ان نبیوں کی بیویاں زنا کار تھیں۔ کیا اس آیت سے ان نبیوں کی توہین نہیں ہوتی  
نوٹ: ہمارے نزدیک خیانت سے مراد زنا نہیں بلکہ شرک اور مشرکین کی خفیہ سازشوں میں  
شریک ہونا مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا  
وَلَا مَسْتَأْنِسِينَ لِّحَدِيثٍ إِذْ  
ذُكِرَ كَانَ يُؤْذَى النَّبِيَّ  
فَيَسْتَحْيِي مِّنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي  
مِنَ الْحَقِّ

جب نبی کے گھر میں تم لوگ کھانا کھا چکو تو چلے  
جایا کرو اور یہ مت کرو کہ وہیں بیٹھ کر بات چیت  
میں مشغول ہو جاؤ۔ اس سے نبی کو تکلیف ہوتی  
ہے تم سے شرما رہا ہے اور اللہ تعالیٰ حق بات  
کہنے سے نہیں شرمتا۔



بتائیے یہ تکلیف کیا تھی۔ ۵۶ سال کی عمر میں تنہائی کی اتنی سخت ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کا اظہار کرنا پڑا۔ اور جوابات نبی صلی اللہ علیہ وسلم شرم کی وجہ سے نہ کہہ سکتے تھے اللہ تعالیٰ نے کہہ دی۔ بتائیے اس آیت سے توہین رسول ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو کیا یہ آیت آپ کسی غیر مسلم کو سنا سکتے ہیں۔ اگر آپ نے سنا دی تو پھر وہ ہمارے نبی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آخر اس آیت کا کیا جواب ہے؟ کیا وہی جواب جو آپ نے حدیث کو دیا؟ اگر نہیں تو تفریق کی وجہ بتائیے اگر آپ تاویل کریں تو آخر تاویل کے لئے آیت ہی کیوں ہے حدیث کیوں نہیں۔ برق صاحب قرآن سے تو بظاہر توہین رسول ہوتی ہے یہ حدیث ہی ہے جو ان آیات کو صحیح معنی پہنا کر توہین کو محو کر دیتی ہے۔ معاذ اللہ نہ قرآن مجید میں توہین کا پہلو ہے نہ حدیث میں۔ بس اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا کرے تو غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں ورنہ اعتراض تو کس چیز پر نہیں ہوا اور کون سی چیز اس سے بچی۔

یہی وہ حدیث ہے جس نے مجھے احادیث سے بظن کیا اور اس کتاب کی محرک بنی۔ میں اس حدیث پر ہر قسم کے آدمیوں سے تبادلہ خیالات کیا

## غلط فہمی

مثلاً علماء، مُلّا، پروفیسر، معلم، انگریزی تعلیم یافتہ اور عوام۔ صحیح مذاق علماء نے کہا ادب کا تقاضا یہی ہے کہ خاموش رہیے۔ پروفیسر، معلم، اور انگریزی تعلیم یافتہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے اور عوام غضب سے کھولنے لگے کہ سرور کائنات کی ذات پر یہ جملہ؟ لیکن ملاہر مقام پر یہی کہتا نظر آیا کہ حدیث درست ہے اور حضور یہ کام کرتے تھے۔

(دوا سلام ص ۲۳)

## ازالہ

معلوم نہیں کس قسم کے علماء سے آپ کو سابقہ پڑا ابغالباً وہ بھی آپ کی اصطلاح میں مُلّا ہی ہوں گے کہ اتنی معمولی بات بھی آپ کو نہ سمجھا سکے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ نے پروفیسر معلم، انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے مباشرت کے کیا معنی بتائے۔ وہ بیچارے مباشرت کو اپنی اصطلاح میں جماع سمجھ بیٹھے ہوں گے اور اس وجہ سے تعجب کا اظہار کیا ہوگا ورنہ روزے کی حالت میں پاس اٹھنے، بیٹھنے اور چھوٹنے سے تعجب ہونا خود تعجب انگیز ہے اب ذرا ان لوگوں کے سامنے نورات و قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات تلاوت کر کے ان سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتے ہیں اگر وہ کانوں پر ہاتھ رکھیں تو پھر تورات کو اصلی غیر محرف اور قرآن مجید کو محفوظ سمجھنے کا جو عقیدہ آپ رکھتے ہیں اس پر نظر ثانی فرما لیجئے گا، اور اگر یہ نہیں کر سکتے (حالانکہ تورات کے متعلق ایسا کرنا لازمی ہے) تو پھر یہ کیجئے کہ احادیث صحیحہ سے جو بظنی پیدا ہو گئی ہے اس پر نظر ثانی فرما لیجئے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ، رسول



صحابہ کی توہین کے تورات و قرآن دونوں مرتکب ہیں تو پھر حدیث پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر وہ صحیح ہیں تو پھر یہ بھی صحیح ہے۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل امت کے لئے واجب التقلید ہے“

(دوا سلام ص ۲۰۳)

**صحیح فہمی**

برق صاحب آپ کا یہ جملہ کتنا مؤمنانہ جملہ ہے اسی جذبہ سے آپ نے اپنی کتاب تحریر کی۔ ہمارے حسن ظن اور آپ کی اپنی تحریر کے مطابق معاذ اللہ آپ کی تحریر معاندانہ نہیں اس کی بنا صرف غلط فہمی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

مانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت سے بہرہ ور تھے لیکن امت میں کتنے

ایسے لوگ موجود ہیں جو معانقہ وغیرہ کے بعد جماع سے رک سکیں گے

**غلط فہمی**

(دوا سلام ص ۲۰۳)

برق صاحب آپ کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ آپ خود بھی اس بات کے قائل ہیں

کہ مباشرت سے مراد جماع نہیں ہے معلوم نہیں پھر اعتراض کی کیا وجہ ہے غالباً مباشرت

کے جو معنی و دوسروں کے حوالہ سے آپ نے نقل کئے ہیں وہ اس کے محرک ہیں اگر یہ صحیح ہے تو یہ سارا اعتراض دوسروں پر ہونا چاہیے، نہ کہ حدیث پر

اب رہی یہ بات کہ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب حالت روزہ مباشرت کی ہے۔ لہذا

براہمستی پر واجب ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ یہاں بھی آپ سے غلط فہمی ہو گئی اگر روزہ میں مباشرت

کرنا روزہ کا کوئی رکن ہوتا اور اس فعل کا تعلق براہ راست دین سے ہوتا تو پھر بے شک ایسا کرنا براہمستی

پر واجب تھا۔ لیکن روزہ میں مباشرت کرنا نہ روزہ کا رکن ہے نہ اس کا تعلق براہ راست دینی امور

سے ہے لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل امت کے لئے صورت جواز پیش کرے گا نہ کہ وجوب،

پھر اس سلسلہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمادی ہے کہ کون اس فعل میں میری

اتباع کر سکتا ہے اور کون نہیں۔ جو شخص خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہے وہ اس معاملہ میں آپ کی

اتباع کر سکتا ہے اور جو قابو نہیں رکھ سکتا وہ اتباع بھی نہیں کر سکتا۔ یعنی اس اجازت و رخصت

سے وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے

کو مباشرت کی اجازت دی اور جوان کو اس

سے منع فرمایا۔

فَإِذَا الَّذِي رَخَّصَ لَهُ شَيْخٌ

وَالَّذِي نَهَاكَ شَابٌّ (ابوداؤد کتاب

الصوم) سکتا علیہ المندى والما

بیل الادطاب، ج ۲ ص ۱۸



اس حدیث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس فعل کی صرف رخصت ہے نہ کہ وجوب۔ پھر یہ رخصت بھی عام نہیں بلکہ مقید، غرض یہ کہ احادیث میں تو ہر چیز کی وضاحت ہے، اور اعتراض عدم تحقیق کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھیے کہ مباشرت مفسد صوم نہیں اس نوعیت سے عقیدہ حدیث کی اتباع سب کرتے ہیں اور اس عقیدہ کا ہر تافرض واجب ہے، اور اس کا محرک جماع ہونا تو اس سبب سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی جو ان کو اس سے روک دیا ہے، اور جس کی خواہشات کمزور ہو چکی ہوں یا جو اپنی خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہو اس کو رخصت دے دی ہے اور کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی خواہشات پر ہر انسان سے زیادہ قابو تھا۔ لہذا آپ نے اس پر عمل کر لیا۔ اور قابو میں رکھنے والوں کے لئے فعلی اجازت بھی مہیا کر دی اب جو لوگ اسے ناجائز کہتے ہیں اور جن کے اقوال برق صاحب نے ص ۴۲ پر نقل کئے ہیں وہ ایسی ہی حالت کو ملحوظ رکھ کر کہتے ہیں جس میں اندیشہ تحریک جماع ہو ورنہ نہیں اور اس سلسلہ میں تمام بحثوں کا یہی خلاصہ ہے۔

**غلط فہمی** ”امام بخاری اور مسلم نے تو صرف بوس و کنار اور گھٹنوں سے پیچھے استعمال آلت کی اجازت دی تھی، ابو داؤد ایک قدم اور آگے نکل گئے

کہتے ہیں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ روزہ رکھ کر مجھے چومتے تھے اور میری زبان چوستے تھے۔ ایں گل دیگر شگفت“ (رد اسلام ص ۲۵)

**ازالہ** برق صاحب انصاف سے بتائیے صحیح بخاری و صحیح مسلم میں گھٹنوں سے پیچھے آلت کی استعمال کی اجازت آپ نے کہاں دیکھی؟ براہ کرم اس کا جواب دیجیئے گا درمیان میں غلط فہمی کو دور کر لیجئے گا۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں یہ عبارت نہیں ہے یہ ایک تلاحجی کی تشریح ہے جس کو آپ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں پھر زبان چوسنے کا اضافہ امام ابو داؤد کی طرف منسوب کرنا کتنی بڑی غلط فہمی ہے حالانکہ امام ابو داؤد تو خود فرماتے ہیں:-

هَذَا الْإِسْنَادُ لَيْسَ بِصَحِيحٍ • یہ سند صحیح نہیں ہے۔

(ابو داؤد عربی مطبوعہ، مجتبیٰ دہلی جلد اول عائشہ ص ۳۳)

و کذا فی نصب الرایۃ جلد ۲ ص ۲۵۳)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ”اس کی سند ضعیف ہے“ (نیل الاوطار کتاب الصوم) زیلعی لکھتے ہیں:-

یعنی اس کو احمد نے اپنی مسند میں روایت

کیا ہے اور یہ ضعیف ہے ابن عدی فرماتے

ہیں زبان چوسنے کے الفاظ کوئی بیان نہیں کرتا

رَوَاهُ أَحْمَدُ فِي مُسْنَدِهِ وَهُوَ

حَدِيثٌ ضَعِيفٌ۔ قَالَ ابْنُ عَدِيٍّ

وَيُعْضُ لِسَانَهَا لَا يَقُولُهُ إِلَّا مُحَمَّدُ بْنُ



دینار قَدْ ضَعَفَهُ يَحْيَى بْنُ مَعِينٍ وَاسْعَدُ  
 بَنُ أَوْسٍ قَالَ ابْنُ مَعِينٍ فِيهِ أَيْضًا  
 بَضْرُئِي ضَعِيفٌ وَقَالَ عَبْدُ الْحَقِّ  
 فِي أَحْسَنِ أَمْرِهِ هَذَا حَدِيثٌ لَا يَصِحُّ  
 فَإِنَّ بَنِي دِينَارٍ وَابْنَ أَوْسٍ لَا يَحْتَجُّ  
 بِهِمَا

سوائے محمد بن دینار کے اور تحقیق اس کو امام  
 یحییٰ بن معین نے ضعیف کہا ہے اور سعد بن  
 اوس بصری کو بھی امام ابن معین فرماتے ہیں ضعیف  
 ہے اور عبد الحق نے احکام میں فرمایا ہے کہ یہ  
 حدیث صحیح نہیں کیونکہ ابن دینار اور ابن اوس  
 دونوں ہی ناقابلِ محبت ہیں۔

(نصب الرایہ ج ۴ ص ۲۵۳ فصل فی الاستبراء ۶)

برق صاحب محدثین تو اسے کھوٹا اور ناکارہ سمجھ کر مسترد کر رہے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ  
 محدثین ایک سے ایک بڑھیا حدیث گھڑتے گئے (دوا اسلام ص ۲۰۵) کہنے یہ محدثین پر الزام نہیں ہے،  
 برق صاحب کس پر الزام لگانے کے لئے وہ چیز پیش کی جاتی ہے جس کو وہ صحیح تسلیم کرتا ہو اور جس کو وہ  
 تسلیم ہی نہ کرتا ہو اس کو بطور محبت پیش کرنا بعید از عقل ہے۔

حذیفہ فرماتے ہیں روزہ رکھ کر جو شخص بیوی کا تصور باندھے اس کا

روزہ ٹوٹ جاتا ہے (دوا اسلام ص ۲۰۴-۲۰۵)

**غلط فہمی**

برق صاحب یہ بھی کھوٹا سمجھ رہے ہیں کہ یہ قول حضرت حذیفہ پر اتمام ہے امام شوکانی  
 لکھتے ہیں:-

**ازالہ**

قال فی الفتح و اسنادہ ضعیف  
 یعنی حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا  
 ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔

”سوال حضرت عائشہ نے اسود کو تو مباشرت سے روکا لیکن خود اس

فعل کا ارتکاب کرتی رہیں یہ کیا؟.....“ کی جواب میں اس سوال کا، نہ

**غلط فہمی**

صرف اس فعل کا ارتکاب کرتی رہیں بلکہ دوسروں کو ترغیب دیتی ہیں..... غنہ کی کہان

نیز نگینوں کو کون سمجھے ہر طرف اختلاف ہر جگہ تضاد“ (دوا اسلام ص ۲۰۵-۲۰۶)

حضرت عائشہؓ خود اس فعل کا ارتکاب کرتی رہیں۔ یہ کس حدیث میں ہے؟ براہِ کم

اس کا حوالہ دیا جائے مسئلہ زیر بحث کی اصلیت یہ ہے کہ جو شخص اپنی خواہش کو قابو

**ازالہ**

میں نہ رکھ سکتا ہو اس کے لئے بحالتِ روزہ مباشرت منع ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک جوان کو اس سے منع فرما دیا اور جو شخص اپنی خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہے اس کے لئے

اجازت ہے اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ایسا کر لیا کرتے تھے اور اسی لئے آپؐ

ایک بوڑھے کو اس کی اجازت دی۔ عبد اللہ بن جن کا ذکر برق صاحب کی ذکر کردہ عبارت میں ہے کیونکہ



روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے بالکل علیحدہ رہا کرتے۔ تھے پاس تک نہ آتے تھے۔ ان کی بیوی نے حضرت عائشہؓ سے شکایت کی تو حضرت عائشہؓ نے مسئلہ سمجھانے کے لئے یہ بات کہی کہ تم اپنی بیوی کے پاس کیوں نہیں گئے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ تم اپنی بیوی کے پاس آ سکتے ہو۔ پیار کر سکتے ہو۔ کھیل سکتے ہو۔ یہ راہبانہ زندگی تم نے کس سے سیکھی۔ عبد اللہؓ کو اس پر تعجب بھی ہوا اور پوچھا کہ کیا پیار بھی کر سکتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہاں (موطا امام مالک) گویا حضرت عائشہؓ کا مقصد مسئلہ سمجھانا اور ان کی شدت کو ختم کرنا تھا کہ اس میں کوئی ترغیب تھی نہ کچھ اور، سیاق و سباق اور پس منظر کو سامنے نہ رکھنے سے ایسی غلط فہمیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ برق صاحب غالباً یہ سمجھتے ہوں گے کہ بیوی کے ساتھ ہنسنا بولنا، پیار کرنا بغیر شہوت کے ہو ہی نہیں سکتا اور غالباً غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے۔

**غلط فہمی** | جیا عورت کی فطرت ہے کوئی عورت کسی صورت میں بھی شرمگاہوں (مروانہ ہوں یا زنا نہ) کا ذکر نہیں کرتی۔ آج تک کسی بیوی نے اپنے شوہر سے مباشرت کی التجا نہیں کی اور نہ مرد کے سامنے کبھی عریاں بات کی تو پھر ہم یہ کیسے تسلیم کر لیں کہ حضرت عائشہؓ غیر مردوں کو اپنے گھر میں اور وہ بھی روزہ کی حالت میں بوس و کنار کی ترغیب دیتی تھیں۔ (دوا سلام ص ۲۰۶-۲۰۷)

**ازالہ** | بے شک جیا عورت کی فطرت ہے لیکن اظہار حق کے معاملہ میں جیا مذموم ہے یہی وجہ ہے کہ مسائل کے بیان میں ازواج مطہرات نے اخفائے حق سے کام نہیں لیا اور کنایوں میں مسائل کو حل کر دیا۔ یہ قطعاً صحیح نہیں کہ زوجہ مطہرہ نے شرمگاہوں کا ذکر کیا ہو اگر ایسی کوئی حدیث ہو تو بتائیے۔ پھر یہ بھی بتائیے کہ ڈاکٹری و طب یونانی کے کالجوں اور مدرسوں میں تناسل و تولید پر لیکچر دئے جاتے ہیں یا نہیں۔ لیکچر دینے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں اور سننے والوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط جماعتیں ہوتی ہیں اور آج کل کا گندہ معاشرہ ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کسی نے کہا ہے کہ یہ کیا بے حیائی ہے بلکہ اب تو عام اسکولوں میں اس کی ابتدائی تعلیم لازمی ہو گئی ہے۔ ہر اسکول میں اعضائے تناسل کے متعلق پڑھایا جاتا ہے اس کی شکلیں تک کھینچی جاتی ہیں پڑھانے والی عورتیں ہوتی ہیں۔ پڑھنے والی بھی عورتیں ہوتی ہیں لیکن اس تعلیم سے ان دونوں کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہاں عورت کی فطرت کہاں چلی جاتی ہے۔

برق صاحب آپ بار بار لفظ مباشرت کو جاء کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں اس سے قارئین کو بڑی غلط فہمی ہوتی ہے۔

پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے غیر مردوں کو اپنے گھر میں بوس و کنار کی ترغیب دی



تھی جس شخص سے حضرت عائشہؓ نے یہ بات کہی تھی آپ ہی کے بیان کے مطابق وہ حضرت ابو بکرؓ کے پوتے حضرت عبداللہؓ تھے (دو اسلام ص ۲۰۴) لہذا عبداللہؓ حضرت عائشہؓ کے حقیقی بھتیجے اور محرم تھے اور حضرت عائشہؓ ان کی حقیقی چھوٹی بھین اب بتائیے کہ وہ محرم تھے یا نامحرم۔ معلوم نہیں آپ لکھتے وقت کچھ غور بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ اچھا اب یہ بھی بتائیے کہ ماں یا چھوٹی بھین اپنے بچہ کو اسی قسم کے مسائل سے آشنا کرتی ہے یا نہیں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ بچہ مسئلہ کو غلط سمجھا ہو حضرت عائشہؓ نے عبداللہؓ کی غلط فہمی دور کر کے مسئلہ سمجھا دیا اور روزہ میں راسبائہؓ زندگی کو مہمل قرار دیا۔

”ساری قوم میں حضرت عائشہؓ کو کیا پڑی تھی کہ مباشرت کی تلقین کرتی

**غلط فہمی**

پھریں۔ آخر حضور علیہ السلام کے حرم میں دس ازواج اور بھی تھیں، ہر

صحابی کے گھر میں ایک ایک بیوی تھی۔ خود صحابہ کے منہ میں زبان تھی پھر کیا وجہ ہے کہ

مباشرت کی اکثر احادیث حضرت عائشہؓ سے منقول ہیں“ (دو اسلام ص ۲۰۴)

گویا برقی صاحب کے خیال میں یہ حدیث صرف حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ یہ عدم

**ازالہ**

تحقیق کا نتیجہ ہے یہ حدیث زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت

ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔

”مجھے یوں نظر آتا ہے کہ دشمنان اسلام نے حضرت عائشہؓ اور حضور علیہ الصلوٰۃ

**غلط فہمی**

و السلام کے وقار کو کم کرنے کے لئے یہ احادیث وضع کیں“ (دو اسلام ص ۲۰۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ بیویوں کے تو آپ بھی قائل ہیں (دو اسلام ص ۲۰۴)

**ازالہ**

تو کیا یہ گیارہ بیویوں کا افسانہ بھی کسی دشمنان اسلام کا شاخسانہ ہے تاکہ اس سے کردار

رسول پر بھرپور چوٹ پڑے اور آپ کا وقار ختم ہو جائے اور جب یہ نہیں تو اظہار مسائل سے وقار

ختم نہیں ہوتا۔ یہ بالکل مرعوب ذہنیت ہے۔

یہ حدیث جب دوسرے صحابیوں سے بھی مروی ہے تو پھر صرف حضرت عائشہؓ کا نام لینا

غلط فہمی ہے لہذا وضع کا شاخسانہ لغو ہے آخر دشمنان اسلام کے نام تو بھیجے۔ امام مالک نے یہ نہیں

اس کو ہشام بن عروہ، اور عروہ بن زبیر سے روایت کیا ہے۔ عروہ، حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے اور

حضرت عائشہؓ کے حقیقی بھانجے اور تربیت یافتہ ہیں۔ ہشام انہی عروہ کے لڑکے، اور بہت بڑے امام

ہیں۔ اب فرمائیے اس حدیث کے گھڑنے والے حضرت عروہؓ ہیں یا امام ہشام یا خود امام مالک ہیں۔

ان میں سے کس کو آپ دشمن اسلام سمجھتے ہیں؟ پھر اس کی یہی ایک سند نہیں بلکہ متعدد اسناد ہیں کس

کس امام کو آپ دشمن اسلام سمجھیں گے کیا قرآن کی اس آیت ”تَبْتَغِي مَرْضَاتِ اَزْوَاجِكَ“ (یعنی

اے رسول تم اپنی بیویوں کی رضا کے جو یا ہو) سے رسول اور ازواج کے وقار کو مٹائیں نہیں پہنچتی؟ پھر کس کس



چیز کو آپ دشمنان اسلام کا کرشمہ قرار دیں گے۔

## خلاصہ

روزے کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس اٹھنا بیٹھنا اور خواہشات پر قابو رکھنے والے کے لئے پیار کرنا بالکل جائز ہے اس سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے نہ روزے میں کوئی خرابی آتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے منہ میں پانی لے کر کلی کرنا۔ جس طرح منہ میں پانی لینے سے روزہ میں کوئی نقص نہیں آتا اسی طرح بیوی کو پیار کرنے سے بھی کوئی نقص نہیں آتا اور یہ مثال خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کو پیار کیا۔ پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

اَسْأَيْتَ لَوْ تَمَضَّضْتَ بِسَآءٍ  
وَ اَنْتَ صَائِمٌ قُلْتَ اَبَاسٌ بِذَلِكَ  
فَقَالَ فَفَيْمَ (ابوداؤد کتاب  
القیام و سندہ صحیح نیل الاوطار  
جزء ۲ ص ۱۷۹)

مطلب یہ کہ منہ میں پانی لینا اگرچہ پانی پینے کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن چونکہ اس میں پانی پینے کی نیت نہیں ہوتی۔ لہذا روزہ میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح پیار کرنا جماع کا پیش خیمہ ہے لیکن جب پیار کرنے سے جماع و شہوت کی نیت نہیں ہوتی۔ تو ایسا پیار بھی روزہ میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتا۔

آپ کہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت ہی کافی تھی، عمل کر کے دکھانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ ہم کہتے ہیں اس کی بھی وجہ ہے لیکن اگر وجہ نہ بھی ہو تو جائز کام کرنے میں اعتراض ہی کیا ہے آپ بلا وجہ ڈر رہے ہیں، وجہ یہ ہے کہ مدعیان تقویٰ کے غلو کو توڑنا مقصود تھا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مدعی تقویٰ یہ کہہ دے کہ یہ کام تقویٰ کے منافی ہے لہذا مناسب نہیں۔ عورت سے دور رہنا ہی مستحسن ہے۔ اور اس طرح ایسا نہ زندگی کی داغ بیل ڈالی جائے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص نے پیار کرنے کو مناسب نہیں سمجھا بلکہ آپ کے فعل کو ٹالنے کی کوشش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَا تَقَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَخْشَاکُمْ  
اللہ کی قسم مجھ میں تم سے زیادہ اللہ کا  
تقویٰ اور اس کی خشیت ہے۔ (صحیح مسلم)



بلکہ یہاں تک فرمایا :-

أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِحُدُودِ اللَّهِ (رواہ عبد الرزاق

باسناد صحیح نیل الاوطاس ج ۳ ص ۱۸)

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ محرم رموز شریعت تھے۔ لہذا جو کچھ آپ نے کیا وہ شریعت کے حدود کے اندر رہ کر کیا اور جو کچھ کیا وہ جائز تھا۔ نامناسب نہیں تھا آپ اور ہم اس کو نامناسب کہنے والے کون؟

”قرآن شریف میں مذکور ہے :-

**غلط فہمی**

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَأَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَ كُودُ اللَّهِ

لوگ آپ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں کہ دیکھو کہ حیض ایک قسم کی غلاظت ہے اس لئے دو ران حیض میں بیویوں سے دور رہیے اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب مت جائیے اور پاک ہونے کے بعد ان سے مباشرت کیجئے۔

(البقرہ)

اس آیت میں دو حکم دئے گئے ہیں، اول حیض کی حالت میں عورتوں سے دور رہیے، دوم ان کے قریب مت جائیے۔ ذرا دیکھیں حدیث نے اس قریب و دور کی کیا تشریح کی ہے؟

عَنْ عَائِشَةَ .....  
كَانَ يَأْمُرُنِي فَأَتُوهُ فَيُبَاشِرُنِي وَأَنَا حَائِضٌ

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حیض کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تڑپوش پہننے کا حکم دیتے اور اس کے بعد مجھ سے مباشرت کرتے تھے۔

یہ ہے قریب و دور کی تشریح حدیث میں“ (دوا سلام ص ۲۰۷-۲۰۸)

آیت مذکور میں ”أَذًى“ وارد ہوا ہے برق صاحب نے اس کا ترجمہ غلاظت کیا ہے حالانکہ یہ لفظ اذیت سے بنا ہے یعنی حیض ایک قسم کی تکلیف ہے اور اس تکلیف کی

**ازالہ**

حالت میں قریب مناسب نہیں ہے ہاں جب وہ اس تکلیف سے پاک ہو جائیں تو پھر ان کے پاس آؤ اس طریقہ سے جس طریقہ سے آنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے یعنی قانون فطرت کے مطابق نہ کہ خلاف وضع فطری کے طور پر، یہ ہے آیت کا منشاء اور مفہوم۔ آیت میں قریب سے مراد جماع ہے نہ کہ پاس اٹھنا بیٹھنا اور فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَ كُودُ اللَّهِ“ (اللہ کے حکم کے مطابق ان کے



پاس اُم) اس پر قرینہ ہے۔ برق صاحب نے قرب کے معنی پاس بیٹھنے کے سمجھ لئے اور اتنی لمبی چوڑی بحث کر ڈالی۔ آیت میں جماع کی ممانعت ہے۔ حدیث میں پاس اٹھنے بیٹھنے کی اجازت، دونوں میں تعارض کہاں ہے۔ برق صاحب نے بار بار پاس اٹھنے بیٹھنے کے بجائے لفظ مباشرت استعمال کیا ہے حالانکہ وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ لفظ اردو میں دوسرے معنی رکھتا ہے اور غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے۔ برق صاحب کی تحریر جو کوئی پڑھے گا وہ یہی سمجھے گا کہ جماع کرتے تھے حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔

”احادیث میں بار بار آتا ہے۔“

دکات الملک لا ریبہ کہ حضور کو اپنی خواہشات پر کمال ضبط تھا

**غلط فہمی**

(بخاری و مسلم موطا وغیرہ)

یہ عجیب قسم کا ضبط ہے کہ بقول بخاری و مسلم آپ نہ روزے میں مباشرت سے

رکتے تھے نہ حیض میں“ (دو اسلام ص ۲۱۱-۲۱۲)

یہ جملہ کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی خواہشات پر کمال ضبط تھا“ دوسری احادیث میں نہیں آیا ہے بلکہ معاشرت و حیض اور مباشرت در صریح نام کی احادیث ہی میں وارد ہوا ہے معلوم نہیں برق صاحب نے کس وجہ سے اس کو علیحدہ ذکر کیا ہے اس کلمہ سہی تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مباشرت کے معنی وہ نہیں جو ہماری اصطلاح میں لئے جاتے ہیں۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ آپ حالت حیض میں اور حالت صوم میں مباشرت فرمایا کرتے تھے اور آپ کو اپنی خواہشات پر مکمل ضبط حاصل تھا (بخاری و مسلم) حضرت عائشہ کے اخوی الفاظ بتا رہے ہیں کہ مباشرت سے مراد جماع نہیں بلکہ پاس بیٹھنا مراد ہے۔ برق صاحب اس کے معنی جماع بتاتے ہیں اور یہی غلط فہمی کا اصل سبب ہے۔ حدیث کا مطلب صاف ہے کہ آپ مباشرت تو کرتے تھے لیکن کمال ضبط کی وجہ سے جماع نہیں کرتے تھے۔

”امام مالک نے بھی یہ احادیث نقل کی ہیں لیکن حضور کی طرف مباشرت

منسوب نہیں کی۔ صرف بوسے کا ذکر کیا ہے بدیگر الفاظ امام مالک بھی

یہ سمجھتے تھے کہ مباشرت کی نسبت حضور والا صفات کی طرف مرادف تنقیص ہے“

(دو اسلام ص ۲۱۱)

دو مباشرت“ کے معنی پاس اٹھنے بیٹھنے کے ہیں اس لحاظ سے بوسہ کچھ مباشرت سے زیادہ

**ازالہ**

ہی ہے لیکن برق صاحب مباشرت کے معنی جماع لے رہے ہیں اور اسی وجہ سے اس کو

بوسہ سے زیادہ سمجھ کر موجب تنقیص سمجھ رہے ہیں امام مالک کی موطا میں مباشرت کا لفظ استعمال نہیں ہوا،



یہ تو صحیح ہے لیکن جو اس کے معنی ہیں وہ موطا میں موجود ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ کے پاس حبض کی حالت میں لیٹنا، اور پاس اٹھنا بیٹھنا اسی کو تو مباشرت کہتے ہیں اور یہ چیز موطا میں موجود ہے جماع کے معنوں میں یہ لفظ نہ موطا میں ہے نہ کسی دوسری کتاب میں۔

غلط فہمی | ”بخاری کی حدیث ہے۔“

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے نہاتے تھے۔

عن عائشہ قالت كنت اغتسل انا والنبی صلی اللہ علیہ وسلم من انا واحد۔

مطلب یہ کہ حضور ازواج کے ہمراہ برہنہ غسل فرمایا کرتے تھے۔ (دو اسلام ص ۲۱۱)

برق صاحب نے تمام حالات کا جائزہ نہیں لیا ورنہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

ازالہ | اول۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لیٹی ہوتی تھی اور میرے پر آپ کے قبلہ کی جانب ہوتے تھے پس جب آپ سجدہ کرتے تو میرے پیر دبا دیتے میں پریمیٹ لیتی پھر جب آپ کھڑے ہو جاتے تو میں پر پھیلا دیتی اور ان ایام میں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔

كُنْتُ اَنَامُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجُلَايَ فِي قُبُلَتِهِمْ وَإِذَا سَجَدَ غَمَزَنِي فَتَقَبَّضْتُ رِجْلِي فَأَذَا قَامَ بَسْطُهَا وَالْبُيُوتُ يَوْمَئِذٍ لَيْسَ فِيهَا مَصَابِيحُ (موطا مالک باب ما جاء في صلوة الليل)

یعنی تاریکی کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ آپ سجدہ کے لئے جھک رہے ہیں لہذا آپ کو پیر دبانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اگر اجالا ہوتا تو حضرت عائشہ آپ کو سجدہ کے لئے خود ہی جھکتا ہوا دیکھ لیتیں۔ دوسری حدیث سنئے حضرت عائشہ فرماتی ہیں:-

ایک رات کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہیں پایا تو میں نے ٹوٹا میرے ہاتھ آپ کے تلووں پر لگے۔ آپ سجدہ کر رہے تھے اور آپ کے پاؤں مبارک کھڑے تھے۔

فَقَدْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً مِنَ اللَّيْلِ أَشْ فَالْمَسْنُونُ فَوَقَعَتْ يَدِي عَلَى بَطْنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوبَتَانِ (مجموع مسلم باب ما يقال في الركوع والسجود)

ابن دینار امام دیش سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر میں اتنا آنا جیسا ہوتا تھا کہ ایک



دوسرے کو دیکھنا محال تھا لہذا حدیث پر جو اعتراض ہے وہ کالعدم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھتے تھے حضرت عائشہ فرماتی ہیں:-

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
لِيُصَلِّيَ الصُّبْحَ فَيَنْقَضَ فِي النِّسَاءِ  
مُتَلَفِّفَاتٍ بِمِثْرِ وَطِئَةٍ مَا يُحْسَنُ  
مِنَ الْغُلَسِ (موطا امام مالک باب  
وقوت الصلوة وصحیح بخاری وصحیح مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ایسے وقت  
پڑھتے تھے کہ عورتیں جب نماز پڑھ کر اپنی چادر  
میں لپیٹی ہوئی واپس ہوتی تھیں۔ تو  
اندھیرے کے سبب سے پہچانی نہیں  
جاتی تھیں۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد بھی اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ کسی  
کو پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ تو کھلی جگہ کا حال تھا۔ حجرہ کے اندھیرے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا  
ہے کہ جب نماز کے بعد کھلی جگہ میں اچھی طرح دیکھا نہیں جاسکتا تھا تو پھر بند حجرے میں شدید تاریکی  
میں کیا نظر آتا ہوگا۔ پس اس تشبیہ سے ثابت ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کو برہنہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے  
لہذا اعتراض فضول ہے۔

رابع صاحب کا یہ کہنا کہ یہ چیز سبھی نہیں دشمن کی کہیں گے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے شایان شان تو متبہی کی بیوی سے نکاح کرنا بھی نہیں تھا۔ دشمن کہتے ہیں جو کچھ کہتے ہیں۔ مہر کیا آپ  
اس واقعہ کو قرآن مجید سے نکال دیں گے۔ ربیع صاحب یہاں دوسرے کی نگاہ میں سمجھنے نہ سمجھنے کا سوال  
نہیں ہے۔ یہاں تو آپ کے افعال سے ضابطہ حیات تیار کروایا جا رہا ہے۔ یہاں مسائل و مسائل درج  
ہیں۔ جائز اور ناجائز میں سنت کے فریقہ امتیاز کر دیا جا رہا ہے لہذا امر وہ چیز ملے گی جس سے ضابطہ حیات  
انسانی پر روشنی پڑتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ربیع عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر درنی حالات بھی منظر عام پر  
لائے گئے اور یہی تو ضابطہ کا کمال ہے اور ہم اس پر نازاں ہیں اور آپ اس سے شرماتے ہیں۔  
دوم یہ حدیث میں ہے کہ:-

مِنْ إِنْاءٍ بَيْنِي وَبَيْنَهُ وَاحِدٍ  
(صحیح مسلم عن عائشہ)

یعنی ہم ایک ہی لگن سے نہایا کرتے جو ہم دونوں  
کے درمیان رکھا ہوتا تھا۔

لہذا یہ لگن دونوں کے درمیان پر وہ کام بھی کرتا تھا۔

## خلاصہ

انتہائی تاریکی میں دونوں نہاتے تھے، ایسا اندھیرا ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔  
پھر دونوں کے درمیان لگن رکھا ہوتا تھا۔ لہذا یہ سمجھنا کہ دونوں ایک دوسرے کو برہنہ دیکھتے تھے،



بالکل غلط ہے۔

سوم، برق صاحب آپ نے یہ حدیث نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دونوں برہنہ نہایا کرتے تھے۔ براہ کرم بتائیے کہ اس میں ”برہنہ“ کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ آخر اس اضافہ کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی؟ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ دونوں تہ بند باندھ کر نہایا کرتے تھے، دونوں کے درمیان پردہ بڑا ہوتا تھا تو کیا یہ اضافہ ناجائز ہوگا، اگر وہ جائز ہے تو یہ اس سے زیادہ جائز ہے۔ اور شایان شان بھی ہے کاش آپ نے بجائے اس اضافہ کے یہ اضافہ کر دیا ہوتا تو کتنا قرین انصاف تھا، حدیث میں برہنہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے لہذا اعتراض فضول ہے۔

برق صاحب تمام احادیث پر نظر ڈال کر کسی حدیث کا مطلب نکالا کبھی تاکہ کبھی غلط فہمی

”اور سنیئے ابو سلمہ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت عائشہؓ کا بھائی، حضرت عائشہؓ

کے پاس گئے ان کے بھائی نے ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کس طرح غسل فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے پانی سے بھرا ہوا ایک

برتن منگوا دیا جس سے آپ نے غسل کیا اور سر پر بھی پانی ڈالا اور میان میں ایک پردہ لٹکایا

ہوا تھا“ (بخاری جلد ۱ ص ۲۹) سوال یہ ہے کہ آیا یہ دونوں اس پردے میں سے حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا کو غسل کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اگر جواب نفی میں ہے تو غسل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مناسبت کرنے کا مقصد کیا تھا اور اگر اثبات میں

ہے تو پھر ”ہود و اسلام ص ۲۱۲-۲۱۳“

برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی۔ غسل کے معنی صرف نہانے کے نہیں، بلکہ غسل کے

معنی نہانے کے پانی کے بھی ہیں اور ان معنوں میں یہ لفظ صحیح بخاری ہی میں جگہ جگہ استعمال

ہوا ہے مثلاً حضرت میمونہؓ فرماتی ہیں

وَصَنَعْتُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلًا (صحیح بخاری کتاب الغسل)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے

غسل رکھا۔ یعنی نہانے کا پانی رکھا۔

صحیح بخاری صحیح مسلم میں اس حدیث کی جو سرخی ہے وہ خود اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے کافی

ہے امام بخاری نے اس حدیث پر باب باندھا ہے۔

غسل تقریباً ایک صاع پانی سے کرنا چاہیے۔

الغسل بالصاع وعنوة

صحیح مسلم میں سرخی یہ ہے۔

غسل میں کتنا پانی لینا مستحب ہے۔

قد استحب من الماء في غسل الجنابة



اس بنا پر فسأَلَهَا عَنْ غُسْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا مَطْلَبٌ بِهِ هُوَ أَنَّهُمْ نَهَانَهُ  
 كَے پانی کے متعلق سوال کیا اس سوال کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے کیا کیا؟ وہ ان ہی الفاظ کے  
 آگے مذکور ہے کہ ”فَدَعَتْ بِإِنَاءٍ“ انہوں نے ایک برتن منگوایا اور اس برتن کے ذریعہ یہ بتا دیا کہ رسول  
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے پانی سے نہایا کرتے تھے لہذا حدیث مذکور میں غسل کی کیفیت کا بیان نہیں بلکہ غسل  
 کے پانی کا بیان ہے اس سے غسل رسولؐ کی نمائش کرنا مقصود نہ تھا غسل کی کیفیت تو حضرت عائشہؓ نے  
 زبانی بتائی تھی ابوسلمہ کہتے ہیں:-

قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
 اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اغْتَسَلَ بَدَأَ  
 بِمِائِنِهِ الْخَمْرَ (صحیح مسلم)

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم جب غسل کرتے تو سیدھے ہاتھ سے  
 شروع کرتے وغیرہ وغیرہ

نسائی میں اس طرح ہے کہ ابوسلمہ کہتے ہیں:-

وَصَفَتْ عَائِشَةُ غُسْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْجَنَابَةِ قَالَتْ كَانَ  
 يَغْسِلُ يَدَيْهِ ثَلَاثًا.....

حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
 غسل کی کیفیت بتائی تو کہا کہ آپ پہلے دونوں ہاتھ  
 دھوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ کہ غسل کی کیفیت بتانے کے لئے حضرت عائشہؓ نے غسل نہیں کیا بلکہ جب انہوں نے  
 پانی کی مقدار کا ذکر کیا تو ابوسلمہ وغیرہ نے تعجب کا اظہار کیا کہ اتنے کم پانی سے کیسے نہایا جاسکتا ہے  
 تو حضرت عائشہؓ نے کہا یہ بالکل ممکن ہے اور اب میں نہانے جا رہی ہوں، اور اتنے ہی پانی سے نہاؤں  
 گی پس انہوں نے پردہ ڈالا اور غسل فرمایا اور یہ ثابت کر دیا کہ اتنے پانی سے نہانا ممکن نہیں نہانے کا مقصد  
 یہ تھا، نہ کہ وہ جو برق صاحب سمجھے۔

چار نامحرم آنکھیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو غسل کرتا دیکھیں اور  
 امام بخاری کو نہ غیرت آئے، نہ غصہ اور اس حدیث کو قول رسول اللہ

علیہ وآلہ وسلم سمجھ کر اپنی کتاب میں شامل کر لیں، کیا کوئی مسلمان یہ برداشت کر سکتا  
 ہے کہ اس کی بیوی ایک پتلا سا پردہ تان کر سارے محلے کے سامنے نہائے اور شرعی غسل

کا طریقہ بتائے۔ (دوا سلام ص ۲۱۳)

برق صاحب یہ وہی مبالغہ اور رنگ آمیزی ہے جس کا ذکر آپ پہلے کر چکے ہیں ان میں سے  
 کوئی بھی بات صحیح نہیں۔ دواؤں کو چار آنکھ کہہ کر عجیب رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے آپ

دواؤں بھی کہہ سکتے تھے پھر آپ نے ان دونوں کو نامحرم کیسے بنا دیا۔ آپ کی نقل کردہ عبارت میں موجود  
 ہے کہ میں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھائی حضرت عائشہؓ کے پاس گئے (دوا سلام ص ۲۱۳-۲۱۴)



لہذا آپ ہی کی کتاب اور خود حدیث کے متن سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک تو یقیناً حضرت عائشہؓ کے بھائی تھے اور محرم تھے۔ اب رہ گئے ابوسلمہ، تو ابوسلمہ بھی حضرت عائشہؓ کے رضاعی بھانجے تھے۔ لہذا دونوں محرم تھے، برق صاحب یہ تو بتائیے کہ یہ ”پتلا سا پردہ تان کر سارے محلے کے سامنے نہلے“ یہ کن الفاظ کا ترجمہ ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

## غلط فہمی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا جَلَسَ بَيْنَ شَعْبَيْنِ الْأَرْبَعُ ثُمَّ جَهْدَ هَا وَجَبَ عَلَيْهِ الْغُسْلُ وَإِنْ لَمْ يَنْزِلْ (مسلم ج ۱)

ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب مرد عورت کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر زور لگانا شروع کر دے تو اس کے لئے نہانا ضروری ہو جاتا ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

(۴۸۵)

اب اس بحث کو جانے دیجیے کہ کئی احادیث کی رو سے غسل ضروری نہیں۔ (تفصیل گزر چکی ہے) حدیث کی زبان دیکھیے۔ ماشاء اللہ ”کتنی پاکیزہ اور شستہ“ ہے (دو اسلام

(۲۱۴)

برق صاحب عربی عبارت تو بے شک ”پاکیزہ اور شستہ“ ہے ناشائستگی تو ترجمہ نے پیدا کر دی ہے صحیح ترجمہ یہ ہے ”جب کوئی مرد عورت کے چاروں شہوں کے درمیان بیٹھ جائے پھر اس کے ساتھ کوشش کرے تو غسل فرض ہو جائے گا خواہ انزال نہ ہو“ برق صاحب آپ نے جو ترجمہ کیا ہے اس سے بھی زیادہ ناشائستہ اور شرمناک ترجمہ ہو سکتا ہے۔ مترجم کی مرضی پر انحصار ہے چاہے جیسا ترجمہ کرے۔ برق صاحب ذرا قرآن مجید کے مندرجہ ذیل کلمات پر غور فرمائیے:-

(۱) خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ وَافِقٍ (۲) أَنْفَ أَيْتُمْ مَّا تُشْمُونَ (۳) فَلَمَّا تَغَشَّاهَا (۴) الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۵) نِسَاءُ كُذِّبَتْ لَكُمْ فَأُتُوْا حَتَّىٰ تَكُونُوا فِي سِتْرِكُمْ

کیا ان کلمات کے ناشائستہ اور حیا سوز ترجمے نہیں ہو سکتے؟ ہو سکتے ہیں لیکن یہ قصور ترجمہ کا ہوگا نہ کہ متن کا۔

برق صاحب لکھتے ہیں:-

## غلط فہمی

جب اللہ کے فضل و کرم سے حضور نے قلعہ خیبر کو فتح کر لیا تو کسی نے کہا، صفیہ بنت حبیب بڑی خوب صورت لڑکی ہے اس کا خاوند جنگ میں مر چکا ہے اور وہ ابھی دامن ہے یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے لئے پسند کر لیا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور حیا ل سے نہیں بلکہ صفیہ کی شہرت حسن سن کر اپنے حرم میں



داخل کر لیا تھا (دوا سلام ص ۲۱۵)

برق صاحب حدیث کے مختلف اسناد سے بیان کردہ ٹکڑے آپ کی پریشانی کا سبب  
**ازالہ** | ہیں آپ نے ان عبارتوں کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان عبارتوں کو متضاد  
 سمجھ کر اعتراض کر دیا ہے۔

برق صاحب لکھتے ہیں:-

”حضرت صفیہ جنگ خیبر کے اسیروں میں شامل تھیں، ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے  
 ایک لونڈی کی درخواست کی، آپ نے فرمایا، خود چن لو، اس نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا،  
 بعد میں کسی نے کہا کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے اسے لونڈی بنا کر اس سے ندمت لینا ظلم ہے اس لئے  
 حضور اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں حضور نے یہ تجویز مان لی اور اسے آزاد کر کے

نکاح کر لیا“ (دوا سلام ص ۲۱۴-۲۱۵)

یہ دونوں عبارتیں صحیح بخاری ہی سے ماخوذ ہیں۔ برق صاحب کو پہلی عبارت شایانِ شان نہیں معلوم  
 ہوئی وہ دوسری کو صحیح سمجھتے ہیں اور پہلی کو غلط۔ حالانکہ دونوں صحیح ہیں، اور ایک دوسرے میں اس طرح  
 پیوست ہیں جیسا کہ درج ذیل ہے۔

”حضرت صفیہ اسیروں میں شامل تھیں۔ ان کے حسن کا ذکر آپ کے سامنے ہوا یہ بھی کہا گیا  
 کہ وہ ابھی دہن ہیں یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ حضرت وحیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک لونڈی  
 کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا لے لو، انہوں نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا۔ بعد میں کسی نے رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کا ذکر کیا اور آپ سے عرض کیا کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے اور آپ  
 کے سوا کسی کے شایانِ شان نہیں اس لئے آپ اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے یہ تجویز منظور کر لی اور انہیں آزاد کر کے نکاح کر لیا“

حدیث تو بالکل صحیح ہے برق صاحب کو خواہ مخواہ المجہن پیدا ہو گئی۔ کاش وہ ان عبارتوں کو ترتیب  
 دے کر سمجھنے کی کوشش فرماتے، قصصِ قرآن مجید میں بھی یہی دقت پیش آتی ہے کوئی بات کہیں ہے اور  
 کوئی کہیں، بظاہر تضاد نظر آتا ہے لیکن ترتیب عبارات سے یہ تضاد کالعدم ہو جاتا ہے (قرآن مجید کے  
 اس ظاہری تضاد کو تفصیل سے دیکھنا ہو تو اس کتاب کا بیسواں باب ملاحظہ فرمائیے) مجملًا بطور مثال  
 کے ایک آیت درج ذیل ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ (البقرة: ۲۱۳)  
 سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ پس اللہ نے  
 بنی بھیجے شروع کر دئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب لوگ ایک ہی صراطِ مستقیم پر متحد و متفق تھے۔ تو پھر بنی بھیجنے کی



کی ضرورت پیش آئی، جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے جو دوسری جگہ مذکور ہے۔ یعنی ”انہوں نے اختلاف کیا“ لہذا آیت مذکورہ کا ترجمہ اس طرح ہوگا ”سب لوگ ایک ہی جماعت تھے (پھر انہوں نے اختلاف شروع کر دیا) تو اللہ تعالیٰ نے (اس اختلاف کو رفع کرنے کی غرض سے) نبی بھیجے شروع کر دئے۔

برق صاحب اس طرح منتشر عبارات کو ترتیب دے کر اعتراض دور کر لیا کیجیے۔

**غلط فہمی** | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

عن قتادة عن النسب  
بن مالك قال كان النبي صلى الله  
عليه وسلم يدور على نساءه في  
الساعة الواحدة من الليل والنهار  
وهن إحدى عشرة قال قلت  
لأنس أو كان يطيقه قال كنا نتحدث  
أنه اعطى قوة ثلاثين رجالا -

قتادہ کہتے ہیں کہ مجھے انس بن مالک نے بتایا  
کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دن ہو یا رات  
ایک ہی وقت میں اپنی گیارہ بیویوں سے محبت  
فرمایا کرتے تھے ہیں نے پوچھا رسول اللہ صلی  
میں اتنی طاقت تھی کہا آپ میں تیس مردوں  
کی طاقت موجود تھی۔

(بخاری)

ملاحظہ کیا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دلچسپ تصویر۔ یہ حدیث صریحاً غلط ہے

(بوہاسد ص ۲۱۶-۲۱۷)

حدیث تو غلط نہیں ہے آپ ”كَانَ يَدُورُ“ کا ترجمہ غلط کر کے الجھن میں پڑ گئے  
اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے ”دورہ کرتے تھے“ لہذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے

**ازالہ**

دوسری حدیث میں اس کی تشریح موجود ہے:-

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ إِذَا انْصَرَفَ مِنَ الْعَصْرِ وَخَلَّ  
عَلَى نِسَائِهِ (بخاری کتاب النکاح)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عصر  
سے فارغ ہوتے، تو اپنی بیویوں کے پاس  
تشریف لے جاتے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:-

إِذَا صَلَّى الْعَصْرَ رَأَى عَلَى نِسَائِهِ  
(صحیح مسلم کتاب الطلاق)

جب نماز عصر پڑھ چکے تو اپنی بیویوں کے پاس  
دورہ کرتے تھے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:-

قُلَّ يَوْمٌ إِلَّا وَدَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ يُطَوِّفُ عَلَيْهَا جَمِيعًا، فَيُقَبِّلُ وَ

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وآلہ وسلم اکثر روزانہ ہم سب کے پاس



یَلْبِسُ مَا دُونَ الْوِقَاعِ ۝ (رداء)  
 ابو داؤد وسکت علیہ الحافظ فتح الباری  
 دیرہ کیا کرتے تھے، آپ پیر کرتے، ہاتھ لگاتے  
 جتے، لیکن جامع نہیں کرتے تھے۔

کتاب النکاح باب القرعة بین النساء  
 اذا اراد سفها وروی نحوه احمد وسندہ

صیغہ بلوغ الامانی جز ۱۶ ص ۲۳۸

یعنی آپ روزانہ تمام بیویوں کے پاس ملاقات کے لئے اور ان کی خانگی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے  
 تشریف لے جایا کرتے تھے دن رات یعنی چوبیس گھنٹوں میں ایک ساعت بھی جو سب کے لئے مشترک تھی اگر  
 ایسا نہ ہوتا تو ہر بیوی کے پاس نو دن کے بعد پہنچتے، اور اتنے طویل عرصہ تک اس کی خبر نہ لیتے کہ کس حال میں  
 ہے اور اس پر کیا گزر رہی ہے۔ برق صاحب اس مشترک وقت میں کسی بیوی کے ہاں ٹھہر جانا کوئی نا انصافی  
 نہیں۔ اس وقت میں تو سب شریک تھیں اور یہ وقت باری میں شامل نہ ہوتا تھا۔

”قرآن کہتا ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ“ کہ رسول تم جیسے بشر ہیں اور ہے

بھی درست ہم جیسا قد، ہماری طرح ایک دل، ایک جگر، دو پھیپھے، نظام

جسم ہم جیسا، کھانا پینا ہم جیسا ہو ہو ہم جیسے انسان، لیکن حدیث کہتی ہے کہ ان میں تیس مردوں

کی طاقت تھی۔ (ردو اسلام ص ۲۱۹)

**غلط فہمی**

برق صاحب ظاہری اعضاء کے لحاظ سے تو بے شک سب انسان ایک جیسے ہیں، لیکن  
 کیا آپ کا خیال ہے کہ قوت جسمانی، قوت روحانی، بہادری، ہمت، عقل، حسن وغیرہ کے

**ازالہ**

لحاظ سے بھی سب برابر ہیں؟ برق صاحب ایک پہلوان بھی آدمی ہے اور ایک کمزور بھی آدمی ہے، کیا دونوں  
 برابر ہیں، کیا ایک پہلوان میں دس، پندرہ معمولی آدمیوں کے برابر طاقت نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو یہ  
 کیسے۔ جب کہ دونوں کے جسم میں ایک دل ایک جگر ہے وغیرہ وغیرہ۔ موسیٰ علیہ السلام بھی ایک آدمی تھے لیکن  
 ایک پتھر سے ایک قبطی کو ہلاک کر دیا (قرآن مجید) اور ہم بھی آدمی ہیں لیکن کیا ایک پتھر سے کسی آدمی کو ہلاک کر  
 سکتے ہیں۔ یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی آدمی تھے لیکن زنانہ مصر نے ان کو دیکھ کر ہاتھ کاٹ ڈالے تھے  
 اور یہ کہا تھا کہ یہ انسان نہیں کوئی مکرم فرشتہ ہے (قرآن مجید)

برق صاحب! ایک نبی جس طرح روحانی قوت میں سب سے اعلیٰ ہوتا ہے اسی طرح جسمانی قوت  
 میں بھی سب سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر رکانہ پہلوان مقابلہ پر آگیا تو وہ بھی خاک میں غلطاب  
 نظر آیا۔ اگر کوئی ناقابل تسخیر چٹان سامنے آگئی، تو ایک ہی ضرب میں پاش پاش ہو گئی حالانکہ اس چٹان کو توڑنے  
 سے صحابہ عاجز ہو گئے تھے۔ بہادری کا یہ عالم کہ اعدا و حنین کے میدانوں میں اکیلے ڈٹے رہے۔ برق صاحب آپ  
 اللہ کے رسول کی قوت کو عام انسانوں کے برابر سمجھ رہے ہیں، حیرت ہے ایک انسان دوسرے انسان سے متعدد



باتوں میں مختلف نظر آتا ہے، بعض آدمی ایسے بھی مل جاتے ہیں جو اتنے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے ہیں جو دوسروں کے لئے ناممکن ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ انسان ہوتے ہیں اور ایک ہی دل والے، برق صاحب آپ ہی کی تحریر کو وہ عبارت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ نقل کر کے ہم آپ سے انصاف کے خواہاں ہیں ہمیں اس رسول پر ناز ہے جو تیس آدمیوں کی قوت رکھتے ہوئے بھی ہر ترغیب، کھشش، اور ہر گناہ سے دامن بچا کر نکل گیا تھا (دوا سلام ص ۷)

”حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تیس مردوں کی طاقت اور کوئی اولاد

نہ ہو بات کیا تھی“ (دوا سلام ص ۲۱۹)

**غلط فہمی**

برق صاحب! اولاد کا ہونا طاقت و صحت ہی پر منحصر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

**ازالہ**

اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يُهَبِّ لِمَنْ يَشَاءُ  
اِنَاثًا وَيُهَبِّ لِمَنْ يَشَاءُ الذَّكَوٰرَ  
(شوری: ۲۹)

اور جس کو چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں دیتا ہے۔

اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرًا وَاِنَاثًا  
(شوری: ۵۰)

خود ہمارے زمانہ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ باوجود قوت و صحت کے اولاد نہیں ہوتی۔ تعجب تو یہ ہے کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اولاد نہ ہونے پر تعجب ہے

صحیح مسلم میں ایک روایت ہے کہ خدا تعالیٰ تین آدمیوں کو دگنا معاوضہ دے گا

**غلط فہمی**

اول وہ یہودی یا عیسائی جو اپنے رسول پر ایمان لانے کے بعد حضور پر ایمان لے

آئے۔ دوم۔ وہ غلام جو خدا اور آقا دونوں کے حقوق ادا کرے اور سوم وہ شخص جو لونڈی کو

تعلیم و تربیت دے کر پہلے آزاد کرے اور پھر نکاح کر لے (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۹۹) یہ تھا

رسول کا ارشاد، اب سوال یہ ہے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماریہ قبطیہ کو

آزاد کر کے اس سے نکاح کیا تھا۔ اگر ایسا کیا تھا تو سیرت نگاروں نے آپ کا نام ازواج

مطہرات میں کیوں نہ درج کیا۔ اگر نہیں کیا تھا تو دوسروں کو حکم کیوں دیا؟ اس

لئے ماریہ قبطیہ کو گھر میں رکھنے اور اس سے ابراہیم کے پیدا ہونے کا افسانہ غلط ہے

(دوا سلام حاشیہ ص ۲۱۹-۲۲۰)

برق صاحب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کہاں دیا ہے؟ آپ نے تو اس کام

کا ثواب بیان فرمایا ہے آپ نے غلط فہمی سے ترغیب کو حکم سمجھ لیا۔ اب سوال یہ ہے کہ

**ازالہ**



آپ نے حضرت ماریہ قبطیہ کو آزاد کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب قرآن مجید میں موجود ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ نے دونوں چیزیں (قرآن و حدیث) سرسری طور پر دیکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِمَّنْ بَعْدُ وَلَا  
أَنْ تَبْدَلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ  
أَعْجَبَتْ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ  
يَمِينُكَ (الاحزاب :- ۵۲)

اے رسول! تمہارے لئے ان بیویوں کے بعد  
اور بیوی حلال نہیں نہ کسی اور کو تم ان میں کسی  
کے ساتھ بدل سکتے ہو خواہ وہ تمہیں کتنی ہی حسین  
کیونکہ معلوم ہو، مگر ہاں لونڈی رکھ سکتے

ہو۔

اس آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روک دیا تھا لہذا آپ حضرت ماریہ کو آزاد کر کے بیوی نہ بنا سکے۔ الغرض حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے۔

”میرا خیال ہے کہ حضور نے مدینہ میں اگر ازواجِ مطہرات کو بطور شہر استعمال ہی نہیں فرمایا تھا“ (دو اسلام ص ۲۲)

**غلط فہمی**

یہ خیالی قطعاً صحیح نہیں آپ کا یہ خیال تو اتر کے خلاف ہے اگر اس طرح محض ظن و تخمین سے تو اتر کا انکار سونے لگا تو پھر قرآن مجید کا بھی انکار ناممکن نہیں رہے گا۔ برق صاحب اگر کوئی دشمن اسلام یہ کہہ دے کہ آپ کے پیغمبر نے جو ان عورتیں اپنی گھر میں کیوں رکھ چھوڑی تھیں جب کہ وہ ان کی تسکین کے قابل نہ تھے۔ کیا یہ ان عورتوں پر ظلم نہیں تھا؟ کیا یہ انسانیت کا خون نہیں؟ کیا یہ عیسائی مذہب کی راہبہ عورتوں کی مماثلت نہیں؟ آخر ان عورتوں سے کیا کام لیا جاتا تھا؟ بتائیے ان سوالات کا آپ کیا جواب دیں گے یہی کہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اللہ ہی جانے۔

”بے اندازہ مصروفیات ہلا تعداد و تفکرات، اور بے شمار پریشانیوں میں انہیں مباشرت کی سوجھ بوجھ کیسے کتنی تھی“ (دو اسلام ص ۲۲)

**غلط فہمی**

بے شک ان بے اندازہ مصروفیتوں کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی راہبانہ نہیں تھی۔ آپ نے دین و دنیا کو اس طرح سمود یا تھا کہ ہمیں آپ کی اسی زندگی پر ناز ہے۔ کیا کوئی دوسرا انسان ایسا اسوہ پیش کر سکتا ہے۔ جو چیز قابلِ فخر ہے آپ اس سے شرماتے ہیں۔

برق صاحب! احساس کمتری کو دل سے نکال دیجیئے انشاء اللہ سب کام ٹھیک ہو جائیں گے  
دیکھیے ایک غیر مسلم پول برٹن کیا لکھتا ہے؟  
وہ تحریر کرتا ہے:-



I could not but respect the wisdom  
of the Prophet Muhammad for so  
early teaching his followers to mingle  
the life of religious devotion with  
the life of the busy world. (A search  
in the secret Egypt" By Paul Brunton  
Page 134.)

ترجمہ: میں پیغمبر اسلام حضرت محمد کی دانائی کی تحکیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا، جنہوں  
نے اپنے متبعین کو اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ دینی زندگی کو دنیاوی مصروف زندگی کے  
ساتھ سمونا سکھا دیا۔

اس کا راوی انسؓ ہے اور یہ وہی بزرگ ہیں جنہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم  
کی عمر بھی معلوم نہ تھی (دو اسلام ص ۲۱)

**غلط فہمی**

حضرت انسؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر معلوم تھی ان کا بیان ہے کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۶۳ سال تھی۔ (صحیح مسلم) باقی رہا یہ امر کہ اس حدیث میں گیارہ  
بیویوں کا ذکر ہے۔ حالانکہ آپ کی صرف نو بیویاں زندہ تھیں، دو کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ بے شک صحیح ہے  
لیکن اس میں غلطی حضرت انسؓ سے نہیں ہوئی۔ اور کسی راوی نے دو لونڈیوں کو ملا کر گیارہ کہہ دیا ہے۔ حضرت  
انسؓ سے اسی حدیث میں نو کی تعداد مذکور ہے معلوم نہیں صحیح بخاری سے اس حدیث کو نقل کرتے وقت  
برق صاحب نے اس کا آخری حصہ کیوں چھوڑ دیا، حالانکہ امام بخاری نے اس کو نقل ہی اس لئے کیا تھا  
کہ راوی کی غلطی ثابت کریں کہ اس نے اس روایت میں نو کے بجائے گیارہ غلطی سے کہا ہے۔ حضرت  
انسؓ نے تو نو ہی کہا تھا۔ غرض کہ ہر بات کا جواب حدیث میں موجود ہوتا ہے۔ مگر برق صاحب تحقیقی  
نظر نہیں ڈالتے۔

”حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے  
چھ برس کی عمر میں ہوا تھا“ دینی بی وانا بنت تسع سنین اور آپ

**غلط فہمی**

نے مجھ سے نو برس کی عمر میں مجامعت کی... اتنی نابالغ بچی ہو، مہینہ بھر تپ مرقہ  
میں مبتلا رہ کر کاٹا ہو چکی ہو۔ کیا ایسی بچی مجامعت کی تاب لاسکتی ہے۔ (دو

اسلام ص ۲۱)



## ازالہ

برق صاحب یہ وہی مبالغہ آمیزی اور رنگین بیانی ہے، جس کا آپ کو خود اعتراف ہے  
 مباشرت کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں۔ ”یدور“ کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں۔  
 ”بنی“ کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں۔ آخر یہ مجامعت کا لفظ بار بار کیوں آجاتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت  
 ذرا تحقیق کر لیا کیجئے۔ ترجمہ مذکور میں مجامعت آپ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے ”بنی“ کے معنی ہیں ”شادی کر کے  
 بیوی کو گھر میں لانا“ (مفتاح اللغات) لہذا صحیح ترجمہ یہ ہوا کہ نوسال کی عمر میں وداع ہوئی۔ اس کے بعد کیا  
 ہوا۔ حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ مختلف ممالک میں بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے۔ بلکہ ایک ہی ملک میں  
 بلوغ کی عمروں میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ لہذا آپ کا یہ خیال کہ حضرت عائشہؓ نابالغ تھیں غلط فہمی پر مبنی  
 ہے۔ ایک افریقی لڑکی کے ۹ سال کی عمر میں ۲۸ مارچ ۱۹۶۶ء کو بچہ ہوا۔ (اخبار ڈان مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۶ء)  
 گویا وہ آٹھ سال کی عمر میں بالغ ہو گئی تھی۔

## غلط فہمی

”سبرہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعہ کی اجازت  
 طلب کی۔ آپ نے دے دی۔ میں اس عورت کے پاس تین راتیں ٹھہرا۔“  
 (مسلم جلد ۳ ص ۲۲۳)

تو پھر کی حکم ہے ان خوانین کے متعلق جو پیشاور سے چل کر ٹبی بازار میں کچھ ایسے ہی  
 مقاصد کے لئے جاتے ہیں اور کئی کئی راتیں وہیں گزارتے ہیں (دو اسلام ص ۲۲۴)

## ازالہ

کتنی زبردست غلط فہمی آپ کو ہوئی، یہ اس وقت کا ذکر ہے جب متعہ کی ممانعت نہیں  
 ہوئی تھی آپ نے خود لکھا ہے کہ جنگ خیبر میں اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 حرام کر دیا تھا (دو اسلام ص ۲۲۴) لہذا پھر بھی اعتراض کرنا قرین انصاف نہیں۔ اسی طرح اوائل اسلام  
 میں کافر عورتوں سے نکاح جائز تھا، شراب بھی عام طور پر پی جاتی تھی۔ بتدریج یہ چیزیں حرام ہوئیں لہذا  
 حدیث پر اس کے کیا اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔

## غلط فہمی

حضرت جابر کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم صلعم اور حضرت صدیق کے زمانہ میں  
 مٹی بھرا ٹاڈے کر عورتوں کو استعمال کیا کرتے تھے۔ اور اس حرکت سے ہمیں

حضرت عمرؓ نے روکا تھا (ص ۲۲۴-۲۲۵)

## ازالہ

حرمیت کے بعد جن لوگوں نے ایسا کیا یہ ان کی لاعلمی تھی جب حضرت عمر کو معلوم ہوا تو انہوں  
 نے اس کی حرمیت کا اعلان کر دیا۔

## غلط فہمی

حضرت جابر کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج کے لئے  
 روانہ ہوئے جن کے پاس قربانی کے لئے کچھ بھی نہیں تھا انہیں ذی الحجہ کی پانچویں  
 تاریخ کو احرام توڑنے کی اجازت دی گئی چنانچہ ہم نے خوب جماع کیا اور پانچویں دن کے بعد



جب ہم عرفہ کے لئے روانہ ہوئے تو نقطہ مذاکیرونا المنیٰ ہمارے اعضاءے تناسل سے نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا۔ عام حالات میں جماع کے بعد تسکین آجاتی ہے۔ لیکن خدا جانے ان صحابہؓ نے کون سا کشتہ کھا یا ہوا تھا کہ حج کے مقدس موقع پر بھی ان کا نطفہ اچھل اچھل کر زمین پر گر رہا تھا۔ (دوا سلام ص ۲۵)

برق صاحب! یہ رنگ آمیزی نہیں تو اور کیا ہے عربی عبارت اس شرمناک ترجمہ کی متعل نہیں۔ بہر حال قصور عبارت کے مفقود کو نہ سمجھنے کا ہے۔ سنی عبد اللہ بن عمر

**ازالہ**

رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ مَثْنِي مَثْنِي وَلَوْ تَرَى بِرُكْعَةٍ وَ يُصَلِّي رُكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْغَدَاةِ كَأَنَّ الْإِذَاْنَ بِأُذُنَيْهِ (صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت نماز پڑھتے تھے، اور ایک رکعت وتر پڑھتے تھے اور صبح کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے تھے گویا کہ اذان آپ کے کان میں ہوتی تھی۔

یعنی صبح کی سنتیں ایسے وقت پڑھتے تھے کہ اذان ختم ہوتی اور سنتیں شروع کر دیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اذان سنتے ہوتے تھے اور سنتیں پڑھنی شروع کر دیتے تھے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اذان اور سنتوں کے آغاز کے درمیان میں بہت کم وقفہ ہوتا تھا۔ گویا وقفہ کی قلت کو عبد اللہ بن عمرؓ اس طرح ظاہر کر رہے ہیں۔ یہی وقفہ کی قلت آپ کی نقل کردہ حدیث میں ہے۔ یعنی ابھی کچھ دیر پہلے وہ صحبت کر چکے تھے اور اب احرام میں تھے اور صحبت کرنے اور احرام باندھنے کے درمیان بہت ہی قلیل وقفہ تھا۔ یہ الفاظ کہ ان کے مذاکیر بانی ٹپکارہے تھے۔ وقفہ کی قلت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم صحبت کر چکے تھے اور اب حج کر رہے تھے۔ دورانِ حج پانی پیکانے کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ پانی پیکانا حج کے آغاز سے پہلے ہوا تھا۔ آپ نے جو ترجمہ کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس میں تحریف معنوی ہوئی ہے۔ گونادانستہ ہوئی ہو۔ لفظ جماع سے پہلے ”خوب“ کا اضافہ بھی خوب ہے۔ !!! ”نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا“ یہ ترجمہ صحیح نہیں مہر اس میں ”بدستور“ کا اضافہ محاورہ عرب کے خلاف ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ صحبت اور پھر احرام باندھ لینے میں اتنا کم وقفہ تھا گویا پانی ابھی ٹپک رہا ہے۔

”و نہ یہ احادیث صحابہؓ کی سیرت کے مطابق اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم الشان کردار کے موافق۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق

**غلط فہمی**

قرآن کہتا ہے ۔



تَوَاهُمُ رُكْعًا سَجْدًا اِيْتَتَغُوْنَ  
فَعِلَاءَتِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا -

(دو اسلام ۲۲۵-۲۲۶) لئے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

ان ہی صحابہؓ کے متعلق آپ پہلے لکھ آئے ہیں :-  
**ازالہ** ”ان حالات میں ممکن ہے کہ کسی صحابی نے عمداً کسی حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں ص ۴۵۔ اب بتائے آپ کا کون سا بیان صحیح ہے کیا یہ بیان کہ صحابہ کرام قصداً تحریف کرتے تھے، آپ کی وارد کردہ قرآنی آیت کے عین مطابق ہے۔ کچھ تو انصاف اور تحقیق سے لکھا کیجئے! اسلام کے مزاج کے مطابق ترجمہ کیا کیجئے۔ آزاد ترجمہ اگر جائز رکھا گیا تو پھر کوئی من چلا قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے قحبہ خانہ کھولنے کی اجازت نکال لے گا۔

آیت یہ ہے :-  
وَلَا تُكَلِّمُوْا فِتْنٰتِكُمْ عَلٰی الْبَعَاثِ  
اِنْ اَرَدْتُمْ مَّحَصِّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرْضَ  
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا -

اگر تمہاری لونڈیاں پاک و امن رہنا چاہتی  
ہوں تو ان کو دنیا کمانے کے لئے زنا پر  
مجبور نہ کرو۔

(سورۃ نور آیت نمبر ۳۳)

(النور: ۳۳)



# باب ۱۰

## حدیث میں نماز کی صورت

**غلط فہمی** | معراج کی حدیث نقل کرنے کے بعد برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-  
اس داستان کا خلاصہ یہ ہوا کہ امت رسولؐ کی استعداد کا علم نہ خدا کو تھا اور نہ حضورؐ کو۔ اگر موسیٰ علیہ السلام بیچ میں نہ پڑتے تو امت پر پچاس نمازیں فرض ہو جاتیں اور یہ امت صبح سے لے کر شام تک نمازیں ہی پڑھتی رہتی۔ نہ کما سکتی نہ کھا سکتی.... یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عقل کی داد دیجیئے... ماشاء اللہ کیا داستان تراشی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو خدا کا اور رسولؐ کو علم و دانش بنا ڈالا ہے۔ (دو اسلام ص ۲۳۹)

**ازالہ** | بات درحقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم تھا کہ پچاس وقت کی نمازیں ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر احسان و کرم کرنا مقصود تھا، زیادہ بوجھ ڈال کر پچاس کو کم کر دینے میں جو لطف و کرم ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اس کا تجربہ ہو یا جو علم نفسیات میں ماہر ہوں۔ قصور کو معاف کرنا، دل کو خوش کرتا ہے۔ اس میں معاف کرنے والے کا تحمل اور اس کی شانِ عالیہ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی قصور معاف کر کے بہت خوش ہوتا ہے۔ اور بندوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنے قصور معاف کرائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا  
اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک  
اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دے گا۔  
(النور: ۵۳)

بار بار فرماتا ہے:-  
إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ  
بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے:-



ایک اور جگہ فرماتا ہے :-

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ  
بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرة: ۱۸۵)

اسی طرح بوجہ ہلکا کر دینا بھی اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہے لیکن بندوں سے کتاب ہے کہ تم کہو، کہ اے

اللہ ہم پر زیادہ بوجہ نہ ڈالنا۔ مثلاً ارشاد ہے :-

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا  
بِهِ (البقرة: ۲۸۶)

بات صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی ایسا حکم نہیں دینا چاہتا جو دشوار ہو بلکہ وہ تو آسانی چاہتا ہے۔  
مگر ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ بندے التجا کریں اور ہم پر میں تخفیف کروں، اور اسی لئے اس نے ہمیں یہ دعا سکھائی۔  
نمازوں میں تخفیف بھی اسی بنا پر بندے کی التجا پر واقع ہوئی۔

چلتے چلتے اس اعتراض کا جواب قرآن مجید سے بھی سنتے جائیے۔ موسیٰ علیہ السلام کو نبی بنایا جاتا ہے۔  
وہ درخواست کرتے ہیں :-

وَاجْعَلْ لِّي زَوْجًا مِّنْ أَهْلِي هَارُونَ  
أَخِي ۖ اسْتَدْرَبْتُهُ ۖ وَاسْتَوَكَّهُ  
فِي أَمْرِي ه (طہ)

بلکہ صاف صاف اس طرح دعا کرتے ہیں :-

وَيُفِيئُنِي مَدْرِي وَلَا يُطْلِقْ لِسَانِي  
فَأَوْسِلْ إِلَى هَارُونَ ه

(الشعراء: ۱۳)

کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے اور یہ بات اللہ تعالیٰ  
کو پہلے سے معلوم نہیں تھی۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے توجہ دلائی تو اللہ تعالیٰ کو بھی نفوز با اللہ مرش آیا، کہ  
واقعی یہ کام اکیلے ان کے بس کی بات نہیں۔ لہذا ہارون علیہ السلام کو بھی رسول بنا دیا۔ ارشاد  
باری ہے :-

قَدْ أُفِيَّتْ سَمُوكَ يَمُوسَى (طہ: ۳۶)

قرآن مجید سے اس قسم کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں اور جب اس قسم کی باتوں سے قرآن مجید

پر اعتراض نہیں، تو ہمیشہ پر اعتراض کیوں؟ ایک مثال اور سنئے، ہم نماز میں پڑھتے ہیں :-

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (الفاتحہ)

اے اللہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔



مہر مکتے ہیں:-

مِرَاطُ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ  
الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ .  
ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، ان  
لوگوں کا راستہ نہیں جو مغضوب یا گمراہ ہیں۔  
یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نہیں جانتا کہ سیدھا راستہ کون سا ہے، ہم اللہ کو بتاتے  
ہیں کہ سیدھا راستہ کون سا ہے کہیں وہ غلط نہ کر جائے۔ نعوذ باللہ۔ ایک اور مثال سنئے:-

عَلِمَ أَنْ لَنْ نَحْضُوهُ فَنَابَ عَلَيْكُمْ  
فَأَقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ .  
اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے  
لہذا اس نے تم پر رحم کرنے کا ارادہ کیا پس اب تم  
مبتدا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔  
(المزمل: ۲۰)

بتائیے کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا۔ بعد میں تجربہ سے معلوم ہوا تو تخفیف کر دی۔ بات یہاں  
بھی وہی ہے۔ یہاں بھی اصولِ لطف و رحم جلوہ فرما ہے۔ یعنی زیادہ بوجھ ڈال کر ہلکا کر دینا یہ اللہ تعالیٰ کو  
بہت پسند ہے۔ اس طرح وہ اپنے بندوں پر رحم خیر و انہ کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ اور سنئے  
ارشاد باری ہے:-

أَلَمْ تَرَ خَفَّتِ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ  
فِيكُمْ ضَعْفًا (الأنفال ۶۶)  
اب اللہ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا اور اس کو معلوم ہو  
گیا (یا اس کو معلوم تھا) کہ تم میں کمزوری ہے۔

یعنی حکمِ مسلمین کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ بعد میں اس کو ہلکا کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا حکم  
پہلے دیا ہی کیوں گیا تھا۔ کیا ان آیات کی بنا پر قرآن مجید پر اعتراض کیا جاسکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر حدیث نے  
کی تصور کیا ہے؟

”اور یہ آخری فقرہ بھی خوب ہے کہ ”ہم اپنا قول نہیں بدلا کرتے“ تو  
پھر پچاس سے پچیس اور پچیس سے پانچ کیوں کہیں“ (دوا سلام ص ۲۲۹)

یہاں بات سے مراد احکامِ شریعت نہیں ہیں کیونکہ احکامِ شریعت تو بدلا ہی کتے ہیں۔  
ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ  
بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا (البقرہ: ۱۰۴)  
جب ہم کسی حکم کو منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی  
کے مثل دوسرا حکم دے دیتے ہیں۔

برق صاحب اس آیت پر وہی اعتراض ہو سکتا ہے جو آپ نے حدیث پر کیا ہے۔ یعنی پہلے ایسا حکم  
دیا ہی کیوں جاتا ہے جو چل نہیں سکتا یا جس سے بہتر دوسرا موجود ہوتا ہے۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا اس آیت سے  
یہ ضرور ثابت ہوا کہ احکامِ شریعت منسوخ ہوا کرتے ہیں اور حدیث زیر بحث میں ”قول“ سے مراد احکامِ شریعت نہیں  
بلکہ حسبات کا وہ اٹل قانون مراد ہے جو اس آیت میں بتایا گیا ہے۔



مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ  
أَمْثَلِهَا۔ (الانعام : ۱۶۰) جو نیکی کرے گا اس کو اس نیکی کا دس گن  
ثواب ملے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم نے پچاس کی پانچ تو کر دیں لیکن ثواب ہم پچاس ہی کا دیں گے۔ کیونکہ ہمارا قانون  
یہ ہے کہ ثواب دس گن دیا کرتے ہیں، یہ قانون غیر تبدیل ہے، بدلے گا نہیں، یہی مطلب ہے حدیث  
کے اس ٹکڑے کا ”مَا يَبْدُلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ“، کیونکہ اس فقرہ سے پہلے حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں،  
”هِيَ خَمْسٌ وَهِيَ خَمْسُونَ“ یعنی بظاہر یہ پانچ ہیں، لیکن حقیقت میں یہ پچاس ہی کے برابر شمار ہوں گی اور  
اس طرح پچاس جو ہم نے فرض کی تھیں ان کی ادائیگی ہو جائے گی۔ دوسری روایت میں حدیث کے  
الفاظ اس قانون کی طرف صراحت سے اشارہ کرتے ہیں اور نہ بدلنے والی بات کی تفسیر کرتے  
ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:-

يَا مُصَدِّدُ إِنَّهُنَّ خَمْسٌ صَلَوَاتٍ  
كُلُّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ لِكُلِّ صَلَاةٍ عَشْرًا  
مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَتْ  
لَهُ حَسَنَةٌ فَإِنْ عَمِلَهَا كَتَبَتْ لَهُ  
عَشْرًا۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان  
باب الاسراء)

اے محمد! دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں،  
ہر نماز کا ثواب دس کے برابر ہے (اور یہ اس قانون  
کے لحاظ سے ہے) کہ جس نے ایک نیکی کا ارادہ کیا  
اور عمل نہ کر سکا اس کے لئے ایک نیکی لکھو گی اور جس  
نے عمل کر لیا اس کے لئے دس نیکیاں لکھوں گا

الغرض نہ بدلنے والی بات یہ قانونِ حسنات ہے نہ کہ احکامِ شریعت۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے نینا  
وضو کیا کرتے تھے (بخاری جلد ۱ ص ۲۵)

**غلط فہمی**

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ کے گھر میں تھا کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر سوچنے کے بعد جاگے، وضو کیا، نماز پڑھی، پھر آپ لیٹ  
گئے یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ اس کے بعد نماز کے لئے بلائے والا آیا۔ آپ  
اس کے ہمراہ مسجد کو چل دئے۔ اور وہاں جا کر وضو کئے بغیر نماز ادا کی۔ ”بخاری“  
(دو اسلام ص ۲۳)

برق صاحب یہ تردید یا تعارض نہیں ہے ہر نماز کے لئے نینا وضو کرنا، یہ آپ کا معمول تھا  
اور کبھی کبھی اسی وضو سے دوسری نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ عمل شاذ تھا اور وہ  
اکثر، لہذا البغواتی ”لَا كَثْرَةَ حُكْمِ الْكُلِّ“ حضرت انسؓ نے آپ کا معمول یہ بتایا کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کیا  
کرتے تھے۔ سینے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

**ازالہ**



یَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ مُّجَادِلًا عَنِ  
نَفْسِهَا (النحل: ۱۱۱) قیامت کے دن ہر شخص اپنے نفس کے معاملہ  
میں جھگڑتا ہوا آئے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُونَ ه وَلَا يُؤْذَنُ  
لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ (المسلات ۳۲، ۳۵) قیامت کے دن لوگ بات نہ کر سکیں گے اور  
نہ انہیں اجازت ملیگی کہ اپنے عذر پیش کر سکیں۔

پہلی آیت میں ہے کہ انسان اپنے معاملہ میں خوب بحث کرے گا اور دوسری میں ہے کہ وہ بول  
بھی نہ سکے گا، کہ معذرت پیش کر سکے۔ کیونکہ دوسری آیت پہلی آیت کی تردید کرتی ہے۔ نہیں دوسری  
آیت میں عام حالت کا بیان ہے، پہلی آیت اس کو خاص کرتی ہے۔ اسی طرح برق صاحب کی پیش کردہ پہلی  
حدیث کہ آپ نے نیا وضو نہیں کیا، عام حالت کو بیان کرتی ہے اور دوسری اس کی تخصیص کرتی ہے کہ اس  
خاص واقعہ میں ایسا بھی ہوا تھا، کہ آپ نے نیا وضو نہیں کیا اور یہ بھی جائز ہے۔ برق صاحب اگر آپ  
قرآن مجید کو غور سے پڑھ لیتے، تو احادیث میں تطبیق دینے کا ملکہ پیدا ہو جاتا اور غلط فہمیاں نہ ہوتیں۔

## دوسری طریقہ سے

برق صاحب پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت کی نماز کے لئے آپ نیا وضو کرتے تھے۔ دوسری  
حدیث میں یہ ہے کہ رات کی نماز کے لئے آپ نے وضو کیا اور اسی وضو سے آپ نے صبح کی نماز پڑھی  
اس میں یہ کہاں ہے کہ عشاء کی نماز کے وضو سے آپ نے صبح کی نماز پڑھی۔ حدیث میں تو یہ  
ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد آپ سو گئے تھے۔ پھر اٹھے وضو کیا اور نماز پڑھی لہذا دونوں حدیثوں  
کوئی تعارض ہی نہیں۔ تعارض اس وقت ہوتا جب آپ صبح کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے۔  
”اس حدیث سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ اول کہ حضور ہر نماز کے لئے  
نیا وضو نہیں کرتے تھے۔ دوم کہ نیند کے بعد وضو ضروری نہیں۔ اگر  
آپ یہ کہیں کہ رسول اکرم کی صرف آنکھیں سوتی تھیں۔ اور دل جاگتا رہتا تھا، اس  
لئے ان کے لئے وضو ضروری نہیں تھا۔ اور یہ ہدایت صرف امت کے لئے تھی، تو ملاحظہ  
کیجئے صحیح مسلم کا یہ قول:-

كان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ينامون  
ثم يصلون ولا يتوضون۔ کہ حضور کے صحابہ سو چکنے کے بعد وضو کے بغیر  
نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل بھی نبی علیہ السلام کی طرح جاگتے رہتے تھے۔ ”ادو اسلام  
صفحہ ۲۲۳-۲۲۱)



## ازالہ

پہلی بات کا جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے یعنی پانچوں نمازوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیا وضو کرتے تھے، اور ان میں سے کسی ایک نماز کے وضو سے دوسری نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یہی آپ کا معمول تھا سوائے اظہارِ حجاز کے آپ نے اس کے خلاف کبھی نہیں کیا، لہذا برق صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے نیا وضو نہیں کرتے تھے۔ یہی دوسری بات کہ نیند کے بعد وضو ضروری نہیں، تو اس کے متعلق عرض ہے کہ جو حدیث آپ نے نقل فرمائی ہے اس میں ہے:-

”شَرَّ صُطْبَجَةٍ“ پھر آپ لیٹ جایا کرتے تھے۔

لیکن صحابہ کے متعلق یہ نہیں ہے کہ وہ بھی لیٹ کر سویا کرتے تھے اور پھر وضو نہیں کرتے تھے۔ صحابہ کے متعلق جو الفاظ برق صاحب نے نقل فرمائے ہیں وہ ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں دیر کی، صحابہ مسجد میں انتظار کرتے رہے حتیٰ کہ اس انتظار کے دوران بعض لوگ اونگھنے لگے، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

حَتَّى دَقَّ نَاسٌ وَاسْتَيْقَظُوا وَرَقَدُوا  
وَاسْتَيْقَظُوا (صحیح مسلم) حتیٰ کہ بعض لوگ سو گئے پھر جاگے پھر سو گئے،  
پھر جاگے۔

الفاظ حدیث خود بتا رہے ہیں کہ بعض صحابہ اونگھ رہے تھے، سو جاتے تھے، پھر جاگ جاتے تھے اس میں لیٹ کر سونے کا کوئی ذکر نہیں۔ حضرت انسؓ کی روایت میں اس کی صراحت ہے:-

حَتَّى تَخْفِقَ رُؤُوسُهُمْ ثُمَّ يَصْلَوْنَ وَلَا  
يَتَوَضَّئُونَ (رواہ ابوداؤد و رجالہ صحابہ کے سر اونگھ کی وجہ سے جبک جاتے تھے اور پھر وہ بغیر (تازہ) وضو کئے نماز  
ثقات (تقریباً سکت علیہ الشوکانی پڑھ لیتے تھے۔

نیل الاوطار جزاقل ص ۱۶۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی بھی غفلت کی نیند نہ سوتے تھے کہ آپ کو وضو ٹوٹنے کا علم نہ ہو لہذا آپ کا وضو نہ ٹوٹتا تھا۔ غفلت کی نیند بیٹھے بیٹھے سونے سے نہیں آتی، لہذا ایسی حالت میں صحابہ کا وضو بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ لیٹ کر سونے سے غفلت طاری ہو جاتی ہے، لہذا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

## غلط فہمی

فقہ بتلاتی ہے کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے (دوا سلام ص ۲۲۹) پھر

اس کے بعد تعارض میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ اغزوہ ذات الرقاع میں حضور ایک تیر سے زخمی ہو گئے اور خون بہہ نکلا، لیکن آپ اس حالت میں بھی نماز پڑھتے رہے۔

(دوا سلام ص ۲۳۱)



**ازالہ** | برق صاحب ابھی تک تو آپ حدیث کو حدیث سے ٹکڑا رہے تھے لیکن یہ آپ نے کیا کیا کہ اب فقہ کو حدیث سے ٹکڑا لے لگے۔ فقہ میں اکثر مسائل بے بنیاد و من گھڑت ہیں اور یہ مسائل قرآن و حدیث سے ٹکڑاتے ہیں۔ لہذا وہ مسائل خود مردود ہیں۔ ان کو حدیث کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ پھر فقہ سے مراد آپ کی حنفی فقہ ہے اور حنفی فقہ تو بیشتر مقامات پر حدیث سے ٹکڑاتی ہے لہذا وہ کوئی چیز نہیں۔

## انتباہ

برق صاحب نے لکھا ہے کہ حضور کے تیر لگا اور خون بہہ نکلا وغیرہ وغیرہ، یہ صحیح نہیں بلکہ ایک اور شخص کے تیر لگا تھا۔ اس کے خون نکلا، اور اس حالت میں بھی وہ نماز پڑھتا رہا ملاحظہ ہو، صحیح بخاری جلد ۱ ص ۳۲

**غلط فہمی** | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ایک اندازہ سوال :- کیا جماعت کے بعد غسل ضروری ہے؟ کئی جواب :- زید بن خالد نے حضرت عثمان سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص جماعت کرے اور ازال سے پہلے علیحدہ ہو جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ فرمایا شرم گاہ کو دھو ڈالے اور وضو کر لے، میں نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سنا تھا۔ (بخاری)

۲۔ دخول کے بعد غسل واجب ہو جاتا ہے (موطا ص ۲۲)  
۳۔ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔۔۔ غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ ازال ہو یا نہ ہو (صحیح مسلم)  
۴۔ ابی بن کعب کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص جماعت کرے اور ازال سے پہلے علیحدہ ہو جائے تو کیا وہ غسل کرے۔ فرمایا وہ صرف وضو کر کے نماز پڑھ لے۔ (صحیح مسلم)

**ازالہ** | حضرت عثمان کا جواب یہ ہے۔ ا۔ **يَتَوَضَّأُ كَمَا يَتَوَضَّأُ** یعنی ایسا وضو کرے جیسا نماز کے لئے کیا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری)

ظاہر ہے کہ سوال نماز پڑھنے کے لئے نہیں تھا بلکہ دوسری ضروریات کے لئے تھا مثلاً کھانا پینا، چلنا، پھیرنا وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-



”تَوَضَّأُوا غُسْلَ ذِكْرِكُمْ ثُمَّ نَمَ“ یعنی وضو کرو اور ذکر کو دھو ڈالو، پھر سو جاؤ۔

بلکہ یہاں تک فرمایا ”وَحَتَّى يَغْتَسِلَ إِذَا شَاءَ“ پھر حیب چاہے غسل کرے محض سونے کے لئے

غسل کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے۔

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحالت جنابت

جب کھانے یا سونے کا ارادہ فرماتے تو وضو

کرتے جیسا کہ نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے۔

إِذَا كَانَ جُنُبًا فَارَادَ أَنْ يَأْكُلَ

أَوْ يَنَامَ تَوَضَّأَ وَضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ

(مسلم)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ علاوہ نماز کے دوسری ضروریات کے لئے صرف وضو کافی ہے۔

نمبر ۲ اور نمبر ۳ کا مضمون واحد ہے اور یہی حکم ہے جو قیامت تک کے لئے باقی ہے یعنی نماز کے لئے

غسل ضروری ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

حدیث نمبر ۴ ایک منسوخ حدیث ہے جس کو حضرت ابی بن کعبؓ نے بیان فرمایا ہے ابی بن کعب خود ہی

فرماتے ہیں۔

إِذَا كَانَ السَّاعِرُ مِنَ الْمَاءِ رُخْصَةً

ازال سے غسل کرنا یہ رخصت شروع اسلام

میں تھی، پھر ہم کو اس سے منع کر دیا گیا۔

فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ تَشَدَّدَ هِيَ عَنْهَا۔ (رواہ

الترمذی وصححه)

پھر ہمیں اس کے بعد غسل کا حکم دیا گیا۔

ثُمَّ أَمْرُنَا بِالْإِغْتِسَالِ بَعْدَهَا (ابوداؤد)

لہذا چاروں احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

کیا سمجھ؟ دخول کے بعد غسل ضروری ہے یا غیر ضروری ہے۔ سمجھنا کیا

ہے بھیا! یہ ہے وحی خفی۔ ہم وحی جلی کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ان مخفی اسرار کی

تہ تک کیسے پہنچیں؟ (ص ۲۳۲)

برق صاحب یہ طنز آپ کو زیب نہیں دیتا یہ تو اپنے اصطلاحی نلکے کے لئے رہنے دیجیے

اگر آپ وحی جلی کو نہیں سمجھ سکتے تو پھر وہ بھی قابل اعتراض ٹھہری جس طرح کہ وحی خفی سمجھیں

نہ آنے کی وجہ سے قابل اعتراض ہے۔ برق صاحب یہ حقیقت ہے کہ وحی جلی کا سمجھنا آسان کام نہیں وحی جلی

کے سمجھنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ وحی خفی کی تشریح میں اسے دیکھا جائے اگر ایسا نہ کیا جائے تو نہ صلوٰۃ کے

معنی معلوم ہوں گے نہ عمرہ کے۔

کیا غسل سے بچے ہوئے پانی سے وضو جائز ہے؟

ابا جائز ہے۔ اِنَّ رَسُولَ اللَّهِ

عورت کے غسل سے بچے ہوئے پانی کو وضو

غلط فہمی

ازالہ



نهی ان یتوضا الرجل بفضل طهور کے لئے مت استعمال کرو۔

المہاکہ (ترمذی، ابن ماجہ)

۲۔ جائز ہے (الف)

عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کان یغتسل بفضل

مییونۃ (مسلم جلد اول ص ۳۷۳) (دو اسلام ص ۲۲۲، ۲۳۳)

**ازالہ** | برق صاحب پہلی حدیث میں حکم عام ہے۔ دوسری حدیث میں اس کی تخصیص ہے یعنی یہ حکم میاں بوی کے درمیان نہیں ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے محرم ہوتے ہیں۔ پھر دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اس لئے اس قسم کی پابندی تکلیف مالایطاق ہے۔ دونوں حدیثیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہیں۔ نامحرم کے بچے ہوئے پانی سے وضو نہیں کر سکتے اور محرم کے بچے ہوئے پانی سے وضو کر سکتے ہیں۔ برق صاحب یہ ایک نفسیاتی اور جنسی مسئلہ ہے وضو کرنے والے کو اس بچے ہوئے پانی سے ایک قسم کا تعلق ہو جاتا ہے اور ایک نامحرم اس تعلق کی وجہ سے اس پانی سے حتماً اٹھا سکتا ہے یہ محض ایک جذباتی چیز ہے جو بغیر کافی تجربہ اور نفسیاتی و جنسی علوم میں مہارت پیدا کئے سمجھ میں نہیں آ سکتی وضو ایک مقدس فریضہ ہے، ایک مقدس فریضہ کا پیش خیمہ، لہذا اس میں کسی ایسے جذبہ کی آمیزش جس کا تعلق شہوات نفسانی سے ہو مناسب نہیں تھا اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔ اور کیونکہ یہ چیز محرم کے بچے ہوئے پانی سے پیدا نہیں ہوتی، اس لئے آپ نے اپنے فعل سے اس پر مہر جواز لگا دی کیجئے اب کیا اعتراض ہے؟

کیا آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے خور لٹ جاتا ہے؟

**غلط فہمی** | ۱۔ ٹوٹ جاتا ہے۔ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ میں نے حضور کو یہ فرماتے

ہوئے سنا تھا کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد نیا وضو ضروری ہے۔

۲۔ نہیں ٹوٹتا۔ ایک مرتبہ حضور نے ایک بکری کا بھننا ہوا بازار و تناول فرمایا اور پھر وضو

کئے بغیر نماز پڑھ لی۔ (دو اسلام ص ۲۳۳-۲۳۴)

ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں پہلی حدیث منسوخ ہے۔ دوسری حدیث کا تعلق

اس زمانہ سے ہے جب پہلی حدیث کا حکم منسوخ ہو چکا تھا پہلی حدیث کے منسوخ ہونے کی

دلیل یہ حدیث ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حکم آگ پر پکی ہوئی چیز

عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ آخِرَ الْأَمْرِ مِنْ

مَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ



تَرَكَ الْوُضُوءَ مِثْلًا مَسَّتُهُ النَّارُ رَوَاهُ  
الْبُخَارِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ النَّوَوِيُّ - نِيل

(الوطاس، جزء ۱ ص ۱۸۲)

سوال یہ ہے کہ آیا وضو میں ہاتھ منہ اور پاؤں کو ایک ایک مرتبہ دھونا چاہیے  
یا زیادہ، حدیث کا فیصلہ ملاحظہ ہو۔

## غلط فہمی

۱۔ حضور ایک مرتبہ دھوتے تھے۔

عن ابن عباس قال توضا النبي صلى  
مرة مرة (بخاری، کتاب الوضوء)

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضور وضو میں اعضا کو ایک  
ایک مرتبہ دھوتے تھے۔

۲۔ دو، دو مرتبہ دھوتے تھے۔

عن عبد الله بن زيد ان النبي صلى  
توضا مرتين مرتين (بخاری، کتاب الوضوء)

عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ  
حضور وضو میں اعضا کو دو، دو، مرتبہ  
دھوتے تھے۔

۳۔ تین تین مرتبہ دھوتے تھے۔

حضرت عثمان بن عفان فرماتے ہیں کہ حضور تین مرتبہ اعضا کو دھوتے تھے اور جو شخص  
اس طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے  
ہیں (بخاری کتاب الوضوء (دو اسلام ص ۲۳۷))

پہلی دونوں حدیثوں کی عبارت بتا رہی ہے کہ دونوں حدیثوں کا تعلق ایک خاص واقعہ

سے ہے۔ برق صاحب سے ان دونوں کے ترجمہ میں غلطی ہوئی۔ صحیح ترجمہ یہ ہے

## ازالہ

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ایک ایک مرتبہ دعویٰ“ ”دو دو مرتبہ دعویٰ“ نہ یہ کہ دھوتے تھے دونوں میں  
ماضی مطلق کا صیغہ ہے، نہ کہ ماضی استمراری کا۔ تیسری حدیث میں عادتِ مستمرہ کا بیان ہے یعنی رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مستمرہ تو یہی تھی کہ آپ تین تین مرتبہ ہر عضو کو دھویا کرتے تھے اور یہی اصلی وضو  
ہے اسی پر وہ ثواب ہے جو حدیث نمبر ۳ میں مذکور ہے یاں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے ایک یا دو مرتبہ  
دھویا ہے اس کی صورت محض جواز کی ہے۔ سنت کی نہیں۔ عرب کے بے آب دگیاہ رنگت لوز میں  
اکثر پانی کی قلت ہوتی ہے۔ لہذا جب کبھی پانی کی قلت ہوتی آپ نے دو مرتبہ یا ایک مرتبہ دھو کر وضو کر لیا  
اس کا تجربہ ہم کو کراچی کی زندگی میں اکثر ہوا ہے کسی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ تل سے پانی نہیں آتا جو تھوڑا بہت  
نی ہوتا ہے اسی سے وضو کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات دو، دو مرتبہ اور بعض اوقات ایک ایک مرتبہ ہر عضو  
کو دھونا پڑتا ہے اتنا پانی ہی نہیں ملتا کہ تین تین مرتبہ دھویا جائے وغیرہ کامل وضو کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہوتی



دوسری وجہ سینے، حضرت اسامہؓ کہتے ہیں۔

وَفَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
مِنْ عَرَفَةَ حَتَّى إِذَا كَانَ بِالشَّعْبِ  
نَزَلَ فَبَالَ ثُمَّ تَوَضَّأَ وَلَمْ يُسَبِّحِ الْوُضُوءَ  
فَقُلْتُ لَهُ الصَّلَاةُ - قَالَ الصَّلَاةُ  
أَمَامَكَ فَزَكَيْتَ فَلَمَّا جَاءَ الْمَدِينَةَ  
نَزَلَ فَتَوَضَّأَ فَاسْبَغِ الْوُضُوءَ ثُمَّ  
أَقِمَّتِ الصَّلَاةُ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ رَمِيمٍ  
مسلم باب الافاضة من عرفات  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرفات سے پیسے  
جب گھاٹی میں پہنچے تو اترے، پیشاب کیا پھر  
وضو کیا، لیکن پورا وضو نہیں کیا۔ میں نے کہا  
نماز پڑھ لیجیے فرمایا نماز آگے چل کر پڑھیں گے  
پس آپ سوار ہوئے اور مزدلفہ پہنچ کر  
اُترے۔ پھر آپ نے پورا وضو کیا، پھر  
اقامت ہوئی اور آپ نے مغرب کی  
نماز پڑھی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علاوہ نماز کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختصر وضو لیا کرتے تھے لیکن  
نماز کے لئے پورا ہی وضو کرتے تھے۔ لہذا اگر کسی حدیث میں مختصر وضو مذکور ہے تو ان دونوں وجہوں میں سے  
کسی ایک وجہ کی بنا پر سمجھا۔

”ہم ظہر، عصر اور عشاء کی نماز میں چار چار رکعت پڑھتے ہیں لیکن....“ عمر بن خطاب  
فرمایا کرتے تھے کہ رات اور دن کی نماز میں درود رکعت ہے۔“ (رد اسلام

۲۳۵)

حضرت عمرؓ کے جس قول کو برقیؒ نے نقل کیا ہے، اس سے نفل نماز مراد ہے  
اس قول کو غریبؒ نے زکی طوفیؒ نے ہذا برودت غلط فہمی ہے۔ حضرت عمرؓ سے متعدد احادیث  
میں نماز عصر اور عشاء میں چار رکعت ہی ثابت ہیں۔

ازالہ

## ازالہ دوسرے طریقے سے

سنت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول سنداً بیان نہیں ہوا۔ بلکہ مؤلا میں بلا سند ہے  
لہذا اس سے سند پیز کو محل اعتراض میں لانا خود قابل اعتراض ہے۔ بویز ثابت ہی نہ ہو، اس پر  
اعتراض فنول ہے۔

بخاری میں مذکور ہے، ابو جحیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن درپردہ کے وقت سند بابر تشریف  
لئے، پانی لگوا دیا، وضو کیا.... اور پھر سلوتا ظہر و عصر کی درود رکعتیں پڑھیں  
اس حدیث میں قطعاً یہ مذکور نہیں ہے کہ آپ سر پہ تھے اور اس لئے آپ نے نماز میں تنہیت  
کر لی تھی (رد اسلام ۲۳۵-۲۳۶)

غلط فہمی



**ترجمہ**  
اس ہی حدیث میں آگے یہ لفظ ہیں ”وَبَيْنَ يَدَيِ عَذَّةٍ“ اور بطور سترہ کے آپ کے سامنے ایک برہمی کھڑی کر دی گئی تھی، اس سے صاف ظاہر ہوا کہ مسیح نبوی کا واقعہ نہیں ہے کیونکہ مسجد میں برہمی گاڑنا قرین قیاس نہیں ہے پھر اس سے ذرا اوپر البجفیہ کی دوسری روایت ہے اس میں صاف مذکور ہے کہ :-

اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى  
 بِهِمْ بِالْبَطْحَاءِ وَبَيْنَ يَدَيْ عَنَزَةٍ  
 الظُّهُورِ كُتَيْبٍ وَالْعَصَا رُكْعَتَيْنِ  
 يَمِيْنَيْنِ يَدِ الْمَرْءِ اَمَةً وَالْحِمَادُ  
 (صحیح بخاری الواب سترة المصلی)

بطحا مکہ میں ہے لہذا ثابت ہوا کہ آپ نے دو دو رکعت سفر میں پڑھائی تھیں۔ صحیح مسلم میں اور بھی زیادہ

صراحت ہے، البوجہ فیہ فرماتے ہیں۔

تَمَّ لَمْ يَزَلْ يُصَلِّي رَكَعَتَيْنِ حَتَّى رَجَعَ  
إِلَى الْمَدِينَةِ - (صحیح مسلم باب  
سترة المصلی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو، دو  
رکعت ہی پڑھتے رہے، یہاں تک کہ آپ واپس  
مدینہ منورہ پہنچے۔

دیکھا آپ نے احادیث تو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ سفر کا واقعہ تھا۔ اگر آپ تحقیق کرتے تو یہ غلط فہمی کیوں ہوتی۔

”ہم نماز عصر کے بعد نفل وغیرہ مکروہ سمجھتے ہیں اور یہی فیصلہ حضرت عمرؓ کا بھی تھا۔۔۔ لیکن حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:-

رکعتان لم یکن رسول اللہ یدعہما  
سرا وعلانیۃ رکعتان قبل الصبح و  
رکعتان بعد العصر۔

کہ حضور نماز صبح سے پہلے اور نماز عصر کے  
بعد ہمیشہ دو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔  
(رد اسلام ص ۲۳۴)

**ازالہ** برق صاحب سے ترجمہ کرنے میں غلطی ہوئی۔ پہلے حضرت عائشہؓ کی حدیث سنئے۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 يُصَلِّيهِمَا وَلَا يُصَلِّيُهُمَا فِي الْمَسْجِدِ  
 خَافَةَ أَنْ يُثْقَلَ عَلَى أُمَّتِهِ وَكَانَ  
 مُحِبًّا مِمَّا يَخَفُ عَنْهُمْ -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز کے بعد  
 دو رکعت پڑھتے تھے اور ان دونوں کو مسجد میں  
 نہیں پڑھتے تھے یعنی خفیہ اور کرتے تھے۔ اس  
 خوف سے کہ امت پر بوجھ نہ ہو جائے اور آپ امت پر



(صحیح بخاری کتاب المواقیت)

تخفیف پسند کرتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد ان دو رکعتوں کو آپ علانیہ ادا نہیں فرماتے تھے۔ اب حدیث زریحہ کا صحیح ترجمہ سنئے۔

”دو رکعتیں ایسی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ علانیہ چھوڑتے تھے اور نہ تنہائی میں چھوڑتے تھے اور وہ دو رکعت فجر سے پہلے کی دو رکعت ہیں اور عصر کے بعد بھی دو رکعت آپ پڑھتے تھے“ لفظ علانیہ بتاتا ہے کہ نہ چھوڑنا فجر کی سنتوں کے متعلق ہے۔ کیونکہ عصر کی سنتیں تو آپ علانیہ پڑھتے ہی نہ تھے۔

جو فضیلہ حضرت عمرؓ کا ہے وہی فضیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے۔ آپ نے بھی عصر کے بعد نوافل سے منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصر کے بعد دو رکعت پڑھنا آپ کے لئے مخصوص تھا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔

كَانَ يُصَلِّي بَعْدَ الْعَصْرِ وَيَنْهَى عَنْهُمَا (ابوداؤد وسکت علیہ الشوکانی)

آپ عصر کے بعد نماز پڑھتے تھے لیکن (امت کو) منع فرماتے تھے۔

نیل جز ۳ ص ۲۲)

لہذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

”ہم قیام صلوٰۃ کے وقت اقامت میں ہر تکبیر دو دو مرتبہ کہیں لیکن مسلم میں غلط فہمی | ..... درج ہے۔“

حضرت بلال کو حکم دیا گیا، کہ وہ اذان کی تکبیریں دو دو مرتبہ ادا قیامت کی صرف ایک مرتبہ کہے۔“ (دوا سلام ص ۲۳۲)

یہ بھی کوئی تعارض کی بات ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان و اقامت کے دو طریقہ تعلیم کئے ہیں۔ لہذا دونوں صحیح ہیں ”ہم ایسا کرتے ہیں“ اور ”فقہ میر ایسا لکھا ہے“ ان جملوں سے حدیث پر کیا اعتراض ہے؟ اگر فقہ میں کوئی بات غلط ہو یا آپ غلط عمل کر رہے ہوں تو اس غلط مذہب اور غلط عمل کو چھوڑا جائے نہ کہ حدیث کو۔

ہم پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سورت بھی پڑھتے ہیں لیکن غلط فہمی | مسلم میں درج ہے کہ ایک شخص نے ابوہریرہؓ سے پوچھا کہ کیا فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت پڑھنا ضروری ہے۔ کہا، اگر کوئی سورت پڑھ لے تو اچھا ہے، ورنہ فاتحہ ہی کافی ہے اور ہمارے ائمہ فقہ کہتے ہیں کہ صرف فاتحہ سے نماز مکمل نہیں ہوتی۔“

(دوا سلام ص ۲۳۴)



**ازالہ** غالباً آپ حنفی مذہب کے مطابق نماز پڑھتے ہیں، حنفی مذہب میں تو یہاں تک ہے کہ آخری دو رکعت میں کچھ بھی نہ پڑھے تو نماز ہو جائے گی۔ آپ اپنے مروجہ مذہب کی غلطی کو صحیح مان کر حدیث کو قابل اعتراض ٹھہراتے ہیں۔ یہ اصول ہی غلط ہے۔ حدیث کے مقابلہ میں فقہ کی بات مسترد کی جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہ کا یہ قول مقتدی کے لئے ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

لَا تَقْرَأُ بَشْيَءٍ مِّنَ الْقُرْآنِ إِذَا جُمِعَتْ  
إِلَّا بِأَمْرِ الْقُرْآنِ فَإِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ  
لَّمْ يَقْرَأْ بِهَا (رواہ ابوداؤد وسندہ  
جوب میں بلند آواز سے قرائت کروں تو قرآن  
میں سے کچھ بھی نہ پڑھو، مگر سورۃ فاتحہ، کیونکہ  
اس کے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوتی۔)

صحیح نیل الاوطار، جز ۲ ص ۱۸۲)

ہم دعائے قنوت عشاء میں پڑھتے ہیں لیکن حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ دعائے  
قنوت نماز مغرب و فجر میں پڑھی جاتی تھی (دو اسلام ص ۲۲)

**ازالہ** حضرت انسؓ کی حدیث میں قنوت نازلہ کا بیان ہے اور یہ اب بھی ضرورت کے  
وقت سنت ہے۔ وتر کا قنوت اس سے علیحدہ ہے آپ دونوں کو ایک سمجھ رہے ہیں  
”ہمارا امام سبحانک اللہم ومجدک... لا الہ غیرک دل میں پڑھتا ہے، لیکن  
مسلم میں عبیدہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بلند آواز سے پڑھتے تھے“  
(دو اسلام ص ۲۲)

**ازالہ** حضرت عمرؓ تعلیم کی غرض سے ثنا بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ دارقطنی کی روایت  
میں صاف مذکور ہے۔

يُسَمِّعُنَا ذَلِكَ وَيُعَلِّمُنَا (دارقطنی ص ۱۳۵) یعنی ہمیں سناتے تھے اور سکھاتے تھے۔

وسندہ صحیح التعلیق المغنی)

**غلط فہمی** بلکہ ایک روایت کے مطابق حضور اور ان کے صحابہ... سبحانک اللہم... کو چھوڑ  
جاتے تھے، انسؓ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر اور عثمان کے پیچھے  
نماز پڑھتا رہا یہ حضرات نماز کا آغاز ہی سورہ فاتحہ سے کیا کرتے تھے... افتتاح کے  
معنی ہیں آغاز کرنا، شروع کرنا اور شروع کا مفہوم ہی ہے کہ اس سے پہلے اور کوئی چیز  
نہ ہو۔ (دو اسلام ص ۲۳۸-۲۳۹)

**ازالہ** برق صاحب حدیث میں تو یہ نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ سے نماز شروع کرتے تھے، لفظ  
”نماز“ آپ کی طرف سے ہے حدیث میں اس طرح ہے :-



يَسْتَفْتِحُونَ بِالْحَمْدِ لِلَّهِ رَبِّ  
الْعَالَمِينَ۔ الحمد للرب العالمين سے شروع کرتے  
تھے۔

اس کے آگے :-

لَا يَذْكُرُونَ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ وَلَا فِي آخِهَا۔ نہ اس سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ،  
نہ آخر میں ۔

دوسری حدیث میں وہ خود اس کی وضاحت کرتے ہیں :-

فَلَمَّا سَمِعَ أَحَدًا امْتِنَهُمْ يَقِيَّ أَيْسَمِ  
اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (صحیح مسلم)  
میں نے ان میں سے کسی کو بسم اللہ الخ  
پڑھتے نہیں سنا۔

مطلب ظاہر ہے کہ قراءت بالجہر کی ابتداء الحمد للرب العالمین سے کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بسم  
اللہ بھی ایسی آواز سے نہیں پڑھتے تھے کہ میں سن سکوں۔ لہذا حدیث میں ثنا پڑھنے کی نفی نہیں ہے، بلکہ  
ذکر یہ ہے کہ بلند آواز سے کیا چیز شروع کرتے تھے اور عدم ذکر سے عدم شنے لازم نہیں آتا۔ برق صاب  
کچھ تو اصول پر بھی غور فرمایا کیجئے۔ غرض یہ کہ محض پڑھنے کی ابتداء ثنا سے ہوتی اور بلند آواز سے قراءت  
کی ابتداء سورہ فاتحہ سے ہوتی۔

ہمیں نماز میں رکوع و سجود و قیام و قعود کے بغیر کسی اور عمل کی اجازت نہیں  
لیکن بخاری میں ہے ”سہل بن سعد کہتے ہیں کہ جب مسجد نبوی کے لئے منبر  
تیار ہوا تو حضور اس پر چڑھ گئے۔ منہ قبلہ کی طرف پھیر لیا، بجیکر ہی... پھر سجدے کے لئے  
زمین پر اتر آئے۔“

”ایک مرتبہ حضور نے اپنی دختر زینب کی بیٹی امامہ کو اٹھا کر نماز شروع کر دی۔“  
”ابن عباس کہتے ہیں، حضور رات کی نماز پڑھ رہے تھے میں بھی ان کے پیچھے بائیں طرف  
کھڑا ہو گیا۔ آپ نے مجھے پکڑ کر دائیں طرف کر دیا۔“ (دو اسلام ص ۲۳۸)

برق صاحب یہ کس نے کہہ دیا کہ کوئی عمل جائز ہی نہیں کاش آپ حنفی فقہ ہی کو  
ملاحظہ فرماتے، ہاں ایسا عمل جائز نہیں جو ضروریات نماز سے نہ ہو۔ منبر پر کھڑے ہو کر  
نماز پڑھنا ضروریات نماز سے تھا تاکہ لوگ نماز سیکھ لیں۔ سہل بن سعد کی روایت میں خود فخر کائنات صلی اللہ  
علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمادی ہے۔ نماز کے بعد آپ نے فرمایا :-

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا صَنَعْتُ هَذَا لَتَأْتُمُوا  
بِحُجِّي وَلِتَعْلَمُوا صَلَاتِي (صحیح بخاری)  
اے لوگو! میں نے اس لئے ایسا کیا تھا کہ تم  
میری اقتدا کرو اور میری نماز  
سیکھ لو۔ (کتاب الجمعة)



(۲) جب بچہ کو سنبھالنے والا کوئی نہ ہو اور نماز بھی پڑھنی ہو تو اس کی یہی صورت ہے کہ بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے۔ نماز کو محض اس عذر سے ترک نہ کیا جائے، امت کی عورتوں کے لئے یہ ایک آسانی بھی ہے اور ان کے عذر لنگ کارو بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نواسی کو اٹھا کر نماز پڑھی، اور اپنے عمل سے اس حالت میں نماز کی ادائیگی کا طریقہ سکھا دیا، **فَلْتَدِلْهُمُ**۔

(۳) بائیں سے دائیں طرف یا آگے سے پیچھے کر دینا یہ اب بھی جائز ہے، کیونکہ نماز کی ضروریات سے ہے معلوم نہیں برق صاحب نے اسے ناجائز کیسے سمجھ لیا۔

فقہاء کے ہاں دوران نماز میں نمازی کے سامنے سے گزرنا ممنوع ہے بخاری

میں ابوسعید سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص نمازی کے سامنے سے گزرے

ہو تو اسے روکے، اگر نہ روکے، **فَلْيَقَاتِلْهُ فَاَنْهَاهُ شَيْطَانٌ**، تو اس سے باقاعدہ تلوار سے جنگ کرو اس لئے کہ وہ شیطان ہے۔

لیکن ابن عباس کہتے ہیں کہ میں گدھی پر سوار ہو کر منیٰ میں پہنچا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے، میں کچھ نمازیوں کے سامنے سے گزر کر گدھی سے اتر آیا...، نماز میں شامل ہو گیا اور کسی نے برا نہ مانا، (ص ۲۳۹)

**فَلْيَقَاتِلْهُ** کے معنی "باقاعدہ تلوار سے جنگ کرو" یہ کس حد تک صحیح ہیں؟ کیا یہ رنگینی

اور مبالغہ آمیزی نہیں؟ سیدھے سادھے معنی یہ ہیں کہ اس سے لڑے۔

امام کا سترہ تمام مقتدیوں کے لئے کافی ہے، لہذا اگر کوئی شخص سترہ کے پیچھے سے مقتدیوں کے سامنے سے گزرے تو گزر سکتا ہے دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نمازی اور سترہ کے درمیان سے گزرے اسے روکنا چاہیے اگر نہ روکے تو طاقت کے ذریعے سے واپس کر دے، لیکن اگر کوئی شخص کسی صف کے سامنے سے گزرے، ایسی حالت میں کہ امام کے سامنے سترہ ہو تو گزر سکتا ہے لہذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

عبداللہ بن عمر کا فیصلہ ہے... کہ کسی چیز کے سامنے گزر جانے سے نماز

باطل نہیں ہوتی... مسلم کی ایک حدیث ہے... ابوہریرہؓ حضورؐ سے

روایت کرتے ہیں کہ عورت، گدھا اور کتا سامنے آجائیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں... کہ میں نماز میں حضورؐ کے سامنے پاؤں ان کی طرف پھیرا

کر لیٹ جاتی تھی (روا اسلام ص ۲۳۹-۲۴۰)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا جو فیصلہ ہے وہی حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

**ازالہ**

**غلط فہمی**



اِذَا وَضَعَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلَ  
مُؤَخَّرَةِ الرَّحْلِ فَلْيُصَلِّ وَلَا يُبَايِ  
مَنْ مَرَّ دَسًا أَوْ ذَلِكَ -  
(صحیح مسلم)

جب تم میں سے کوئی شخص کجاوے کی پھل بکڑی  
کے مانند کوئی چیز اپنے سامنے رکھ لے تو نماز پڑھے  
اور جو کوئی سترے کے آگے سے گزرے تو اس  
کے گزرنے کی پروا نہ کرے۔

دوسری حدیث میں آپ فرماتے ہیں:-  
لَا يُصَوِّرُ مَا مَشَى بَيْنَ يَدَيْهِ -  
(مسلم)

پھر کوئی چیز بھی جو سامنے سے گزرے نقصان  
نہ دیگی۔

ہاں اگر کوئی چیز سترہ اور نمازی کے درمیان سے گزرے یا سترہ نہ ہو پھر نمازی کے سامنے سے  
گزرے تو نماز قطع ہو جائے گی، برق صاحب نے جو حدیث صحیح مسلم کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ اس  
کے آخری الفاظ نقل نہیں کئے، آخری الفاظ یہ ہیں:-

وَيَقِي ذَلِكَ مِثْلَ مُؤَخَّرَةِ  
الرَّحْلِ -  
(صحیح مسلم)

(عورت، گدھا اور کتا نماز کو قطع کرتے ہیں) اور  
اس قطع سے بچاتی ہے وہ چیز، جو بطور سترہ سامنے  
رکھی ہو، مؤخرۃ الرحل کے مثل۔

اب حدیث میں اور ابن عمرؓ کے قول میں کوئی منافات و تعارض باقی نہیں رہا۔  
اب رہ جاتی ہے وہ حدیث جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے، برق صاحب  
محرم عورت اور نامحرم میں بھی آخر فرق ہے، پھر لیٹے رہنے اور گزرنے میں بھی فرق ہے۔ گزرنے کی  
ممانعت ہے، لیٹے رہنے کی نہیں، آخر تعارض کی کون سی بات ہے پھر نبی اور غیر نبی کا فرق بھی ملحوظ  
رکھا جاسکتا ہے، اندھیرے اور اجالے میں بھی فرق ہے، اختیار اور اضطرار میں بھی فرق ہے۔ آپؐ  
کسی فرق کو ملحوظ نہ رکھا، اگرچہ اصلی فرق محرم اور نامحرم ہی کا ہے، نامحرم کے گزرنے سے خیالات پریشان  
ہوتے ہیں، دوسوہ پیدا ہوتا ہے، حضور قلب جاتا رہتا ہے اور یہی قطع صلوة ہے، برخلاف اس کے اگر  
محرم سامنے سے نکلے تو خیالات میں پراگندگی پیدا نہیں ہوتی، نہ حضور قلب قطع ہوتا ہے، یہ نفسیاتی  
اور حیاتیاتی مسئلہ ہے، اس کے سمجھنے کے لئے ان علوم کی مہارت ضروری ہے، یا پھر تجربہ  
درکار ہے۔

”حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:-

**غلط فہمی** | کنت انا م بین یدی  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجلای فی  
قبلتہ فاذا سجد غمزنی فقبضت

میں نماز میں حضور کے سامنے پاؤں ان کی  
طرف پھیل کر لیٹ جاتی جب وہ سجدہ کرنے لگتے  
تو مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیتے چنانچہ میں پاؤں



رجلی فاذا قام بسبطتهما والبعوت  
سیت لیتی اور جب وہ اٹھتے، تو پھر پیلا  
لیس فیہا مصابیحہ - دہی اور گھر میں چراغ موجود نہیں تھا۔

(بخاری جلد ۱ ص ۵۵)

یہ اندھیرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ ابرو کو دیکھ لینا حضرت عائشہؓ  
ہی کا کمال ہو سکتا ہے، (ص ۲۳)

یہ بحال تو آپ نے کیا کہ ”غزنی“ کا ترجمہ ”آنکھ سے اشارہ کر دیتے“ کر دیا، غلط  
فہمی کی حد ہو گئی ”غزنی“ کے معنی کسی چیز کو ہاتھ سے دباننا بھی ہے دیکھو منتہی الارب فی

**ازالہ**

لغات العرب جلد ۳ ص ۴۹ و مفتاح اللغات ص ۵۹، المنجد ص ۵۸۸  
برق صاحب قطع نظر اس لغوی معنی کے اگر آپ احادیث ہی کا گہرا مطالعہ فرما لیتے، تو یہ غلط فہمی  
نہ ہوتی، دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ خود ہی فرماتی ہیں:-

غَزَزَ رَجُلِي فَقَبَضْتُهُمَا (صحیح  
بخاری ابواب السترة)  
آپ میرے پیروں کو دبا دیتے، میں ان کو  
سمیٹ لیتی۔

”جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے مسلم والی حدیث پیش کی  
گئی تو آپ نے بگڑ کر فرمایا، تم لوگوں نے ہم عورتوں کو گدھوں اور کتوں

**غلط فہمی**

جیسا سمجھ لیا، خدا کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چٹائی پر لیٹی ہوتی تھی اور وہ نماز  
ادا کیا کرتے تھے، (مسلم)

بد بگڑ الفاظ حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کی صحت سے انکار کر دیا ہے اور پھر بھی یہ  
صحیح مسلم کا جزو بنی ہوئی ہے (دو اسلام ص ۲۴۱-۲۴۲)

برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، حضرت عائشہؓ کے سامنے حدیث بیان نہیں کی گئی  
بلکہ بعض لوگوں کا قول پیش کیا گیا۔ مثلاً عروہؓ کہتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ

**ازالہ**

عنہا نے پوچھا:-

مَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ فَقُلْنَا الْمَرْأَةُ وَ  
الْحِمَامُ وَصَحِيبُ الْمَسْلَمِ  
نماز کو کیا چیز قطع کرتی ہے؟ ہم نے کہا عورت  
اور گدھا۔

دوسری حدیث میں ہے:-

وَكُرِعَتْ عَنْهَا مَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ وَصَحِيبُ  
حضرت عائشہؓ کے پاس اس چیز کا ذکر آیا جو  
نماز کو توڑتی ہے۔

بخاری و صحیح مسلم

غرض یہ کہ حضرت عائشہؓ کے سامنے لوگوں کی رائے پیش کی گئی۔ اس لئے انہوں نے اس کی تردید



میں حدیث سنائی کہ محض سامنے لیٹنے سے نماز منقطع نہیں ہوتی۔ رہا عورت کا سامنے سے گزرنا جبکہ سانسے کوئی سترونہ ہو تو اس سے بے شک نماز منقطع ہو جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اس سے انکار نہیں کیا بلکہ وہ تو خود اس مضمون کی حدیث روایت کرتی ہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

لَا يَقْطَعُ صَلَاةَ الْمُسْلِمِ شَيْءٌ إِلَّا الْجَاهُ  
وَالْكَافِرُ وَالْكَلْبُ وَالْمَرْأَةُ فَقَالَتْ  
عَائِشَةُ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَقَدْ قُرْنَا  
بِذَوَاتِ الشُّعْرِ (مسند احمد ورجا  
موثقون مجمع الزوائد جز ۲ ص ۶)

مسلم کی نماز کو کوئی چیز منقطع نہیں کرتی سوائے  
گدھے، کافر، کتے اور عورت کے۔ حضرت  
عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا، اے  
اللہ کے رسول! ہمیں بڑے جانوروں کے  
ساتھ جمع کر دیا گیا۔

غرض یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ صحیح مسلم کی حدیث کی تائید کرتی ہیں اور باوجود اظہار افسوس کے حدیث کو بعینہ روایت کرتی تھیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتی تھیں۔

”عام مسلمان رکوع سے پہلے یا بعد ہاتھ نہیں اٹھاتے لیکن بخاری میں پوری جگہ  
غلط فہمی | احادیث اس مضمون پر ملتی ہیں کہ حضور رکوع سے پہلے اور پیچھے نیز درمیانی  
التمیحات سے اٹھ کر ہاتھ اٹھایا کرتے تھے“ (دو اسلام ص ۲۴)

عام مسلمانوں سے مراد آپ کی احناف ہیں جن کی ہندو پاکستان میں اکثریت ہے اور  
حنفی مذہب ہی سے آپ کو بھی تعلق ہے لہذا ہر ایسی چیز آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہے  
جو آپ کے مذہب میں نہیں ہے۔ برق صاحب مذہب اسلام تو وہی ہے جو حدیث میں ہے باقی رہا  
کسی فرقہ کا اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا یہ ان کا اپنا فعل ہے ان کے کسی فعل سے اسلامی چیز پر کوئی اثر نہیں  
پڑتا۔ برق صاحب یہ گروہ بندیاں ہی ہیں جنہوں نے اسلام کو تباہ کیا، یہ تقلید ہی کی بندشیں ہیں جنہوں  
نے فرقوں، بدعات و خرافات کو جنم دیا، آپ کو اسی تقلید کی وجہ سے رفع یدین نظر نہ آیا۔ در نہ رفع  
یدین نقلاً و عملاً متواتر ہے، سنت ثابتہ ہے اور اسی پر جماعت المسلمین کا عمل ہے آپ کو صرف چار احادیث  
نظر آئیں، حالانکہ صحیح بخاری میں بھی چار نہیں پانچ احادیث ہیں اور اگر آپ تحقیق کرتے تو آپ کو معلوم  
ہوتا کہ کئی سوا احادیث و آثار اس باب میں صحیح ثابت ہوئے ہیں۔

”ہم بلا وجہ ظہر و عصر و عشاء و مغرب کی نمازوں کو جمع نہیں کر سکتے لیکن موطا میں  
غلط فہمی | ہے کہ حضور بغیر کسی خوف یا سفر کے بھی نماز ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو اکٹھا  
کر لیا کرتے تھے“ (دو اسلام ص ۲۴)



**ازالہ** | برق صاحب آپ نے ”صلیٰ“ کا ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ آپ نے ظہر وعصر کو جمع کیا، مغرب وعشاء کو جمع کیا۔ نہ یہ کہ ”جمع کر لیا کرتے تھے“ آپ نے عامنی مطلق کو ماضی استمراری بنا دیا۔ یہ صرف ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ دونوں نمازوں کو اپنے اصلی وقت ہی میں ادا کیا، وقت سے ہٹا کر کوئی نماز نہیں پڑھی گئی۔ عبد اللہ بن عباس جن کی حدیث برق صاحب نے نقل فرمائی ہے، وہی اس کی تشریح کرتے ہیں :-

صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
بِالْيَدِ يَنْتَ ثَمَانِيًا وَسَبْعًا حَبِيبًا آخِرَ  
الظُّهْرِ وَتَجَلَّ الْعَصْرُ وَآخِرَ الْمَغْرِبِ  
وَتَجَلَّ الْعِشَاءُ رَسَانِي كِتَابَ الْمَوَاقِيتِ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ  
مدینہ منورہ میں آٹھ اور سات رکعات اکٹھی پڑھیں  
آپ نے ظہر کو آخر وقت پڑھا اور عصر کو جلدی،  
مغرب کو آخر وقت میں ادا کیا، اور عشاء

کو جلدی۔

(وسندہ صحیح)

غرض یہ کہ یہ جمع صوری تھی نہ کہ حقیقی یعنی بظاہر دونوں ایک وقت میں پڑھی گئی تھیں لیکن حقیقتہً دونوں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئی تھیں۔

”فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ حائضہ روزے رکھے اور نماز نہ پڑھے۔“

**غلط فہمی** | ات الحائض تقضى الصيام

حائضہ روزے رکھے، لیکن نماز ادا نہ کرے

(بخاری جلد ۲ ص ۲۳۹)

ولا تقضى الصلوة۔

لیکن حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ :  
حضور کی ایک زوجہ محترمہ حضور کے ہمراہ معتکف ہو گئیں اس دوران میں انہیں حیض شروع ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ جب وہ نماز پڑھتی تھیں تو ہم ان کے نیچے برتن رکھ دیتے

تھے، (ص ۲۳۱-۲۳۲)

**ازالہ** | برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ حائضہ روزے کی قضا کرے اور نماز کی قضا نہ کرے نہ یہ کہ بحالت حیض روزے رکھے، جیسا کہ برق صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔

دوسری حدیث میں ”استحاضہ“ کا ترجمہ ”حیض“ صحیح نہیں، حیض اور استحاضہ علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ برق صاحب دونوں کو ایک سمجھ بیٹھے۔ زوجہ مطہرہ استحاضہ کی حالت میں نماز ادا فرماتی تھیں نہ کہ بحالت حیض، حالت حیض میں نماز معاف ہے۔ لیکن حالت استحاضہ میں نماز معاف نہیں ہے۔ استحاضہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-



اِنَّكَ ذٰلِكَ عَرُوقٌ وَّلٰیْسَ بِحِیْضٍ فَاِذَا  
اَقْبَلْتَ حِیْضُكَ فَدَعِی الصَّلٰوةَ وَاِذَا  
اَذْبَرْتَ فَاَغْسِلِی عَنْكَ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّی  
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

استحاضہ حیض نہیں ہے بلکہ ایک رگ کا  
خون ہے پس جب حیض شروع ہو تو نماز چھوڑ  
دو اور جب حیض چلا جائے تو خون دھو ڈالو  
اور نماز پڑھو۔

**غلط فہمی** | حضور فرماتے ہیں کہ مجھے رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے سے روک دیا گیا ہے  
(مسلم جلد ۲ ص ۹۱)

لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ۔  
حضور رکوع اور سجود میں قرآن کی یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ ”سُبْحٰنَ قَدْرَسِ دَبِ  
الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ“ (مسلم)

مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکم دے کر خود ہی اسے توڑ دیا کرتے تھے  
(دوا سلام ص ۲۲۲-۲۲۳)

**ازالہ** | برق صاحب آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی آپ اس تسبیح کو قرآن مجید کی آیت  
سمجھ رہے ہیں حالانکہ یہ قرآن مجید کی آیت نہیں آپ نے قرآن مجید کا بہت ہی سرسری  
مطالعہ کیا ہے اور حدیث کا بھی اور اسی وجہ سے یہ غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ حدیث مذکور کے ترجمہ میں  
”قرآن کی آیت“ آپ کا اضافہ ہے عربی متن میں یہ الفاظ نہیں ہیں اور کیونکہ تسبیح قرآن مجید کی آیت  
نہیں ہے لہذا اعتراض کا عدم ہے۔

**غلط فہمی** | ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نماز میں انسانی کلام جائز نہیں  
(مسلم جلد ۲ ص ۱۲۹)

لیکن ابوالدرداء روایت کرتے ہیں کہ۔  
ایک مرتبہ نماز کے دوران میں حضور کے سامنے شیطان آگیا تو آپ نے تین مرتبہ کہا

... تم پر اللہ کی لعنت (مسلم جلد ۲ ص ۱۳۹)

یعنی حضور کے لئے نماز میں انسانی کلام جائز ہے اور دوسروں کے لئے ناجائز  
(دوا سلام ص ۲۲۳)

**ازالہ** | بے شک نماز میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے کلام کرنا حرام ہے لیکن نمازی  
کا اللہ سے کلام کرنا جائز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابلیس کے سامنے  
آجانے پر کہا:-

میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ



یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، گو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا کی کہ وہ شیطان کو دور رکھے۔ اور یہ شیطان سے پناہ مانگنا بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَا يَنْزَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ  
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (احمد السجد: ۳۶)

جب شیطان تمہیں ستائے تو اللہ کی پناہ طلب کرو۔  
پھر شیطان سے پناہ مانگنا صرف آپ کے لئے ہی جائز نہیں، بلکہ آپ کی اتباع میں ہر ایک کے لئے جائز ہے اور اس کا آپ نے حکم بھی دیا ہے۔ (ملاحظہ صحیح مسلم کتاب السلام باب التعوذ من شیطان)

ہم دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ لیکن حضرت انس کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بارش کی دعا کے بغیر کسی اور دعا میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ (دوا سلام ص ۲۴۴)

ازالہ | برق صاحب نے حدیث کا آخری جملہ چھوڑ دیا اور وہ یہ ہے:-  
فَاِنَّهُ يَرْفَعُ حَتَّى يَرَى  
بَيَاضَ اَبْطَحِيْرٍ -

(صحیح بخاری)  
لہذا حضرت انسؓ کا منشاء یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دعا میں ہاتھ اٹھاتے اور اپنے نہیں کرتے تھے جتنے دعاؤں استسقاء میں۔ حضرت انسؓ نے دوسری دعاؤں میں رفع بلیغ کا انکار کیا ہے نہ کہ مطلق رفع کا، برق صاحب کو بڑی زبردست غلط فہمی ہوئی۔

غلط فہمی | ہم جوتے اتار کر نماز ادا کرتے ہیں لیکن سعید بن یزید الازدی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا... کیا حضور جو تول سمیت نماز پڑھا کرتے تھے۔  
کہا ہاں۔ (دوا سلام ص ۲۴۴)

ازالہ | دونوں طرح سنت ہے اور دونوں طرح جائز ہے۔ اس میں کون سا تعارض ہے۔

غلط فہمی | ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ سجدے میں کتے کی طرح بازو مت کھولو حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:-

لَا يَبْسُطُ ذِرَاعِيْهِ كَالْكَلْبِ  
ایک نمازی سجدے میں کتے کی طرح بازو نہ کھولے۔



لیکن ایک اور حدیث میں ہے کہ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں بازوؤں کو اتنا کھول لیتے تھے کہ ان کی گھلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی (رد و اسلام

ص ۲۴۴-۲۴۵)

برق صاحب نے پہلی حدیث کا ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ سجدے میں کتے کی طرح بازو نہ بچھائے۔ اس میں کھولنے یا نہ کھولنے کا کوئی ذکر ہی نہیں لہذا کوئی تعارض نہیں، حنفی مذہب میں بھی سجدے میں بازو کھولنا سنت ہے اور عام لوگ بھی یہی کرتے ہیں۔ آپ کا عمل عام لوگوں کے بھی خلاف ہے۔ حنفی مذہب کے بھی خلاف ہے اور دین اسلام کے بھی خلاف ہے۔

”پہلی رکعت کے بعد سیدھے اٹھ جاتے ہیں لیکن مالک بن الحویرث کہتے ہیں .... کہ حضور دوسرے سجدے سے سر اٹھانے کے بعد پہلے آرام سے زمین پر بیٹھ جاتے

**غلط فہمی**

اور پھر اٹھتے“ (رد و اسلام ص ۲۴۵)

پہلی رکعت کے بعد بیٹھنا سنت ہے اور یہی جماعت المسلمین کا معمول ہے، حنفی تقلید اس کا انکار کرتے ہیں اور بے دلیل انکار کرتے ہیں۔

**ازالہ**

”حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور .... سب سے زیادہ مختصر اور

**غلط فہمی**

مکمل نماز پڑھتے تھے“ (رد و اسلام ص ۲۴۵)

وہی انسؓ .... بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی، کہ جب وہ رکوع سے سر اٹھاتے تھے تو اتنی دیر کھڑے رہتے تھے کہ دیکھنے والا یہ سمجھتا

کہ آپ بھول گئے ہیں اور سجدہ کے بعد بھی یہی حالت ہوتی تھی، (رد و اسلام ص ۲۴۶)

پہلی حدیث میں ہے کہ آپ مکمل نماز پڑھتے تھے اور مکمل کی تشریح یہ ہے کہ قومہ اور جلسہ

میں کچھ دیر بیٹھ جاتا کرتے تھے یہ نہیں کہ تو چل میں آیا، اللہ اکبر، اللہ اکبر ہوتا رہتا ہے

**ازالہ**

کہیں سکون ہے نہ اطمینان، نہ قومہ میں دعا پڑھی جاتی ہے نہ جلسہ میں، ان دعاؤں میں مشکل سے ۳۰

سیکند لگتے ہیں۔ اگر یہ ۳۰ سیکند بھی بہت لمبا وقفہ ہے تو پھر اللہ ہی حافظ ہے۔ ہاں جو

لوگ جلسہ جلسہ اللہ اکبر، اللہ اکبر کرتے ہیں وہ یہی سمجھیں گے کہ شاید بھول ہو گئی۔ اور یہی

ہمارا تجربہ ہے۔

برق صاحب نے لکھا ہے کہ آپ کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی ”یہ حدیث کے الفاظ نہیں

ہیں، برق صاحب نے غلط فہمی سے خود لکھ دئے ہیں۔ قومہ میں سکون سے کھڑا ہو جانے اور

جلسہ میں سکون سے بیٹھ جانے کو انہوں نے طول نماز سمجھ لیا۔



جو کسر باقی تھی، اسے ابوسعید الخدری پورا کرتا ہے کسی نے ابوسعید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے متعلق سوال کیا تو آپ نے کہا:-

## غلط فہمی

کانت صلوۃ الظهر وتقام فیینطلق  
احدنا الی البقیع فیقف فی حاجتہ  
ثم یاتی اہلہ فیتوضأ ثم یرجع  
الی المسجد ورسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم فی الركعة الاولی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اتنی لمبی  
ہوتی تھی کہ فرض کیجئے نماز ظہر شروع ہو چکی ہے  
ایک شخص پہلے بقیع میں جاتا ہے وہاں سے فارغ  
ہو کر گھر لوٹتا ہے وضو کرتا ہے پھر مسجد میں جاتا ہے  
اور حضور بھی پہلی رکعت ہی پڑھا رہے ہوتے تھے

اس حدیث میں بھی لمبی نماز کا کوئی ذکر نہیں آپ نے ”وتقام“ کا ترجمہ ”شروع ہو چکی“  
کے اور ”فرض کیجئے“ کے الفاظ کا اضافہ کر کے نماز کے لمبا ہونے کا مفہوم پیدا کر  
دیا لیکن صحیح ترجمہ صرف اتنا ہے کہ نماز کی اقامت ہوتی نظر ہے کہ اقامت میں کچھ وقت لگتا ہو گا۔  
صف بندی بھی ہوتی ہو گی۔ پھر صف بندی کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام مشہور  
ہے، آپ کسی کو آگے کرتے کسی کو پیچھے کرتے پھر نماز شروع ہوتی ہو گی۔ لہذا اتنے عرصہ میں اگر کوئی شخص  
پیشاب اور وضو سے فارغ ہو کر آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی رکعت میں پاتا۔ یہی حضرت ابوسعید  
خدری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں تقریباً تیس آیات تلاوت  
فرماتے تھے (صحیح مسلم) لہذا ثابت ہوا کہ نماز طویل نہیں ہوتی تھی اور نہ ایسی نامکمل ہوتی تھی جیسی  
آج کل ہوتی ہے۔ برق صاحب نے حضرت انسؓ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما کے متعلق جو  
خلاف ادب الفاظ استعمال کئے ہیں اگر وہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں  
تو مناسب ہو گا۔

بخاری کی حدیث ہے کہ ”ابدوا بالصلوۃ“ (نماز کو ذرا ٹھنڈے  
وقت میں پڑھو) لیکن بخاری ہی میں ایک اور حدیث ہے۔

## غلط فہمی

”انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر اتنی جلدی پڑھ لیتے  
تھے کہ اگر ہم نماز پڑھ کر عوالی (مدینہ سے چار میل) سے بھی پھر آتے، تو سورج کافی اونچا  
ہوتا تھا۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۷۰) انگریزی میل ۱.۶۰ گز لمبا ہوتا ہے۔ اور عربوں کا پرانا میل  
۲۴۵۵ گز۔ اس حساب سے عوالی اور مدینہ کا دو طرفہ سفر گیارہ میل اور ایک فرلانگ بنتا ہے  
جس پر درمیانی رفتار سے کم از کم چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔۔۔ بدیگر الفاظ حضور نماز عصر غروب  
آفتاب سے ساڑھے پانچ گھنٹے پہلے پڑھا کرتے تھے۔۔۔ قربان جاؤ اس وحی خفی پر۔



## ازالہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کہ نماز کو ٹھنڈے وقت پڑھا کرو، یہ ظہر کے متعلق ہے اور یہ اس لئے کہ آنے والوں کو دیواروں کا سایہ مل جائے۔ اور وہ بآسانی آسکیں، یہ حکم اس زمانہ کے لئے مخصوص ہے جب سخت گرمی کا موسم ہو ورنہ ٹھنڈا کرنے کے کیا معنی ہوں گے۔ برق صاحب نے اس حکم کو عصر کے متعلق سمجھایا ان کی پہلی غلط فہمی ہے حالانکہ حدیث میں ظہر کی صراحت موجود ہے معلوم نہیں لفظ ”ظہر“ برق صاحب کی نظر سے کیسے اوجھل ہو گیا۔

دوسری حدیث کا ترجمہ کرنے میں برق صاحب کو زبردست غلط فہمی ہوئی۔ صحیح ترجمہ

ملاحظہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھتے	كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
تھے جب کہ سورج بلند اور چمک دار ہوتا تھا۔ پھر	يُصَلِّيُ الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةً
ایک جانے والا غالی جاتا تھا اور ان کے	حَتَّىٰ يَنذِرَهُمْ الذَّاهِبُ إِلَى الْعُورَىٰ
پاس پہنچ جاتا تھا، ایسی حالت میں کہ سورج	فَيَأْتِيهِمُ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ
بلند ہوتا تھا۔	(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حدیث میں یک طرفہ فاصلہ کا ذکر ہے۔ برق صاحب نے دوطرفہ کر دیا۔ ایک طرف کا فاصلہ چار عربی میل ہوا اور یہ فاصلہ بآسانی  $\frac{1}{4}$  گھنٹہ میں طے ہو سکتا ہے۔ اس حساب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غروب آفتاب سے تقریباً ڈھائی گھنٹے پہلے نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ بالکل اسی وقت ہم خود آج کل نماز عصر ادا کرتے ہیں لہذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے۔

ابو امامہ کہتے ہیں کہ میں اور عمر بن عبدالعزیزؓ نماز ظہر پڑھ کر معاً حضرت انس بن مالک کے ہاں چلے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ نماز عصر پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا یہ کیا؟ کہنے لگے کہ حضورؐ کا وقت عصر یہی تھا۔ (رد اسلام ص ۲۴۸)

## غلط فہمی

اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ ان لوگوں نے ظہر کی نماز دیر سے پڑھی ہوگی یہ تصور ان کا ہے نہ کہ اصلی وقت کا، عصر کا اصلی وقت مغرب سے تقریباً  $\frac{1}{4}$  یا  $\frac{1}{2}$  گھنٹہ پہلے شروع ہوتا ہے۔ آج کل عوام الناس جس وقت نماز پڑھتے ہیں وہ آخر وقت ہوتا ہے۔

## ازالہ

## انتباہ

اس کے بعد برق صاحب نے ”چند اختلاف“ کے عنوان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ دعائیں نقل فرمائی ہیں اور ان کو اپنے عمل یا احناف کے عمل سے متعارض سمجھا ہے۔ برق صاحب



بات یہ نہیں ہے جواب سمجھے ہیں اگر رکوع میں ایک سے زائد دعائیں ماثور ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سب غلط ہیں۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ دعائیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ آخر اس میں اشکال کی کون سی بات ہے۔ اشکال تو اس وجہ سے پیدا ہوا کہ آپ کو بچپن سے ان دعاؤں سے ناواقف رکھا گیا۔

”تویہ ہے حدیث کی نماز! کیا آپ ہی نماز پڑھا کرتے تھے اگر نہیں تو کس منہ سے یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر حدیث نہ رہے تو نماز کا نام و نشان مٹ جائے، آپ حدیث کی نماز سے کوسوں بھاگتے ہیں اور پھر حدیث کو شارح صلوٰۃ بھی کہتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ بڑا متمہ کون سا ہے آپ یا آپ کی حدیث! اردو اسلام (۲۵۲-۲۵۱)

آپ کی تمام غلط فہمیوں کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے لہذا حدیث کی نماز بالکل صحیح ہے اور اسی طریقہ سے افراد جماعت المسلمین نماز ادا کرتے ہیں حدیث کی نماز سے کوسوں دور وہ بھاگتے ہیں جنہوں نے اپنے علیحدہ علیحدہ مذہب بنائے ہیں اور جو اپنے مذہب کی خاطر طرح طرح کے حیلوں اور بہانوں سے حدیث کو رد کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر فتنہ انکار حدیث کو جنم دینے والے ہی لوگ ہیں اور اس فتنہ کی پرورش کرنے والے وہ لوگ ہیں جو آج علی الاعلان میدان میں اتر آئے ہیں، برق صاحب اس جلی اور خفی انکار حدیث سے بچئے۔ فرقہ بندی سے علیحدہ ہو کر نماز کو سیکھئے۔ پھر آپ کو وہی نماز حاصل ہوگی جو حدیث میں ہے۔



# باب ۱۱

## بہترین عمل

**غلط فہمی** جب ملانے دیکھا کہ مسلمان بننے کے لئے جان دینا پڑتی ہے تو اس نے بعض دیگر اعمال کی افضلیت پر احادیث گھڑنا شروع کر دیں اور جہاد کی وقعت کو گھٹا کر کہیں تو اسے تیسرے یا چوتھے درجے کا عمل بنا دیا اور کہیں اچھے اعمال کی فہرست بنی سے خارج کر دیا (صفحہ ۲۵۶)

**الزالم** برق صاحب قرآن مجید میں بھی ایسی متعدد آیات ہیں جن میں جہاد کا ذکر نہیں ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

۱۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَنْزِلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبَشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوعَدُوْنَ۔  
 جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے اور پھر اس پر جمے رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ تم نہ ڈرو، اور نہ غم کھاؤ اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

(رحمہ السجدہ ۱-۳)

اس آیت کی رو سے بس ”رَبُّنَا اللّٰهُ“ کہہ لے اور اسی پر جبار ہے، تو وہ جنتی ہے اس آیت کی رو سے نہ مالی قربانی کی ضرورت، نہ میدان کارزار میں داؤد شجاعت دینے کی ضرورت، کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت بھی کسی ملا کی گھڑی مہرٹی ہے۔؟

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا دُکِرَ اللّٰهُ وَحَلَّتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا نَزَّلَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهُ زَادَتْهُمْ اٰیْمًا نَّافِعًا عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ  
 مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جائے اور وہ



وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ  
هُمُ الْمُؤْمِنُونَ ۖ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ  
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ ۖ وَرِزْقٌ  
كَرِيمٌ ۝

اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں۔ جو لوگ نماز کو قائم  
کرتے ہیں اور ہماری دی ہوئی دولت میں سے  
خرچ کرتے ہیں یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کیلئے  
ان کے رب کے پاس درجات ہیں، مغفرت  
ہے اور بہترین رزق ہے۔

(الانفال: ۲ تا ۴)

اس آیت میں بھی جہاد کا ذکر نہیں ہے بلکہ دل کو نرم بنانے، توکل کرے، نماز پڑھے، اور محظوظ  
بہت کبھی خرچ بھی کرتا رہے خواہ اس خرچ کا محل کچھ ہی ہو، اللہ کے لئے خرچ کرنا بھی ضروری  
نہیں ہے بس وہ پکا مومن ہے، وہ حقیقی مسلم ہے، وہ جنت کا ٹھیکہ دار ہے، بتائیے اس آیت کے متعلق  
ہم کیا خیال قائم کریں؟

۲۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ  
هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ  
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعَصِّمُونَ ۝ وَالَّذِينَ  
هُمْ لِلزَّكَاةِ نَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ  
هُمْ لِفُؤْادِهِمْ حَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ  
أَرْزَقْنَاهُمْ أَزْوَاجًا مِّمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ  
فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَمْلُومِينَ ۖ فَمَنْ أَمْتَغَىٰ  
رَأْسَهُ زُيْلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ  
وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ  
رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ  
مُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝  
الَّذِينَ يَرِثُونَ الْغَنَىٰ دُونَ هُمُ فِيهَا  
خَالِدُونَ ۝ (المؤمنون - ۱ تا ۱۱)

بے شک نجات پائی ان مومنین نے جو اپنی نماز  
میں خشوع کرتے ہیں اور جو لغو کاموں سے دور  
رہتے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی  
شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے  
بیوی اور لونڈی کے کہ ان کے حق میں وہ  
قابل ملامت نہیں ہیں، بلکہ جو ان کے علاوہ  
تلاش کریں وہ حد سے گزرنے والے ہیں  
اور جو لوگ امانتوں اور عہدوں کی حفاظت  
کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی  
حفاظت کرتے ہیں یہی لوگ جنت الفردوس  
کے وارث ہوں گے، اور اس میں  
میشہ رہیں گے۔

برق صاحب! دیکھا آپ نے اعمال صالحہ کی کتنی لمبی فہرست ہے لیکن جہاد کا ذکر کہیں نہیں،  
سورہ معارج میں کم و بیش انہی اعمال پر مشتمل پھر ایک لمبی فہرست ہے لیکن اس میں بھی جہاد کا ذکر نہیں  
باجوہ اس کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ”أُولَٰئِكَ فِي جَنَّتٍ مُّكْرَمُونَ“ (معارج: ۳۵) یہ لوگ  
جنت میں عزت والے ہوں گے ان طویل فہرستوں میں جہاد کا ذکر تک نہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ جہاد  
کوئی ایسی ضروری چیز نہیں جس کے بغیر جنت نہ مل سکے۔ بتائیے اب ان آیات کے متعلق ہم کیا خیال



قائم کریں۔ قرآن مجید میں اس قسم کی اور بھی بہت سی آیات ہیں، بخوف طوالت ہم نقل نہیں کر سکتے، مثنیٰ نمونہ ادھر دارے یہی کافی ہیں

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ سب سے بہترین عمل کون سا ہے فرمایا، نماز یہ پابندی وقت، اس کے بعد والدین

**غلط فہمی**

کی خدمت اور اس کے بعد جہاد (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۹) دیکھا آپ نے نماز کو کہاں رکھا اور جہاد کو کہاں جا پھینکا (دو اسلام ص ۲۵۶)

برق صاحب اوپر سورہ مومن اور سورہ معارج سے اعمالِ صالحہ کی طویل قرآنی فہرستیں پیش کی جا چکی ہیں ان دونوں فہرستوں میں نماز سے آغاز ہوا ہے اور نماز ہی پر اختتام ہوا ہے گویا نماز پر بڑا زور دیا گیا ہے رہا جہاد تو اس کا ان طویل فہرستوں میں ذکر تک نہیں، اب بتائیے نماز زیادہ اہم ہے یا جہاد۔ اچھا وہ آیت سنئے جس میں جہاد کو سب سے پیچھے ڈال دیا گیا ہے۔

بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ جو ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر قیامت پر، فرشتوں پر کتابوں پر اور نبیوں پر اور جس نے اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو یتیموں کو، مساکین کو، مسافروں کو، سائین کو مال دیا اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کیا اور جس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور جو عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب عہد کر لیں، اور جو صبر کرنے والے ہیں غربت میں، بیماری میں اور جہاد میں، یہی لوگ ہیں جنہوں نے سچ کہا (صدق دل سے ایمان لائے) اور یہی متقی ہیں۔

وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ  
وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ  
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ  
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ  
الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ  
بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ  
فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَافِعِ وَحِينَ الْبَأْسِ  
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ  
هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝

(البقرة، ۱۷۷)

برق صاحب دیکھا آپ نے کتنی طویل فہرست ہے لیکن جہاد فہرست کے اختتام پر ہے۔

حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:-

**غلط فہمی**

نزی الجہاد افضل

کہ ہماری رائے میں جہاد بہترین عمل ہے

کیا ہم جہاد نہ کریں، فرمایا نہیں، بلکہ حج بہترین

جہاد ہے۔

العمل افلا مجاہد قال لا لکن

افضل الجہاد حج مبرور



چلو اہل عرب اور ہمارے امراء کی توجہ اس سے خلاصی ہوئی... برصغیر جہاد والے کو کیا پڑی ہے کہ جان دے کر گھٹیا جہاد کرتا پھرے (دوا سلام ص ۲۵۶ - ۲۵۷)

برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے :-  
**ازالہ** | ”ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افضل العمل ہے تو کیا ہم جہاد نہ کریں، آپ نے فرمایا تم عورتوں

کے لئے بہترین جہاد حج مبرور ہے“  
 برق صاحب نے ”لکھن“ کو ”لکھن“ سمجھ کر ترجمہ کیا اور یہی اصلی غلط فہمی ہے حدیث کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ازواج مطہرات اور عام عورتوں کے لئے حج ہی جہاد ہے ان کے لئے میدان کارزار میں مردوں کے دوش بدوش لڑنا اور کافر مردوں سے گتھا گتھم ہونا مناسب نہیں، برق صاحب سمجھے کہ گویا یہ حکم مردوں کے لئے ہے نہیں، ہرگز نہیں پھر حدیث سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ جہاد بہترین عمل ہے لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حج جہاد سے بہتر ہے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حج بھی ایک قسم کا جہاد ہے اور عورتوں کے لئے ہی جہاد بہتر ہے۔

کسی نے حضورؐ سے پوچھا کہ بہترین عمل کون سا ہے؟ فرمایا، خدا اور رسول پر ایمان، اس کے بعد جہاد اور اس کے بعد حج۔

**غلط فہمی**

اوپر والی حدیث کے مطابق بہتر عمل حج تھا اور اس کے بعد جہاد، اس حدیث کے مطابق حج سے جہاد بہتر ہے۔ (دوا سلام ص ۲۵۷)

اوپر والی حدیث کا ترجمہ آپ سے غلط ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کو یہاں بھی الجھن پیش آئی۔ اس حدیث میں عورتوں کے لئے حج کو بہتر بتایا گیا۔ اور اس حدیث میں حکم عام ہے یعنی مردوں کے لئے جہاد حج سے افضل ہے۔

**ازالہ**

”قرآن لاکھ چلائے کہ ہم جہاد کے بغیر جنت نہیں دیں گے... لیکن حدیث کہتی ہے کہ اللہ نمازی اور روزہ دار کو بہشت میں بھیجنے پر مجبور ہے“ (دوا سلام ص ۲۵۸)

**غلط فہمی**

قرآن تو صرف ربنا اللہ کہنے پر جنت کی بشارت دیتا ہے، جنت میں لے جانے والے عملوں کی طویل فہرست بیان کرتا ہے، اور مکرر سہ کر بیان کرتا ہے

**ازالہ**

لیکن کہیں جہاد کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ بغیر جہاد کے جنت ہی میں نہیں، بلکہ جنت الفردوس میں داخل کر دیتا ہے۔

نمازی اور روزہ دار کے لئے جو الفاظ حدیث میں آئے ہیں وہ یہ ہیں :-



كَانَ حَقًّا عَلَى اللَّهِ أَنْ يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ ۖ  
برق صاحب نے ”كَانَ حَقًّا عَلَى اللَّهِ“ کے معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مجبور ہے، سنیئے !

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے :-  
كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝  
ہم پر مومنین کی مدد کرنا حق ہے ۔

(الروم : ۴۷)

برق صاحب آپ کے لحاظ سے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کی مدد کرنے کے لئے مجبور ہے تو کیا قرآن مجید پر بھی وہی اعتراض ہوگا جو حدیث پر کیا گیا ہے، اگر نہیں تو حدیث نے کیا تصور کیا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اعمال کی ادائیگی پر جنت کا وعدہ کیا ہے اور کیونکہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا، لہذا اس کے لئے وعدہ پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ بتائیے اب وہ وعدہ پورا کرے یا نہیں؟ اگر کرتا ہے تو گویا بقول آپ کے مجبور ہے اگر نہیں کرتا تو وعدہ خلافی ہوتی ہے۔

”ایک حدیث ملاحظہ ہو:-

**غلط فہمی**

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل کون سا ہے۔ ایسا عمل جو تمہارے درجوں کو بلند کرے، جو سونے چاندی کی قربانی سے بہتر ہو، اور اس جہاد سے بھی اچھا ہو جس میں تم دوسروں کی گردنیں کاٹتے اور اپنی کٹاتے ہو۔ لوگوں نے کہا بتائیے، کہا ”اللہ کا ذکر“

سب سے زیادہ اللہ کا ذکر ایک مہکاری کرتا ہے جو ایک ایک سانس میں دس دس مرتبہ اللہ کا نام لے کر بھیک مانگتا ہے، تو گویا اس حدیث کی رو سے مہکاری بہشت کے ٹھیکیدار اور سردار ہوں گے اور ہم تم سب ان کے خدمت گار۔“  
(دو اسلام ص ۲۵۸-۲۵۹)

برق صاحب اس حدیث کا جواب باب اول میں دیا جا چکا ہے یہاں آپ نے اسے دوبارہ نقل کر دیا ہے۔ اور پر قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ کہیں تو دخول جنت صرف بنا اللہ کے مدد پر مل جاتی ہے اور کہیں اور اعمال کی ادائیگی پر جن میں جہاد کا ذکر نہیں، بتائیے ایک مہکاری جو صبح سے لے کر شام تک ”ربنا اللہ“ کا نعرہ لگائے وہ جنتی ہے؟ اگر ہے تو پھر کیا قرآن مجید پر بھی وہی اعتراض ہوگا جو حدیث پر ہے؟ درحقیقت یہ اعتراض ہی غلط فہمی پر مبنی ہے (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو)



”یہ نہ سمجھیے کہ افضلیت جہاد پر حضور کا کوئی قول موجود ہی نہیں، بہتیرے ہیں  
لیکن ہمارے واعظین اور دینی راہنما انہیں چھپائے رکھتے ہیں۔“

**غلط فہمی**

(دو اسلام ص ۲۵۹)

برق صاحب جو لوگ چھپاتے ہیں وہ قابل مواخذہ ہیں لیکن داد دیجیئے محدثین کو کہ انہوں  
نے جہاد کی افضلیت میں بے شمار احادیث اپنی کتابوں کی زینت بنادیں۔ اور ان

**ازالہ**

ملا کی طرح چھپایا نہیں اور یہی وہ احادیث ہیں جن کو فخر کے ساتھ آپ نے ص ۲۶ اور ص ۲۶۱ پر  
نقل فرمایا ہے۔

”متقین کا مصدر ہے تقویٰ جس کے معنی ہیں حفاظت، بچاؤ، ڈیفنس، یعنی

**غلط فہمی**

متقی لوگ وہ ہیں جن کا ڈیفنس مضبوط ہو جن کی سرحدیں مستحکم ہوں۔ جو مہیب  
عسکری طاقت کے مالک ہوں۔ اور جن کا کردار اتنا بلند ہو کہ ان پر کسی قسم کا حملہ نہ کیا

جاسکے“ (دو اسلام ص ۲۶۲)

برق صاحب ہو سکتا ہے کہ متقی کی تعریف میں یہ اوصاف بھی شامل ہوں، بہر حال ذرا  
مندرجہ ذیل آیت بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں متقین کے کچھ اوصاف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے

**ازالہ**

میں اور وہ آپ کے قیاسی اوصاف سے بہت زیادہ مستند ہیں۔

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ  
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ  
أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ  
فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاطِمِينَ  
الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ  
اللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَالَّذِينَ  
إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا  
أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ

اپنے رب کی مغفرت کے لئے جلدی کرو اور  
اس جنت کی طرف بھی جلدی کرو جس کا عرض  
آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے وہ جنت  
متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یعنی وہ لوگ  
جو خوش حالی اور تنگ حالی دونوں حالتوں میں  
خرچ کرتے ہیں اور وہ جو غصہ کو پی جاتے  
ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکی  
کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور وہ لوگ  
جو فحش کام کرنے کے بعد یا اور کوئی گناہ عظیم  
کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔

(ال عمران ۱۳۳ تا ۱۳۵)

## خلاصہ باب

کسی آیت میں کسی نیک عمل کا ذکر ہے اور کسی آیت میں کسی گناہ کا، ان تمام آیات سے اعمال کی جو فہرست



تیار ہوتی ہے وہ اسلام ہے، بالکل اسی طرح کسی حدیث میں کسی عمل کی فضیلت مذکور ہے اور کسی میں کسی عمل کی، موقع اور محل کے لحاظ سے کہیں کسی کا ذکر ہے، اور کہیں کسی کی اہمیت، ان تمام احادیث سے جو اعمال کی فہرست تیار ہوگی وہ ایک مسلم کے لئے ضروری ہے۔ کسی ایک آیت یا کسی ایک حدیث کو موردِ طعن ٹھہرانا یا صرف اسی آیت یا حدیث کے عمل پر تکیہ کر لینا کسی عالم کا قول ہے نہ فعل۔ اگر کسی ملا نے ایسا کہا ہے یا کیا ہے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے جس حدیث میں ذکر کو جہاد سے افضل کہا گیا ہے وہاں ذکر میں وہ چیز بھی شامل ہے جس کو آپ کی اصطلاح میں ”اُتد کا پروپیگنڈا“ کہتے ہیں یعنی توحید کی اشاعت، اُتد کی حاکمیت کا پرچار، قوانینِ الہیہ کی تبلیغ اور جب یہ چیزیں بھی ذکر اُتد میں شامل ہوں تو یقیناً وہ جہاد یعنی جنگ سے افضل ہے کیونکہ جہاد تبلیغ کے بعد آیا کرتا ہے۔ اگر تبلیغ نہ ہو تو جہاد کا عدم ہوگا، پھر جہاد میں جو تکلیف پہنچتی ہے وہ بہت کم عرصہ کے لئے ہوتی ہے لیکن تبلیغ میں جو مصائب اور تکالیف جھیلنی پڑتی ہیں وہ جہاد کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہیں ایک آدمی تبلیغ کرتا ہے اور سب اس کی مخالفت کرتے ہیں، حکومت کے مظالم کا نشانہ صرف وہی ایک آدمی ہوتا ہے نہ اس کے پاس دفاع ہوتا ہے نہ قوت، کہ وہ حکومت اور عوام کا مقابلہ کر سکے وہ بالکل مجبور ہوتا ہے اور خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کرتا ہے، یہ ہے اُتد کا ذکر، کہاں جنگ اور کہاں یہ؟

(تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو)



# باب ۱۲

## اللہ کی عادت

”سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بُری حالت کا ذمہ دار کون ہے؟“  
**غلط فہمی** | اس کا جواب صرف ایک ہے کہ مُلّا اور اس کا حدیثی اسلام۔“

(دوا سلام ص ۲۶۶)

یہ صحیح نہیں مسلمین کے زوال کا سبب حدیث نہیں بلکہ اس کا اصل سبب قرآن و حدیث  
**ازالہ** | کو غلط سمجھنا اور اس پر عمل نہ کرنا ہے۔ جتنی تحریکیں اب تک اصلاح کے لئے اٹھیں  
 ان سب کا دستور العمل حدیث تھی لیکن باوجود اس کے ہر تحریک کی تاریخ جہاد فی سبیل اللہ سے لبریز  
 ہے۔

میر تقی صاحب آپ عبارت آرائی اور رنگین بیانی سے جہاد کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری  
 سمجھنے لگتا ہے کہ سب کچھ جہاد ہی ہے گویا جہاد اسلام کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ  
 جہاد یعنی جنگ مقصدِ اصلی نہیں، بلکہ مقصد کے حصول اور بقا کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر یہ مقصد بغیر جہاد  
 ہی کے حاصل ہو جائے تو آخر پھر جہاد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اگر  
 کوئی شخص ایسا ہو کہ جسے جہاد کرنے کی نوبت ہی نہ آئے خواہ وہ کہیں کا بھی رہنے والا ہو تو وہ غلبتی ہے  
 اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس کو آپ نے ص ۲۵۸ پر صحیح بخاری کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے۔  
 ذرا غور فرمائیے آپ کا مقصد تھا حصولِ پاکستان۔ کیا آپ نے اس کے لئے کوئی جنگ لڑی؟ طائر  
 کہ نہیں لڑی، بلکہ دوسرے ذرائع سے پاکستان حاصل ہو گیا تو بتائیے یہ کامیابی ہے یا نہیں؟ یا  
 کامیابی جب ہی ہوتی کہ مخالفینِ پاکستان سے میدانِ کارزار میں لڑکر پاکستان حاصل کیا جاتا،  
 اسی طرح دین کے معاملہ میں اصلی مقصد اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ اور اس کا واحدِ الہ و حاکم ہونے کا  
 عقیدہ منوانا ہے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کا انسداد کرنا ہے اگر اس



لئے جنگ کی ضرورت پیش آئے تو جنگ بھی کی جاسکتی ہے اور اگر جنگ کے بغیر یہ چیز حاصل ہو جائے، تو فہو المراد جنگ کرنا اسلام کا اصلی مقصد نہیں بلکہ مسلم بحالتِ مجبوری جنگ کرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَنْ يَكُونُوا ظَالِمِينَ (الحج: ۳۹)  
مسلمین کو جنگ کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-  
وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (البقرة: ۱۹۰)  
اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے رٹتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:-  
وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا (النساء: ۷۵)  
اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے، حالانکہ کمزور مسلم مرد، عورتیں اور بچے (جو ظالموں کے شکنجہ میں گرفتار ہیں) یہ دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اس لعنتی سے نجات دے جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔

برق صاحب! یہ ہیں وہ حالات جن میں ایک مسلم تلوار اٹھاتا ہے، آپ چاہتے ہیں کہ وہ کچھ اور کرے ہی نہیں، بس رٹتا ہی پھرے گویا رٹنا ہی اصلی مقصد ہے۔ برق صاحب! اس تیسری آیت کو ذرا پھر پڑھیے اور غور سے پڑھیے، اس میں کمزور مسلمین کی دعا ہے بتائیے یہ دعا قبول ہوئی تھی یا نہیں، اگر ہوئی تھی اور ضرور ہوئی تھی تو ماننا پڑے گا کہ دعا بھی کوئی اہم چیز ہے اور محض دعا سے بھی کام بن جایا کرتے ہیں ان کمزور مسلمین نے سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات دلوا دی، دعا ہی وہ چیز ہے کہ جہاں اور تمام وسائل مفقود ہوں وہاں وہی کام آتی ہے، بلکہ یہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کی ضرورت وسائل کی موجودگی میں بھی ضروری ہے، اور وسائل کے فقدان کی حالت میں بھی ضروری ہے۔ مسلمین نے میدانِ جنگ میں بھی دعا کی ہے اور یہ دعا قرآن مجید میں منقول ہے۔

وَأَنْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ اے اللہ ہم کو کافروں کے مقابلہ میں نصرت عطا فرما۔ (الاعراف: ۱۳۷)

دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دیتا ہے لیکن اس کے معنی نہیں کہ وسائل کو تلاش نہ کیا جائے۔ وسائل کی تلاش بھی ضروری ہے اور دعا بھی ضروری ہے آپ بلا وجہ دعا کے مخالف



ہو گئے یہ ہے دعا کی حقیقت جو نہ صرف حدیث بلکہ قرآن مجید سے بھی ثابت ہے آپ دعا کے اصلی منشا سے اعراض کر کے اس کو ملا کے سرٹھوپ رہے ہیں۔ جدوجہد کو چھوڑ کر دعا پر تکیہ کرنا یہ ملا کا شعار سہی اور بے شک یہ برا ہے لیکن مطلق دعا کا انکار، قرآن مجید کا انکار ہے، کیونکہ قرآن مجید دعاؤں سے مملو ہے۔

برق صاحب ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں اور قدیم زمانہ سے موجود رہے ہیں جو عدم تشدد کے حامل ہیں۔ جو جنگ و حرب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بغیر جنگ کے انہوں نے تبلیغ کی، ان کی اس تبلیغ سے صرف ہندوستان بلکہ چین و جاپان تک متاثر ہوئے اور ان کے مذہب کے ماننے والے آج بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں یہ کس طرح پھیلے، کس طرح ان کی حکومتیں قائم ہوئیں، یہ کون سی جنگ لڑے؟ کیا بغیر جنگ کے انہوں نے مقصد کو حاصل کیا یا نہیں؟ اگر کیا اور ضرور کیا تو آخر مقصد کے حصول کے بعد ذریعہ کی کیا اہمیت ہے؟ برق صاحب ذریعہ کو مقصد نہ بنائے یہ لوگ جو عدم تشدد کے حامی ہیں اگر چاہیں تو ایسی ہی عبارت آرائی اور رنگینی مضامین سے جنگ و جہاد کے پرچھے اڑا سکتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو محض مسیح و مسیحی عبارت سے مرعوب کر کے جہاد سے متنفر کر سکتے ہیں لیکن حقیقت عبارت آرائی میں نہیں ہوتی نہ جہاد بے حقیقت چنیو ہے نہ جہاد ہی سب کچھ ہے مثال کے لئے سینے، ستھیارتھ پرکاش کے چودھویں باب کا مصنف قرآنی آیات پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”قرآن کا خدا اور پیغمبر دونوں جنگجو تھے جو لڑائی کا حکم دیتا ہے وہ امن میں خلل انداز ہوتا ہے لڑائی تو ادھر م کی لڑائی سے خوف کرنے سے ہوتی ہے“ (ستھیارتھ پرکاش باب ۱۲ ص ۱۷۷)

ایک اور جگہ لکھتا ہے :-

”یہ تحریر محمد صاحب نے اس مطلب سے کی ہوگی کہ لڑائی میں نہ بھاگے اور اپنی فتح ہواور مرنے سے کوئی نہ ڈرے اپنا اقبال بڑھے اور مذہب پھیلے“ (ص ۱۷۷)

برق صاحب دیکھا آپ نے یہ کس طرح قرآنی جہاد کا مضحکہ اڑا رہا ہے اور یہ تو آریہ مذہب کی کتاب کا حال ہے جو عدم تشدد کے قائل نہیں، اگر آپ بد مذہب اور عینی مذہب کے ماننے والوں کی کتابوں کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اس جنگ کو سب سے زیادہ برا عمل سمجھتے ہیں حتیٰ کہ اس جہاد کا مذاق ہمارے زمانہ کے بہت بڑے سیاسی لیڈر گاندھی جی نے بھی اڑایا ہے، برق صاحب یہ ہے افراط و تفریط، وہ جہاد کو لغو فعل سمجھتے ہیں اور آپ جہاد ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ ہو جہاں مسلمین کے زوال اور اس کے اسباب پر قرآن مجید سے استشاد



کیا گیا ہے۔

**غلط فہمی** ”دنیا ئے اسلام میں لاکھوں مساجد، ان میں لاکھوں مکا اور ہر مکا صبح و شام مسلمانوں کو مندرجہ ذیل اسباق دے رہا ہے۔“  
(دوا اسلام ص ۲۶۶)

**ازالہ** اس عبادت کے بعد برق صاحب نے وہ اسباق درج کئے ہیں ہم یہ اسباق ذیل میں درج کر رہے ہیں اور ہر سبق کا جواب بھی ساتھ ساتھ دے رہے ہیں۔

**غلط فہمی** ۱۔ کہ صرف تم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو یہ امت بخشی بخشی ہے  
(دوا اسلام ص ۲۶۶)

**ازالہ** کسی عالم نے ایسا نہیں کہا۔

**غلط فہمی** ۲۔ کہ ..... یہ دنیا مردار ہے جس کے طالب کئے ہیں۔“  
(دوا اسلام ص ۲۶۶)

**ازالہ** اس کا مفصل و مدلل جواب تمہید میں ملاحظہ فرمائیں۔

**غلط فہمی** ۳۔ کہ ”المؤمن لا یخس“ مومن جسم پر کتنی ہی غلاظت مل لے وہ ناپاک نہیں ہوتا (دوا اسلام ص ۲۶۶)

**ازالہ** ”المؤمن لا یخس“ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے برق صاحب درحقیقت اس حدیث پر اعتراض کر رہے ہیں جس میں یہ جملہ وارد ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں نیچے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

سَيُخْلِقُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا اُنْقَلَبْتُمْ  
اِلَيْهِمْ لَتُعْزِيْهُنَّ عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا  
عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَا وَكَلُوْهُمْ جَهَنَّمَ  
جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

(التوبة: ۹۵)

کہئے منافق اگرچہ کتنا ہی صابن سے نہائے ناپاک ہی رہے گا۔

۲۔ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ  
نَجَسٌ (التوبة: ۲۸)

اے ایمان والو! بات درحقیقت یہ ہے کہ مشرک نجس و ناپاک ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرک نجس ہوتا ہے مومن نجس نہیں ہوتا اور یہی حدیث کا مطلب ہے:-

۳۔ وَاِنَّمَا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ  
اور جن لوگوں کے دل میں مرض ہے تو اس نے



فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَا تُوُوا  
وَهُمْ كَافِرُونَ (التوبہ: ۱۲۵)  
۴۔ وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَىٰ الذِّنِّ لَا  
يَعْقِلُونَ (یونس: ۱۰۰)

ان کی گندگی پر مزید گندگی کا اضافہ کر دیا اور وہ  
کفر کی حالت میں مر گئے۔  
اور اللہ تعالیٰ گندگی ان لوگوں پر ڈال دیتا ہے  
جو عقل نہیں رکھتے۔

برق صاحب یہ کون سی گندگی ہے؟ یہی وہ گندگی ہے جو مؤمن میں کبھی نہیں ہوتی، یہی وہ روحانی  
گندگی ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے اب تو غالباً حدیث کا مطلب سمجھ میں آ گیا ہو گا۔  
”۴۔ کہ صرف کلمہ پڑھنے سے بہشت مل جاتی ہے۔“

## غلط فہمی

(دو اسلام ص ۲۶۶)

ازالہ | برق صاحب ایسا کہتا تو کوئی نہیں جو کہتا ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے، یہ ضرور ہے  
کہ بعض احادیث سے بظاہر ایسا مطلب نکلتا ہے اور غلط فہمی سے بعض لوگ اس کا دعویٰ کر بیٹھتے  
ہیں کہ صرف کلمہ پڑھنے سے جنت مل جاتی ہے اور یہی غلط فہمی آپ کو بھی ہوئی۔  
اچھا برق صاحب اب حدیث کا مطلب سنئے، فرض کیجئے دو شخص ہیں ایک حکومت کا باغی ہے  
ملک میں فساد برپا کرتا ہے، فتنے اٹھاتا ہے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرتا ہے آخر گرفتار ہوتا  
ہے، کیئے اس کے ساتھ حکومت کا کیا سلوک ہو گا؟ کیا اس کے لئے کوئی دائمی سزا نہیں ہو گی، ضرور ہو گی  
دوسرا شخص حکومت کا وفادار ہے، غداری نہیں کرتا اتفاقاً اس سے کوئی جرم ہو جاتا ہے، جرم کرتے وقت  
اس کی نیت سرکشی کی نہیں ہوتی بلکہ نادانی اور جہالت ایسی طاری ہوتی ہے کہ وہ مدہوش ہو جاتا ہے،  
اور جرم کر بیٹھتا ہے پھر یہ بھی گرفتار ہوتا ہے کیئے کیا حکومت اس کو دسی ہی سزا دے گی جیسے پہلے شخص  
کو دی ہے کیا اس کی سزا دائمی ہو گی؟ نہیں، ہرگز نہیں بلکہ حکومت اس کو سزا دے کہ پھر ہلاک نہ دے گی  
آخر ان دونوں میں امتیاز پیدا کرنے والی کیا چیز ہے؟ پہلا وفاداری کا عہد نہیں کرتا، دوسرا دل سے  
وفاداری کا عہد کرتا ہے، غداری کی سزا دائمی سزا ہے، وفاداری کے جذبہ کے ساتھ کسی جرم کی سزا  
دائم نہیں۔ یہی بات ہے کہ جو شخص دل سے کلمہ پڑھ کر اتفاقاً گنہگار مرتکب ہو جاتا ہے تو اس کا جرم اتنا  
وزنی نہیں کہ ابدال آباد تک جہنم میں رہنے والوں کے ساتھ وہ بھی ہمیشہ کے لئے دوزخ میں بند کر دیا جائے  
اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس کو غلط فہمی کی وجہ سے برق صاحب نے ص ۲۶۵ پر اعتراضاً  
نقل کیا ہے۔ اور وہ حدیث یہ ہے:-

”حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس گیا آپ نے فرمایا:-

مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ثُمَّ حَبَّ كُفًى شَخْصًا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَتَمَ بِهِ أَمْرًا سَكِي مَوْتًا



مات علی ذلک الادخل الجنة ۱۰  
اسی عقیدہ پر ہوتی ہے تو وہ جنت میں  
چلا جاتا ہے ۔

میں نے پوچھا اگر وہ زانی اور چور ہو فرمایا مہر بھی جنت میں جائے گا ۔  
مذکورہ بالا توضیح کے بعد آپ نے اس حدیث کا مطلب سمجھ لیا ہوگا ۔ اس حدیث کا مطلب  
وہ نہیں جو بطور خلاصہ آپ نے تحریر فرمایا ہے یعنی کلمہ پڑھتا جائے اور زنا اور سرقہ کے مزے بھی  
لوٹتا جائے ، سیدھا جنت میں جائے گا ، (دوسرا سلام ص ۲۵)  
آپ کے خلاصہ سے سرکشی اور بغاوت ٹپکتی ہے اور سرکشی و بغاوت کی نیت سے اگر گناہ کیا  
جائے تو وہ معاف نہیں ہوتا ہاں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اس کے احکام کا وفادار رہے اور  
مہر بھی اتفاقاً گناہ ہو جائے تو یہ شخص اس عہد و فاداری کی وجہ سے قابل درگزر ہے اور کبھی نہ کبھی  
اپنے جرم کی سزا مہلکت کر جنت میں چلا جائے گا اس حدیث کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ عہد و فاداری (یعنی  
کلمہ شہادت) کبھی نہ کبھی اس کو جنت میں پہنچا کر رہے گا خواہ سزا کے بعد یا بغیر سزا کے ، کیونکہ اللہ تعالیٰ  
جرم کو معاف بھی کر سکتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :-

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهِ  
وَلْيَغْفِرْ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ  
بیشک اللہ شرک کو نہیں بخشتے گا اس کے علاوہ  
اور گناہوں کو بخشت دے گا جس کے لئے  
(النساء ۱-۱۱۶)

اس آیت کی روشنی میں حدیث کا مطلب سمجھنے کی کوشش کیجئے ، حدیث کو نہ سمجھنے سے  
ساری خرابی پیدا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے سامنے اس قسم کی احادیث بیان کرنے سے  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے ، مبادا وہ غلط مطلب سمجھ کر صرف کلمہ پر بھروسہ  
کر لیں ، مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ بس شرک معاف نہیں ہوگا اور باقی  
گناہ تو انشاء اللہ معاف ہو ہی جائیں گے ، خوب گناہ کرتا مہرے تو بتائیے اس میں آیت کا کیا تصور ہے  
فقور تو اس کی سمجھ کا ہے آیت میں دوسرے گناہوں کی معافی کا امکان تو ضرور ہے اس سے زیادہ  
کچھ نہیں اسی طرح حدیث میں کلمہ شہادت پڑھ لینے کے بعد دخول جنت کا امکان ہے ۔ سزا کے معاف  
ہو جانے کی صورت میں یا سزا کی مدت ختم ہو جانے کے بعد ، لیکن جو شخص کلمہ ہی نہیں پڑھتا یعنی  
اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہی تسلیم نہیں کرتا ، یا کلمہ پڑھ کر غدارمی کرتا ہے یا اللہ کی حاکمیت کے ساتھ ساتھ  
دوسروں کو بھی اس حاکمیت میں شریک کرتا ہے ۔ تو یہ صورتیں ایسی ہیں کہ ان کی موجودگی میں جنت میں  
جانے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا ، آیت اور حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ شرک کی موجودگی اور وفاداری



کے عہد کے فقدان کی صورت میں دخولِ جنت ناممکن ہے اور توحیدِ خالص اور وفاداری کے عہد کی موجودگی میں گنہ گار کا جنت میں جانا ممکن ہے، معافی کے بعد یا سزا بھگتنے کے بعد، اب اس حدیث کی تائیدِ مزید میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سنیے:-

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَلْبَسُوا بِالْجَنَّةِ (حَمَّ السَّجْدَةِ: ۳۰) جنت کی بشارت سنو!

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف ”ربنا اللہ“ کہنے اور اسی پر تہمتے رہنے سے جنت مل جاتی ہے اور یہی حدیث کا مطلب ہے کہ صرف کلمہ پڑھنے اور اس پر تہمتے رہنے سے جنت مل جاتی ہے اگر آیت میں کچھ شرطیں محذوف ہیں تو وہی حدیث میں بھی ہوں گی اور اگر نہیں تو پھر جو اعتراض حدیث پر ہے وہی قرآن مجید پر ہوگا۔ اور اگر قرآن مجید پر اعتراض نہیں تو حدیث پر بھی نہ ہوگا۔

۵۔ فقہ و حدیث کے بغیر باقی تمام علوم ناپاک ہیں، سائنس گناہ اور کائنات میں غور کرنا کفر ہے“ (دوا سلام ص ۲۶۶، ۲۶۷)

**غلط فہمی**

ازالہ | یہ کسی ملا ہی نے کہا ہوگا، کوئی عالم ایسی بات نہیں کہتا۔

۶۔ دنیا کا سب سے بڑا عمل رات کے وقت کے دو نفل ہیں دُکعتین فی جوف الليل خیر من الدنيا وما فیہا“ رات کے وقت کے دو نفل دنیا

**غلط فہمی**

وما فیہا سے بہتر ہیں (دوا سلام ص ۲۶۷)

ازالہ | حدیث میں ان نفلوں کو دنیا و ما فیہا سے بہتر فرمایا گیا ہے یہ نہیں کہ اس سے بڑا کوئی عمل نہیں بہت سے اعمال ایسے ہیں جو دنیا و ما فیہا سے بہت بہتر ہیں، برق صاحب نے جو تفصیل کل کا صیغہ استعمال کیا ہے یہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے یہاں اعمال کی تفصیل کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ ان دونوں نفلوں کا مقابلہ دنیا و ما فیہا سے کیا گیا ہے، مطلب یہ کہ ان کا ثواب اتنا زیادہ ہے کہ ان کے سامنے دنیا و ما فیہا ہیچ ہیں۔

غلط فہمی | ”ہر نیکو خیرا خواہ وہ چنگیز ہو یا ہٹلر اگر ہم پر حکومت کر رہا ہے تو وہ ہمارا اولی الامر ہے اور اس کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔“

(دوا سلام ص ۲۶۷)

ازالہ | کسی ملا نے کہا ہوگا کوئی عالم ایسی بات نہیں کہتا۔



۸۔ ”خرقہ دنیا کا بہترین لباس ہے .... (حدیث) تم پشیم کا لباس پہنا کرو

کہ ایمان کی لذت اسی میں ہے۔“ (دوا سلام ص ۲۶۷)

یہ بھی کسی مُلا کی گھڑنت ہے کہ کسی عالم نے اس موضوع حدیث کو تسلیم نہیں کیا۔

۹۔ فلاں دعا ایک لاکھ حج اور لاکھ شہیدوں کا ثواب دلاتی ہے۔“

(دوا سلام ص ۲۶۷)

۱۰۔ ”مرشد بچڑے بغیر نجات ناممکن ہے۔“ (دوا سلام ص ۲۶۷)

۱۱۔ اللہ نے تمام اختیارات فلاں مردے کے حوالے کر دئے ہیں (دوا سلام ص ۲۶۷)

۱۲۔ یہ سب کسی مُلا کی گھڑنت ہے کسی عالم نے ایسا کبھی نہیں کہا۔

”حصولِ علم، صحیح حدیث کی رُوسے کسی اجر کا مستحق ہی نہیں۔“

(دوا سلام ص ۲۶۸)

ایسی کوئی حدیث نہیں ہے نہ برق صاحب نے اس حدیث کو نقل

فرمایا۔

”ہر مرض، ہر افتاد، اور ہر حادثہ کا علاج دعا سے کیا جاتا رہا“

(دوا سلام ص ۲۶۸)

مطلق دعا کا انکار قرآن مجید کا انکار ہے، تفصیل کے لئے اسی باب کے گذشتہ

صفحات ص ۳۶۷ تا ص ۳۶۸ ملاحظہ کیجیے

غور کرو کہ دنیا میں ہماری کیسی کیسی سلطنتیں قائم ہوئیں وہ امیہ جو سندھ

کے رنگ تانوں سے فرانس تک چھائے ہوئے تھے وہ عباسیہ جن کی ہیت

سے ایک عالم لڑتا تھا، وہ تیموری جن کی بجلیاں دہلی پر چمکیں تو قسطنطنیہ پر جاگرتی تھیں

(دوا سلام ص ۲۶۹)

برق صاحب جن لوگوں کا ذکر بڑے طعرات سے آپ نے کیا ہے یہ سب لوگ انہی احادیث

کے متوالے تھے لیکن باہمی ہمہ وہ تخت و تاج کے مالک تھے ہاں جب یہ غلط فہمی میں مبتلا

ہو گئے احادیث کی روح سے ناواقف ہو گئے اور بقول آپ کے عیاش ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان

کی داستان عظمت و جہت کو افسانہ بنا دیا کیونکہ اس میں حدیث کا کیا قصور ہے، اصلی حدیث والے

تو حکومت کرتے رہے۔

”حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ہمراہ ایک ہی سواری پر سوار تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص منہ سے لا الہ الا اللہ

**غلط فہمی**

**ازالہ**

**غلط فہمی**

**ازالہ**

**غلط فہمی**

**ازالہ**

**غلط فہمی**

**ازالہ**

**غلط فہمی**

**ازالہ**

**غلط فہمی**

**ازالہ**

**غلط فہمی**

**ازالہ**

**غلط فہمی**



کہے گا اس پر جہنم کو حرام کر دیا جائے گا، معاذ نے پوچھا کیا میں سب کو یہ بشارت سنا دوں، فرمایا کہ لوگ اس پر اعتماد کے سست ہو جائیں گے، چنانچہ معاذ نے مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی،  
(مسلم جلد ۲۵ ص ۲۰۵)

”معاذ نے تو مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی اور اس لئے اس زمانہ کے لوگ اس سستی اور کام چوری سے بچ گئے جس کا خطرہ حضورؐ نے فرمایا تھا لیکن اب ہم کیا کریں یہ حدیث گزشتہ ساڑھے تیرہ سو برس سے ہمارے سامنے ہے، کروڑوں مسلمانوں کو کابل بنا چکی ہے اور قیامت تک بناتی جائے گی کیا ہمارے علماء اس مرض کا علاج سوچیں گے۔“

(دوسرا سلام ص ۲۶۲)

**ازالہ** برق صاحب اس زمانہ کے لوگ تو اس لئے سستی سے بچ گئے کہ وہ اس حدیث سے ناواقف تھے لیکن کیا حضرت معاذ بھی سستی سے بچے تھے یا نہیں اگر بچے تھے تو پھر دوسرے بھی بچ سکتے ہیں بشرطیکہ حدیث کا مطلب وہ بالکل اسی طرح سمجھتے ہوں جس طرح حضرت معاذ سمجھتے تھے غلط مطلب نہ سمجھ بیٹھیں۔ اسی غلط فہمی کے انسداد کے لئے تو اس حدیث کی اشاعت عام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا تھا یعنی حدیث کا اصلی مطلب تو سستی اور کاہلی پیدا کرنا سبب نہیں تھا ہاں غلط فہمی اس سستی اور کاہلی کا سبب بن سکتی تھی، برق صاحب، پھر آپ نے یہ بھی سوچا کہ حضرت معاذ کی وفات کے بعد سے صد ہا سال تک مسلمانوں کی شوکت و حشمت کا ڈنکا بجتا رہا اس کی کیا وجہ ہے کیا یہ لوگ بھی اس حدیث سے ناواقف تھے۔ نہیں بلکہ یہ لوگ بھی حضرت معاذؓ کی طرح حدیث کے اصلی مطلب سے واقف تھے۔ باقی جواب کے لئے اسی باب میں اوپر لکھا جا چکا ہے نمبر ۴ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

## انتباہ

برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا، حدیث زیر بحث میں منہ سے ”لا اله الا اللہ“ کہنے کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ دل کی گواہی کا ذکر ہے اور صحیح مسلم کی دوسری روایتوں میں اس کی تصریح بھی ہے پھر برق صاحب نے حضرت عبادہ بن صامتؓ اور حضرت معاذؓ کی احادیث کے متن کو بھی گڑبگڑ دیا ہے حضرت معاذؓ کی حدیث کا متن بالکل دوسرا ہے، برق صاحب نے اسے نقل نہیں فرمایا بلکہ حضرت عبادہؓ کی حدیث کا متن حضرت معاذؓ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے۔

”اس حدیث کا مفہوم رسالت اور الوہیت کا زبانی اقرار تھا اور چونکہ زبانی اقرار کی اتنی بڑی جزا قوم کو بے عمل بنا سکتی تھی اس لئے آپ نے اس حدیث

**غلط فہمی**



بیان کرنے سے روک دیا تھا" (ص ۲۴)

**ازالہ** | حدیث کا اصلی مفہوم یہ نہیں تھا بلکہ دل سے گواہی دینا تھا حدیث کے الفاظ ہیں  
مَنْ شَهِدَ حَسْبُ نَفْسِهِ دَلِيلٌ فِيهِ اس کی صراحت موجود ہے،

ارشاد باری ہے :-

لَيْشَهِدَنَّ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُسْتَيَقِنًا

یعنی جو شخص لا الہ الا اللہ کی گواہی دے اور دل

بہا قلبہ (صحیح مسلم) سے اس پر یقین کرے۔

پھر دل سے اس پر یقین کر کے گواہی دینے کے تقاضے بھی اس میں شامل تھے کیونکہ لوگ اس کا مطلب غلط سمجھ کر اعمال چھوڑ دیتے اس لئے اس کی اشاعت کو روک دیا گیا اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ نہیں تھا کہ بے عمل آدمی جنت میں جائے گا، اور اگر یہی ہوتا تو پھر روکنے کا کیا معقد تھا؟ لہذا حدیث کا اصلی مطلب کلمہ پڑھ کر کلمہ کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔

**غلط فہمی** | ”ہمارے اس استدلال کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے، ایک مرتبہ  
حضرت ایک باغ میں تشریف فرما تھے کہ آپ کے پاس ابوہریرہ جا پہنچے، حضرت

نے فرمایا کہ جاؤ جو شخص ملے اسے یہ بشارت دے دو، کہ کلمہ پڑھنے والا داخل جنت ہوگا،

(دور اسلام ص ۲۴)

**ازالہ** | اس حدیث کے ترجمہ میں جگہ جگہ غلطیاں ہیں ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا، پھر اس حدیث میں  
مُسْتَيَقِنًا بِهَا قَلْبُهُ دل سے اس پر یقین ہو۔

کے الفاظ موجود ہیں لہذا یہ حدیث برق صاحب کے استدلال کی تائید نہیں کرتی، بلکہ تردید کرتی ہے  
مطلب اس حدیث کا بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوا، اس حدیث پر مفصل بحث باب اول  
میں ملاحظہ فرمائیں :-

**غلط فہمی** | ”حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرت کے پاس گیا آپ نے فرمایا  
ما من عبد قال لا اله الا الله

جب کوئی لا الہ الا اللہ کہتا ہے اور اس

اللا للہ ثم مات علی ذلک الادخل

کی موت اس عقیدہ پر ہو جاتی ہے تو وہ جنت

الجنة۔

میں چلا جاتا ہے الخ“ (دور اسلام ص ۲۴، ۲۵)

**ازالہ** | اس حدیث پر مفصل بحث اسی باب میں ۲ کی ذیل میں ص ۲۶۳ تا ۲۶۵  
پیر گزر چکی ہے۔

”ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ غماز، خائن، زانی، چور، بھوٹی قسمیں کھانیوالا

**غلط فہمی** | اور احسان جتانے والا اور غرور سے دامن گھسیٹ کر چلنے والا بھی بہشت



میں نہیں جائے گا، لیکن دوسری طرف ہمیں بتایا جاتا ہے اگرچہ اور زانی کلمہ پڑھتے رہیں  
تو وہ یقیناً بہشت میں جائیں گے، (دوسلام ص ۲۷۶)

**ازالہ** | برق صاحب احادیث میں سب کچھ ہے، جرموں کی سزا کا بھی بیان ہے اور ان کی معافی  
کا بھی ذکر ہے۔ اور یہ معافی کب ہو سکتی ہے اور کس حالت میں ہو سکتی ہے۔ اس کی

بھی تفصیل احادیث میں موجود ہے لہذا جب تک تمام احادیث کا علم حاصل نہ ہو کوئی شخص حقیقت تک  
بآسانی نہیں پہنچ سکتا، یہی قرآن مجید کا حال ہے، قرآن مجید کی بعض آیات سے اسی قسم کی غلط فہمی پیدا  
ہو سکتی ہے اس غلط فہمی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ اسلام کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا  
جائے اگر ایسا ہو جائے تو پھر یہ آیات و احادیث غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتیں۔ بعض جرموں کا تعلق  
اللہ تعالیٰ سے ہے بعض کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بھی ہے اور بندوں سے بھی، اول الذکر میں اگر شرک نہ  
ہو تو معافی کا امکان ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا عہد دل سے ادا کرتا ہو صرف زبان سے نہیں  
اور جب معافی کا امکان ہو تو پھر دخول جنت کا بھی امکان باقی رہتا ہے ہو خیر الذکر میں جب تک بندہ  
معاف نہ کرے نہ معافی کا امکان ہے نہ دخول جنت کا امکان، اور کیونکہ بندے کے معاف کرنے کا امکان  
بھی ہو سکتا ہے لہذا دخول جنت کا امکان بھی ہو سکتا ہے خیر صہ یہ ہوا کہ علاوہ شرک کے کوئی گناہ  
ایسا نہیں کہ اس کی وجہ سے جنت میں جانا ناممکن ہو جائے، دوسرے گناہ معاف بھی ہو سکتے ہیں اور ان  
کی سزا بھی مل سکتی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر جرم کی سزا برابر ہو اور اگر شرک کی سزا جو سب سے بڑا  
اور ناقابل معافی گناہ ہے ابدالاً بلو جہنم ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ دوسرے گناہوں کی سزا ابد الابد  
جہنم نہیں ہوگی اور ان گناہوں کی سزا جہنم کی ایک مسلم جنت میں داخل ہو جائے گا کسی حدیث کا یہ  
مطلب نہیں کہ جرموں کی سزا ہی نہیں ہوتا ہے اور ضرور ہے اور یہی سزائیں آپ کی نقل کردہ احادیث  
میں موجود ہیں یہ احادیث ہر جرم کی سزا بیان کرتی ہیں، لیکن یہ نہیں بتاتیں کہ مجرم سزا پا کر بھی جنت  
میں جائے گا یا نہیں دونوں احادیث اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں جرموں کی سزا بھی مقرر ہے یہ سزائیں بھی  
سکتی ہے اور سزا سے پہلے معافی بھی مل سکتی ہے عرض یہ کہ ہر مجرم (مشرک نہیں) کبھی نہ کبھی  
یقیناً جنت میں جائے گا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم گناہ کریں اور یہ سمجھیں کہ معاف ہو ہی جائے گا۔  
ہو سکتا ہے کہ ہمارا گناہ غلط ہو اور سزا جہنم پڑے اور سزا بھی ایسی کہ الامان والحفیظ، اس سزا  
کا تصور کرنے کے بعد ہم محض خوش فہمی کی بنا پر گناہ کرتے رہیں تو یہ عقل سے بعید ہے، کوئی صاحب  
عقل دہوش ایسا نہیں کرے گا کہ معافی کی امید ہو مگر وہ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دے اور  
خطرہ بھی ایسا کہ اس کے بیان سے روٹنے کھڑے ہوتے ہیں، بے عقل و نا سمجھ لوگ تو وہی ایسا کر  
سکتے ہیں لہذا ان کے سامنے ان کی عقل سے بالاتر چیز بیان ہی نہیں کرنی چاہیے ہی وجہ ہے



کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کس دنیا کس کے سامنے ان احادیث کو بیان کرنے سے روک دیا ہے۔

برق صاحب ان احادیث کو غلط فہمی کی وجہ سے وضعی سمجھتے ہیں حالانکہ مندرجہ ذیل آیات ان احادیث کی تائید کرتی ہیں، کیا انہیں بھی موضوع کہا جاسکتا ہے، اگر تشریح و تاویل سے دوسرا مطلب لیا جائے گا تو پھر وہی مطلب حقیقت میں حدیث کا بھی ہوگا اب آیات سنئے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا  
دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (النساء: ۱۱۶)

بے شک اللہ شرک کے علاوہ ہر گناہ جس کیلئے  
چاہے گا معاف کر دے گا۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ  
اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ  
أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَلْبَسُوا  
بِالْجَنَّةِ (طہ السجدہ: ۳۰)

بے شک جن لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا رب  
اللہ ہے اور پھر اسی پر جمے رہے تو ان پر فرشتے  
نازل ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نہ ڈرو نہ غمگین  
ہو اور جنت کی بشارت سنو۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں سوائے شرک کے، رہی توبہ، تو توبہ سے  
تو دوسرے گناہ کیا، شرک بھی معاف ہو سکتا ہے۔

دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ ”ربنا اللہ“ کہنے والا جنت میں جائے گا۔ اور یہی مطلب ہے  
اس حدیث کا کہ ”جس نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا جنت میں جائے گا“ یہ مزور ہے کہ ”ربنا اللہ“ کہنے کے  
بعد بھی چند شرائط ہیں جن کے بغیر صرف ”ربنا اللہ“ قابل قبول نہیں اور وہ سب اس قول کے تقاضے  
ہیں۔ اسی طرح لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے بھی چند تقاضے ہیں جن کے بغیر صرف ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ مفید نہیں  
مہر یہ بھی یاد رہے کہ کلمہ پڑھنے کے بعد بعض صورتیں ایسی بھی آجاتی ہیں کہ صرف کلمہ بھی کافی ہو جاتا  
ہے۔ مثلاً کوئی شخص مسلم ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ کسی فرزند کی ادائیگی کا وقت آئے وہ شہید کر دیا  
جاتا ہے یا اتفاقاً اپنی طبعی موت مر جاتا ہے تو وہ شخص قطعی جنتی ہے۔ لہذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جنت  
کی کبھی کلمہ ہے جس نے اسے پڑھ لیا وہ جنت میں جائے گا۔



# باب ۱۳

## لفظ مغفرت کی تحقیق

**غلط فہمی** | مغفرت کا ماخذ ”مغفر“ ہے جس کے معنی ہیں چھپانا اور ڈھانکنا، ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہوتا ہے، جو اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کوئی گناہ معاف نہیں ہو سکتا ہے، البتہ چھپ سکتا ہے۔

(دو اسلام ص ۲۷)

**ازالہ** | برق صاحب کسی لفظ کے ایک معنی تو لغوی ہوتے ہیں اور ایک اصطلاحی، اب یہ کام اہل زبان کا ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ کہاں وہ کسی لفظ کو اصطلاحی معنی میں استعمال کرتے ہیں اور کہاں لغوی معنی میں اور جہاں وہ کسی لفظ کو اصطلاحی معنی میں استعمال کرتے ہیں وہاں اس لفظ کے لغوی معنی لینا صحیح نہیں، مثلاً۔

(۱) ”میں کیلا کھارہا ہوں“ اس جملہ میں ”کھارہا ہوں“ اپنے اصلی اور لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن اس جملہ میں، کہ

(۲) ”میرا سر ہچک کھارہا ہے“ ”کھارہا ہے“ اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے اس لئے کہ نہ سر کھاتا ہے، نہ ”چکر“ کوئی مادی چیز ہے، جسے کھایا جاسکے لہذا دوسرے جملہ میں ”کھانا“ کے لغوی معنی لینا کسی طرح ٹھیک نہیں، بالکل یہی حالت لفظ مغفرت کی ہے، اصطلاحی طور پر یہ لفظ معافی کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے اور اب یہی اس کے عام فہم معنی ہیں اور اگر اس کے لغوی معنی پر ہی اصرار کیا جائے ”یعنی ڈھانک دینا“ تو بھی مراد وہی ہے کہ کسی گناہ کو ڈھانک دیا گیا یعنی اب اس کے متعلق کوئی پوچھ کچھ نہیں ہوگی، اور اس لحاظ سے یہ معافی ہی کے مترادف ہوا۔

برق صاحب کا خیال ہے کہ گناہ معاف نہیں ہوتا اور اس سلسلہ میں انہوں نے چند مثالیں دی ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں



(۱) ”سینکڑوں ایسے صحابہ ہو گزرے ہیں جنہوں نے آغاز میں حضور کی مخالفت کی ...  
لیکن بعد میں حلقہ گوش اسلام بن گئے اور ان کے پچھلے گناہ اس نئے عمل کے چھپے

چھپ گئے“ (دو اسلام ص ۲۷۹)

برق صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی، کسی گناہ کا نتیجہ ہی نہیں کہ زمانہ حال میں واقع ہو وہ نتیجہ مستقبل میں بھی واقع ہو سکتا ہے جس زمانہ میں صحابہ کافر تھے گناہ کرتے تھے، ہو سکتا ہے کہ ان کو اس گناہ کی سزا مل گئی ہو اور بہت ممکن ہے کہ نہ بھی ملی ہو اور ظاہر یہی ہے کہ اکثر صحابہ کو ان کے کفر کے زمانہ میں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ خیر بحث اس سے نہیں کہ زمانہ ماضی میں کیا ہوا سوال یہ ہے کہ آیا زمانہ مستقبل میں بھی اس گناہ کی کوئی سزا مقرر ہے یا نہیں اگر ہے تو اس سزا کو ضرور اس کا یا عمل چھپا دے گا اور یہ معافی نہیں تو اور کیا ہے، یہ کس نے کہا کہ زمانہ ماضی میں جو سزا اسے مل چکی ہے وہ معاف ہو جائے گی، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ زمانہ مستقبل میں جو عذاب آنے والا ہے وہ مل جائے گا۔  
دوسری مثال برق صاحب یہ دیتے ہیں۔

”فرض کیجئے کہ ایک نوجوان کسی عادت بد میں مبتلا ہو کر صحت کا جنازہ نکال لیتا ہے پھر دفعۃً سنبھل جاتا ہے صحیح الجسم نوجوان بن جاتا ہے اس نے گویا تلافی یافت کر لی اور اس کے پچھلے گناہ چھپ گئے اس کا مطلب یہ گزیرہ نہیں کہ سنبھلا گناہ معاف ہو گیا ہے اس نے ایک گناہ کیا اور اس کی باقاعدہ سزا بھگتی، برسوں کمزوری اور بری صحبت کا شکار رہا، عام نفرت کا نشانہ بنا۔ یہی اس گناہ کی سزا تھی جو وہ بھگت چکا اب اسے نیک اعمال کا صلہ مل رہا ہے“ (دو اسلام ص ۲۷۹-۲۸۰)

برق صاحب نے پھر وہی بات دہرائی ہے کہ ماضی میں وہ سزا بھگت چکا، سوال یہ ہے کہ اگر کچھ عرصہ اور وہ اپنی بری عادتوں کو جاری رکھتا تو کیا وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو جاتا، جس سے نجات ناممکن ہو جاتی اور اگر ایسی حالت میں وہ اپنی بری عادت کو چھوڑ بھی دیتا تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا، کیا یہ ترک بد عملی اس کو فائدہ پہنچاتی؟ نہیں بلکہ اس کی وہ بری عادت مستقبل میں بھی اس کے لئے عذاب بن جاتی اب بتائیے کہ اس مرحلہ تک پہنچنے سے پہلے اگر وہ تائب ہو گیا اور اپنی صحت کو ٹھیک کر لیا تو وہ مستقبل میں آنے والی اور نہ ٹلنے والی مصیبت سے بچ گیا۔ اس مستقبل میں آنے والی مصیبت کی طرف اس کے قدم اٹھ چکے تھے اور اس مصیبت کی عمارت کی بنیاد وہ رکھ چکا تھا لیکن اس کے سنبھل جانے کی وجہ سے یہ بنیاد بے کار کر دی گئی اور مستقبل کی ساری مصیبتیں ٹل گئیں۔ لہذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا گناہ معاف ہو گیا تو اس کے ہی معنی ہوتے ہیں کہ مستقبل میں آنے والا عذاب معاف ہو گیا نہ کہ ماضی میں گذرا ہوا عذاب، برق صاحب ہمارا مطلب ہی نہ سمجھے، لہذا انہیں اعتراض



کرنا پڑا۔ غرض یہ کہ اگر کوئی شخص گناہ کرتا ہے اور اپنی زندگی میں اس سے توبہ کر کے نیک عمل کر لیتا ہے تو اس گناہ کی آنے والی سزا معاف ہو جائے گی۔ ہاں اگر وہ موت کے مرحلہ تک پہنچ گیا تو پھر نیک عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور تلافیِ مافات کی گنجائش نہیں رہتی، لہذا توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اب رہی یہ بات کہ کیا گناہ معاف ہوتا ہے یا نہیں، تو خود قرآن مجید اس پر شاہد ہے کہ گناہ معاف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ  
(الشوریٰ ۱-۳۰)

جو مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اور بہت سے گناہ تو وہ معاف ہی کر دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض گناہوں کی سزا مل جاتی ہے اور بہت سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ان کی کوئی سزا ہی نہیں ملتی، نہ ماضی میں نہ مستقبل میں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:-

أَوْ يُوَفُّهُمْ بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ  
(الشوریٰ ۱-۳۲)

اللہ یہ تو کر سکتا ہے کہ یا تو ان کے گناہ کی سزا میں انہیں تباہ کر دے یا یہ کہ بہت سے گناہ معاف کر دے۔

قرآن مجید میں مقدم مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ”عَفْوٌ“ کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی ”معاف کرنے والا“ لہذا اس اسمِ گرامی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کر دے اور یہی حقیقت بھی ہے کہ وہ معاف کرتا رہتا ہے۔

**غلط فہمی**  
سینکڑوں ایسے صحابہ ہو گزرے ہیں جنہوں نے آغاز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، تکلیفیں دیں اور آپ پر چڑھائی کی، لیکن بعد میں حلقہ بگوش اسلام بن گئے اور ان کے پچھلے گناہ اس نیک عمل کے پیچھے چھپ گئے، (دو اسلام ص ۲۶۹)

**ازالہ**  
یہ تو تسلیم ہے کہ ان کے بڑے اعمال نیک، اعمال کے پیچھے چھپ گئے لیکن سوال یہ ہے کہ ان بڑے اعمال کی سزا انہیں ملی یا نہیں۔ اگر نہیں ملی تو کیا دوزخ میں ان کو جانا پڑے گا اور اگر مل گئی تو کیا ملی؟ اگر آپ فرمائیں کہ وہ نادام ہوئے اور اسلام قبول کر لیا، بس یہ ندامت ہی ان کی سزا ہو گئی تو یہ قطعاً تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اتنے بڑے بڑے گناہ کریں، صحابہ کو قتل کریں اور تکلیفیں پہنچائیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچائیں، بازارِ طائف میں آپ پر پتھر کی بارش کریں، پھر زنا کرتے ہوئے، شراب پیتے ہوئے میدانِ کارزار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل پہنچ جائیں اور سزا انہیں کیا ملے، صرف ندامت کیا اسے خلافِ عقل نہ کہیں گے ہرگز صاحب



کیا یہ قرآن مجید کے خلاف نہیں؟ قرآن مجید تو کہتا ہے۔

وَمَنْ يَقتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَاِجْرًا آتٰهُ

جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (النساء: ۹۳) درزخ میں رہے گا۔

بتائیے ایک شخص تو اس جرم میں ابدالآباد جہنم میں جلتا رہے اور دوسرا شخص اسی جرم میں صرف ندامت کے بعد بھڑکھڑا پالے کیا یہ نا انصافی نہیں؟ اگر ان سواہ کا گناہ یعنی مومن کو قتل کرنا معاف نہیں ہوا تو پھر لازماً ان کو وہی سزا مہلکتی چاہیے جو قرآنی قوانین کے تحت مقرر ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کے لئے ندامت اور کسی کے لئے ابدالآباد جہنم کا عذاب، یہ تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے توبہ کر لی، گناہ معاف ہو گیا لیکن یہ نہیں ہو سکتا (بقول آپ کے) گناہ تو معاف نہیں ہوا لیکن سزا معاف ہو گئی۔ حیرت ہے کہ آپ ایک شخص کے حق میں صرف ندامت کو سزا سمجھ لیں اور دوسرے کے حق میں ابدالآباد جہنم، بات درحقیقت یہ ہے کہ ندامت تو کوئی سزا ہی نہیں، اصل سزا تو وہی جہنم کی سزا ہے اور وہ معاف ہو گئی لہذا یہ کہنا صحیح ہے کہ گناہ معاف ہو گیا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

## غلط فہمی

حضرت عثمان نے چید آدمیوں کو وضو کا طریقہ بتا کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی

طرح وضو کیا کرتے تھے، جو شخص اس طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے اس کے تمام اگلے اور پیچھے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کرنے کے بعد وضو کر کے دو رکعت پڑھ لے تو گناہ معاف، یا کوئی طالب العلم سال بھر کام نہ کرے اور آخر میں دو رکعت نماز پڑھ لے سستی کا گناہ معاف، اور وہ پاس، یا کوئی شخص درخت سے کود کر ٹانگیں تڑولے اور فوراً دو رکعت نفل پڑھے تو گناہ معاف اور ٹانگیں واپس (در اسلام ص ۲۸۲)

برق صاحب نہ تو حدیث کو سمجھے، نہ اپنی مثالوں کو، یہ مثالیں اس حدیث پر

## ازالہ

چپاں نہیں ہو سکتیں۔ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں، کبیرہ اور صغیرہ، اور یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں نہ کہ کبیرہ۔ (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیے)

پھر ایک اور لحاظ سے بھی گناہ کی دو قسمیں ہیں ایک صرف اللہ کا گناہ، دوسرے اللہ کے گناہ کے ساتھ بندہ کا گناہ، پہلا گناہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے کہ اسے چاہے تو معاف کر دے، اور چاہے تو اس کی سزا دے۔ مثلاً جب کبھی آپ سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو آپ فوراً یا کچھ دیر بعد اس سے معافی مانگ لیتے ہیں اور وہ معاف کر دیتا ہے تو اس معافی میں کوئی اشکال نہیں



نہ کوئی چھپیگی ہے نہ وہ مثالیں اس معافی کے معافی ہیں جن کو برق صاحب نے اوپر نقل فرمایا ہے۔  
(تفصیل کے لئے باب ۱۲ ملاحظہ فرمائیں) برخلاف اس کے دوسرا گناہ صرف اللہ کا گناہ نہیں بلکہ بندے کا بھی گناہ ہے، لہذا یہ گناہ معاف نہیں ہوتا جب تک بندہ معاف نہ کرے۔ یہ ہے اس قسم کی تمام احادیث کا خلاصہ۔

باپ کو قتل کرنا، باپ کا جرم ہے، باپ کے عزیز و اقارب کا جرم ہے پھر یہ کبیرہ گناہ ہے لہذا بہرہ و صورت اس کے معاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کوئی طالب علم سال بھر کام نہ کرے تو اس نے اپنا سال ضائع کر دیا اب اگر وہ اپنی کاہلی پر نادام ہو جائے اور دوسرے سال محنت کرے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے مستقبل میں اس کے لئے سہولتوں کا امکان ہے لیکن ایک سال کا جو نقصان ہو چکا وہ ایسی سزا ہے جو ماضی میں اسے مل چکی اور جو سزا مل چکی اس کے معاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی مانگیں توڑ ڈالے تو اس کو اپنے غلط کام کی سزا مل چکی اور جو سزا مل چکی اس کی معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم کہتے ہیں کہ آنے والی سزا معاف ہوتی ہے، برق صاحب زمانہ ماضی کی سزاؤں کو بیچ میں لے آتے ہیں حالانکہ ان سے تو ہم بحث ہی نہیں کرتے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی چیز مشکل نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے، اگر وہ بندے کے گناہ معاف کرنے کا ارادہ ہی کرے تو پھر کیا چیز مانع ہو سکتی ہے، باپ کے اعزہ و اقارب بھی معاف کر سکتے ہیں اللہ تعالیٰ باپ کو بھی معافی دینے پر راضی کر سکتا ہے۔ جب اس نے خود قرآن مجید میں وعدہ فرمایا ہے کہ سوائے شرک کے وہ ہر گناہ کو معاف کر دے گا، تو پھر کیا امر مانع ہے، کہ باپ کا قتل مناف نہ ہو سکے اور یہ اس کی عادت اور قانون کے بھی خلاف نہیں، اس لئے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کو معاف کرنے کا قانون قرآن مجید میں موجود ہے۔

طالب علم ناکام ہوا اس نے سزا جھگت لی اگر سزا سے پہلے یعنی دوسرے الفاظ میں امتحان سے پہلے دعا کرتا تو بے شک اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ اس کے لئے کامیابی کا سبب پیدا کر دیتا لیکن امتحان ہو چکا، سزا مل چکی اب دوسرے کے در رکعت پڑھنا کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ یعنی میدان محشر میں امتحان ہو چکا، سزا مل گئی اور اب دوزخ میں پہنچ کر کوئی شخص معافی مانگے تو بے فائدہ ہے۔

برق صاحب ہم کہتے ہیں کہ زندگی میں معافی مانگے اور آپ مثالیں ایسی دیتے ہیں کہ گویا مجرم دوزخ میں جا کر معافی مانگے، ظاہر ہے کہ دوزخ میں پہنچ کر معافی نہیں ہو سکتی اور ہم اس میں آپ سے متفق ہیں لیکن زندگی میں نیک اعمال کے صلہ میں معافی ہو سکتی ہے ہم کہتے ہیں کہ امتحان سے پہلے محنت کرے اور آپ ہمیں الزام دیتے ہیں کہ امتحان کے بعد محنت کرے، حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے ہمیں الزام



ریتے رقت براہِ کرم اس فرق کو تو ملحوظ رکھ لیا ہوتا۔

## مزید گزارش

برق صاحب فرماتے ہیں:-

”معفرت کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں اول اس گناہ سے بچنا، دوم تلافی مانا

کے لئے صحیح اور نظری کوشش“ (دوا سلام ص ۲۸)

برق صاحب! ہمیں آپ سے اتفاق ہے اب یہ بتائیے کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کر کے آئندہ اس گناہ سے بچے تو ایک شرط تو معفرت کی پوری ہو گئی۔ اب اگر وہ دس نوکر کے دو رکعت نماز ادا کر لے تو یہ ایک نیک عمل ہوا، اور نیک عمل کے پیچھے بقول آپ کے پچھلے گناہ چھپ جایا کرتے ہیں لہذا یہ نیک عمل اس گناہ کو چھپائے گا۔ یہ نیک عمل اس بات کی ایک صحیح اور نظری کوشش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو جائے اور گویا یہ تلافی مانا کا کام کرے گا۔ لہذا دونوں شرطیں پوری ہو گئیں۔ بتائیے اب بھی گناہ معاف ہوگا یا نہیں؟ یہ ہے حدیث کا مطلب! قرآن مجید تو اس سے بھی زیادہ عجیب بات کہتا ہے، سنئے:

فَرَلُوْا حَظٰٓةً مِّنْ غَفٰرٍ لَّكُمْ خَطُٰٓٔ الْاٰلِہٖ

تم خطہ کہو تو تمہارے گناہ معاف

کر دیں گے۔

(البقرہ: ۵۸)

اگر صرف خطہ (یا استغفر اللہ) کہنے سے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں تو دو رکعت نماز سے کیوں نہ معاف ہوں گے اور اگر کوئی تاویل یہاں چل سکتی ہے تو پھر وہی تاویل حدیث میں کیوں نہیں چل سکتی۔

## حدیث کا صحیح مفہوم

ایک آدمی دس نوکر نے بیٹھتا ہے، وہ دس نوکیوں کر رہا ہے؟ اس سے پہلے وہ کس مشغلہ میں تھا اسے کیوں چھوڑا، اپنے وقت عزیز کو وضو میں کیوں صرف کیا؟ کس چیز نے اس کو تمام کاروبار اور حرام سے روک دیا اور دفعۃً رک دیا؟ اب یہ تصور رہے جو اس کے ذہن میں آتا ہے وہ سوچتا ہے کہ میں بندہ ہوں میرا کوئی مالک ہے میں مخلوق ہوں میرا کوئی خالق ہے، یہ وضو میں اس کے حکم سے کر رہا ہوں۔ اس کو راضی کرنے کے لئے کر رہا ہوں۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس سے پہلے میں فلاں گناہ کر کے لئے ناراض ہو چکا ہوں حالانکہ اس وقت بھی میں اس کا بندہ تھا، وہ میرا قاتل تھا، مجھ سے کہا کہ میں نے پہلے اپنے خالق کو ناراض کیا، اب ندامت کا تصور پیدا ہوتا ہے وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور دو رکعت نماز ادا کر



اپنے مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، رحمتِ الہی جوش میں آتی ہے اور اس نادم بندے کو ڈھانک لیتی ہے، یہ ہے حدیث کا مطلب، غالباً آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا اور صرف یہی حدیث نہیں بلکہ اس قسم کی جتنی احادیث آپ نے نقل فرمائی ہیں سب سمجھ میں آجائیں گی۔

ہر نیکی انابت الی اللہ کا جذبہ پیدا کرتی ہے اس نیکی کی ادائیگی کے وقت بندے کو محسوس ہوتا ہے کہ میں کہاں ہوں، کیا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیئے یہ نیکی میں کس کے حکم سے کر رہا ہوں، کس کے فرمان سے کر رہا ہوں، کس کو خوش کرنے کے لئے کر رہا ہوں اس کو میں نے پہلے ناراض تو نہیں کیا ہے، اگر کیا ہے تو یہ مجھ سے اچھا ہوا یا برا ہوا، یہ تصورات اس کی کایا لپٹ دیتے ہیں اور اس کی برائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور چہرہ ایک نیک اور صالح انسان کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ احادیث میں جگہ جگہ نیکیوں کی ترغیب دی گئی ہے بظاہر وہ نیکی اس قابل نہیں کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو سکے لیکن اس کے یہ ذہنی تصورات اور چہرہ ذہنی تبدیلی، گناہ سے نفرت، یہ ہے وہ چیز جو اس نیکی نے پیدا کی، لہذا مغفرت کا اصلی سبب وہ نیکی ہی بنی، اس نیکی ہی نے اس کو دوسری طرف موڑ دیا اور اب وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہے، نیکی سے یہ تصور پیدا ہونا، گناہوں کا چھوڑنا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ  
وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۱-۲۵)

بے شک نماز بے حیائی اور تمام برے کاموں سے روکتی ہے۔

اب اگر کسی نمازی کی برائیاں دور نہ ہوں تو یہ اس کا قصور ہے کہ اس نے ایک نیک عمل تو کیا، لیکن اپنے ذہن کو نہیں بدلا۔ نماز پڑھتے وقت اس نے نہیں سوچا کہ وہ کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے جس وجہ سے وہ یہ کام کر رہا ہے کیا اس وجہ سے فلاں کام نہیں کرنا چاہیئے فلاں کام نہیں چھوڑنا چاہیئے یہ تصورات اس کے ذہن میں نہیں آئے اس کی نماز نے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، لہذا برائیاں دور نہ ہوئیں، اس میں نماز کا کوئی قصور نہیں نہ آیتِ قرآنی کا قصور ہے یہی حال ان تمام نیکیوں کا ہے جو احادیث میں بیان ہوئی ہیں اور جن میں مغفرتِ ذنوب کا تذکرہ ہے اگر ان نیکیوں کو کرنے کے بعد بھی نیکی کرنے والا برائیاں کرتا رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، نہ وہ تصورات آئے جو آنے چاہیئے تھے لہذا اس کو اس نیکی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اس میں نہ حدیث کا قصور ہے نہ اس نیکی کا قصور ہے، بلکہ اس نیکی کے طریقہ ادائیگی کا قصور ہے اس کی نیکی ان تصورات سے خالی رہی جو مغفرتِ ذنوب کا ذریعہ ہیں لہذا مغفرت نہ ہو سکی۔

برق صاحب حدیث کا مطلب تو اب سمجھ میں آگیا ہوگا اگرچہ قرآن مجید تو بغیر نیکی کے بھی مغفرتِ ذنوب کی خوش خبری سناتا ہے اور یہ آیات اس باب میں اور اس باب سے پہلے باب (۱۲) میں نقل ہو چکی ہیں



اگر بغیر نیکی کے بہت سے گناہ معاف ہو جایا کرتے ہیں تو پھر نیکی سے معاف ہو جانا کیا بعید ہے لہذا حدیث زیر بحث اعتراض سے بالکل پاک و صاف ہے، حدیث اپنی جگہ پر صحیح ہے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جب چاہے اور جس ذریعہ سے چاہے گناہ کو معاف کر دے حدیث کو سمجھنے کے لئے قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے ورنہ قدم قدم پر غلط فہمی سے سابقہ پڑتا ہے، مغفرتِ ذنوب پر ایک اور زاویہ سے بھی ہم بحث کر چکے ہیں براہِ کرم باب اول ملاحظہ فرمائیے۔

گناہوں کا کتنا عجیب علاج بتایا ہے کہ قتل کرو، لامحذور و قتل معاف،

**غلط فہمی**

اب خیر سے ہمارے علماء چلا رہے ہیں کہ پاکستان میں شریعت نافذ کرو، اگر اس طرح کی شریعت جاری ہو گئی تو پہلے ہی دن قیامت آجائے گی اس لئے کہ ہر آدمی قتل و زنا کے بعد مٹھ پاؤں دھو لے گا اور سزا سے بچ جائے گا (دوا سلام ص ۲۸۴)

اللہ تعالیٰ گناہ سے بیزار ہے لہذا اس کے سزا باب کے لئے کچھ طریقے اختیار کرتا ہے، پہلا طریقہ ہے ”دوزخ کے عذاب سے ڈرانا“ دوسرا طریقہ ہے ”نیکیوں کے ذریعہ مجرم میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا“ تیسرا طریقہ ہے ”سزا دینا“ کیونکہ پہلے دونوں طریقے ہر حالت میں کارگر نہیں ہوتے اس لئے بعض گناہوں کے روکنے کے لئے تیسرا ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے اور کچھ سزائیں دی جاتی ہیں تاکہ ان سزاؤں کے خوف سے وہ آئندہ گناہ کا مرتکب نہ ہو، یہ تیسرا طریقہ ایک اور وجہ سے بھی ضروری ہے وہ یہ کہ پہلے دو طریقوں سے صرف مجرم کی اصلاح کا امکان ہوتا ہے لیکن تیسرے طریقہ سے دوسروں کی بھی اصلاح ہوتی ہے ان کو عبرت ہوتی ہے، اور پھر ان کو اس جرم کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

تیسرا طریقہ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ بعض گناہوں سے دوسرے انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور جب تک ان کی حق تلفی دور نہ ہو، جرم کی معافی کوئی معنی نہیں رکھتی، لہذا اس حق تلفی کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ حق، حق والے کو مل جائے یا حق والا حق تلف کرنے والے کو سزا دلوں اور اپنا دل مٹھڈا کرے اور اپنے مشغول جذبات کو بھادے ورنہ پھر ایک اور جرم کا امکان باقی رہ جاتا ہے۔ بلکہ اس سلسلہ میں جرائم کا ایک لامحدود سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جو نسل بعد نسل جاری رہتا ہے برق صاحب تو یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ معاف ہی نہیں ہوتا، سزا مل کر ہی رہتی ہے ہم پوچھتے ہیں دو آدمی قتل کرتے ہیں ایک مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیتے ہیں دوسرے مقتول کے ورثا قاتل کو قتل کر دیتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں قرآن مجید سے ثابت ہیں تو پھر یہ بتائیے کہ اس دوسرے قاتل کو سزا مل گئی لیکن پہلے قاتل کو سزا کہاں ملی؟ دونوں برابر کے مجرم تھے ایک کو سزا نہیں ملی دوسرے کو ملی آپ یہ کہیں گے کہ اسے ندامت ہوئی ہم کہتے ہیں کیا خبر ندامت بھی ہوئی یا نہیں ورنہ انہوں نے اپنی طرف سے خود ہی معاف کر دیا



اور اگر بالفرض ندامت بھی ہوئی، رسوائی بھی ہوئی تو یہ بتائیے کہ ایک ہی جرم کی سزا مختلف کیوں؟ ایک کو ضرر ندامت و رسوائی کی سزا، دوسرے کو ندامت و رسوائی کے ساتھ قتل کی سزا پس ثابت ہوا کہ جرم ہو سکتا ہے اور معافی بھی مل سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جرم کی سزا مل کر ہی رہے جب انسانوں میں یہ صفت پائی جاتی ہے کہ وہ معاف کر کے خوش ہوتے ہیں اور یہ ایک نفسیاتی چیز ہے تو پھر ارحم الراحمین عَفُوٌّ غَفُورٌ معاف کر کے خوش کیوں نہ ہوگا۔ برقی صاحب کیوں اللہ تعالیٰ کو آپ غضب کا مجسمہ سمجھتے ہیں کہ وہ گناہ کو معاف کرتا ہی نہیں اس کو اس وقت تک چین ہی نہیں آتا جب تک وہ سزا نہ دے لے یہ سراسر اس کی رحمت سے ناامید ہونے کی مثال ہے وہ فرماتا ہے:-

اے میرے گناہگار بندو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دے گا۔ بے شک وہ غفور ہے، رحیم ہے۔

يُعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ  
أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ  
إِنَّ اللَّهَ يَخْفِي الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ  
هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝

(الزمر: ۵۳)

انسانوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

جو صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ بڑے عزم اور حوصلے کا کام ہے۔

وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ  
لِأَمْرٍ عَظِيمٍ ۝

(الشوریٰ: ۴۲)

دوسری جگہ متقین کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

متقی وہ لوگ ہیں جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ چیز خوش قسمت لوگوں کو ہی ملا کرتی ہے۔

وَالكَافِرِينَ الْغِيَظُ وَالْعَافِينَ  
عَنِ النَّاسِ ۚ (ال عمران: ۱۳۲)  
وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝  
(الحج السجدة: ۳۵)

اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم دیتا ہے:-

آپ انہیں معاف کرو یا کریں اور ان کے لئے مغفرت طلب کیا کریں۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ  
(ال عمران: ۱۵۹)

جب معافی کی صفت اللہ تعالیٰ اپنے رسول میں دکھینا چاہتا ہے، اپنے بندوں میں دکھینا چاہتا ہے، اس صفت کو وہ پسند کرتا ہے تو وہ خود ارحم الراحمین ہو کر اس صفت سے متصف نہ ہو یہ ناممکن ہے نہ یہ اس کے شایان شان ہے بلکہ وہ ضرور معاف کرتا ہے، معاف کرتا رہتا ہے اور معاف کرنے کو



پسند کرتا ہے جیسا کہ ہم پہلے آیات قرآنی سے ثابت کر چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو یہ دعا سکھائی ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفِ لَنَا  
ہمیں معاف فرما، ہماری معفرت فرما۔  
(البقرہ: ۲۸۶)

اگر اللہ تعالیٰ معاف ہی نہیں کرتا تو معافی مانگنے کا حکم کیوں دیتا ہے، معافی مانگنے کا حکم دینے سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ کو معاف کرتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دعا کی بھی کوئی حقیقت ہے، دعا سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اگر دعا کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کیوں فرماتا کہ یہ دعا مانگو اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد دعاؤں کی تعلیم دی گئی ہے، لہذا دعا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور دعا مطلب برآری اور گناہوں کی معافی کے لئے ضرور اثر رکھتی ہے۔



# باب ۱۲

## مسئلہ شفاعت

”قرآن مجید کے طول و عرض میں کہیں مذکور نہیں کہ آنحضرت صلعم محشر میں شفاعت کریں گے“ (ص ۲۸۵)

**غلط فہمی**

قرآن مجید میں مقام شفاعت کا ذکر موجود ہے، ارشاد باری ہے۔  
 عَسَىٰ اَنْ يَّجْعَلَ لَّكَ رَبُّكَ  
 مَقَامًا مَّحْمُودًا ۝

ربّی اسرائیل :- (۷۹)

یہ مقام محمود ہی تو مقام شفاعت ہے :-

”البتہ دنیا میں استغفار کا ذکر ضرور ہے، اگر یہ لوگ مغفرت طلب کریں اور رسولؐ بھی ان کے لئے مغفرت مانگے تو پھر یہ اللہ کو تواب و رحیم

**غلط فہمی**

پائیں گے“ (قرآن)

”مطلب یہ کہ جو لوگ تلافی مافات کے لئے کمر بستہ ہو جائیں اور حضور ان کی

رہبری فرمائیں تو ان کے پچھلے گناہ چھپ جائیں گے“ (دو اسلام ص ۲۵۸)

استغفار کے معنی رہبری کرنا یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ معنی قطعاً صحیح نہیں اس

سے پہلے برق صاحب نے استغفار کے معنی چھپانے کے کئے ہیں (دو اسلام ص ۲۶۹)

**ازالہ**

معلوم نہیں کہ کون سے معنی صحیح ہیں؟ اچھا برق صاحب یہ تو بتائیے کہ وہ تلافی مافات بھی کسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی رہبری بھی فرمائیں لیکن گناہ پھر بھی معاف نہ ہو، سزا مل کر ہی رہے تو پھر تلافی مافات کا نتیجہ کیا ہے۔ تلافی مافات سے آئندہ کی اصلاح ہو گئی گذشتہ گناہ کے لئے وہ تلافی کوئی فائدہ نہیں دے گی لوگ تو خیر پچھلے گناہ بھول جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ تو گناہ بھول بھی نہیں سکتا



اس سے کوئی چیز چھپ بھی نہیں سکتی ہو بقول آپ کے سزا بھی ضرور دیتا ہے لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ گناہ چھپ سکے نہ سزا ہی سے بچ سکے۔ یہ ہیں معفرت کے لغوی معنی اختیار کرنے کا نتیجہ۔

”اس مضمون کے علاوہ شفاعت کا کوئی اور تخیل قرآن میں موجود نہیں بلکہ عدم شفاعت پر جا بجا اشارے ملتے ہیں“ (دوا سلام ص ۲۸۵)

**غلط فہمی**

برق صاحب آپ نے صرف وہ آیتیں ہی لکھی ہیں جن میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے لیکن وہ آیتیں تحریر نہیں فرمائیں، جن میں ایک شرط کے ساتھ شفاعت کا ثبوت ملتا ہے اور وہ شرط ہے ”اِذْنِ الْهٰی“ ارشاد باری ہے:-

۱۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَکَ

اِلَّا بِاِذْنِہٖ (البقرہ: ۲۵۵) کون ہے جو اللہ کے ہاں سفارش کر سکے مگر اس کی اجازت سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کلیۃ شفاعت کی نفی نہیں ہے بلکہ اس شفاعت کی نفی ہے جو بغیر اجازت کے ہو، اس سلسلہ میں برق صاحب نے جو آیت پیش کی ہے وہ مع ترجمہ درج ذیل ہے:-

وَاتَّقُوا یَوْمًا لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ

عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْہَا

شَفَاعَةٌ اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص اپنے آپ کو پیش کر کے دوسرے کو نہیں بچا سکے گا۔

جب کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔

(دوا سلام ص ۲۸۵)

برق صاحب نے ”وَلَا یُقْبَلُ مِنْہَا شَفَاعَةٌ“ کا ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”انسان کی طرف سے کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی“، یعنی کوئی شخص چاہے کہ میں کسی کو اپنا سفارشی خود بنا لوں تو نہیں بنا سکتا۔ اس قسم کی شفاعت اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں ہوگی کہ مجرم خود کسی کو شفیع بنا کر لائے اور پھر اس کی سفارش کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے شفیع بنانے یا نہ بنانے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:-

قُلْ لِلّٰہِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا

کہہ دیجئے، تمام سفارشوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

(الزمر: ۲۴)

دوسری آیت میں اس سے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ شفاعت کا ثبوت ملتا ہے۔

۲۔ یَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ

اِلَّا مَنْ اِذْنٌ لِّہِ التَّحْمِیْنِ وَرَضِیَ

لَہٗ قَوْلًا قیامت کے دن شفاعت نفع نہیں دے گی مگر ہاں اس شخص کو نفع دے گی جس کے لئے رحمن کی طرف سے سفارش کی اجازت مل جائے اور حرج



(طہ ۱۰۹)

اس کے لئے سفارش کو پسند فرمائے۔

تیسری آیت ملاحظہ فرمائیے:-

لَا يُمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ  
عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۝وہاں لوگوں کو شفاعت کا اختیار نہیں ہوگا  
مگر ہاں جس نے رحمان سے کوئی عہد  
لے لیا ہو۔

(مہم ۸۷)

چوتھی آیت ملاحظہ فرمائیے:-

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ ۝

مکرم بندے بھی کسی کی سفارش نہیں کر سکتے  
مگر جس کے لئے اللہ کی رضا ہو۔

(الانبیاء ۲۸)

پانچویں آیت ملاحظہ فرمائیے:-

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ

اللہ کے ہاں شفاعت نفع نہیں دے گی مگر اس  
کو جس کے لئے اللہ کی اجازت ہو۔

(سبا ۲۳)

چھٹی آیت ملاحظہ فرمائیے:-

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَخِفُّونَ مِنْ

اور اللہ کے علاوہ جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں وہ  
سفارش کا اختیار نہیں رکھتے مگر ہاں وہ جو حق کے  
ساتھ گواہی دیں اور انہیں علم بھی ہو (وہ سفارش  
کر سکتے ہیں)۔

دُونِهِ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ

وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

(الزخوف ۸۶)

مزید آیات مطالعہ فرمائیے:-

۷۔ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ

کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت  
کے بعد۔

(یونس ۳)

۸۔ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۝

مشرکین قیامت کو سفارش کرنے والوں کی  
سفارش کام نہ آئیگی۔

(المدثر ۲۸)

ان آیات سے ثابت ہوا کہ شفاعت نفع دے گی بشرطیکہ شفاعت کرنے والا شفاعت کی اجازت حاصل کر لے اگر اجازت مل گئی تو پھر نفع دینا بھی یقینی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں نا انصافی اور ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا وہاں نجات اسی کو ملے گی جو نجات کا اہل ہوگا اور جو نجات کا اہل ہوگا اسی کے لئے شفاعت کی اجازت بھی دی جائے گی۔ برق صاحب نے جو حدیث شفاعت نقل کی ہے اسے پورا نقل نہیں فرمایا حالانکہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ موجود ہیں:-  
فَيُؤْذَنُ لِي (صحیح بخاری و صحیح مسلم) پھر مجھے اجازت دی جائے گی۔



اللہ تعالیٰ فرمائے گا:-

شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول ہوگی۔

(سُفَعَّ تَشَفَّعَ)

اس کے بعد حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

پھر اللہ میرے لئے مقرر کر دے گا۔

فَيَحْدِلِي حَدًّا رَمِيمًا بَخَارِي وَ

(صحیح مسلم)

یعنی میں صرف ان لوگوں کی سفارش کر سکوں گا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ آپ ان لوگوں کی سفارش کر سکتے ہیں ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حق میں سفارش کی اجازت ہی نہیں ملے گی، الغرض اللہ تعالیٰ کے علم و قانون میں جو لوگ نجات کے اہل قرار پا سکتے ہیں، انہیں کے متعلق سفارش کی اجازت ہوگی، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

(میری سفارش سے لوگ دوزخ سے نکالے جائیں

إِلَّا مَنْ حَبَسَهُ الْقِيَامُ)

گے) مگر وہ لوگ جن کو قرآن نے روک لیا (دوزخ

(صحیح بخاری)

سے نہیں نکالے جائیں گے)

حدیث مذکور سے تین باتیں ثابت ہوئیں:-

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، اور بغیر اجازت کے سفارش نہیں کریں گے۔

۲۔ جن لوگوں کی آپ سفارش کریں گے ان کا تعین بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔

۳۔ آپ ان لوگوں کی سفارش نہیں کر سکیں گے جو قانون الہی کے ماتحت ایسی سزا کے مستوجب ہیں جو معاف نہیں ہو سکتی۔

بتائیے ان تینوں میں سے کون سی بات ایسی ہے جو قرآن مجید یا دوسری احادیث سے ٹکراتی ہے۔

”ابو ہریرہ سے روایت ہے..... کہ قیامت کے دن سب سے پہلے

لوگ حضرت آدم کے پاس جائیں گے اور التجا کریں گے وہ کہیں گے کہ

**غلط فہمی**

میں نے تودانہ گندم کھالیا تھا اس لئے اللہ کے سامنے جانے سے ڈرتا ہوں پھر ابراہیم

کے پاس جائیں گے، وہ کہیں گے کہ میں نے تین جھوٹ بولے تھے اس لئے مجھے

معاف کرو۔ آخر میں لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں گے اور آپ اللہ کے

حضور میں روانہ ہو جائیں گے۔

کیونچہ حدیث تراشی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ابراہیم سے بھی



بڑھا دیا جن کی اتباع کا آپ کو بار بار حکم دیا گیا تھا اور فَاَتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيفًا  
(تم موجد ابراہیم کے آثارِ قدم پر چلو) اور آپ پر تین بھوٹ بولنے کا الزام بھی لگا دیا،  
(دوسرا سلام ص ۲۸۶-۲۸۸)

پہلی غلط فہمی تو یہ ہے کہ آیت کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ تم اتباع کرو  
موجد ابراہیم کی ملت کا، اور ملت سے مراد اسلام ہے اور یہ اللہ کا دین ہے تو مطلب  
یہ ہوا کہ اس اسلام کی پیروی کرو جو ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا نہ کہ وہ نام نہاد ملت ابراہیمی جس کو  
کفار مکہ یا اہل کتاب پیش کرتے تھے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ برق صاحب کے خیال میں ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے اور اس کے لئے بطور دلیل انہوں نے یہ آیت پیش کی ہے حالانکہ آیت  
ایک الزامی جواب ہے جو مشرکین عرب اور اہل کتاب کو دیا گیا ہے کیونکہ یہ لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے  
تھے کہ ہم دین ابراہیمی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اصلی دین ابراہیمی پر تو اے رسول تم ہو اور تم اسی  
اصلی ملت کی پیروی کئے چلے جاؤ۔ ان کے کہنے کی پرواہ نہ کرو۔ یہ لوگ مشرک ہیں اور ابراہیم  
علیہ السلام مشرک نہیں تھے پھر یہ دین ابراہیمی پر کیسے ہو سکتے ہیں اب آیت ملاحظہ فرمائیے:-

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا  
(حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے  
اور نہ عیسائی، بلکہ موجد مسلم تھے۔ اور وہ مشرکین  
میں سے نہیں تھے۔)

الغرض اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ اور اہل کتاب کے دعویٰ کو باطل کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا رسول  
ہی ابراہیمی دین پر ہے اور اپنے رسول سے کہہ دیا، کہ تم ان کی ملامت کی پرمانہ کرو اور اصلی دین ابراہیمی  
کی پیروی کئے چلے جاؤ۔

برق صاحب ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے:-  
اُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰى اللّٰهُ  
فَهٰذِهِمْ اَفْتَدٰى:-  
(انعام: ۹۰)

یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تمام رسولوں کے نقش قدم پر چلنے کا حکم دے رہا ہے، بتائیے  
کیا سب رسول، نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوئے گویا جماعت  
مرسلین میں سب سے کم درجہ کے نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ غالباً آپ بھی تسلیم  
نہیں کریں گے، ابراہیم علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا راستہ ایک ہے۔ یعنی اسلام، پس



اس پر چلنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اس میں افضل و مفضل کا کوئی سوال نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں یا نہیں، تو یہ بات خود قرآن مجید سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

عَسَىٰ أَنْ يَتَّخِذَكَ رَبُّكَ مَقَامًا  
مَّحْمُودًا (بنی اسرائیل: ۷۹)  
وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَفَاتِمَةُ النَّبِيِّينَ  
(الاحزاب: ۴۰)

عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں  
کھڑا کرے گا۔  
آپ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے  
ختم کرنے والے۔

خاتم النبیین کے الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ آپ سب سے افضل ہیں کیونکہ افضل سب کے بعد  
میں ہی آیا کرتا ہے بادشاہ کی سواری جب نکلتی ہے تو جلوس آگے آگے ہوتا ہے، اور بادشاہ  
سب کے آخر میں، مشاعرہ میں سب سے بڑے شاعر کو سب کے آخر میں اپنا کلام سنانے کا  
وقت دیا جاتا ہے۔ جلسہ عام میں سب سے زیادہ عالم کو سب کے آخر میں تقریر کا موقع  
دیا جاتا ہے۔ الغرض سب کے بعد میں آنے والا (عاقب) سب سے افضل ہوتا ہے۔  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ  
إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ  
وَالْأَرْضِ (الاعراف: ۱۵۸)

اے رسول! کہہ دیجئے، اے لوگو! میں تم سب کی  
طرف اس اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں  
جس اللہ کی بادشاہت آسمانوں میں بھی ہے اور  
زمین میں بھی۔

فَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ  
بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا: ۲۸)

اے رسول! ہم نے آپ کو تمام انسانوں کیلئے  
بشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقوام عالم کے لئے رسول  
ہیں، برخلاف اس کے آپ سے پہلے جتنے بھی نبی آئے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف رسول بن کر آئے عیسیٰ  
علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ  
(آل عمران: ۴۹)

وہ بنی اسرائیل کے لئے رسول بنا کر بھیجے  
گئے تھے۔

خود ابراہیم علیہ السلام جن کو برحق صاحب افضل الانبیاء سمجھے ہیں، اپنی قوم ہی کی طرف  
رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ دوسری قوموں کی طرف دوسرے رسول بھیجے گئے تھے۔  
ارشاد باری تعالیٰ ہے:-



فَلَمَّا دَا أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ  
نِكَرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً  
قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمٍ  
لُوطٍ ه (هود: ۷۰)

جب ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کو دیکھا کہ کھانے  
کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے، تو ڈرے، فرشتوں  
نے کہا ڈرو نہیں، ہم لوط علیہ السلام کی قوم  
کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں لوط علیہ السلام اپنی قوم کی طرف رسول تھے،  
اور وہاں ابراہیم علیہ السلام کی رسالت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

قُلْ إِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي  
يُحِبُّكُمُ اللَّهُ ه (۲۱)

(اے رسول!) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت  
کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب  
بنائے گا۔

بتائیے جس شخص کا متبع محبوب اللہ ہے وہ خود کتا بڑا محبوب ہوگا۔ لہذا اگر ابراہیم علیہ السلام اللہ  
کے خلیل ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب ہیں۔  
احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفیست کے متعلق بہت کچھ ہے، کاش برق  
صاحب انہیں بھی تسلیم کریں۔

آپ پر جھوٹ بولنے کا الزام بھی لگا دیا،

(دوسرا سلام ص ۲۸۸)

**غلط فہمی**

جھوٹ کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے، ارشاد باری ہے:-

وَقَالَ اللَّهُ لَا كَيْدَ تَأْمَنَّاكُمْ  
بَعْدَ أَنْ تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ ه فَعَلَّهُمْ  
جُذَا ذَا لَا كَيْدَ أَلَهُمْ لَعْنُهُمْ إِلَيْهِ  
يَرْجِعُونَ ه (الانبیاء: ۵۷، ۵۸)

ابراہیم علیہ السلام نے کہا اللہ کی قسم تمہارے سب جانے  
کے بعد میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا  
پس انہوں نے تمام بت توڑ ڈالے سوائے بڑے  
بت کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

**ازالہ**

پھر جب وہ مشرکین بت خانہ میں آئے تو بہت برہم ہوئے اور پوچھا:-

أَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا يَا لَهْتَ يَا  
إِبْرَاهِيمُ ه قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ  
هَذَا أَنَا سَأَلُوهُمْ إِنِ احْتَالُوا  
يَنْطِقُونَ ه (الانبیاء: ۶۳)

اے ابراہیم کیا ہمارے ان معبودوں کے ساتھ یہ  
حرکت تم نے کی ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا  
نہیں بلکہ یہ کام اس بڑے بت نے کیا ہے، ان بتوں  
ہی سے پوچھو اگر یہ بولتے ہوں۔

یہ قرآن مجید کی آیات آپ کے سامنے ہیں اگر یہ جھوٹ نہیں تو معلوم نہیں پھر جھوٹ کس چیز کا نام ہے؟  
اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر اعتراض کا رخ قرآن مجید کی طرف ہوگا، بتائیے کیا کیا جائے؟



اچھا مان لیا کہ آدم نے دانہ کھایا.... لیکن حضرت عیسیٰ نے کیا قصور کیا تھا کہ انہیں شفاعت کی اجازت نہیں مل سکی.... یوسف علیہ السلام میں

## غلط فہمی

کیا کمی تھی۔ (دوسرا سلام ص ۲۸۵)

پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ عدم و کسر سے عدم شے لازم نہیں آتا، دوسرے یہ ضروری نہیں کہ ہر نبی اپنا قصور یاد کر کے ہی اس کام کا اپنے کو اہل نہ سمجھے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ بے قصور ہو کر بھی وہ اپنے کو اس کام کا اہل نہ سمجھیں مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کے جواب میں صرف اتنا ہے کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے کسی قصور کا ذکر نہیں کیا پھر بھی خود کو اس کام کا اہل نہ سمجھا۔

## ازالہ

حدیث میں صرف بڑے بڑے رسولوں کا ذکر ہے باقی کو بھی ان ہی پر قیاس کیا جاسکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ حدیث میں فرداً فرداً لاکھوں پیغمبروں کے پاس جانا مذکور ہو، پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ خود ہی باقی انبیاء کے پاس نہ جائیں یہ سمجھ کر کہ جب اتنے بڑے نبیوں نے جواب دے دیا، تو دوسروں کے پاس جانا حاصل ہے پھر اس غلط فہمی کا جواب خود حدیث میں موجود ہے یعنی جب وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام اس شخص کی نشاندہی کر دیں گے۔ جس کے لئے یہ کام مخصوص ہے اس طرح وہ لوگ ان کی ہدایت کے مطابق یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے۔ اس وقت آپ کو شفاعت کی اجازت ملے گی اور آپ شفاعت کریں گے۔

”حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

## غلط فہمی

ارشاد موجود ہے کہ آپ اکرم الناس تھے... البوسیریہؒ سے روایت ہے کہ حضورؐ سے کسی نے پوچھا کہ دنیا کا بہترین انسان کون ہے؟ فرمایا سب سے بڑا پرہیزگار، کہا میرے سوال کا یہ مطلب نہیں تھا، فرمایا تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام“ (بخاری جلد ۲ ص ۱۵۲)

حیرت ہے کہ اس اہم کام یعنی شفاعت کے لئے دنیا کا بہترین انسان کیوں منتخب نہ

ہو سکا (ص ۲۸۵)

حدیث مذکور میں خود اس غلط فہمی کا ازالہ موجود ہے اکرم الناس تو آپ نے اسی کو فرمایا

## ازالہ

جو سب سے زیادہ متقی ہو اور یہی قرآن مجید میں بھی ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ یعنی اللہ کے ہاں اکرم الناس وہ ہے جو سب سے

زیادہ متقی و پرہیزگار ہو۔ (الحجرات ۱۳-۱۲)

ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے عقیدہ کے مطابق اور قرآن و حدیث کی صراحت کے بموجب سب سے



زیادہ متقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں لہذا شفاعت کبریٰ کا حق سوائے آپ کے اور کس کو ہو سکتا ہے اب یہ سوال کہ پھر یوسف علیہ السلام کس لحاظ سے اکرم الناس ہیں تو اس کی وجہ دوسری ہے وہاں مکرم سے مراد مکرم بلحاظ نسب ہے اور یہ حدیث میں موجود ہے صحابہ نے کہا ہم یہ نہیں پوچھ رہے تھے آپ نے ارشاد فرمایا:-

فَيُؤَسِّفُ بَنِي اللَّهِ ابْنُ بَنِي اللَّهِ ابْنُ  
بَنِي اللَّهِ ابْنُ خَلِيلِ اللَّهِ ه  
بلحاظ نسب تو یوسف علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ خود  
بھی بنی، بنی کے بیٹے ہیں، بنی کے پوتے ہیں غنیں  
اللہ کے پڑ پوتے ہیں۔

بلحاظ نسب یوسف علیہ السلام کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ خود بھی بنی ہیں، اور ان کی تین پشتیں نبوت سے سرفراز ہیں، کیونکہ اللہ کے ہاں انساب کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ تقویٰ کی اہمیت ہے، لہذا شفاعت کبریٰ اس شخص کو مل سکتی ہے جو تقویٰ کے زیور سے سب سے زیادہ آراستہ ہو۔

”اگر کسی طالب العلم کو ایک سال پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ امتحان میں کچھ لکھے یا نہ لکھے وہ ہر رنگ کامیاب ہو جائے گا تو وہ یقیناً کام چھوڑ کر آوارہ گردی شروع کر دے گا“ (دوا اسلام ص ۲۸۸)

**ازالہ** طالب علم کام کرنا اس وقت چھوڑ سکتا ہے جب اسے کامیابی کا یقین ہو۔ شفاعت کے سلسلہ میں یقین نہ قرآن مجید سے حاصل ہوتا ہے نہ احادیث سے۔ بلکہ قرآن و حدیث کی تصریحات کی بناء پر اصل چیز جس پر شفاعت کا دار و مدار ہے وہ انسان کا اپنا عمل ہے۔ پس نجات و چیزوں پر موقوف ہوئی۔ ایک عمل دوسرے شفاعت لہذا ایسا کون بے وقوف ہوگا جو صرف ایک شرط کو پورا کرے اور دوسری کو چھوڑ دے۔ حالانکہ شرط شفاعت تو شرط عمل ہی پر موقوف ہے حدیث شفاعت میں یہ چیز موجود ہے، یعنی جن کو قرآن روک لے گا ان کے حق میں شفاعت نہیں ہوگی بتائی اب کیا اعتراض ہے؟

**غلط فہمی** ”رسول اللہؐ رو رہے تھے کہ اللہ نے جبریل سے کہا، اے جبریل! محمد (صلعم) کے پاس جاؤ اور اسے ہماری طرف سے کہو کہ ہم تمہیں امتیازی امت کے متعلق خوش کریں گے اور مغموں نہ ہونے دیں گے (مسلم) اس وعدہ کی رو سے ہم سب کو جنت میں تو پہنچ ہی جانا ہے پھر کام کیوں کریں، نماز کیوں پڑھیں؟ روزے کیوں رکھیں اور جہاد کے خوف ناک مصائب کیوں برداشت کریں“ (دوا اسلام ص ۲۸۹)



## ازالہ

ایک مسلم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشی میں خوش ہو تاکہ اسے لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی چیز سے خوش ہوں گے جس چیز سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا، سفارش آپ انہی کی کریں گے جن کی سفارش کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا لہذا ایسا موقع تو کوئی آئے گا ہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفارش کرنا چاہیں اور سفارش قبول نہ ہو اور پھر سفارش قبول نہ ہونے پر آپ کو ملال ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خود اسی کی سفارش سے خوش ہوں گے جس کی سفارش کی اجازت ہوگی اور جس کی سفارش کی اجازت نہ ہوگی اس سے آپ خود بنیادیں ہوں گے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ امت کے بعض لوگوں سے آپ فرمائیں گے۔

سُحُقًا سَحَقًا (صحیح بخاری و صحیح مسلم) دور ہو جاؤ دور ہو جاؤ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں سے آپ کو نفرت ہوگی اور آپ سفارش ہی نہ کریں گے اور جن سے آپ کو محبت ہوگی وہ وہی لوگ ہوں گے جو اللہ کے بھی پیارے ہوں گے اور ان ہی کے حق میں سفارش قبول ہونے کے بعد آپ خوش ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
أُولَٰئِكَ هُمُ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۖ جَزَاءُ لَهُمْ  
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي  
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا  
أَبَدًا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ  
ذَٰلِكَ يَمَنُ خَشِيَ رَبَّهُ ۝

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک  
عمل کئے وہ بہترین مخلوق ہیں۔ ان کی جزا  
باغات عدن ہیں، جن کے پتے نہیں بہتی  
ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ  
اللہ سے راضی، اور اللہ تعالیٰ ان سے  
راضی ہوگا۔ یہ سب کچھ اس کے لئے ہے جو  
اللہ سے ڈرتا ہے۔

(البینۃ: ۸۱-۸۲)

دوسری جگہ فرمایا ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ۝ ارجعي  
إِلَىٰ رَبِّكِ ۚ رَاضِيَةً مَُّرِضِيَةً ۝  
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

اے نفس مطمئنہ جا اپنے رب کی طرف، تو اس  
سے راضی وہ تجھ سے راضی، میرے بندوں  
میں داخل ہو جا، اور میری جنت  
میں داخل ہو جا۔

(الفجر: ۲۷ تا ۳۰)

ان آیات سے ثابت ہوا کہ ہر صالح مؤمن کو اللہ تعالیٰ راضی کر دے گا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے  
کہ سید الاولین والآخرین کو اللہ تعالیٰ راضی نہ کرے گا ضرور کریگا۔ لہذا حدیث زیر بحث بالکل قرآن مجید کے  
مطابق ہے ہر حق صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔



## دوسرا جواب

برق صاحب احادیث میں اگر شفاعت کا ذکر ہے تو احادیث میں یہ بھی ہے کہ آپ کا امتی کون ہے اور امت سے خارج کون ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-  
 مَرَّ غَشَّاءٌ فَلَيْسَ مِنَّا  
 جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔  
 (صحیح مسلم)

اسی طرح بے نمازی کو آپ نے کافر تک فرمایا ہے (ترمذی) قریب قریب ہی حال روزہ کا ہے جہاد کے متعلق فرمایا ہے کہ جو شخص نہ جہاد کرے نہ جہاد کا ارادہ رکھے تو یہ نفاق کی علامت ہے (صحیح مسلم) اب ان حالات میں یہ بتائیے کہ امتی کون ہے اور امت سے خارج کون ہے؟ بلکہ مختصر اور جامع الفاظ میں آپ نے فرمادیا۔

مَرَّ رَجُلٌ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔ جو میری سنت سے بے رغبتی کرے  
 (صحیح بخاری و صحیح مسلم) وہ مجھ سے نہیں۔

مطلب یہ کہ جو شخص آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرتا ہے وہی امتی ہے اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ آپ کو ناخوش نہ کرے گا، بتائیے اب حدیث زیر بحث پر کیا اعتراض ہے؟



# باب ۱۵

## قرآن سے متصادم احادیث

”حدیث ملاحظہ ہو۔۔۔“

### غلط فہمی

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ خدا کو ایک مان کر میری رسالت کا اقرار نہ کریں، اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند نہ ہو جائیں اگر وہ ان باتوں کو مان لیں تو پھر میں ان کی جان اور مال سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ ہاں جان و مال میں اللہ کے حقوق کسی طرح ساقط نہیں ہوں گے۔ (بخاری جلد ۱ ص ۵)

یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے:-

اول:- قرآن حکیم نے بدامنی کو روکنے اور مظالم کے انسداد کے لیے جہاد کا حکم دیا ہے نہ کہ قرآن کی تعلیم زبردستی منوانے کے لئے۔ (دوا سلام ص ۲۹۲)

### ازالہ

اس غلط فہمی کا ازالہ خود برق صاحب کی تحریر میں موجود ہے برق صاحب فرماتے ہیں:-

”قرآن میں بار بار یہی حکم دیا گیا ہے کہ ظالموں، بدعبدوں سے لڑو، لیکن اگر مندرجہ ذیل چار صورتوں میں سے کوئی صورت پیدا ہو جائے تو جنگ ختم کر دو۔

اول:- جب فتنہ اور بدامنی ختم ہو جائے :-

دوم:- جب دشمن سے صلح ہو جائے۔

سوم:- جب وہ جبریہ دینے پر راضی ہو جائے۔

چہاد م:- فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ

اور اگر وہ توبہ قبول کرنے کے بعد صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو پھر ان کے راستہ سے ہٹ جاؤ۔

(دوا سلام ص ۲۹۲، ص ۲۹۳)

برق صاحب یہ چوتھی وجہ جو آپ نے تحریر کی ہے وہی حدیث مذکور میں ہے، بلاوجہ آپ نے



اس حدیث کو مطلق سمجھ لیا ہے۔ میدانِ جنگ میں اگر کافر مسلم ہو جائیں اور اس کے عملی ثبوت کے لیے نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ایسے لوگوں سے لڑائی بند کرنی ہوگی۔ ہاں اگر وہ صرف دھوکہ دینے کے لئے مسلم ہوں تو حدیث میں اس کی بھی تشریح ہے، یعنی ”حَسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ“ اسلامی حکومت ظاہر کی بنا پر ان کو مسلم سمجھے گی اور ان کا اصلی حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔ اسلامی حکومت محض دھوکہ اور نفاق کے اندیشہ سے ان پر کفر کا اطلاق نہیں کرے گی بلکہ اصل معاملہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑے گی۔

بالکل اسی طرح قرآن مجید میں بھی ہے جو وجہ دوم کے تحت برق صاحب نے لکھا ہے یعنی کافر اگر صلح کرنا چاہیں تو صلح کر لو یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کافروں نے دھوکہ دینے کے لئے صلح کی ہو تو ایسے موقع کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے آگے فرمایا ”وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ“۔ (انفال: ۶۱) (یعنی صلح کر لو) اور اللہ پر توکل کرو ایسا نہ ہو کہ وہ صلح کرنا چاہیں اور تم دغا کے اندیشہ سے صلح نہ کرو۔ بلکہ صلح ان کے ظاہری مطالبہ پر ہی کر لی جائے اور دلوں کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے، حدیث زیر بحث میدانِ جنگ ہی کے متعلق ہے ورنہ ”حَسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ“ کے الفاظ نہ ہوتے کیونکہ میدانِ جنگ میں ایسا ہو سکتا ہے کہ دشمن دھوکہ دینے کے لئے مسلم ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا حساب اللہ لے گا۔ تم ان کے ظاہری ایمان کو تسلیم کر کے لڑائی سے باز آ جاؤ۔

برق صاحب قرآن مجید کی جو آیت آپ نے جبہ سوم میں نقل کی ہے وہ بھی حدیث مذکور کی تائید کرتی ہے مگر آپ نے اسے پورا نقل نہیں فرمایا۔ پوری آیت اس طرح ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا يَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجُزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ه (التوبة: ۱-۲۹)

ان اہل کتاب سے جنگ کرو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور دین حق کی پیروی نہیں کرتے پھر ان سے جنگ اس وقت تک جاری رکھو جب تک وہ ذلیل ہو کر جزیہ نہ ادا کریں۔

اس آیت میں جنگ جاری رکھنے کی تین وجہیں بتائی گئی ہیں:-

۱۔ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہ لانا۔

۲۔ حرام چیزوں کو حلال سمجھنا۔

۳۔ دین حق یعنی اسلام کی پیروی نہ کرنا۔

یعنی جن لوگوں میں یہ تین باتیں نہ ہوں ان سے لڑنا چاہیے، دوسرے لفظوں میں اس طرح



کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں سے ٹو اس لئے کہ وہ مسلم نہیں ہیں۔ اب یا تو وہ ان تینوں باتوں کو مان کر مسلم بن جائیں ورنہ جزیہ دینا قبول کریں۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلم کرنے لے کر منافق ہے اور جو کافر قوم اسلام قبول کرنا نہیں چاہتی تو پھر اس کو ذلیل و بکر جزیہ دینے پر مجبور کیا جائے۔ ان دونوں باتوں میں سے ایک چیز انہیں مجبوراً اختیار کرنی ہوگی۔ یا اسلام یا جزیہ۔ بتائیے یہ آیت کیا کہتی ہے۔ کیا زبردستی مسلم بنانے کی ہدایت نہیں دیتی کیا یہ آیت زبردستی لوگوں کو محکوم بنانے کی ہدایت نہیں دیتی اگر اس میں ان دونوں باتوں کا حکم ہے تو پھر حدیث نے کیا قصور کیا؟ جو اعتراض بظاہر اس آیت پر ہے وہی بظاہر حدیث زیر بحث پر ہے برق صاحب غلط فہمی سے تو آیات میں بھی تضاد پیدا ہو سکتا ہے آخری باب میں اس بات کی قدرے تفصیل ہے کہ قرآنی آیات میں بظاہر کتنا تضاد ہے۔

دوسری آیت سنئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا غُلَظًا (التوبة: ۱-۱۲۳)

اے ایمان والو! اپنے گرد و پیش کے کفار سے جنگ کرو اور ان کو ہمت مارے اندر سختی پانا چاہیئے۔

برق صاحب اوپر اور نیچے کی آیات پڑھ لیجئے اور پھر بتائیے کہ ان کافروں سے لڑنے کی کیا وجہ ہے؟ کوئی وجہ آپ کو نہیں ملے گی۔ پس اگر حدیث مذکور اور قرآنی آیات میں تضاد ہے تو یہ آیت بھی تو قرآن مجید سے ٹکراتی ہے اگر اس کا کوئی صحیح مقام ہے تو وہی صحیح مقام حدیث مذکور کا بھی ہے۔

اور سنئے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

(التحريم: ۹)

پوری سورہ تحریم پڑھ جائیے آپ کو جنگ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ملے گی لہذا کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ یہ آیت بھی قرآن مجید سے تضاد ہے یا نہیں؟ براہِ کم احادیث کو بالاسستیاب پڑھئے، اور پھر ان کی روشنی میں کسی حدیث کا مطلب سمجھئے، برق صاحب یہ وہ حدیث ہے جس کا ایک جز صحابہ کی موجودگی میں پڑھا گیا، پڑھنے والے ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ کہنے والے یعنی عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور جن کے سامنے پڑھی گئی، وہ مرکزِ ملت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے نہ مرکزِ ملت نے یہ کہا کہ میں اس کو منسوخ کرتا ہوں، نہ انہوں نے اور نہ کسی اور صحابی نے یہ کہا کہ یہ تو قرآن مجید کے بھی خلاف ہے یہ صحابہ کرام کی جماعت ہے جو اس حدیث کو تسلیم کرتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کی تعریف



برق صاحب بھی اپنی کتاب میں کر آئے ہیں اور جن کی تعریف قرآن مجید میں موجود ہے بن کوفی اللہ عنہ کا خطاب دیا گیا۔ جن کے متعلق قرآن مجید کا دعویٰ ہے

وَالْزُّمُّهُمْ كَلِمَةُ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا  
أَخَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا (الفنہ: ۲۶)

اور تقویٰ کو ان کے ساتھ چمٹا دیا گیا ہے اور وہ اس کے زیادہ حق دار ہیں اور اہل بھی۔

برق صاحب جب ان سچے اور اسلام کا صحیح فہم رکھنے والے مسلمان نے اس کو قرآن مجید کے خلاف نہیں سمجھا تو آپ کیوں اس کو خلاف سمجھتے ہیں۔

”دوم حضور علیہ السلام نے معاذ بن جبل کو اہل بحرین سے جزیہ وصول

کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ (بخاری جلد ۲ ص ۱۳۱) حالانکہ وہ لوگ غیر مسلم

تھے اور اس حدیث کی رو سے ان کے خلاف جہاد کرنا چاہیے تھا“ (دو اسلام ص ۲۹۴)

یہ بھی غلط فہمی ہے جہاد کی تو اس وقت ضرورت ہے جب دشمن نہ اسلام قبول کرے، نہ

جزیہ دے اور اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دشمن نے جزیہ دینا قبول کر لیا، لہذا

جہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

”سوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

فرمایا تھا کہ .... انہیں اسلام کی طرف دعوت دو، یہ نہیں فرمایا

کہ ہر غیر مسلم کو قتل کر دو اور جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے جنگ جاری رکھو“ (دو اسلام ص ۲۹۴)

جنگ تو جاری تھی لہذا جنگ جاری رکھنے کی ہدایت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں

بحالت جنگ آپ نے فرمایا کہ انہیں اسلام کی دعوت دینا، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو

اچھا ہے تاکہ جنگ بحسن و خوبی اختتام کو پہنچے اور بلا وجہ خونریزی نہ ہو۔

”چہارم۔ مؤطا میں مذکور ہے۔

ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر کہنے لگا

کہ میں بیعت کو توڑتا ہوں تین مرتبہ ہی التجا دہرائی لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس

کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا تو آپ نے فرمایا: مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے جہاں خالص دھات

باقی رہ جاتی ہے اور کثافت نکل جاتی ہے“ (مؤطا ص ۲۵۹)

اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرتد سے جنگ نہیں کی بلکہ خاموش رہے

جس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام میں کسی کا مذہب بوجہ تبدیل کرنے کی کوئی ہدایت

موجود نہیں (دو اسلام ص ۲۹۴-۲۹۵)



## ازالہ

اس حدیث میں یہ کہاں ہے کہ آپؐ اس جنگ نہیں کی۔  
دوم۔ اس حدیث میں یہ کہاں ہے کہ وہ سلطنت اسلامیہ میں رہا، ہو سکتا ہے کہ وہ دارالحرب میں چلا گیا ہو اور آپؐ اس پر قادر نہ ہو سکے ہوں اور یہ بالکل قرین قیاس ہے اس لئے کہ اسلامی حکومت اس وقت تک صرف مدینہ ہی تک محدود تھی اور یہ اوائل اسلام کا زمانہ تھا، مدینہ کی آب و ہوا خراب تھی اسی وجہ سے اس اعرابی کی صحت بھی خراب ہو گئی اور اس نے بیعت توڑنی چاہی کچھ عرصہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے مدینہ کی آب و ہوا اچھی ہو گئی تھی۔

سوم۔ اس حدیث میں جو اصل مضمون ہے وہ برق صاحب نے چھوڑ دیا، اصل مضمون اس طرح ہے کہ اس کو مدینہ کی آب و ہوا ناہموافق ہوئی تو اس نے مدینہ سے باہر جانا چاہا اور بیعت واپس کر۔ نے کے لئے کہا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ (أَصَابَ الْأَعْرَابِيَّ وَعَلَقُ بِالْمَدِينَةِ) یعنی وہ مدینہ میں کسی مرض میں مبتلا ہو گیا (صحیح مسلم باب المدینۃ تمقی شرارہا) پس ثابت ہوا کہ وہ شخص محض مدینہ سے باہر جانا چاہتا تھا لیکن آپؐ نے اس کی اجازت نہیں دی بلکہ خاموش رہے حدیث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مدینہ میں رہنے کی بھی بیعت کی تھی، اس بیعت کو توڑ کر وہ چلا گیا، بتائیے اس میں ارتداد کا ذکر ہی کہاں ہے۔

## غلط فہمی

”اور یہ حدیث بھی (وضعی ہے)“ مَن بَدَلَ دِينَهُ فَاقتُلُوْهُ

کہ جو شخص اسلام چھوڑ جائے اسے قتل کر ڈالو (دوسرا سلام ص ۲۹۵)

## ازالہ

پہلا جواب۔ برق صاحب! کافر کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کرنا یہ از روئے آیت قرآنی ناجائز ہے، کسی مسلم کو اسلام پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرنا از روئے حدیث ضروری ہے یہ دو مختلف مسئلے ہیں، دونوں ایک نہیں، قرآن مجید میں جو کچھ ہے وہ بھی صحیح ہے اور حج کچھ حدیث میں ہے وہ بھی صحیح ہے وہ اپنی جگہ پر اور یہ اپنی جگہ پر لہذا تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تصادم وہاں ہوتا ہے جہاں مسئلہ ایک ہو اور حکم دو اور متضاد، یہاں مسئلے دو ہیں لہذا حکم بھی دو ہیں۔

پہلا مسئلہ۔ کافر کو اسلام لانے کے لئے مجبور کرنا،

دوسرا مسئلہ۔ مسلم کو اسلام پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرنا۔

پہلا مسئلہ۔ ”لَا كُفْرًا فِي الدِّينِ“ کے مطابق ہے اور دوسرا مسئلہ ”مَن بَدَلَ دِينَهُ فَاقتُلُوْهُ“ کے مطابق ہے لہذا حدیث قرآن مجید کے خلاف نہیں۔

## دوسرا جواب

اس حدیث کی صحت کا ایک اور ثبوت بھی ہے اور وہ ہے تاریخی ثبوت، حضرت ابو بکر صدیق



رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے جنگ کی، یہ ایک مسئلہ تاریخی حقیقت ہے، اور محدثین کے اصول پر بھی یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے، لہذا مسئلہ یہی ہوا کہ مرتد سے قتال ضروری ہے۔ اگر آپ اس مسئلہ واقعہ کا بھی انکار کر دیں تو پھر یہ کہا جائے گا کہ آپ حقائق کا بھی انکار کر دیتے ہیں اور اس کی آپ سے توقع نہیں ہے۔

## تیسرا جواب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ  
اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلٰی الَّذِيْنَ  
اٰمَنُوْا وَحِبَّةَ الْمَنَآرِ وَكَفٰرُ الْاٰخِرَةِ  
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ صبح کے وقت اس چیز پر ایمان لے آؤ جو ایمان والوں پر نازل کی گئی ہے اور شام کے وقت اس انکار کو، شاید مسلم بھی اس طریقہ سے اسلام برگشتہ ہو جائیں۔

(ال عمران: ۷۲)

یہ بھی اہل کتاب کی ایک چال، مسلم ہو جانے کے بعد اگر پھر کوئی شخص دوبارہ کافر ہو جائے تو دوسروں پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے، اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اسلام میں کوئی نہ کوئی ایسی خرابی ہے کہ مسلم ہونے کے بعد پھر لوگ اس سے منحرف ہو جاتے ہیں اور خود مسلم بھی یہ گمان کر سکتے ہیں کہ واقعی کوئی ایسی خرابی ہے کہ لوگ مسلم ہو کر پھر کافر ہو گئے، ان کے ایمان میں بھی تزلزل کا اندیشہ ہے اور کافروں کے مسلم نہ ہونے کا بھی خطرہ ہے اور یہ چیز اسلامی معاشرہ کے لئے بڑی خطرناک ہے اس سے اسلام کی ترقی رک جاتی ہے اور اگر کہیں مسلم ہو کر کافر ہو جانے والا شخص ذی حیثیت اور ذی علم ہو، تو پھر اس کا بہت ہی بُرا اثر پڑتا ہے۔ لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ اتنا بُرا آدمی، اتنا بُرا عالم جب اسلام سے برگشتہ ہو گیا تو ضرور کوئی مخفی خرابی ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام سے منحرف ہو گیا، یہ خطرہ کا بہت ہی خوف ناک پہلو ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس سازش کی اطلاع اس آیت میں دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دینی قانون نافذ کر دیا کہ،

مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ رَٰحِمٍ ۖ

جو مرتد ہو جائے اسے قتل کر دو۔

(بخاری، کتاب استنابة المحدثین)

سازش کرنے والوں کے حوصلے پست ہو گئے اور اسلام ترقی کے مراحل طے کرتا چلا گیا، یہ سے حدیث کا پس منظر، کتنا معقول قانون ہے اس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے معلوم نہیں اس قابلِ فخر قانون کو برق صاحب کیوں نہ سمجھ سکے اور کیوں اس کی افادیت کا اندازہ نہ لگا سکے، کافروں کی گہری



سازشوں کے سدباب کے لیے یہی قانون ہے۔ فلتا الحمد۔

یہ خطرہ اسلام اور اسلامی معاشرہ کو ہر وقت درپیش ہے لہذا حدیث مذکور میں بیان کردہ یہ قانون بھی غیر متبدل ہے، اگر یہ قانون نہ ہو تو ارتداد کے دروازے کھل جاتے ہیں اس قانون نے ہمیشہ کے لئے ارتداد کا خاتمہ کر دیا اور اسلام کو تمام خطروں سے بچالیا، یہ ہے اس حدیث کا سیاسی و نفسیاتی جائزہ۔

## چوتھا جواب

کسی وقت بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن عناصر کسی مسلم کا ایمان خرید لیں یا دوسرے مذاہب کی تبلیغی جماعتیں محض روپیہ کے بل بوتے پر مسلمان کو مرتد کرنے لگ جائیں جیسا کہ آج کل ہمارے ملک میں ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں اس فتنہ کے انسداد کے لئے بھی ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کے پاس کوئی غیر متبدل قانون ہو جو اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے اور یہی وہ قانون ہے جو حدیث مذکور کی صورت میں ہمیں دیا گیا ہے، یہ ہے اس کا دینی پہلو۔

## پانچواں جواب

اسلام ایک عسکری نظام ہے، خانقاہی نظام نہیں ہے، مسلمان کا بچہ بچہ اسلامی فوج کا سپاہی ہے، یہاں آپ کے کان تلواروں کی تھنکار سنیں گے، اور آپ کی آنکھ غازیوں کے جھرمٹ دیکھے گی جو شہادت کی لار وال دولت حاصل کرنے کے لئے جنگ کے مہیڑے مہیڑے شعلوں میں کود رہے ہیں، یہاں وہ پروانے نظر آئیں گے جو کسی کے جمال جہاں آ رہے رہ کر قربان ہو رہے ہیں، برق صاحب آپ کے نزدیک تو جہاد ہی روح اسلام ہے لہذا اس مسئلہ پر جو کچھ لکھ جائے گا وہ تو آپ کو پسند ہونا ہی چاہیئے۔ یہ تو صحیح ہے، کہ حکومت کسی شہری کو زبردستی فوج میں شامل نہیں کرتی اور یہ ”لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ“ کا ایک منظر ہے لیکن جب کوئی شخص خود فوج میں شامل ہو جاتا ہے تو پھر وہ خود فوجی خدمات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، اور اگر وہ خود فوجی خدمات سے علیحدگی اختیار کرے اور کسی فوجی ضابطہ کو ماننے سے انکار کر دے تو حکومت کا فوجی قانون اس کو برداشت نہیں کر سکتا، حکومت فوراً اس کو سزائے موت دے گی اور یہ ”مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَانْزِلُوْهُ“ کا منظر ہے۔

بالکل اسی طرح اسلام ایک فوجی نظام ہے، حکومت النبیہ کسی کو اس بات پر تو مجبور نہیں کرتی کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائے لیکن جب کوئی شخص خود بخود اس فوجی نظام میں داخل ہو جاتا ہے، تو پھر اس کو علیحدگی کا اختیار باقی نہیں رہتا اور اگر کوئی شخص خود علیحدگی اختیار کرے تو اس کی سزا عام دنیاوی قانون کے لحاظ سے بھی اور دینی قانون کے لحاظ سے بھی موت کے سوا کچھ نہیں لہذا اس اسلامی عسکری نظام میں جس وقت بھی کوئی شخص نکلے گا اس کو موت کی سزا دی جائے گی، یہ ملازمت کی طرح عارضی چیز نہیں بلکہ



یہ چیز دائمی ہے اور مسلم مہم سے لے کر لحد تک اسلام کا ایک سپاہی ہے وہ کسی وقت بھی خود اپنے آپ کو اس فوجی نظام سے علیحدہ نہیں کر سکتا اور کیونکہ فوج کا سپاہی مقررہ میعاد تک کے لئے عملدازم ہوتا ہے، اس میعاد کے بعد حکومت اس کو علیحدہ کر دیتی ہے اور اگر وہ علیحدہ نہ کرے تو اس کا بھی اس کو اختیار ہے مٹیک اسی راج جو شخص ایمان لاکر اسلامی عسکری نظام میں شامل ہو جاتا ہے وہ اپنی پوری زندگی اسلام کی وفاداری میں گزارنے کا عہد کر لیتا ہے لہذا اس مقررہ میعاد میں وہ خود علیحدگی اختیار کرنا تو کجا اگر وہ علیحدہ ہونے کی درخواست بھی کرے تو حکومت وقت کو اختیار ہے کہ اسے علیحدگی کی اجازت نہ دے، اس اختیار کے استعمال پر اعتراض صحیح نہیں۔

فوجی ملازمت کیونکہ عارضی ہوتی ہے لہذا حکومت سوچ سکتی ہے کہ اب فلاں سپاہی کو سبکدوش کر دیا جائے تو مضائقہ نہیں لیکن اسلامی فوج کی رکنیت عارضی نہیں بلکہ دائمی ہوتی ہے۔ لہذا حکومت کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کسی اسلامی سپاہی کو فوجی رکنیت سے علیحدہ کرے جو شخص اسلامی فوجی نظام میں داخل ہوتا ہے وہ اس معاہدہ کی پابندی کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ اب موت تک اس نظام سے وابستہ رہے گا اگر وہ اس معاہدہ کے ساتھ آنا نہیں چاہتا تو نہ آئے اس پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جب وہ آئے گا تو پھر اپنے معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور اگر کر لگا، تو یقیناً موت کی سزا پائے گا۔

## ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرتد کو بہ حیثیت ایک ذمی کے برداشت کر لیا جائے تو کیا حرج ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص فوج میں داخل نہ ہو شہری کی حیثیت سے رہ سکتا ہے وہ جہاں چاہے جائے آئے اس پر کوئی پابندی نہیں لیکن فوج میں داخل ہونے کے بعد اس کو اس قسم کی آزادی نہیں رہتی۔ وہ ایک ضابطہ کا پابند ہوتا ہے وہ فوجی اسرار سے واقف ہوتا ہے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، ذمی محسن ایک شہری ہے اور مسلم ایک سپاہی ہے جو شخص مسلم ہے وہ گویا اسلامی فوج کے اسرار سے بھی واقف ہے اور جو ذمی ہے وہ اسلامی فوج کا رکن بن ہی نہیں سکتا، لہذا وہ فوجی اسرار سے واقف بھی نہیں ہو سکتا لہذا کسی ایسے شخص کا جو فوجی اسرار سے واقف ہو، خود فوج سے نکل جانا بڑا اہم معاملہ ہے، یہ بغاوت کے مترادف ہے وہ شخص اسلامی عسکری ضابطہ کا انکار کرتے ہی دوسری صف میں کھڑا ہو گیا وہ کسی ذمت بھی اسلامی نظام کے لئے خطرہ بن سکتا ہے لہذا اسلامی نظام کی بقا کی خاطر اس کا قتل ضروری ہو جاتا ہے اور یہی اس حدیث کا عسکری و سیاسی پہلو ہے، برق صاحب حدیث کیا ہے۔ یہ ہے کہ ہر ایک ہے اسی قسم کے جواہر ہیں جو امام بخاری، امام مسلم وغیرہ نے اپنی کتابوں میں جمع کر دیے ہیں ان کی تدریس



وہی کر سکتا ہے جو اس کا قدروان ہو۔ ”قدر گوہر شاہ بداند یا بداند جوہری“ کیونکہ بمصادق ”ہمارا امتارا  
 اللہ بادشاہ“ اور نفجوائے حدیث پاک ”لَا مَلِكَ إِلَّا اللَّهُ“ کوئی بادشاہ نہیں سوائے اللہ کے ،  
 (صحیح مسلم) آپ بادشاہ تو بن نہیں سکتے، لہذا جوہری بننے کی کوشش کیجیے اور اگر جوہری بھی نہیں  
 بن سکتے تو پھر کسی جوہری سے پوچھ لیا کیجیے مگر افسوس جو جوہری آپ کو ملا وہ آپ کا اصطلاحی ملا تھا۔  
 برق صاحب ایمان بالغیب، ایمان باللہ، ایمان بالرسول کا تقاضہ ہی ہے کہ جو کچھ ہمیں اللہ کی  
 طرف سے بذریعہ رسول ملے، اس پر ایمان لائیں، اپنی عقلوں کو معیار نہ بنائیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو پھر ہمارا  
 ایمان رسول پر نہ ہوا بلکہ عقل پر ہوا پھر عقلیں ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ ہیں ایک ہی بات کسی کی عقل میں آتی ہے  
 اور کسی کی عقل میں نہیں آتی لہذا کسی ایک کی عقل کو معیار نہیں بنایا جاسکتا، ہو سکتا ہے کہ کسی حکم کی  
 مصلحت کسی بھی شخص کی سمجھ میں نہ آئے لیکن اس کے باوجود ہمیں اس حکم کو تسلیم کرنا ہوگا اس لئے کہ وہ حکم  
 اس ہستی کی طرف منسوب ہے جو مخفی مصالح سے واقف ہے، جہاں انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی،  
 ہمارا صرف اتنا فرض ہے کہ ہم یہ دیکھ لیں کہ جو حکم ہم تک پہنچ رہا ہے اس کا ذریعہ کیا ہے، اگر ذریعہ صادق القول  
 معتبر، پرہیزگار لوگوں کا ہے تو پھر ہمیں اس کو تسلیم کرنا ہوگا، محض عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اس کا انکار کر دینا  
 شکست خوردہ ذہنیت ہے، احساس کمتری و بے ایمانی ہے یا شقاق اور مہٹ و دھڑی اور ہم چنیں دگریے  
 نیست کے سوا کچھ نہیں۔



# باب ۱۶

## غلامی اور اسلام

### غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”لارڈ ہیڈلے فاروقی جب مسلمان ہوئے تو آپ نے انگلستان کی مسجد میں اسلام پر ایک تقریر کی جس میں اسلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں کہا :-  
”قرآن میں ایک نقص بھی ہے کہ وہ حکومت کرنے کے تو سب گرتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ اگر مسلمان غلام ہو جائے تو وہ کیا کرے، سارے قرآن میں غلام مسلمان کے لئے ایک ہدایت موجود نہیں“

بدیگر الفاظ لارڈ فاروقی یہ کہہ گئے کہ قرآن جہاں بالوں کا دستور العمل ہے۔ نہ کہ غلاموں کا“

(دو اسلام ص ۲۹۶)

### ازالہ

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں نہ غلاموں اور لونڈیوں کا تذکرہ ہے، نہ ان کے متعلق احکام ہیں جو کچھ ہے بس حدیث میں ہے لہذا حدیث ہی قابل اعتراض ہے لیکن اس میں برق صاحب کی زبردست غلط فہمی ہے بلکہ خوش فہمی ہے، لارڈ ہیڈلے نے بھی قرآن مجید کا سرسری مطالعہ کیا اور اسی طرح برق صاحب نے بھی، ورنہ قرآن مجید کا عالم ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے اب میں غلامی کے سلسلہ میں قرآنی آیات پیش کرتا ہوں، سنیئے :-

(۱) وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ  
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ  
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ

نیکی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں مال  
خرچ کرے، اقرباء کو دے، یتامی، مساکین  
مسافر اور سائلین کو دے اور غلاموں کو آزاد کرانے  
میں خرچ کرے۔

(البقرہ ۱۷۷)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلم غلام ہو سکتا ہے اور اس کو آزاد کرانے میں روپیہ خرچ کرنا نیکی ہے



اور یہ بھی اتفاق فی سبیل اللہ کی ایک مد ہے :-

۲۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ

اے ایمان والو! تم پر قتل کے معاملہ میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے میں آزاد (قاتل) قتل کیا جائے غلام کے بدلے میں غلام (قاتل) کو قتل کیا جائے اور عورت کے بدلے میں قاتلہ کو قتل کیا جائے۔

(البقرة ۱۷۸)

یہ نہیں ہو سکتا کہ قتل تو کرے آزاد اور مرزا میں کسی غلام کو قتل کر دیا جائے، یہ تفویق اسلام میں نہیں، جو قتل کرے وہی سزا بھگتے، اس آیت سے ثابت ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں غلام ہو سکتے ہیں اور ان کے لئے قانون قصاص وہی ہوگا جو آزاد مرد و عورت کے لئے ہے۔

۳۔ وَلَا تَمْلِكُوا لِلشُّرَكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ وَلَا مَلَائِكَةً خَيْرٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَلَا تُجْبِئُكُمْ وَلَا تَمْلِكُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَكَعْبَدُ الْمُؤْمِنِينَ خَيْرٌ مِّنَ مُّشْرِكٍ وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّىٰ تَمْلِكُوا

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ مومنہ لونڈی بہتر ہے مشرک سے اگرچہ وہ مشرکہ تم کو اچھی ہی کیوں نہ معلوم ہو، اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو، جب تک وہ مومن نہ ہو جائیں، مومن غلام بہتر ہے مشرک سے اگرچہ وہ مشرکہ تم کو اچھا ہی کیوں نہ معلوم ہو۔

(البقرة ۲۲۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلم معاشرہ میں مسلم لونڈیاں یا مسلم غلام ہو سکتے ہیں۔ اور ان سے آزاد مرد و عورت کا نکاح کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مِمَّنْ قَدْ خَفِظْتُمْ أَلَّا تَقْدُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

اگر تمہیں یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، نکاح کر لو، دو سے، تین سے، چار سے، اگر یہ اندیشہ ہو کہ بیویوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا لونڈی رکھ لو۔

(النساء ۳)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ لونڈیاں رکھی جاسکتی ہیں، ان سے صحبت کی جاسکتی ہے، ان کے درمیان مساوات رکھنا بھی لازم نہیں ہے۔

۵۔ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا

تم میں سے جن لوگوں کو آزاد مومنہ عورتوں سے نکاح کا مقدور



أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ  
فَمِنْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ  
نَفْسَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَيْمَانِكُمْ  
بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَإِنْ كُنْتُمْ هُنَّ  
بِأَرْبَابِكُمْ أَهْلِينَ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ  
بِالْمَعْرُوفِ الْمُحْصَنَاتِ غَيْرِ  
مُسَافِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَحْدَانٍ  
فَإِذَا أَحْصَيْتِ فَاثْنَيْنِ بِفَاحِشَةٍ  
فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ  
مِنَ الْعَذَابِ (النساء: ۲۵)

ہو وہ مؤمنہ لونڈیوں سے نکاح کر لیں، اللہ  
کو تمہارے ایمان کا خوب علم ہے، بعض  
تمہارے بعض سے ہیں یعنی تم ایک دوسرے کے ہم جنس  
ہو، ان لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے  
نکاح کیا کرو اور قاعدہ کے مطابق ان کا مهر بھی  
دیا کرو وہ لونڈیاں پاک دامن رہیں، حقیقہ  
یا علانیہ بدکاری نہ کریں، پھر جب وہ منکوحہ  
بن جائیں، اور کوئی بے حیائی کا کام  
کر بیٹھیں تو ان کو آزاد عورتوں کی سزا کی  
نصف سزا دی جائے۔

اس آیت سے بھی ثابت ہوا کہ مسلم معاشرہ میں لونڈیاں ہو سکتی ہیں ان کے آقا ہی  
ان کے نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، ان لونڈیوں کو مهر بھی دینا چاہیے وہ اگر  
زنا کریں تو ان کو نصف سزا دی جائے۔

کیا اب بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید لونڈی غلاموں کے احکام سے خاموش ہے۔

۶۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ  
وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا  
مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

(النساء: ۲۳، ۲۴)

۷۔ وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا  
بِهِ شَيْئًا قَرِيبًا إِلَى الدِّينِ إِحْسَانًا  
..... وَمَا مَلَكَتْ

أَيْمَانُكُمْ (النساء: ۳۶)

۸۔ وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ ذُنُوبِهِمْ حَفِظُونَ  
إِلَّا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ  
أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ

(المعارج: ۲۹، ۳۰)

۹۔ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ

تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں.... اور شوہر والی عورتیں  
بھی حرام ہیں مگر لونڈیاں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں  
(یعنی وہ لونڈیاں جو میدان جنگ میں گرفتار ہو جائیں  
اور ان کے کافر شوہر دارالحرب میں زندہ ہوں)  
اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ  
کسی قسم کا شرک مت کرو، والدین کے ساتھ  
احسان کرو... اور لونڈی غلام کے ساتھ بھی احسان  
کرو۔

اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے  
ہیں سوائے بیویوں اور لونڈیوں کے، کہ  
ان کے ساتھ صحبت کرنے میں وہ ملامت  
کے مستحق نہیں۔

مؤمن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں



مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ  
..... وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ  
أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ .....  
أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ

پنچ رکھیں اور اپنی شرنگا ہوں کی حفاظت کریں  
... اور اپنی زینت کسی پر ظاہر نہ کریں، سوائے  
اپنے خاوندوں کے یا اپنے باپوں کے یا خاوند  
کے باپوں کے... یا اپنے غلاموں کے۔

(النور: ۳۱)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلم عورتیں اپنے غلاموں کے سامنے اپنی زینت کا اظہار کر سکتی ہیں،  
ان سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۔ وَلَا تُكْرِهُوا فَتِيَانَكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ  
إِنْ أَرَدْتُمْ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ  
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (النور: ۳۳)

دنیا کمانے کی غرض سے اپنی لونڈیوں کو زنا کاری  
پر مجبور نہ کرو، خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ لونڈیاں  
پاک دامن رہنا چاہیں۔

۱۱۔ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا  
مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ  
عَلِمْتُمْ فِيهِمْ مَخِيًا وَأَلُوهُمْ مِنْ  
مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ

اور جو لونڈی غلام مکاتب بننا چاہیں تو ان کو  
مکاتب بنالیا کرو بشرطیکہ تم یہ سمجھو کہ یہ  
ان کے حق میں بہتر ہے اور اللہ کے دئے ہوئے  
مال میں سے ان مکاتبین کو بھی دیا کرو

(النور: ۳۳)

۱۲۔ وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالْمَظْلُومِينَ  
مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ۔

اور جو غیر شادی شدہ ہوں ان کا نکاح کر دیا کرو  
اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو مظلوم ہوں  
ان کا بھی نکاح کر دیا کرو۔

(النور: ۳۲)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومن لونڈی، غلام کو صالح ہونا چاہیے اور یہ کہ صالح مومن بھی غلام  
ہو سکتا ہے، برق صاحب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غلاموں کو اپنے آقا کا عبد کہا ہے، اگر یہی بات  
حدیث میں ہوتی تو کیا ہوتا؟ کیا کہنے والا یہ نہ کہہ دیتا کہ کیونکہ یہ حدیث شرک کی تعلیم دیتی ہے لہذا یہ موضوع  
بے جہلی ہے، بتائیے اب اس آیت کے متعلق کیا کہا جائے۔

۱۳۔ وَلَا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا  
مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ  
..... أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

کوئی حرج نہیں اگر تم اپنے گھروں میں سے  
کھاؤ یا اپنے باپوں کے گھروں میں سے کھاؤ  
..... یا ان کے گھروں میں سے کھاؤ جن کی کنجیاں  
تمہارے ہاتھ میں ہوں۔

(النور: ۶۱)

۱۴۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ

بے شک فلاح پائی ان مومنین نے جو اپنی نماز



میں عاجزی کرتے ہیں۔۔۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے بیویوں اور لونڈیوں کے کہ ان کے بارے میں انہیں کوئی ملامت نہیں۔

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظاہریں مپھراس کی تلافی کرنی چاہیں تو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا چاہیئے۔

جو شخص قسم کھالے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ مساکین کو اوسط درجہ کا کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے۔

هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ ..... وَالَّذِينَ هُمْ لِأُوجِهِهِمْ حَافِظُونَ ۝ (الرَّاعِي) أَوْ أَجْنِهَهُمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ (المومن: ۶۱ تا ۶۵) وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِن نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحَرِّ يَوْمَ رَبَّاتٍ مِّن قَبْلٍ أَن يَسَاءَلَا

(المجادلتی: ۱-۳)

۱۶۔ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ مِّنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَبَّةٍ ۝

(المائدہ: ۱-۸۹)

غرض یہ کہ قرآن مجید میں اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں جن میں لونڈی غلاموں کے متعلق احکام بیان کئے گئے ہیں، چند آیات بطور نمونہ اوپر نقل کی گئی ہیں ان آیات سے مندرجہ ذیل احکام نکلتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:-

۱۔ لونڈی، غلاموں کی آزادی کے لئے روپیہ خرچ کرنا نیکی ہے۔

۲۔ اگر غلام کسی کو قتل کر دے تو وہ غلام ہی قتل ہوگا نہ کہ آزاد آدمیوں میں سے کوئی دوسرا شخص۔

۳۔ مسلم، لونڈی غلام ہو سکتے ہیں اور ان سے آزاد مرد و عورت نکاح کر سکتے ہیں۔

۴۔ جنگ میں گرفتار ہونے والی لونڈیوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے اور ان میں مساوات کنال لازمی نہیں نہ ان کی تعداد مقرر ہے۔

۵۔ لونڈیوں سے صحبت کی جاسکتی ہے اگرچہ وہ شوہر والی ہوں اور شوہران کے دارالحرب

میں ہوں۔

۶۔ مسلم لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔ لونڈیوں کو مہر

بھی دینا چاہیئے۔

۷۔ لونڈی غلام اگر زنا کریں تو ان کو نصف سزا ملے گی۔

۸۔ لونڈی، غلاموں کے ساتھ نیکی کرنی چاہیئے۔

۹۔ آزاد عورتیں اپنے غلاموں کے سامنے آسکتی ہیں۔



۱۰۔ لونڈیوں کو دنیا کھانے کے لئے زنا پر مجبور کرنا منع ہے، خصوصاً جبکہ وہ پاک دامن رہنا چاہیں۔

۱۱۔ لونڈی غلام کو مکاتب بنانا چاہیے بشرطیکہ اس میں بہتری ہو۔

۱۲۔ صالح لونڈی، غلام کا نکاح کر دینا چاہیے۔

۳۱۔ مالک اپنے غلاموں کے گھروں میں سے بغیر اجازت کھا پی سکتے ہیں۔

۱۴۔ ظہار، قتل خطا اور قسم کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا فرض ہے، وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ کہ اتنے احکام موجود ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن مجید میں مسلم ٹونڈی اور مسلم غلام کے وجود کا سرے سے ذکر ہی نہیں بڑی زبردست غلط فہمی ہے ۔

# ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلم دوسرے مسلم کا غلام تو ہو سکتا ہے اور اس کا وجود بے شک قرآن مجید سے ثابت ہے لیکن ایک مسلم ایک کافر کا غلام نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قرآن مجید مانناؤں دستور العمل ہے نہ کہ غلاموں کا (دوسرا سلام ص ۲۹۶) مطلب یہ کہ کوئی مسلم کبھی محکوم ہو ہی نہیں سکتا، وہ ہمیشہ حاکم ہوگا، اور کافر محکوم اور اس وجہ سے قرآن مجید میں ایسا کوئی حکم نہیں کہ مسلم اگر غلام ہو اور کافر آقا ہو، تو وہ کیا کرے اس کا جواب سنئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۱) وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ  
جس شخص نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدنا،

اِس نے اپنی بیوی سے کہا اِس کو اچھی طرح رکھنا

يَنْفَعُنَا أَوْ نَخْذَهُ الْكَذَّابُ (يوسف: ۲۱)

شاید یہ ہمارے کام آئے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔

ظاہر ہے کہ یوسف علیہ السلام فروخت ہوئے اور عزیز مصر کے ہاں بہ حیثیت غلام کے رہے کیونکہ قرآن مجید سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عزیز مصر نے ان کو بیٹا بنایا تھا چہر کیا ہوا سینے پر۔

۲۔ دَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ

حُكْمًا وَعِلْمًا

فرمایا

(یوسف - ۲۲)

اس کے بعد اس عورت کے عاشق مہرنے کا قصہ شروع ہوتا ہے پھر کیا ہوا سنئے :-

۳۔ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ  
شہر کی عورتوں نے کہا کہ عذین کی

اُمُّ اَلْعَزِيزِ تَرَاوِدْفَتْنَهَا عَجَبِ  
 بیوی اپنے غلام سے خواہش

نَفْسِہ (یوسف: ۳۰) کرتی ہے۔



اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ وہ غلام تھے ورنہ عورتیں ان کو بیٹیا کہتیں۔

۴۔ یَا صَاحِبِی السَّجْنِ ۚ اَرْبَابُ یوسف علیہ السلام نے کہا، اے قید خانہ کے  
مُتَفَرِّقُونَ خَیْرًا ۖ اَمَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ ساقیو! کیا کئی متفرق رب بہتر ہیں یا ایک  
الْقَهَّارُ ۝ (یوسف: ۳۹) اٹل زبردست۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام قید خانہ میں بھی رہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک مومن کافروں کے ہاں قید ہو سکتا ہے۔

۵۔ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَاۤئِنِ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا  
الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلَیْہُمْ ۝ کہ مجھے ملک کے خزانوں پر مامور کر دیجئے، میں  
(یوسف: ۵۵) حفیظ اور امین ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومن، کافر حکومت کا ملازم بھی ہو سکتا ہے۔

## خلاصہ

آیات بالا کا خلاصہ یہ ہوا کہ مومن غلام بھی ہو سکتا ہے، قیدی بھی ہو سکتا ہے اور محکوم بھی، مومن غلام اور مومن قیدی کے متعلق ان آیات کی روشنی میں مندرجہ ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں۔  
۱۔ مومن اگر غلام ہو جائے تو صالح زندگی گزارے، آقا کا وفادار رہے، خیانت نہ کرے، اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر رہے۔

۲۔ مومن اگر کافروں کے ہاں قید ہو جائے تو ایسے مقام میں بھی تبلیغ کرتا رہے۔  
۳۔ مومن اگر محکوم ہو جائے تو امانت داری سے اپنے حاکم کے کام کی نگرانی کرے۔

## ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے عزیزِ مصر مسلم ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ محض امکان سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی اگر وہ مومن تھا تو ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ہی ایمان لایا ہو گا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ناممکن ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کو غلام رکھے یا قیدی، اور اگر وہ کسی دوسرے پیغمبر پر ایمان رکھتا تھا اور ان کی پیغمبری کا منکر تھا تو بھی وہ کافر ہوا، اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت تک یوسف علیہ السلام نبی نہیں ہوئے تھے تو پھر یہ بتائیے کہ وہ کب نبی بنائے گئے قرآن مجید سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ جو ان مرتبے پر حکم اور علم دے دئے گئے تھے اور یہ نبوت کے خصائص ہیں سے ہے، خصوصاً حکم تو صرف نبوت ہی کا خاصہ ہے نہ کہ مومن کا، قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ دونوں الفاظ صرف انبیاء



کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔ الغرض نبوت کے بعد ہی اس عورت کے عشق اور یوسف علیہ السلام کے قید و بند کی کہانی شروع ہوتی ہے پھر تاریخ سے جس کو برق صاحب مستند سمجھتے ہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عزیز مصر بت پرست تھا اس کے مکان کے ایک طاق میں بت رکھے رہتے تھے جب اس کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو زنا کے لئے بلایا تھا تو اپنے بتوں پر پروہ لٹکا دیا تھا لہذا یہ شبہ کہ عزیز مصر مسلم تھا لغو ہے، پھر قرآن مجید سے بھی اس کا کافر ہونا ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنِّي تَزَكُّتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ  
بِاللَّهِ وَهُمْ بِأَخْوَاتِهِمْ كَاثِرُونَ  
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْنِ إِهِيْمَ  
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ  
یوسف علیہ السلام نے فرمایا میں نے اس قوم  
کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ یہ اللہ  
پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، میں تو اپنے  
آباؤ اجداد ابراہیم، اسحاق، یعقوب کی ملت کی  
پیروی کرتا ہوں۔ (یوسف ۱-۳۷، ۳۸)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ پوری قوم کافر تھی۔

## دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ

دوسرا شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ شاہِ مصر مسلم ہو تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ  
یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو اس بادشاہ کے  
دین کے مطابق قید نہیں کر سکتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کا قانون چل رہا تھا ورنہ یہ کہا جاتا کہ یوسف علیہ السلام کو جو شرعیت دی گئی تھی اس کے مطابق وہ اپنے بھائی کو قید نہیں کر سکتے تھے پھر وہ قانون بادشاہ کی طرف منسوب نہ ہوتا، بلکہ اللہ کی طرف منسوب ہوتا، دوسرے یہ کہ اس صورت میں یوسف علیہ السلام اپنی منزل من اللہ شرعیت کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتے تھے۔

## قرآن مجید سے مومنین کے قیدی ہونیکا دوسرا ثبوت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلِكِ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ  
مَنْ بَعَثَ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيِّ  
لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نَقَاتِلَ فِيْ  
آئے رسول، کیا آپ نے بنی اسرائیل کی اس جماعت  
کو نہیں دیکھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد  
اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک سپہ سالار مقرر کر



سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ  
أَنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَا تُقَاتِلُوا  
قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ  
اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ  
أَبْنَانَا

دیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں، نبی نے  
فرمایا جہاد فرض کرینے کے بعد ڈر ہے کہ تم  
جہاد نہ کرو، کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ  
کے راستہ میں نہ لڑیں، حالانکہ ہم اپنے وطن  
سے نکالے گئے اور ہماری اولاد ہم سے

چھین لی گئی۔

(البقرہ ۱۹۶-۲۲۶)

یہ یونین کی اولاد جو کفار کے قبضہ میں رہ گئی تھی کیا یہ وہاں جہاد بنانی کرتی تھی یا جہانداری؟ اگر  
مغلوب و مقهور تھے تو اسلام پر عمل کرتے تھے یا نہیں؟ ان کے متعلق قرآن مجید کیا ہدایت دیتا ہے؟ اگر کوئی  
ہدایت نہیں دیتا تو پھر بتائیے کہ قرآن مجید ایک مکمل ضابطہ حیات ہے یا نہیں۔

## تیسرا ثبوت

اب بھی اگر کچھ شبہ رہ گیا ہو تو اور سنئے:-  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحَرُّوْهُ  
رَقَبَةً مُّؤْمِنَةً وَّادِيَةٌ مُّسْلَمَةٌ إِلَى  
أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ  
مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ  
فَتَحَرُّوْهُ رَقَبَةً مُّؤْمِنَةً وَإِنْ كَانَ  
مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ  
فَدَيْتُمْ مُّسْلِمَةً إِلَىٰ أَوْلِيَٰهَا  
رَقَبَةً مُّؤْمِنَةً

جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کرے تو اس  
کو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے اور اس کے  
ورثہ کو پورا فدیہ دینا چاہیے، ہاں اگر وہ معاف  
کر دیں تو خیر، پھر اگر مقتول دشمن قوم سے ہو، لیکن  
مومن ہو، تو بھی ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے،  
اور اگر مقتول کسی معاہدہ قوم سے ہو تو بھی ایک  
مومن غلام آزاد کرنا ہوگا، اور پورا فدیہ ادا  
کرنا ہوگا۔

(النساء ۹۲)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ:-

۱۔ مومن غلام بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ مومن، دشمن و کافر قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے۔

۳۔ مومن کسی معاہدہ کافر قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دشمن قوم کا فرد تو دیہی ہوگا جو دارالحرب میں رہتا ہو، جہاں اسلامی حکومت



نہ ہو بلکہ وہاں کی حکومت، اسلامی حکومت سے برسرِ پیکار رہتی ہو تو اب بتائیے وہ مومن جو دارالحرب میں کافروں کی حکومت کے ماتحت رہتا ہے مومن ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا وہ وہاں جہانبانی کرتا ہے یا محکوم بن کر غلامی کے دن گزارتا ہے اگر محکوم بن کر غلامی میں اپنی زندگی گزارتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ مومن کبھی محکوم ہو ہی نہیں سکتا نہ مومن کو قرآن مجید محکومیت سکھاتا ہے، بلکہ جہانبانی ہی جہانبانی سکھاتا ہے کتنی بڑی غلط فہمی ہے یہ چیز خوش نما تو ضرور ہے لیکن اس کا وجود ہمیشہ ممکن نہیں، کیا مسلم ہمیشہ حاکم ہی ہوتا ہے محکوم ہو ہی نہیں سکتا؟ اس آیت کی روشنی میں اور سورہ یوسف وغیرہ کی روشنی میں یہ عقیدہ ہی سرے سے باطل ہے جو چیز آپ کو حدیث میں نظر آئی وہی قرآن مجید میں بھی موجود ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ کسی حدیث میں کسی مومن کے کافر کا محکوم یا غلام ہونے کا ذکر نہیں ہے بخلاف اس کے قرآن مجید میں مومن کے کافر کا غلام اور محکوم ہونے کی صراحت ملتی ہے۔ اگر حدیث قابلِ اعتراض ہے تو قرآن مجید کا مطالعہ فرمائیے تاکہ حدیث پر سے اعتراض خود بخود رفع ہو جائے۔

## چوتھا ثبوت

اس سلسلہ میں ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّيْنَاهُمْ اَسْلَمْنَاكَ  
ظَالِمِيْهِمْ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا اَيْنَا كُنْتُمْ  
قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ  
قَالُوْا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاَسْعٰتُ  
فَتَمَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَا لَهُمْ  
جَهَنَّمُ وَاَسْعٰتُ مَصِيْرًا ۝۱۰  
اَلْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ  
وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُوْنَ جِيْلَةً وَّلَا  
يَحْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۚ فَاُولٰٓئِكَ عَسٰى  
اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ  
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء، ۱۰ تا ۱۱)

جب فرشتے ایسے لوگوں کی روح قبض کرتے ہیں  
جو اپنی بانوں پر ظلم کرتے تھے تو کہتے ہیں تم کس  
حالت میں تھے وہ کہتے ہیں ہم ملک میں کمزور تھے  
فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم  
اس میں ہجرت کر کے چلے جاتے، پس ایسے لوگوں  
کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے  
مگر ایسے کمزور مرد، عورتیں، بچے جو کسی تدبیر  
پر قادر نہ ہوں، نہ ہجرت کی ان کے لئے کوئی سبیل  
ہو تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ معاف کر دے  
گا کیونکہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور مغفرت  
کرنے والا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلم مطلوب ہو سکتا ہے اور ایسی حالت میں محکوم و مظلوم بن کر رہ سکتا ہے، برق صاحب اس آیت پر آج کل کیسے عمل ہو سکتا ہے وہ کون سی جگہ ہے جہاں ہجرت کر کے جائیں اور پوری شریعت پر عمل کر سکیں، اور مزید برآں جہانبانی کے فرائض بھی انجام دے سکیں۔



دوسری بات یہ بھی غور طلب ہے کہ لارڈ ہیڈلے نے مسلم ہو کر کس ملک کی حکمرانی کی؟ کہاں جہان بنانی کی اور اگر وہ مسلم ہو کر بھی کافر حکومت کے محکوم بن کر رہے تو پھر مسلم ہونے سے فائدہ کیا ہوا؟ مسلم تو محکوم ہوتا ہی نہیں، اب یا تو وہ کافر ہی رہے ان کا ایمان قبول کرنا عبث رہا اور یا یہ کہا جائے کہ ایک مسلم محکوم بھی ہو سکتا ہے؟ کاش لارڈ ہیڈلے اس کا جواب دیتے۔

”آج سے تیرہ سو برس پہلے شہنشاہانِ روم بھی اس قسم کے وسائل سے کام لیتے تھے۔ انہوں نے بیشمار علماء خرید رکھے تھے جن کا کام احادیث تراشی تھا۔“ (دوا سلام ص ۲۹۸)

یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، برق صاحب نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو محدثین نے کسی احادیث تراشی کو نہیں چھوڑا، ہر ایک کی نشاندہی کر دی ہے براہِ کرم فنونِ حدیث کا گہرا مطالعہ کیجیے۔

للعبد الصالح ..... ایک نیک غلام و گنہگار کا مستحق ہے۔ اللہ کی قسم اگر جہاد و حج مانع نہ ہوتے تو موت تک غلام رہنا پسند کرتا۔  
تو گویا یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ بہترین زندگی دوسروں کی غلامی ہے، یعنی ان کے پیچھے کھینچنا اور ریلگیاں کاٹنا ..... بڑا صاف کرنا ..... لعنت ایسی زندگی ہے  
(دوا سلام ص ۲۹۸-۲۹۹)

اس حدیث کو سمجھنے میں برق صاحب کو دو مغالطہ ہوئے پہلا مغالطہ تو یہ کہ جو الفاظ راوی حدیث کے تھے، ان کو برق صاحب نے حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا دیا۔ دوسرا مغالطہ یہ کہ راوی کا جو منشاء تھا اسے صحیح طور پر سمجھ نہ سکے۔

## پہلا مغالطہ

یہ قول کہ ”اللہ کی قسم اگر جہاد و حج مانع نہ ہوتے تو میں موت تک غلام رہنا پسند کرتا“ حدیث نہیں ہے بلکہ راوی کا قول ہے صحیح مسلم میں راوی کا قول ہونے کی صراحت موجود ہے، کاش برق صاحب تحقیق کر لیتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

## دوسرا مغالطہ

راوی حدیث نے ایسا کیوں کہا؟ اس سلسلہ میں کچھ احادیث سینے۔  
۱۔ غلام سے اتنا ہی کام لیا جائے جتنی وہ طاقت رکھتا ہو۔ (صحیح مسلم)



۲۔ متارے غلام متارے بھائی ہیں پس غلام کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو اس کو تکلیف دہ کام کرنے کے لئے نہ کہو، اگر کہو تو اس کی مدد کرو (صحیح بخاری و صحیح مسلم) گویا اس مشکل کام میں آقا اور غلام دونوں شریک ہوں۔

۳۔ جب خادم کھانا لے کر آئے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ (صحیح مسلم)

۴۔ غلام اگر اپنے مالک کی خیر خواہی کرے، اور اللہ کی عبادت اچھی طرح کرے تو اس کو دوسرا ثواب ہے (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

۵۔ جو شخص غلام کو طمانچہ مارے اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دے (صحیح مسلم)

۶۔ حضرت ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا میں نے کہا یہ اللہ کے لئے آزاد ہے، آپ نے فرمایا اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ میں جلتے (صحیح مسلم) ، ایک شخص نے پوچھا کہ خادم کو کتنی مرتبہ معاف کیا جائے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ۔ (رواہ ابوداؤد و الترمذی و حسنہ)

۸۔ اگر غلام سے نباہ نہ ہو سکے تو اس کو بیچ دو اور اللہ کی مخلوق کو تکلیف نہ دو۔ (ابوداؤد، و رواۃ ثقات۔ تفسیر)

یہ ہیں غلاموں کے حقوق مسلمین نے ان پر عمل کر کے دکھایا غلام اپنے مالکوں سے اتنی محبت کرنے لگے کہ آزاد ہو جانے کے باوجود انہوں نے اپنے مالکوں کو نہیں چھوڑا۔ ان ہی کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر مسلم ناز کر سکتے ہیں یہ ہے ان کا ضابطہ جس ضابطہ کے ماتحت وہ غلاموں کو رکھتے ہیں، کیا کوئی اور ایسی قوم ہے جو اس ضابطہ احادیث کے موافق اپنا ضابطہ بنا سکے اور پھر اس پر عمل بھی کر کے دکھا دے، افسوس جو چیز احادیث میں قابلِ فخر ہے آپ اسی پر اعتراض کرتے ہیں، غلاموں کا وجود آپ کو اچھا معلوم نہیں ہوتا، بالکل صحیح، ٹھیک اسی طرح اسلامی شریعت کو بھی غلاموں کا وجود اچھا معلوم نہیں ہوتا، اور اسی لئے شریعت نے موقع بموقع غلاموں کا آزاد کرنا فرض کر دیا، اور دیگر مواقع پر ترغیب دے کر اس کو بہت ہی بڑا نیک عمل بنا دیا۔ ان کو آزاد کرنے کی فضیلت میں بہتر احادیث موجود ہیں۔

## خلاصہ

خلاصہ یہ ہوا، کہ ۱۔

۱۔ غلام اگر نیک اور صالح ہو تو اسے دوسرا اجر ملے۔

۲۔ لونڈی زنا کرے تو اس کو نصف مرزادی جائے۔



۳۔ غلام اسی طرح رہے کھائے اور پئے جس طرح مالک  
بتائیے یہ زندگی کیا بُری ہے کہ دوسرا اجر اور نصف منرا، اور کھانسنے پینے کی تکلیف نہیں، بے فکری،  
دل جمعی، مساوات، کون ہے جو اس ضابطہ پر قربان نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ راوی کی زبان سے یہ الفاظ  
نکل گئے، یہ تو بہت ہی عمدہ زندگی ہے، کہ ایک مسلم کی غلامی میں دن کٹ جائیں، دنیا کا فکر نہ ہو، اور  
عاقبت سدھر جائے۔

یہ راوی کی ایک نیک خواہش ہے اور آپ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، راوی دین و دنیا  
میں سکون و بے فکری کی زندگی کا اشتیاق ہے، اور اس سکون و بے فکری کی خواہش وہ کر رہا ہے، کیا  
دین و دنیا میں سکون تلاش کرنا کوئی شایع فعل ہے اگر نہیں تو پھر راوی کی اس پاکیزہ خواہش پر اعتراض کرنا فضول  
ہے اس کو اس سکون کے لئے غلامی کی زندگی کو پسند کرنا پڑا۔ غلامی کی زندگی اس سکون و بے فکری  
کا محض ایک وسیلہ ہے لہذا ایک بہت بڑے مقصد کے پیش نظر راوی نے غلامی کی زندگی کا اشتیاق  
ظاہر کیا۔ لیکن ایک اس سے بھی زیادہ بڑے مقصد کی خاطر اس سکون و زندگی کو قربان کر دیا اور آزاد رہنے  
ہی کو ترجیح دی، گویا راوی کے نزدیک بھی آزادی کو غلامی پر ترجیح ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ برق صاحب کیا  
سمجھ بیٹھے، عاقبت کی فکر، قیامت کی دہشت، خوفِ اللہ، یہ چیزیں بعض اوقات انسان کو ایسی  
خواہش کی طرف راغب کر دیتی ہیں کہ جس میں عاقبت کی فکر سے نجات مل جائے کوئی بھول بن جائیگی خواہش  
کرتا ہے اور کوئی پتی۔ کوئی کتنا ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بچھ گیا ہو  
برق صاحب راوی تو مسلم کی غلامی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے اور آپ اس کو غیروں کی غلامی  
کی طرف کھینچ رہے ہیں کہاں مسلم کی غلامی اور کہاں کافر کی غلامی، آپ نے دونوں کو گڈ مڈ کر دیا، مسلم  
کی غلامی راحت ہی راحت ہے، کافر کی غلامی عذاب ہے، لعنت ہے، راوی تو مسلم کی غلامی کی خواہش  
کرتا ہے لیکن پھر بھی اس نے غلامی کو اختیار نہیں کیا، آزادی ہی کو ترجیح دی، یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی کسی  
وقت یہ کہہ دے کاش میں بھول ہوتا تاکہ لوگوں کے کام آتا، پھر مرجھا کر نابود ہو جاتا نہ حساب ہوتا نہ کتاب،  
نہ عاقبت کی فکر ہوتی نہ دنیا کے مصائب میں الجھتا، لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ ایسا کہنے والا بھول بنا ہی  
پسند کرتا ہے۔ اور انسانی زندگی پر اس کو ترجیح دیتا ہے نہیں ہرگز نہیں یہ آرزو ہونا اور وہ بھی کسی خاص  
مقصد کی خاطر اور بات ہے اور حقیقت اسے پسند کرنا اور بات ہے، اس کی یہ نیک خواہش دراصل درس  
عبرت ہے جو دوسروں کو بھی عاقبت کی فکر کی طرف راغب کرتی ہے غلامی کی خواہش کی طرف نہ جلیے  
یہ خواہش درسِ عبرت ہے، کہ انسان دنیا اور آخرت کے سکون کا تلاشی رہے، عیش و راحت میں اللہ  
تعالیٰ کو نہ بھول جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والے عیش و آزادی سے ایسی غلامی کو ترجیح دے جو



اللہ تعالیٰ کا بندہ بنا دے، برق صاحب راوی کی یہ خواہش خائدہ اٹھانے کی چیز ہے نہ کہ اعتراض کرنے کی۔

**غلط فہمی** ”مچھکار اس جعل ساز پر جس نے یہ حدیث تراش کر اسلام کے بنیادی مقصد پر اس قدر خوف ناک حملہ کیا، اور مسلمانوں کو سر پر جہا بنانی سے اٹھا کر غلامی کے متعفن سنڈاس میں پھینکنے کی کوشش کی“ (دو اسلام ص ۲۹۹)

**ازالہ** حدیث تو یہ ہے نہیں! راوی کا قول یہ ہے لہذا مجلس سازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہاں یہ سوچئے کہ نبی ہو، اور قید میں رہنے کی خواہش کر رہا ہو۔ حکومت کی زندگی گزارنا پسند کئے اور ملازم ہو جائے اور اپنے حاکم کے قانون پر چلتا رہے، کیا یہ زندگی کسی نبی کے شایان شان ہے؟ کیا یہ زندگی آپ کو پسند ہے؟ اگر پسند نہیں تو پھر قرآنی آیات (یعنی سورہ یوسف) کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا آپ کو یہ پسند ہے کہ ٹومن ہو کر دارالحرب میں رہے کمزوری دے سبی میں زندگی گزارے یا اسلامی حکومت کے معاہدہ کا نزوم میں اپنی زندگی گزارے، ان کا محکوم بن کر رہے ان کے قانون کی اطاعت کئے۔ اگر یہ باتیں آپ کو پسند نہیں تو پھر سورہ نساء کی مذکورہ بالا آیات کے متعلق کیا خیال ہے، اور ان آیات کے متعلق کیا خیال ہے جن آیات میں بنی اسرائیل کے غلام ہونے کا ذکر ہے، لڑکیوں کے قتل کا ذکر ہے، اولاد کے چھینے جانے کا ذکر ہے، مسلمان کی بے بسی اور لا چاری کا ذکر ہے، بتائیے کیا وہ مسلم تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو ان کی جہا بنانی کہاں چلی گئی؟

برق صاحب اگر غلط فہمی ہو جائے تو اعتراض کرنے سے پہلے سوچ لیا کیجئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اعتراض کی زد دور تک پہنچ جائے یا کہیں دارالٹا آ پڑے، یوسف علیہ السلام کا قید و بند کی زندگی کو ترجیح دینا اس لئے تھا کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتے تھے۔ گویا ایک مبارک مقصد کی خاطر ایک گری ہوئی زندگی کو انہوں نے پسند کیا۔ اسی طرح تبلیغ اسلام کی خاطر انہوں نے محکوم بننا پسند کیا اور وزارت مائیت و زراعت کے عہدہ کی خواہش کی۔ گویا تبلیغ اسلام کے مبارک مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ایک گری ہوئی محکومیت کی زندگی کو پسند کیا، اگر مبارک مقاصد کی برآری کے لئے ایک پست قسم کی زندگی کو اختیار کرنا قابل اعتراض ہے تو پھر برق صاحب یہ اعتراض قرآن مجید پر ہوگا۔ اب سوچ لیجئے، اور اگر مبارک مقاصد کی خاطر ان آیات کی روشنی میں محکومیت اور قید و بند کی زندگی کو اختیار کرنا عیب نہیں بلکہ نیک عمل ہے تو پھر ایک مبارک مقصد کی خاطر غلامی کی زندگی کی خواہش کرنا کون سا عیب ہے کہ اس پر اعتراض کیا جائے۔

برق صاحب جب آپ گھڑی ہوئی احادیث نقل کر رہے تھے تو ہم بھی آپ کے ساتھ تھے لیکن اب تو آپ صحیح احادیث نقل کر رہے ہیں اور صرف اس وجہ سے آپ ان پر اعتراض کر رہے ہیں کہ ان کا منشاء



نہیں سمجھے اور منشاد اور مطلب صرف اس لئے نہیں سمجھ سکے کہ قرآن مجید کو آپ نے غور سے نہیں پڑھا کوئی صحیح حدیث کسی قرآنی آیت کے خلاف نہیں ہاں غلط فہمی کی تو بات ہی دوسری ہے۔

## غلامی کا انسداد

غلامی کے انسداد کے متعلق کچھ لکھنا اگرچہ ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم بعض لوگوں کے شبہ کے ازالہ کی خاطر اس مسئلہ کو بھی ہم واضح کر رہے ہیں اسلام کسی آزاد کو زبردستی غلام بنانے کی اجازت نہیں دیتا نہ کسی آزاد کو بچکر غلام کی حیثیت سے بچنے کی اجازت دیتا ہے حدیث میں اس کی سخت ممانعت ہے لہذا کسی آزاد کو غلام بنانا یا اس کو بچنا تو مسلم کے لئے قطعاً حرام ہے اور نہ کوئی اسلامی حکومت اس بات کی اجازت دے سکتی ہے کہ اس کے ملک میں آزاد لوگوں کو بچکر اغوا کیا جائے، اور پھر ان کو غلام بنایا جائے اور بیچا جائے لہذا یہ جو مسائل قرآن و حدیث میں غلاموں کے متعلق بالتفصیل پائے جاتے ہیں ان لوگوں کے متعلق ہیں جو پہلے سے غلام چلے آ رہے ہوں یا اسلام کے جنگی قوانین کے ماتحت غلام بنائے جائیں، اس رسم کا کلی انسداد اس لئے نہیں کیا گیا کہ۔

۱۔ دارالحرب میں اس پر پابندی لگانا اسلامی حکومت کے اختیار میں نہیں، وہاں اگر آزاد کو بچکر غلام بنایا جائے اور پھر اتفاقاً اس غلام کو اسلامی حکومت میں لاکر بیچا جائے، تو اب اس پر پابندی لگانا اسلامی حکومت کے اختیار میں ہے، حکومت چاہے تو غلاموں کی درآمد بند کر دے اور چاہے تو درآمد کی اجازت دے دے، لیکن اجازت دے دینا زیادہ مناسب ہے اور اس کے بہت سے دہرے ہیں۔

۲۔ اگر وہ اسلامی حکومت میں نہ بیچ سکیں گے تو پھر کسی کافر حکومت میں بیچیں گے اور لانا وہ ایسا کریں گے اس لئے کہ ان کا تو پیشہ یہی ہے لہذا ایک فرد جو ایک اسلامی معاشرہ میں رہ کر اسلامی معاشرہ کا ایک فرد بننے والا تھا مسلمین اس سے محروم ہو گئے اسلامی ممالک میں ان کا خرید لینا ہی مناسب ہے تاکہ مسلمین کی تعداد بڑھتی رہے۔ ایک کافر جو اگر اسلامی حکومت میں نہ خریدا جاتا تو کافر ہی مرتا اور ابدی عذاب میں گرفتار ہوتا، اس ابدی عذاب سے اس کو نجات دلانا انسانی و اسلامی فریضہ ہے پھر تبلیغ اسلام بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے اگر اس تبلیغ کا ایک ذریعہ یہ بھی ہو کہ کوئی شخص اسلامی معاشرہ میں چند دن گزار کر مسلم ہو جائے اور پھر اسلامی قانون کی رُو سے وہ بہت جلد آزاد بھی ہو جائے تو یہ کیا بُرا ہے۔ ایسے غلام کو خرید لینا ہی بڑے دررس نتائج و مصالح کا حامل ہے اور یہ اس مسئلہ کا دینی پہلو ہے۔

دوم درودہ فروش غلاموں کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا سلوک کرتے ہیں، لونڈیوں کو پیچتے ہی نہیں



بلکہ ان کے ساتھ ہر قسم کی نازیبا حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں اور کراتے ہیں ایک ہی لونڈی مختلف مقامات اور مختلف لوگوں کے ہاتھ بچی جاتی ہے اور پھر وہ کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے، ہر جگہ، ہر خریدنے والا، اس کی عصمت کو خراب کرتا ہے اگر کوئی مسلم کسی ایسی لونڈی یا کسی مظلوم غلام کو خرید لے تو اس کے ساتھ یا احسان ہوگا، ظلم و استبداد کے بیچ سے اسے نجات ملے گی۔ مومن کی غلامی کے زیر سایہ اسے راحت و سکون اور پاک دامنی کی زندگی میسر ہوگی، کھانے، پینے اور لباس کے لحاظ سے اس میں اور آقا میں کوئی امتیاز نہیں ہوگا لہذا ایسے مظلوم غلام یا لونڈی کو خرید لینا انسانیت پر احسانِ عظیم ہے یہ ہے اس کا اخلاقی پہلو۔ سوم۔ دوسرے نکاح پر قرآن مجید بھی پابندی لگاتا ہے اور برادری کا رسم و رواج بھی، کوئی شخص یہ مشکل ہی پہلی بیوی کی موجودگی میں اپنی بیٹی کو زوجیت میں دینا گوارا کرے گا اس طرح یہ ہوگا کہ مسلم صرف ایک ہی بیوی کر سکیں گے۔ لونڈی کے سلسلہ میں یہ پابندی نہیں لہذا باآسانی لونڈی کو اپنی زوجیت میں لیا جاسکتا ہے۔ اس طرح تکثیرِ آبادی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اگر مسلم اس تکثیرِ آبادی کے مسئلہ کو اہمیت دیتے اور یک وقت کئی نکاح کرتے رہتے تو آج ہندوستان میں انکی اکثریت ہوتی اور وہ کسی علاقہ سے نکالے نہ جاتے، حکومت انہی کے قبضہ میں رہتی، یہ ہے اس مسئلہ کا سیاسی پہلو۔

۲۔ جہادِ قیامت تک کے لئے فرض ہے لہذا میدانِ جنگ میں قیدیوں کا مسلمین کے قبضہ میں آنا ہمیشہ جاری رہے گا اور کیونکہ یہ چیز بند ہونے والی نہیں لہذا غلامی کا کلی انسداد بھی نامناسب ہے یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے انہیں غلام بنایا ہی نہ جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے کرنے کا ہے، نہ کہ ہمارے کرنے کا، ہم تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں اب رہی یہ بات کہ آخراں میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت ہے تو اپنی مصلحت کو وہ خود ہی خوب جانتا ہے، ہماری سمجھ میں صرف ایک بات آتی ہے کہ اس طرح غلام و لونڈی کی حیثیت سے کافروں کو اپنے پاس رکھنا تبلیغِ اسلام کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ مسلمین کی صحبت میں رہنے والے غلام الا ماشاء اللہ سب کے سب مسلم ہو گئے، اور مسلم آقاؤں کے اخلاق و کردار سے اتنے متاثر ہوئے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی آقا کی خدمت سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کیا، ان ہی کی صحبت میں رہے، علم دین حاصل کیا، انہی میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جو علم و فضل میں آفتاب و ماہتاب بن کر چکے اور دین کے سچے خدمتگار ثابت ہوئے غلام بن کر آئے تھے اور مسلمین کے امام بن کر دنیا سے گئے۔

یہی وجہ ہیں جن کی بنا پر غلامی کا کلی انسداد نہیں کیا گیا، کچھ عرصہ ہوا کہ غلامی کے سلسلہ میں ایک صاحب سے گفتگو ہوئی، کافی بحث ہوئی، لیکن وہ اس مسئلہ کو اسلام کے لیے باعثِ ننگ ہی سمجھتے رہے، اسی گفتگو کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک نام نہاد اسلامی مملکت کے خاص دارالحکومت میں ایک شخص اپنی سالی کو اغوا کر کے لایا اور اس کے ساتھ ناروا حرکات کا مرتکب ہوتا رہا، اس کو چکے میں بٹھانے



پر مجبور کرتا رہا، پھر کچھ دن بعد ایک بڑے افسر کے ہاں ملازم رکھ کر چلا گیا اس عورت نے کچھ سکون کا سانس لیا، مہینہ بھر بعد پھر آیا اس کو زبردستی تانگہ میں سوار کیا وہ روتی رہی چلاتی رہی، لیکن وہ دن دھاڑے افسروں کی بستی میں سے اسے کشاں کشاں لے گیا اور وہ سب دیکھتے رہے، اور حالات سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس عورت کی امداد نہ کر سکے، بالآخر ایک صاحب نے اسے خرید لیا، اور اس طرح اس کی جان بچی۔

اب بتائیے، یہ عورت ظلم ناروا اور بد فعلی کی لعنتوں سے بچ کر اگر ایک شخص کے رحم و کرم کے زیر سایہ اسلامی قانون کے عطا کردہ اختیار و جواز سے اس کی مانتی میں رہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے یا اس ظالم کے ماتحت چکے میں بیٹھنا اس کے لیے بہتر ہے؟ اس واقعہ کے بعد پھر ان صاحب سے گفتگو ہوئی اب وہ اس مسئلہ کی اہمیت کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے کہ بیشک ایسے حالات میں لونڈی یا غلام کا خرید لینا بہت ضروری ہے، اور اس لونڈی یا غلام کے لئے یہ غلامی بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر ایسے مالک میں اور ایسے حالات میں لونڈی، غلام کو نہ خریدا جائے۔ تو یہ انسانیت پر ظلم ہوگا۔

## غلاموں کی رہائی کیلئے اسلام نے کیا کیا

مسلمین کو یہ تو اجازت دی گئی ہے کہ وہ غلام خرید لیں یا میدان جنگ کے قیدیوں کو غلام بنا لیں لیکن پھر اسلام نے سمجھ ہی سمجھان کی آزادی کے ذرائع بھی فراہم کر دیے، بلکہ بعض حالات میں ان کی آزادی کو فرض قرار دیا۔ اب اگر کسی مسلم کے قبضہ میں کوئی غلام آجاتا ہے تو اس کے لئے دو ہی صورتیں ہوتی ہیں:-

اول:- یا تو اسے آزاد کر دے اور قرآن و حدیث میں اس کی ترغیب ہے۔ مسلم اس ترغیب سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ اور سینکڑوں غلام آزاد ہوتے رہے ہیں۔

دوم:- اسے غلام بنا کر رکھے، ایسے غلام کو آزادی کی منزل تک پہنچانے کے لئے بھی اسلام نے بہت سی سہولتیں مہیا کی ہیں مثلاً:-

ظہار، قسم، قتل خطا وغیرہ کے کفارہ میں غلام آزاد کیا جائے۔

غلام کو طمانچہ مارے تو اسے آزاد کر دے۔

لونڈی سے بچہ پیدا ہو جائے تو آقا کی وفات کے بعد وہ آزاد ہے آقا کی زندگی میں بھی اس

کو بیچنا منع ہے۔

سورج گھن کے موقع پر غلام آزاد کیا جائے۔



پھر مدبر اور مکاتب کرنے کی تدابیر بتائی گئیں۔

غرض یہ کہ ان کی آزادی کے لئے کئی ذرائع مہیا کر دئے، اور اگر وہ آزاد نہ بھی ہوں، تو ان کے ساتھ نیک سلوک کی دھتتیں فرمائی گئیں۔ مثلاً:

جو آقا اپنے وہی اسے پہنایا جائے، جو آقا کھائے وہی وہ کھائے اور آقا کے ساتھ بیٹھ کر کھائے اس کو بچان سمجھا جائے۔ اس کو مارا نہ جائے، اس کو ہلکا کام دیا جائے، اگر مشکل کام دیا جائے تو آقا اس کے ساتھ کام کر کے اس کی مدد کرے، وہ صالح ہو تو اس کا نکاح کر دیا جائے، وہ گناہ کر بیٹھے تو سزا اُدھی ملے، نیکی کرے تو دوسرا اجر پائے، دنیا کی فکر سے آزاد ہو۔

یہ ہے مومن کے غلام کی زندگی! کیوں نہ اس پر آزادی نثار ہو اور کیوں نہ کسی راوی کے دل میں یہ خواہش گزرے کہ میں غلام ہوتا تو کیا اچھا ہوتا، مسلم جب غلام کو خریدتا ہے تو صرف ظلم ہی سے اس کو نجات نہیں دیتا بلکہ اس کو یہ زندگی عطا کر کے اس کے لئے جنت کا سماں پیش کرتا ہے، کیا مسلمین کو روک دیا جائے کہ وہ مظلوموں کو ایسی زندگی عطا کرنے سے باز رہیں اگر ایسا کیا جاتا تو یہ انسانیت پر ظلم کے مترادف تھا اور بے رحمی کا انتہائی خوف ناک مظاہرہ۔

اسی وجہ سے اسلام نے غلامی کو کلیتہً مسدود نہ کر کے عاقبت اندیشی کا ثبوت دیا، نا عاقبت اندیش ہیں وہ لوگ جو غلامی کو ظاہری نگاہ سے دیکھتے ہیں نہ اس کے دینی پہلو پر غور کرتے ہیں نہ اخلاقی و انسانی پہلو پر، اور اسلام پر اعتراض کرنے لگتے ہیں کاش اعتراض سے پہلے وہ برسہ پر کافی غور و خوض کر لیتے۔

## نوٹ

صفحہ نمبر ۲۹۲ پر برق صاحب نے ایک حدیث کے متن کا کچھ حصہ چھوڑ دیا ہے، اور نیچے حاشیہ پر لکھا ہے کہ ”یہ لفظ نہ پڑھ سکا“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب نے حدیث کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ لفظ کیا ہے جو ان سے پڑھا نہیں گیا مگر اگر صحیح بخاری میں پڑھانہ جاسکا تھا تو کیا حدیث کی کسی کتاب میں پڑھانہ گیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب باوجود ڈاکٹر ہونے کے تحقیقات سے روگردانی کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غلط فہمیاں موبجاتی ہیں، ابتدا نہیں ہدایت دے اور معاف فرمائے۔



# باب ۱۷

## تقدیر

### غلط فہمی

اس مضمون پر قرآن میں بیسیوں آیات موجود ہیں اور نوع انسانی کی ہزار ہا سالہ تاریخ پکار پکار کہہ رہی ہے کہ یہ دنیا دار المکافات ہے، جہاں صرف اپنی محنت کام آتی ہے اور بے عمل، بد عمل، کاہل اور سہل انگرا افراد و اقوام کا انجام ذلت و رسوائی کے بغیر اور کچھ بھی نہیں (دوا سلام ص ۳۱۷) یہ محال تقدیر کا قرآنی تخیل، اب ذرا ”حدیثی تخیل“ ملاحظہ ہو۔

حضور فرماتے ہیں کہ لطفہ رحم میں پہنچ کر چالیس دن کے بعد منجبد سا خون بنتا ہے مچھروہ لو تھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے کہ جاؤ اور لو تھڑے کے اعمال زندگی، رزق، موت اور سعادت و شقاوت کا فیصلہ بھی لکھ لو۔ اور اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

اس حدیث تراش نے یہ نہ بتایا کہ جب ایک شخص کے اعمال، رزق اور سعادت کا فیصلہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی ہو جاتا ہے تو پھر اللہ نے انسانی ہدایت کے لئے پیغمبر کیوں بھیجے (دوا سلام ص ۳۱۷)۔

برق صاحب یہ بتائیے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بچہ کو پیدا کرتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا ہے کہ بچہ دنیا میں کیا کرے گا یا علم نہیں ہوتا اگر علم نہیں ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں، یہ تو ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کو علم ہوتا ہے تو پھر یہ بتائیے کہ یہ علم ہونا اس انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس کے علم کے مطابق کام کرے، اگر مجبور کرتا ہے تو لکھ لینے کا پھر کیا قصور رہا، اور اگر یہ علم مجبور نہیں کرتا، تو پھر اس کا قبل از وقت لکھ لینا بھی مجبور نہیں کرتا۔ لہذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک و صاف ہے،

### ازالہ



اب اس حدیث کی تائید میں قرآنی آیات سنئے، بعد میں ہم بتائیں گے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

۱۔ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ

مَا نَسْقُطُ مِنْ دَرَقَةٍ إِلَّا یَعْلَمُهَا

وَلَا حَبَّتِ فِی ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ

وَلَا یَاسٍ إِلَّا فِی کِتَابٍ مُّبِیْنٍ ۝

رَآلْ نُّعَامُ ۝ (۵۹)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے علم میں ہر چیز ہے لہذا اس کو یہ بھی علم ہوگا کہ بندہ اپنی زندگی میں

کیا کرنے والا ہے اسی علم کی بنا پر اس نے سب کچھ لکھ لیا ہے اب اگر لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہونے پر

اعتراض نہیں تو بوقتِ پیدائش قسمت میں لکھا جانے پر کیا اعتراض ہے۔

۲۔ وَ اِنَّ مِنْ قُوَّةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا

قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ اَوْ مَعَذِبُوهَا

عَذَابًا شَدِیدًا کَانَ ذٰلِكَ فِی

الْکِتَابِ مَسْطُوْرًا ۝

رَبِّیْ اَسْرَ اَتَمِلُ ۝ (۵۸)

۳۔ مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی

الْاَرْضِ وَلَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ

مِّنْ قَبْلِ اَنْ تُعْبِرَ اَهَا اِنَّ ذٰلِكَ

عَلٰی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝

(الحدید: ۲۲)

بتائیے جو مصیبت پہلے سے لکھی ہوئی ہے وہ تو آکر رہے گی اس کو ٹالنے کی کوشش بے سود

ہے، اگر وہ ٹل جائے تو اللہ کا علم ناقص ہو جائے گا اور یہ ناممکن ہے۔

۴۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا

فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ

فِیْ کِتَابٍ (الحج: ۷۰)

۵۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا

عَلٰی اللّٰهِ رُقُوعُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرُّهَا

وَمُسْتَوْدَعُهَا کُلٌّ فِیْ کِتَابٍ

کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کو علم ہے ہر اس چیز

کا جو آسمان میں ہے اور زمین میں ہے اور یہ

سب کتاب میں مسطور ہے۔

زمین میں رہنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے

ذمہ ہے، وہ جانتا ہے کہ کہاں اس کا مستقر ہے

اور کہاں اس کی آخری آرام گاہ

میں ہے اور جو پتہ گرتا ہے اس کا بھی اس کو علم

ہے، زمین کے اندھیروں میں جو دانہ پڑا ہوا ہے وہ

بھی اسے معلوم ہے اور کوئی خشک و تر چیز ایسی

نہیں جس کا حال لوح محفوظ میں نہ ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے علم میں ہر چیز ہے لہذا اس کو یہ بھی علم ہوگا کہ بندہ اپنی زندگی میں

کیا کرنے والا ہے اسی علم کی بنا پر اس نے سب کچھ لکھ لیا ہے اب اگر لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہونے پر

اعتراض نہیں تو بوقتِ پیدائش قسمت میں لکھا جانے پر کیا اعتراض ہے۔

کوئی بستی ایسی نہیں جس کو ہم قیامت

سے پہلے ہلاک نہ کریں یا عذاب شدید

میں مبتلا نہ کریں، اور یہ سب کچھ لوح محفوظ

میں لکھا ہوا ہے۔

جو مصیبت دنیا میں آتی ہے یا خود تم کو پہنچتی

ہے وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے

کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور بے شک

یہ چیز اللہ کے لئے آسان ہے۔



مُبَيَّنٌ ۵ (ہود: ۱-۶) ہے، یہ سب کچھ روشن کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

اب اگر رزق بھی لکھا ہوا ہے تو پھر اس کی زیادتی کے لئے جدوجہد کیا معنی !!

۶۔ وَ اِنْ تَرَوْا شَيْئًا فَالْحِصْنُ نَا  
خَوَاتِنُهُ وَمَا نُنْزِلُ لَكُمْ اِلَّا بِقَدَرٍ  
مَّعْلُومٍ ۵ (الحج: ۲۱) کرتے ہیں۔

اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں  
اور ہم مقررہ مقدار ہی میں اس چیز کو نازل  
کرتے ہیں۔

اگر مقدار مقرر ہے تو پھر اس کی زیادتی کے لئے جدوجہد بیکار ہے۔

۷۔ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَأَخْتَلَفْتُمْ  
فِي الْمِيْعَادِ وَلَكِنْ لِّيَقْضِيَ اللَّهُ  
أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا (انفال: ۳۲)

اور اگر تم وعدہ کرتے تو وعدہ میں اختلاف ہو  
جاتا اور پھر یہ کام نہ ہوتا، لیکن اللہ کو وہ کام  
کرنا تھا جس کا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تحریر کردہ فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لئے ایسے حالات  
پیدا کر دیئے کہ مسلمان اور کافروں کے مابین لڑائی ہو کر رہی یہ تحریر کردہ فیصلہ اور اس کے لئے حالات کو  
سازگار بنا تاقدیر ہی تو ہے اور یہی حدیث میں ہے:-

۸۔ لَوْ اَنَّ كِتَابَ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ  
لَمَسَّكُمْ فِيْهَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ  
عَظِيْمٌ (الانفال: ۱-۶۸)

اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے سے نہ لکھا ہوتا  
تو جو فدیہ تم نے لیا، اس پر عذاب عظیم  
نازل ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز تھی، جو لکھی ہوئی تھی۔ اگر یہ بات لکھی ہوئی تھی کہ ہم معاف کریں  
گے تو گویا یہ معافی ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی اور غالباً اسی وجہ سے عذاب ٹال دیا گیا، غرض یہ کہ  
اس میں تقدیر کے لکھے جانے کا ثبوت ہے۔

۹۔ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي  
الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِمَّا نَّوْهٰى  
الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى  
اَمْرِیْ ۵ (یوسف: ۱-۲۱)

اس طرح ہم نے یوسف (علیہ السلام) کو ملک  
میں مھکا نا دیا، یہ اس لئے کہ ہمیں اس  
کو احادیث کا علم سکھانا تھا اور اللہ تعالیٰ اپنے  
کام پر غالب ہے۔

یعنی بھائیوں نے تو یوسف علیہ السلام کی ذلت کے لئے کیا کیا تدبیریں کیں لیکن اللہ تعالیٰ  
نے جو فیصلہ کر لیا تھا کہ ایسا کرنا ہے وہ کر کے رہا اور ان کی تمام تدابیر بے کار ثابت ہو گئیں،  
انہیں علم ملنا تھا، وہ مل کر رہا، انہیں نبوت ملنی تھی، وہ مل کر رہی، انہیں  
حکومت و عزت ملنی تھی وہ مل کر رہی، تقدیر کا کتنا واضح ثبوت ہے اور تدبیر کی ناکامی کا  
کتنا زبردست مظاہرہ۔



۱۰۔ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ  
اللَّهُ لَنَا

اے رسول کہہ دیجیے کہ ہم کو کوئی مصیبت  
نہیں پہنچ سکتی، مگر جو اللہ نے ہمارے لئے

(التوبہ: ۵۱)

اس آیت میں تقدیر کا کتنا گھلا ثبوت ہے اور حدیث مذکور کی کتنی زبردست تائید ہے "تِلْكَ  
عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ" اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن سے تقدیر کا ثبوت ملتا ہے معلوم نہیں برق صاحب نے  
ان آیات کا مطالعہ کیوں نہیں فرمایا۔

## تقدیر کا فائدہ

تقدیر سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ہم مجبور ہیں لہذا تدبیر کی ضرورت نہیں تو یہ تقدیر کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے،  
نہ تقدیر کے مسئلہ کا یہ صحیح استعمال ہے ہاں اس کا ایک صحیح استعمال ہے اور وہ خود اللہ تعالیٰ نے  
بتایا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ  
وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِمَّنْ  
قَبْلَ أَنْ نَبْزُوهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ  
يَسِيرٌ ۚ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ  
وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا  
يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۚ

جو مصیبت دنیا میں آتی ہے یا خود تم کو پہنچتی  
ہے وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب  
میں لکھی ہوتی ہے تاکہ کوئی نقصان ہو جائے  
تو تمہیں افسوس نہ ہو، اور جو چیز اللہ تمہیں  
دے اس پر اترنا نہ جاؤ کیونکہ اللہ اترانے  
والے، تکبر کرنے والے کو پسند نہیں

کرتا۔

(الحديد: ۲۲، ۲۳)

اس آیت سے تقدیر کا استعمال معلوم ہو گیا وہ یہ کہ نقصان ہو جائے تو یہ نہ ہو کہ بس اس غم  
میں اپنے آپ کو گھلا دیں بلکہ یہ کہہ کر تسلی کر لیں، کہ نقصان ہو گیا تو کیا ہوا، تقدیر میں ایسا ہی ممقا  
اور اگر کوئی نعمت مل جائے تو یہ نہ سمجھے کہ یہ نعمت میری قابلیت کی بنا پر مجھے ملی ہے جیسا  
کہ قارون نے کہا تھا پھر وہ اس پر اترانے لگے اور اللہ تعالیٰ کو مہول جائے بلکہ اس طرح کہے کہ یہ  
سب کچھ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، میں کس قابل ہوں، یوسف علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے  
نعمت الہی پانے کے بعد اسی قسم کے الفاظ کہے تھے اور یہ الفاظ قرآن مجید میں موجود ہیں۔

## تقدیر کا اصلی مفہوم

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنا پر جو کچھ ہونے والا تھا وہ سب نکلے لیا ہے ہوتا سب کچھ اگرچہ



اس کے موافق ہے لیکن کرنے والا اس کام کے کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے اختیار سے کرتا ہے، بات صرف اتنی ہے کہ اس کا وہ فعل پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق اور ہماری دعائیں بھی کچھ اثر انداز ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن و حدیث میں اس کی صراحت ہے اس سے زیادہ اس مضمون پر کچھ لکھنا اور تقدیر کی گتھی کو سلجھانا اور اس کے پیچھے پڑ جانا اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے بفرمائے آیت ”ذَلَّا تَقِفُ بِهَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ“ اس حکم کے بموجب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں،

برق صاحب! تقدیر کا مسئلہ پیچیدہ مسائل میں سے ہے اس پر زیادہ غور و خوض نہ کیجیے، البتہ لوگوں نے جو غلط نتیجہ اس سے نکال رکھا ہے اس پر جتنا چاہے افسوس کر لیجئے اور بس۔





# باب ۱۸

## متنفا و احادیث

”دورانِ تقریر میں (حضورؐ نے) فرمایا، جو تین بچے پیدا کرے گی، اللہ اسے

نارِ جہنم سے بچالے گا ایک عورت کہنے لگی اور دو بچوں والی؟ فرمایا دو والی

**غلط فہمی**

بھی جنت میں جائے گی۔“ (دو اسلام ص ۲۰۵)

برق صاحب حدیث کا صحیح مطلب نہیں سمجھے ”مَا مِنْكُمْ اَنْثَرَاةٌ تُقَدِّمْنَ مَقْلَوْنَةً

مِنْ ذَلَدِهَا“ (صحیح بخاری کتاب العلم) اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جس عورت

نے تین بچے آگے بھیجے۔“ (یعنی جس کے تین بچے مر گئے) اس عورت کو اس مصیبت پر صبر و شکر کر نیکا

یہ اجر ملے گا کہ وہ بچے دوزخ سے بچانے کا سبب بن جائیں گے۔ اگر برق صاحب ذرا آگے دیکھتے تو

ان کو اس روایت کے متصل وہ روایت بھی مل جاتی جس میں یہ لفظ ہیں ”لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْتَ“ یعنی وہ

بچے ایسے ہوں کہ بلوغ کو نہ پہنچے ہوں، یعنی معصوم ہوں کیا ان لفظوں کی موجودگی میں ”تین بچے پیدا

کرے گی“ صحیح مطلب ہو سکتا ہے؟ پھر یہی حدیث کتاب الجنائز میں بھی موجود ہے۔

الفاظ یہ ہیں:-

اُنْتَا اَنْثَرَاةٌ ذَاتَ لَهَا ثَلَاثَةُ بَنِيْنَ

اَلْوَلَدِہ (صحیح بخاری) جس عورت کے تین بچے

مر گئے۔

پھر اس ہی مضمون کی احادیث حضرت انسؓ سے اس سے پہلے اور حضرت ابو ہریرہؓ

سے اس روایت کے بعد صحیح بخاری کتاب الجنائز میں موجود ہیں۔ حضرت انسؓ کی روایت کے

الفاظ اس طرح ہیں:-

مَا مِنْ النَّاسِ مِنْ مُّسْلِمٍ يُّتِيْهِ لَثَلَاثٌ

حَب كَسَى مَسْمُومٍ كَسَى تَيْنٍ نَّابِلِغٍ

بچے فوت ہو جائیں۔

لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْتَ



حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

لَا يَبُوءُ بِسُلْمٍ ثَلَاثَةً مِّنَ الْوَلَدِ اِذَا كَسَى سُلْمَ كَ تَيْنِ بَنِي مَرْجَانٍ .

الغرض حدیثوں میں ”مرجانے“ کا ذکر ہے اور برق صاحب نے ترجمہ میں اس کے بجائے ”پیدا کرنا لکھ دیا“ اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، برق صاحب نے بغیر تحقیق اور گہرے مطالعہ کے حدیث کا ترجمہ کیا، اور غلط فہمی سے ترجمہ غلط ہو گیا۔ کاش وہ پوری کتاب تحقیق کے بعد لکھتے۔

ایک طرف تو عورت کی عظمت کا یہ حقیقت افزہ اعتراف، اور دوسری

**غلط فہمی**

طرف اس پرستار محبت کی یہ توہین کہ .... آں حضرتؑ فرماتے ہیں کہ

میں نے جہنم کو دیکھا تو اس میں اکثر آبادی عورتوں کی نظر آئی۔ یعنی ایک طرف تو دو

بچوں والی ماؤں کو جنتی بنایا گیا ہے بلکہ ساری جنت ماں کے قدموں میں پھینکی جا

رہی ہے اور دوسری طرف اس کے جہنمی ہونے کا بھی ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

(دو اسلام ص ۳۸۵)

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کو اگر ماں باپ کی خدمت کے صلہ میں جنت

**ازالہ**

مل سکتی ہے تو وہ ماں ضرور جنتی ہے، واہ یہ بھی خوب ہے نیک عمل تو کرے اولاد اور

جنت میں جائے ماں، گویا ماں کے ذمہ نہ کوئی حساب ہے نہ کتاب، بس اولاد نے اس کی خدمت

کی اور وہ جنتی ہو گئی۔ برق صاحب اولاد کا جنت یا دوزخ میں جانا، ان کے اپنے عمل کے باعث ہے

اور عورت کا جنت میں جانا یا دوزخ میں داخل ہونا اس عورت کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر دوزخ میں بہت سی عورتوں کو دیکھا تو اس کو اس مقصد سے عورتوں کے سامنے

بیان کر دیا کہ وہ احسان فراموشی اور غیبت وغیرہ جرائم سے باز رہیں یہ ایک قسم کی ترمیم ہے اعتراض

کی اس میں کیا بات ہے؟

چریاں کریں تو مرد، ڈاکے ڈالیں تو مرد .... بڑھوں اور

**غلط فہمی**

عورتوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کریں تو مرد .... لیکن

جہنم میں جائیں تو عورتیں، کیوں؟ کیا اللہ کے عدل و انصاف کا یہی تقاضا ہے۔

(دو اسلام ص ۳۸۵)

برق صاحب دنیا کی پوری آبادی میں کتنے مرد ہیں جو اس قسم کے گناہ کے مرتکب ہوتے

**ازالہ**

ہیں بہ مشکل دس میں سے ایک، اچھا اب یہ بتائیے کہ دنیا کی آبادی میں کتنی عورتیں ایسی ہیں

جو شرک و بدعات، احسان فراموشی، غیبت، ترک نماز، بدگمانی وغیرہ میں ملوث ہیں؟ آبادی کے ہر گھر کی



عورتوں میں آپ کو یہ باتیں ملیں گی بہت کم ایسی عورتیں ہونگی جو ان لغویات سے بچی ہوں گی یہ باتیں اگرچہ مردوں میں بھی ہوتی ہیں لیکن عورتوں کے مقابلہ میں بہت کم، نمازیں پڑھیں تو مرد، روزے رکھیں تو مرد، تبلیغ کریں تو مرد، جہاد کریں تو مرد، نبوت سے سرفراز ہوں تو مرد، ولی کامل ہوں تو مرد، عالم دین ہوں تو مرد، پھر کیوں نہ جنت میں مردوں کی کثرت ہو، برق صاحب ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتائیے کہ دوزخ میں کس کا تناسب زیادہ ہونا چاہیے۔ مردوں کا یا عورتوں کا؟

”عورت کی نافرمانی کی مزید تشریح اس حدیث میں دیکھیے:-

## غلط فہمی

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو ہم بستری کے لئے بلائے اور وہ انکار کر دے اور شوہر

ناراض ہو کر لیٹ جائے تو اس عورت پر فرشتے صبح تک لعنت برساتے رہتے ہیں۔  
”یہ تمنا اصلی سبب، جس پر مولانا کو اتنی احادیث گھڑنا پڑیں، عورت کے انکار کی

کسی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں“ (رد اسلام ص ۳۹)

برق صاحب کو یہ حدیث اس حدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہے جس میں ہے کہ ماں کے

قدموں کے نیچے جنت ہے یا جس عورت کے دو یا تین بچے فوت ہو جائیں تو اس کے لئے

جنت ہے، بے شک عورت اگر بچوں کے مرنے پر صبر و شکر کرے تو اس ابتلا کا اجر اسے ملے گا اور اگر وہ ناشکری کرے اور اس جرم کا پلٹا بھاری ہو جائے تو پھر دوزخ نہیں تو اور کیا پلے گا کیا یہ قرآن مجید کا اٹل قانون نہیں ہے، عورت کا مرد کے بستر پر آنے سے انکار کرنا بھی ایک قسم کی ناشکری ہے، نافرمانی ہے۔

برق صاحب کا یہ فرمانا کہ انکار کی کسی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں، بالکل ٹھیک ہے لیکن حدیث

میں یہ کہاں ہے کہ معقول وجوہات کی موجودگی میں انکار باعث لعنت ہے، برق صاحب کچھ تو غور کر کے لکھا کیجئے اچھا اگر کوئی معقول وجہ نہ ہو تو پھر کیا حکم ہے؟ کیا خاوند اس کے ہر قسم کے حقوق ادا کرے، اور جب اس کے حقوق ادا کرنے کا وقت آئے تو وہ بغیر کسی معقول وجہ کے انکار کر دے تو کیا یہ جرم قبیح نہیں ہے اگر ہے تو پھر کیا اعتراض ہے؟ یہ تو برابر کے حقوق ہیں، اگر مرد بیوی کا حق ادا کرنے سے انکار کر دے تو وہ مجرم ہوگا۔ اب قرآن مجید کی سنئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (بنی اسرائیل: ۳۳) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَاَهْبِذْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاهْبِذْهُنَّ عورتوں کو بستر سے علیحدہ سدا

اور انہیں مارو۔

(النساء: ۳۴)

ایک جگہ تو ماں کی یہ عزت کہ احسان کرو، بھڑکی مت دو، اُف بھی نہ کرو اور دوسری جگہ اسی پیاری



اماں کے متعلق یہ ارشاد کہ اسے مارو، برق صاحب کیا یہ بھی تضاد ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ پیاری اماں کی سرخی جو آپ نے قائم کی ہے، جذبات کو تو بھڑکا سکتی ہے، لیکن حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔

”جب حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے عہدِ خلافت میں یزید بن ابوسفیان کو ایک فوج کا سپہ سالار بنا کر شام کی طرف روانہ کیا تو سب مقتدر مندرجہ

**غلط فہمی**

ذیل ہدایات بھی دیں۔“

”کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کوئی پھل والا درخت نہ کاٹنا... کسی درخت کو ہرگز نہ جلانا۔

لیکن بخاری میں مذکور ہے:-

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نضیر کے کچھ درخت جلادئے تھے اور کچھ کاٹ کر رکھ دئے تھے، (ص ۱۲۱)

برق صاحب نے ان دونوں واقعات کو متعارض احادیث کی حیثیت سے پیش کیا ہے

پہلی غلط فہمی تو یہ ہوئی کہ برق صاحب پہلی روایت کو بھی حدیث ہی سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ

**ازالہ**

وہ قول صحابی ہے، خیر، دوسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ وہ یہ سمجھے کہ یہ دونوں ہدایات ایک ہی جیسے مواقع کے لئے ہیں، لہذا ان دونوں میں تضاد ہے۔

بات یہ ہے کہ دونوں ہدایتیں علیحدہ علیحدہ مواقع اور محل سے تعلق رکھتی ہیں، علیحدہ علیحدہ کوائف اور حالات کے ماتحت ان دونوں پر عمل ہوگا جنگوں یا شہروں کے درختوں کا بغیر کسی وجہ کے جلادینا یا کاٹ دینا بے شک ممنوع ہے لیکن وہ درخت جو میدان جنگ میں واقع ہوں، ان کے وجود سے اسلامی فوج کو نقصان پہنچتا ہو، اور دشمن فوج کو فائدہ پہنچتا ہو، جنگ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو تو بتائیے کیا ایسے درختوں کا کاٹنا بھی جرم ہے، نہیں، بلکہ جنگی مصالح کے مد نظر ایسا کرنا فرض ہے اب بتائیے ان دونوں میں کیا تضاد ہے، پھر یہ درخت جو کاٹے گئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کاٹے گئے معلوم نہیں برق صاحب قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کئے بغیر اعتراض کیوں کیا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لَيْسَةٍ اَوْ شَرَكْتُمْ هَآ

قَآئِمَةً عَلٰى اَصْوِلِهَا فَبِآذِنِ اللّٰهِ

جودرخت تم نے کاٹے، یا جو تم نے کھڑے

رہنے دئے، تو یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے

حکم سے ہوئے تھے۔

(الحشر :- ۵)

بیجئے اب تک تو حدیث پر اعتراض تھا اب وہی اعتراض قرآن مجید پر آگیا، اب کیا

کیا جائے؟



**غلط فہمی** | پھر بلا وجہ اور بلا ضرورت درختوں کو کاٹنا، مسافروں کو سائے... سے محروم رکھنا یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان تھا؟ اس لئے یہ حدیث

قابلِ اعتماد نہیں۔ (دوسلام ص ۳۱۱)

**ازالہ** | بغیر کسی وجہ کے تو کاٹے نہیں گئے اگر آپ نے وجہ تلاش نہیں کی تو اس میں حدیث کا کیا قصہ ہے۔ یہ درخت اس لئے کاٹے گئے تھے کہ مسلم بغیر ان کے کاٹے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اور کافروں کو ذلت و شکست نصیب نہ ہوتی۔ اگر تاریخ میں آپ نے نہیں پڑھا تھا تو قرآن مجید میں دیکھ لیا ہوتا اس کی وجہ تو خود قرآن مجید بتاتا ہے۔

وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ۝ تاکہ اللہ فاسقوں کو ذلیل کرے۔

(الحشر: ۵)

گویا درخت کاٹنے کی وجہ خود قرآن مجید میں موجود ہے یعنی کافروں کو شکست دینے اور ان کو ذلیل کرنے کا یہ ایک آسان ذریعہ تھا۔ میدان جنگ کھل جانے سے مسلمان کے لئے ڈائی آسان ہوئی اور ان کافروں کو بہت جلد شکست نصیب ہوئی۔

**غلط فہمی** | ”ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک مہم پر روانہ کرنے سے پہلے فرمایا کہ اگر فلاں فلاں مل جائیں تو انہیں آگ میں جلا دینا، سو جب ہم چل پڑے تو کہا ان لوگوں کو جلا نامت بلکہ قتل کر ڈالنا، اس لئے کہ آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے۔“

آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے لیکن،

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ چند آدمی مدینہ میں آکر بیمار ہو گئے، حضورؐ نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ سرکاری اونٹنیوں کا دو دھنکیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا جب وہ شفا یاب ہو کر تروتازہ ہو گئے تو انہوں نے رکھوالے کو مار ڈالا، اور اونٹنیوں کو ہانک کر چل دئے۔

آپ نے انہیں مندرجہ ذیل سزائیں دیں۔

(الف) پہلے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے۔

(ب) پھر لوہے کی سلاخیں گرم کر کے ان کی آنکھوں میں پھیریں۔

(ج) اس کے بعد انہیں گرم ریت پر پھینک دیا، وہ تڑپ تڑپ کر پانی مانگتے رہے، لیکن کسی نے نہ دیا اور ہلاک ہو گئے۔

یہ بے رحمی رحمتہ للعالمین کی شان سے بعید ہے۔ مزید برآں قرآن نے



قاتل کے لئے صرف سزائے موت تجویز کی ہے نہ کہ یہ تین سزائیں بیک وقت “  
(دو اسلام ص ۳۱)

**ازالہ** برق صاحب کے نزدیک ان دونوں احادیث میں یہ تعارض ہے کہ پہلی حدیث میں ہے کہ ”آگ سے مت جلاؤ“ اور دوسری میں ہے، کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوہے کی سلاخیں گرم کر کے آنکھوں میں پھیریں اور گرم ریت پر انہیں ڈال دیا برق صاحب ان دونوں میں فرق تو ضرور ہے، دوسری میں آگ سے جلانے کا کوئی ذکر نہیں، کہاں آگ میں جلا کر مار ڈالنا اور کہاں گرم سلاخی پھیرنا۔ مگر خیر آپ کی خاطر ہم اس کو تضاد ہی ماننے لیتے ہیں اب سنئے:-

پہلی حدیث میں ایک اسلامی قانون ہے کہ کسی شخص کو کسی سزا میں جلانے کا اختیار حکومت کو نہیں ہے، دوسری حدیث میں ایک قرآنی قانون پر عمل ہے اچھا اب یہ بتائیے کہ اگر کسی ظالم نے کسی شخص کو آگ میں جلا کر مارا سو تو اس ظالم کی سزا کی نوعیت کیا ہوگی؟ قرآن کی آیت سنئے:-  
فَمَنْ اَعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ  
بِمِثْلِ مَا اَعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ  
جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اس ہی جیسی زیادتی کرو۔

(البقرة :- ۱۹۴)

بتائیے اس قرآنی حکم کی تعمیل فرض تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو پھر یہ جلانے کا عذاب اللہ کی طرف سے ہوا، بندوں کی طرف سے نہیں۔ بندوں نے تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی اور اگر آپ یہ فرمائی کہ اس جلانے والے ظالم کو صرف تلوار سے قتل کرو یا جلائے تو پھر ہم پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا یہ برابری کا قصاص ہے، کیا اس سزا سے خوف ناک مظالم کا انسداد ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوف ناک مظالم کے انسداد کے لئے اُسی جیسی خوف ناک سزا ہونی چاہیئے، ورنہ ایک آدمی آگ میں جل کر جان دے اور دوسرا ناٹا ناٹا تلوار کی ضرب یا بجلی کے جھٹکے سے مر جائے، کیا یہ انصاف کا خون کرنا نہیں ہے کیا یہ قانون قصاص کا نقص نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ تو خود فرماتا ہے:-

وَالْعَيْنُ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفُ بِالْاَنْفِ  
وَالْاُذُنُ بِالْاُذُنِ وَالسِّنُّ  
بِالسِّنِّ وَالْجُودُ وَحِ قِصَاصُ  
آکھ کے بدلے آنکھ مھوڑی جائے، ناک کے  
بدلے ناک، کان کے بدلے کان، اور دانت  
کے بدلے دانت توڑا جائے اور اسی طرح تمام  
زخموں کا قصاص لیا جائے۔

(المائدہ :- ۴۵)

بتائیے کیا قصاص کی یہ سزائیں بے رحمی کا مظاہرہ نہیں کرتیں، بے شک کرتی ہیں لیکن تمام  
بے رحمیوں کا انسداد ہی ایک ذریعہ ہے، اور اسی لئے رحیم و کریم اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ



”جیسا کہ ویسا مہجرو“ انہوں نے جیسا چرواہوں کے ساتھ کیا تھا ویسا ہی ان کے ساتھ کیا گی  
حدیث میں موجود ہے۔

اِنَّا سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْيُنَ اُولَئِكَ لَا تَهْمُ سَمَلُوْا  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں  
کی آنکھوں میں گرم سلائی اس لئے پھروائی  
کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائی  
بَابُ حَكْمِ الْمُحَارِبِينَ (مچھیری تھی۔)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-  
اَللّٰهُمَّ عَطِشُ مَنْ عَطِشَ اِلَیَّ مُحَمَّدٍ رَسُوْلًا ج ۲، ص ۵۱، کتاب  
المحاربة ورجاله، ثقات، تقییب  
اے اللہ ان لوگوں کو پیاسا مار جن لوگوں نے  
آل محمد کو پیاسا مارا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے مسلم چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائی  
پھروائی تھی اور ان کو پیاسا مارا تھا لہذا قصاص میں ان کو یہ سزائیں بھی دی گئیں۔  
اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے :-

اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ  
وَرَسُوْلَهٗ وَيُسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ  
فَسَادًا اَنْ يُقْتَلُوْا اَوْ يُصَلَّبُوْا اَوْ  
تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ  
خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ  
جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے  
لڑتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں  
ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کر دئے جائیں، یا  
پھانسی دئے جائیں یا ان کے مخالف  
سمت کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں  
جلا وطن کر دیا جائے۔ (المائدہ :- ۳۳)

دیکھا آپ نے قرآن مجید میں قتل کے علاوہ بھی سخت سزائیں ہیں کیا یہ بھی بے رحمی ہے ؟  
الغرض جو کچھ مظالم انہوں نے کئے تھے وہی ان پر دہرائے گئے، لوٹ مار کی سزائیں قرآن  
مجید کے حکم کے ماتحت ان کے ہاتھ، پیر کاٹے گئے، قتل کی سزائیں قتل کئے گئے، آنکھوں میں سلائی  
پھیرنے اور دوسری زیادتیوں کی سزائیں بطور قصاص ان پر ویسی ہی سزائیں کی گئی اور اس طرح قرآن  
مجید کے حکم پر عمل کیا گیا، یہ ہیں وہ عبرت ناک سزائیں جن سے امن عالم برقرار رہتا ہے، اور کسی کو کسی  
پر ظلم ڈھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ آپ سزاؤں کو تو دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ایک سزا اپنے جیسے  
سینڈلوں واقعات کا انسداد کرتی ہے۔ اگر ایک دفعہ کی بے رحمی سے متعدد بے رحمیوں کا استیصال ہوتا  
ہے تو یہ سودا بہت سستا ہے۔



نہ معلوم برق صاحب کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی اور اگر آپ اس کو اب بھی بے رحمی ہی سمجھیں تو کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ سو کوڑوں کی سزا بھی بے رحمی ہے، آنکھ کے بدلے آنکھ مھوڑنا بھی بے رحمی ہے، چوری کی سزائیں ہاتھ کاٹنا بھی بے رحمی ہے کیا آپ ان تمام سزاؤں کو قرآن مجید میں سے نکال دیں گے؟ اگر نہیں تو پھر ان سب بے رحمیوں کے ساتھ اس حدیث کی سزاؤں پر بھی صبر کیجیے، آپ کو رحم آتا ہے لیکن قرآن مجید کو دیکھئے کہ وہ سو کوڑوں کی سزا دیتے وقت رحم کرنے سے منع کرتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بے رحمی کا حکم دیتا ہے، ارشاد ہے:-

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي رِجْلِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ بِاللَّهِ ۚ (النور: ۲۰)

اللہ تعالیٰ کی اس سزا کو نافذ کرتے وقت تم کو ان دونوں کپڑی قسم کا رحم نہیں آنا چاہیے اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ سزاؤں کا نافذ کرنا بے رحمی نہیں ہے اور اگر رحم آ بھی جائے تو اس رحم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزا کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا.... تین چیزیں منحوس ہیں، گھوڑا، بھرت

اور مکان.... اس ارشاد کا مقصد تو یہی ہو سکتا ہے کہ لوگ ان منحوس

**غلط فہمی**

چیزوں سے بچیں، لیکن لوگ کیسے بچ سکتے ہیں؟ جب خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گھوڑا، گیارہ بیویاں اور نو مکانات اپنے قبضہ میں رکھے تھے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھ بیٹھے کہ کیا یہ قول اسی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے.... جس نے فرمایا تھا کہ ”نکاح میری سنت ہے“..... تو ہم کیا جواب دیں گے؟

(دوا سلام ص ۳۱۳، ص ۳۱۴)

ایک حدیث کی تشریح دوسری جگہ موجود ہوتی ہے اگر کہیں مجمل حدیث ہو تو غلط فہمی کا

تو امکان ضرور ہے لیکن اس کا ازالہ دوسری حدیث سے ہو سکتا ہے۔ جو آگے پیچھے

**ازالہ**

موجود ہوتی ہیں مگر اس کے لئے تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے، برق صاحب نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ ان ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دوسری جگہ اس حدیث کی تشریح موجود ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

نخست اگر کسی چیز میں ہوتی تو ان تین چیزوں میں بھی ہوتی، گھر، عورت، گھوڑا۔

إِنَّ كَاتِبَ الشُّؤْمِ فِي شَيْئٍ  
فِي الدَّارِ وَالْمَرْأَةِ وَالْفَرَسِ

(صحیح بخاری)



حضرت سہیلؑ کی روایت کا بھی یہی مضمون ہے، الفاظ یہ ہیں :-

اِنْ كَانَ فِي شَيْءٍ نَّفِي الْفَرْسِ

اگر نحوست کا کوئی وجود ہوتا تو ان تین چیزوں

ذَلِكَ اُمَّةٌ زَالِمَةٌ (بھیم بھاری)

میں بھی ہوتا، گھوڑا، عورت، گھر۔

اب اس حدیث کا پس منظر ملاحظہ فرمائیے آیام جاہلیت میں لوگوں کا خیال تھا کہ فلاں فلاں چیزوں میں نحوست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باطل عقیدہ کی تردید ان الفاظ میں کر دی کہ نحوست کا کوئی وجود نہیں اگر ہوئی تو ان محبوب ترین چیزوں میں بھی ہوتی جن سے کتارہ کشی ناممکن ہے، کیا نحوست کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑا جاسکے آپؐ پر گز نہیں، جب یہ نہیں ہو سکتا تو پھر محض نحوست کے وہم سے وہ بھری چیزوں کو چھوڑنا لائے۔ یہ تو ہے حدیث کا منشا و ماں قرآن مجید میں ضرور نحوست کا ذکر ملتا ہے، قرم عاد پر جو عذاب بھیجا گیا تھا وہ مغوس و نون میں بھیجا گیا تھا،

ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

اِنَّا ارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْجًا صَرْصَرًا  
فِيْ يَوْمٍ نَّخْسُفُ سُمْرَتِيْ

ہم نے ان پر دائمی مغوس دن میں سخت  
آندھی کا عذاب بھیجا تھا۔

(القمری: ۱- ۱۹)

”کیا جن عورتوں نے لاکھوں انبیاء و اولیاء پر اکٹے جن کی گود میں لقمانؑ

فلاطونؑ کہیے.... وہ مغوس ہیں اور ہم مسحور“ (دو اسلام ص ۲۱۲)

**غلط فہمی**

یہ تو اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ عورت مغوس نہیں ہے اور یہ کہ برق صاحب حدیث

کا مطلب غلط سمجھے، تاہم ایک بات عرض ہے کہ کیا یہ عبارت محض جذبات کو بھڑکانے

**ازالہ**

کے لئے نہیں ہے کیا اس میں مبالغہ و رنگینی نہیں ہے، برق صاحب یہ عبارت اس طرح بھی ترتیب دی جاسکتی ہے۔

”کیا جن عورتوں نے لاکھوں شیطان کے اولیاء پیدا کئے، جن کی گود میں فرعونؑ

وہامانؑ کھیلے جنہوں نے کافر، چور، ڈاکو، بدعاش، رنزن، سفاک، فحاش و شرابی لوگوں کو جنم دیا

وہ مسعود ہیں؟ کیا جن عورتوں نے ابولہب، ابوہلہ اور دیگر اشرار کو اپنے دودھ سے پرورش کیا

کیا وہ مغوس نہیں؟ اور سینے عزیز مصر کی زبان سے قرآن مجید کیا کہتا ہے۔

اِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيْمٌ

اے عورتو! بے شک تمہارا کر و فریب بہت

(یوسف: ۲۸) زبردست ہوتا ہے۔

کیا یہ ان ہی عورتوں کے مقتل ہے، جنہوں نے بڑے بڑے انسان پیدا کئے تھے،

قرآن مجید کہتا ہے :-



إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝

بے شک انسان بڑا ہی ظالم اور

جاہل ہے ۔

(الاحزاب : ۷۲)

کیا یہ انیس انسانوں کے متعلق ہے جن میں لاکھوں انبیاء اور اولیاء پیدا ہوئے، برقِ حجاب حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے ذرا قرآن مجید کو بھی مطالعہ کر لیا کیجئے، قرآن مجید کہتا ہے :-

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرُ شَيْءٍ جَدَلًا ۝

انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے

(الکہف : ۵۴)

کی انسانوں کے زمرے میں انبیاء بھی شامل ہیں اگر نہیں تو کیوں؟

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب

نماز کے لئے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پاؤں تھامتا ہوا مہاگ جاتا ہے

اور اذان کے بعد واپس آ جاتا ہے..... واپس اگر نمازی پرست ملتا ہے اسے بھولی

ہوئی باتیں یاد دلانا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ نمازی بھول جاتا ہے اور اسے یاد نہیں رہتا

کہ اس نے کتنی نعمتیں پڑھیں۔

شیطان کا اذان کی عربی عبارت سے گھبراتا، لیکن نماز کی لمبی چوڑی دعاؤں کی

پرواہ نہ کرنا، اور نمازی پر سوار رہنا ایک ایسی منطق ہے جو شاید کسی عقل مند کی سمجھ میں کبھی بھی نہ

آئے۔ (دوا سلام ص ۳۱۵-۳۱۵)

اذان شعارِ اسلام میں سے ہے، اعلانِ کلمۃ الحق ہے، اللہ وحدہ لا شریک لہ کی

توحید کا اعلان ہے اور اس اکیلے کی عبادت کی طرف دعوتِ عام ہے۔ یہ ہیں وہ وجہ جن

کی بنا پر شیطان اذان سے دور بھاگتا ہے۔ یہ آواز اس کو بری لگتی ہے اس سے اس کو ڈر محسوس ہوتا ہے

اور وہ خوفزدہ ہو کر بھاگتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اس دعوتِ توحید کا عام اعلان اس کے کان تک پہنچے۔ اسی

طرح جب اقامت ہوتی ہے تو کیونکہ اس میں بھی وہی اعلان ہوتا ہے اس لئے شیطان دور ہو جاتا

ہے۔ (برقِ صاحب نے لکھا ہے کہ ”جب نمازی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے“ حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے

کہ ”جب نماز کی اقامت ہوتی ہے“)

اس کے علاوہ بھی اس میں کوئی اور محفی راز ہو تو ہم کو کوی علم، ہم لوگ غیب پر ایمان لانے والے ہیں

اور ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کو بے چوں و چرا تسلیم

کرتے ہیں اس کے کہنے اور رموز سے واقف ہونا ہمارے لئے ضروری نہیں اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی بات کو اس وقت تسلیم کریں جب وہ ہماری عقل میں آجائے تو پھر ہمارا ایمان عقل پر مبنی نہ کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم پر بلکہ اس طرح تو رسول کی تکذیب ہوئی، کہ اگر کوئی بات ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہم یہ

**غلط فہمی**

**ازالہ**



کہہ دیں کہ ہمیں آپ کی یہ بات تسلیم نہیں اور گویا آپ نے جوابات ہمیں بتائی ہے وہ غلط ہے، کسی صحیح حدیث کو اس طرح مھٹلایا نہیں جاسکتا، کیونکہ اس اصول پر تو قرآن مجید بھی پورا نہیں اترتا، قرآن مجید میں ہے کہ مرنے رقت فرشتے مرنے والے سے باتیں کرتے ہیں، وہ جواب دیتا ہے، (مثلاً سورہ نساء کی آیت نمبر ۹، ملاحظہ ہو) لیکن یہ چیز ہماری عقل میں نہیں آتی، تو کیا اس کو ہم تسلیم نہ کریں؟

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ برق صاحب نے اس کو مان لیا ہے۔ اس کے آگے وہ لکھتے ہیں:-

”چلو مان لیتے ہیں کہ شیطان بلند آواز سے گھبراتا ہے اس لئے بھاگ نکلتا ہے لیکن یہ تو فرمایا ہے کہ اگر نماز میں مہول صرف شیطانی تسلط کی وجہ سے ہوتی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیوں مہول جایا کرتے تھے.... کیا یہ شیطان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تسلط پاسکتا تھا“ (ص ۲۱۵)

برق صاحب مہول شیطان کی طرف سے بھی ہوتی ہے اور فطرۃ بھی ہوتی ہے، مہول سے صرف اللہ تعالیٰ مستثنیٰ ہے، قرآن میں ہے:-

لَا يَصْنَعُ رَبِّيْ وَلَا يَنْسِي (طہ: ۵۲) میرا رب نہ مھکتا ہے، نہ مھولتا ہے۔  
شیطان کی طرف سے جو مہول ہوتی ہے اس کی مثال مندرجہ ذیل آیت میں ہے:-  
فَاِنِّيْ نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا اَنْسَايْنِيْهِ  
اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَ (الکہف: ۶۳)  
موسىٰ عليه السلام کے سامعنی نے کہا کہ میں  
مچھلی کو مہول گیا، اور آپ سے اس کا ذکر  
کرنا مجھے شیطان ہی نے مھلا دیا۔

دوسری آیت میں ہے:-

قَالَ لَا تُؤْخِذْنِيْ بِمَا نَسِيتُ  
(الکہف: ۶۳)  
موسىٰ عليه السلام نے کہا کہ جو مہول مجھ سے  
ہوتی اس پر میری گرفت نہ کھینچے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی مھولتے تھے، ان کے سامعنی کی مہول شیطان کی طرف سے تھی، اور خود ان کی مہول فطرۃ واقع ہوئی تھی، اور اس لحاظ سے مہول کی دو قسمیں ہوتیں، لیکن دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ مہول جس طرح پہلی مرتبہ شیطان کی طرف سے تھی، دوسری مرتبہ بھی شیطان کی طرف سے تھی، تو پھر وہی اعتراض قرآن مجید پر ہوگا جو حدیث پر ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام پر شیطان تسلط پاسکتا تھا، ہم اس نتیجہ کے اخذ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی مہول فطری تھی جو انسان کی



تخلیق میں شامل ہے۔

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نماز میں مہول شیطان کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے اور فطرۃ بھی ہو سکتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہول فطرۃ تھی نہ کہ شیطان کی وجہ سے اور یہ چیز اس حدیث میں بھی موجود ہے جس کا حوالہ برق صاحب نے دیا ہے۔ نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:-

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ فَأَسْبِغُوا لِي مَاءً يَسْتَوِي كَمَا تَنْسَوْنَ  
(صحیح بخاری و صحیح مسلم) میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں اسی طرح مہولتا ہوں جس طرح تم مہولتے ہو۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صراحت کر دی کہ میری مہول انسان فطرت کے تقاضے سے واقع ہوئی تھی، برق صاحب حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے پھر بھی آپ نے اس کو شیطانی مہول سمجھ لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطری مہول کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَإِذْ كُنَّا نَبِيًّا إِذَا نَسِيتَ ه  
(الکہف: ۲۲۰) اور جب آپ مہول جایا کریں تو اپنے رب کا ذکر کیا کیجئے۔

اور سنئے قرآن کیا کہتا ہے؟

وَإِذْ كُنَّا عَبْدًا نَا آتُوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصُوبٍ وَعَذَابٍ ه  
(ص: ۴۱) اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کیجئے، جب انہوں نے اپنے رب سے کہا، کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔

بتائیے ایوب علیہ السلام رسول متھے یا نہیں؟ اگر متھے تو ان پر شیطان کا تسلط کیسے ہو گیا، کیا شیطان ایوب علیہ السلام پر بھی تسلط و قابو پاسکتا تھا، بتائیے اب کیا کریں، کیا اس آیت کو قرآن مجید سے نکال دیں، کیونکہ اس آیت سے ایک رسول کی توہین ہوتی ہے۔

آخر اس آیت کا ہم کیا جواب دیں غیر مسلموں کو اس کا کیا مطلب بتائیں، برق صاحب درحقیقت غلط فہمی سے کچھ کا کچھ مہول جابجا کرتا ہے، اور اس کی زد میں صرف حدیث ہی نہیں قرآن مجید بھی آسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسی غلط فہمیوں سے پناہ میں رکھے بلا وجہ حدیث پر اعتراض کرنے سے کیا فائدہ، جب غلط فہمی سے اس سے زیادہ بڑا اعتراض قرآن مجید پر ہو سکتا ہے۔

بقول برق صاحب ”کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا“ (دوا سلام ص ۳۱۹)



**غلط فہمی** ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی نے کہا کہ فلاں شخص دن چڑھے تک سویا رہا، آپؐ نے فرمایا کہ شیطان اس کے کانوں میں موت

گیا اس لیے سویا رہا۔“

لیکن اسی جلد کے صفحہ ۷۷ پر یہ روایت دی ہوئی ہے

”عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سفر تھے، پھلی رات تک ہم چلتے رہے، سحر کے قریب لیٹ گئے اور دیر تک سوتے رہے.... سب سے پہلے حضرت مدنی رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے، آپؐ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ہانے کھڑے ہو کر بلند آواز سے تکبیر کہنا شروع کر دی، چنانچہ آپؐ بیدار ہوئے اور نماز پڑھائی۔“

اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ حضورؐ کے دن چڑھے تک سوئے رہنے کی وجہ بھی وہی تھی جو اوپر والی حدیث میں دی گئی ہے تو بغیر اس کے کیا کہیں گے کہ استغفر اللہ استغفر اللہ۔ (ردو اسلام ص ۳۱۵-۳۱۶)

**ازالہ** برق صاحب دونوں حدیثوں کا موقع محل علیحدہ علیحدہ ہے۔ آپؐ نے دونوں کو ایک ہی سیاق و سباق میں پیش کر دیا اور یہی اصل غلط فہمی ہے، پسلی حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

مَا زَالَ نَاسًا حَتَّىٰ أَصْبَحَ مَا قَامَ  
إِلَى الصَّلَاةِ قَالَ ذَلِكَ وَجَلُّ بَالِ  
الشَّيْطَانِ فِي أَدْنَاهُ ۝  
(صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر ہوا  
کہ فلاں شخص دن چڑھے تک سوتا رہا، نماز نہیں  
پڑھی، آپؐ نے فرمایا، اس شخص کے کان میں  
شیطان نے پیشاب کر دیا۔

یہ اس شخص کا حال ہے جو دیر سے اٹھتا ہے، نماز نہیں پڑھتا تو گویا اس پر شیطان کا تسلط ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی اس مضمون کو ادا کیا ہے۔

وَمَنْ يَغْتِرْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ  
لَقَدْ قَبِضَ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ  
قَوِيٌّ ۝ (الزخوف: ۳۶)

اور جو اللہ کے ذکر سے غافل ہو جائے تو ہم  
اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی  
اس کا ساتھی ہوتا ہے۔

برق صاحب اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ ایوب علیہ السلام پر شیطان کو جو تسلط دیا گیا تھا کیا وہ بھی اسی قبیل سے تھا تو آپؐ کیا جواب دیں گے؟ کیا اس وقت بھی آپؐ استغفر اللہ استغفر اللہ کہہ کر خاموش ہو جائیں گے۔



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نیند آئی اور آپ دیر سے اٹھے وہ ایک دن کا واقعہ ہے جو بہادر سے واپسی کے وقت سفر میں پیش آیا، کافی رات تک سفر جاری رہا اور اس کے بعد آپ اور صحابہ کرام آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے، کیونکہ ساری رات کے تھکے ہوئے تھے، لہذا فطرۃ آنکھ دیر سے کھلی یہاں دیر سے آنکھ کھلنے کو اللہ کے ذکر سے غفلت برتنے پر کس طرح محمول کیا جاسکتا ہے اور جب اللہ کے ذکر سے غفلت نہیں تو شیطان کا تسلط کیسے ہو سکتا ہے، برخلاف اس کے جو شخص روزانہ خواب غفلت میں پڑا رہتا ہے اللہ کے ذکر سے بی چراتا ہے، جاگ کر بھی نماز نہیں پڑھتا، تو ایسے شخص پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے یہ ہے ان دونوں احادیث کا مطلب۔

”حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ”جب تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کے لئے بیٹھے تو وہ قبلہ کی طرف منہ نہ کرے، نہ

**غلط فہمی**

بیٹھ... اور یہ بھی ملاحظہ ہو۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس والے مکان کی چھت پر چڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور علیہ السلام قبلہ کی طرف بیٹھ کر کے قضائے حاجت فرما رہے ہیں، کس کو صحیح سمجھیں؟ (دو اسلام ص ۳۱)

دو دنوں کو صحیح سمجھئے، کیونکہ دونوں صحیح ہیں اور اپنے اپنے محل پر واجب التعمیل اور قابل عمل ہیں، ان ہی عبداللہ بن عمر نے جن کی روایت آپ نے نقل کی ہے ان دونوں حدیثوں کے تضاد کو رفع کر دیا ہے غالباً وہ وضاحت آپ کی نظر سے نہیں گذری، ایک صاحب نے عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنی اوٹنی کو بٹھایا، اور اس کو اپنے اور قبلہ کی درمیان کے پیشاب کرنے بیٹھ گئے، ان صاحب نے عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کیا اس سے منع نہیں کیا گیا، عبداللہ بن عمرؓ نے جواب دیا۔

**ازالہ**

بَلَىٰ إِنَّمَا نُحَيِّ عَنْ هَذَا فِي الْفَضَاءِ  
فَإِذَا كَانَ بَيْنَكَ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ  
شَيْءٌ يَسْتُرُكَ فَلَا تَأْسَ

بے شک اس سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ  
ممانعت کھلی فضا میں ہے، اگر تمہارے اور  
قبلہ کے درمیان کوئی چیز ہے تو ایسا کرنے

(رداۃ ابوداؤد و سندہ حسن، نیل الاوطار)

میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

جزا دل ص ۷۳)

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ ممانعت اس وقت ہے جب کوئی آڑ نہ ہو اور جب کوئی چیز سامنے ہو، تو پھر ممانعت نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے پائخانہ میں قضائے حاجت



فرما رہے تھے۔ لہذا آپ کے اور قبلہ کے درمیان دیوار حائل تھی۔

**غلط فہمی** صعب بن جثامۃ اللیشی کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک گور خر بھیجا، آپ نے ٹوٹا دیا۔۔۔ اور فرمایا کہ میں نے احرام باندھا ہوا ہے ورنہ ضرور لے لیتا (مسلم ج ۲۔ ص ۲۳۳)

مطلب یہ کہ احرام میں شکار کا گوشت کھانا ناجائز ہے اب دیکھئے یہ حدیث:-  
 ”سال حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ابوقتادہ بھی تھا، جس کے بغیر باقی سب نے احرام باندھا ہوا تھا، اٹھائے سفر میں ایک گور خر نظر آگیا، ابوقتادہ سوار ہو کر اس کے پیچھے دوڑ پڑا، اور آخر اسے برچھے سے مار لیا، ذبح کر کے پکایا، اور صحابہ کو پیش کیا، صحابہ نے حضور سے پوچھا کہ کیا ہم کھالیں فرمایا کھالویہ حلال ہے؟“ (مسلم ج ۲ ص ۲۳۶) (دوسرا سلام ضائع)

**ازالہ** آپ نے ان دونوں احادیث کو تعارض کی مثال میں پیش کیا ہے حالانکہ تعارض بالکل نہیں ہے پہلی حدیث سے جو نتیجہ آپ نے نکالا ہے وہ بھی صحیح نہیں، احرام میں شکار کا گوشت کھانا جائز ہے بشرطیکہ:-  
 ۱۔ خود شکار نہ کیا ہو

۲۔ شکار کے سلسلہ میں کسی قسم کی مدد نہ کی ہو یا اشارہ نہ کیا ہو اور

۳۔ شکار کرنے والے نے محرم کی نیت سے شکار نہ کیا ہو،

حضرت جابر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

صَيْدُ الْبَرِّ لَكُمْ حَلَالٌ وَأَنْتُمْ

مُحْرَمٌ مَا لَمْ تُصَيْدُوهُ أَوْ يُصَادْ

لَكُمْ (رواہ ابوداؤد وغیرہ وھذا

احسن حدیث۔ روی فی ھذا الباب۔

لئے نہ کیا گیا ہو۔

نیل الاوطار جز ۵، ص ۲۷)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی محرم کو پیش کرنے کے لئے اگر شکار کیا جائے تو وہ شکار

اس محرم کے لئے حرام ہے، حضرت صعب نے جو گور خر آپ کو پیش کیا تھا وہ انہوں نے آپ

ہی کے لئے شکار کیا تھا اور اسی وجہ سے اس کا ایک حصہ نہیں بلکہ سالم گور خر آپ کی خدمت میں پیش

کر دیا، اور اسی لئے آپ نے قبول نہیں فرمایا اور جو گوشت ابوقتادہ نے پیش کیا وہ کھالیا، اس

لئے کہ وہ شکار آپ کی نیت سے نہیں کیا گیا تھا، لہذا تطبیق کی صورت تو دونوں حدیثوں میں موجود



لیکن برق صاحب نے تحقیق نہیں کی۔

”یہی حدیث ذرا آگے من الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

## غلط فہمی

”... اور کچھ گوشت ہم حضورؐ کے پاس لے گئے آپ نے خود تو نہ کھایا،

لیکن صحابہؓ کو اجازت دے دی،“ ذرا آگے اسی واقعہ کو یوں پیش کیا گیا ہے....

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، کچھ باقی ہے؟ صحابہ نے کہہ

صرف ایک ٹانگ باقی ہے چنانچہ آپ نے وہ ٹانگ لی اور کھا گئے۔

(دوا سلام ص ۳۱۸-۳۱۹)

برق صاحب نے ان دونوں عبارتوں کو تضاد کی شکل میں پیش کیا ہے یعنی ایک جگہ

## ازالہ

ہے کہ آپ نے گوشت نہیں کھایا، دوسری جگہ ہے کہ آپ نے کھایا۔ برق صاحب

کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں کون سی بات صحیح ہے، اور کون سی غلط؟ اس کے متعلق عرض ہے

”کہ آپ نے خود تو نہ کھایا“ کے الفاظ حدیث میں نہیں ہیں، آپ پوری صحیح مسلم پڑھ جائیے ایسے الفاظ

آپ کو کہیں نہ ملیں گے جن کا یہ ترجمہ ہو، جو برق صاحب نے نقل کیا ہے، درحقیقت برق صاحب کو

اس جگہ بڑا زبردست دھوکا ہوا ہے۔

”ایک ہی بات کو اتنی متضاد صورتوں میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا قیامت

## غلط فہمی

تک حقیقت کو نہ پاسکے، ہاں ہمہ ہمارے ملّا ہر طرف سے شور مچا رہے ہیں کہ

یہ جی سے خبردار جو اس کی صحت و صداقت پر شبہ کیا ورنہ تمہیں کافر بنا کر جہنم میں اوندھا

لٹا دیں گے“ (دوا سلام ص ۳۱۸)

”آپ نے خود تو نہ کھایا“ حدیث میں نہیں ہے لہذا تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر

## ازالہ

ترجمہ بھی برق صاحب نے صحیح طور پر پیش نہیں فرمایا، بعض صحابہ پیسے ہی کھا چکے۔ تھے

اور بعض نے کھانے سے انکار کر دیا تھا، پھر یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، صحابہ نے

مسند پوچھا، آپ نے فرمایا کھا لو، صحابہ نے کھایا، کچھ دیر بعد آپ نے فرمایا، کچھ بچا ہے؟ لوگوں نے

کہا ایک پنڈلی بچی ہے آپ نے وہ پنڈلی لے کر تناول فرمائی، بتائیے اس میں کیا تضاد ہے؟ لہذا

کیوں نہ کہا جائے کہ یہ وحی ہے اگر تضاد ہوتا تو وحی نہ کہتے جب تضاد نہیں تو پھر وحی ماننے میں کیا

عذر ہے۔؟

پھر برق صاحب یہ بھی یاد رکھیے کہ یہ پورا واقعہ وحی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس پورے واقعہ سے جو نتیجہ

نکلا وہ یہ مسئلہ ہے کہ محرم بعض شرائط کے ساتھ شکار کا گوشت کھا سکتا ہے اور یہ مسئلہ ہے جو من باب

اللہ وحی ہے بتائیے اس مسئلہ کے وحی ہونے کیا امر مانع ہے۔



## غلط فہمی

حنوٰر کا فرمان ہے "احرام میں ایسے کپڑے مت پہنو جن پر زعفران یا اور کوئی خوشبو لگائی گئی ہو۔"

لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ احرام باندھتے اور توڑتے وقت میں حنوٰر پر خوشبو چھڑکا کوئی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ احرام میں خوشبو لگانا جائز ہے یا ناجائز (رد اسلام ۳۱۸)

## ازالہ

پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حالت احرام میں ایسے کپڑے نہ پہنے جائیں جو زعفران یا دوس سے رنگے گئے ہوں۔ دوس ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے برق صاحب نے اس کا ترجمہ "کوئی اور خوشبو" کیا ہے یہ صحیح نہیں، اس حدیث میں خوشبو لگانے یا نہ لگانے کا کوئی ذکر نہیں لہذا تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری حدیث میں برق صاحب نے خلوق کا ترجمہ "خوشبو کی ہے" یہ بھی صحیح نہیں خلوق زعفران کی ایک مرکب خوشبو ہے اور کیونکہ حالت احرام میں زعفرانی کپڑے کی ممانعت ہے، لہذا آپ نے اس شخص کو کپڑے اتارنے کا حکم دیا (نہ کہ دھونے کا جیسا کہ برق صاحب نے ترجمہ کیا ہے) اور بدن پر جو خلوق لگی ہوئی تھی اس کو دھونے کا حکم دیا۔ لیکن خوشبو کی وجہ سے نہیں بلکہ زعفرانی رنگ کی وجہ سے اور اس چیز کی صراحت حدیث میں موجود ہے، آپ فرماتے ہیں:-

اغْسِلْ عَنْكَ أَثْرَ الصُّفْرِ . اپنے بدن سے زردی کا اثر دھو ڈالو۔

(صحیح مسلم)

اب جن حدیثوں میں ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو لگایا کرتے تھے ان میں اور ان میں کوئی تعارض نہیں برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھنے کے بعد خوشبو نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ احرام سے پہلے خوشبو لگایا کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:-

كُنْتُ أُطِيبُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَغُوثُ عَلَى نِسَائِهِ ثُمَّ يُصَبِّحُ مُحْرِمًا يَنْضَحُ طَيِّبًا . میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشبو لگایا کرتی تھی پھر اس کے بعد آپ اپنی بیویوں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ پھر صبح کو آپ احرام باندھ لیا کرتے تھے اور خوشبو کی ملک آپ کے بدن مبارک سے آیا کرتی تھی۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۸۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام سے پہلے اگر خوشبو لگائی جائے اور خوشبو کی ملک احرام



باندھنے کے بعد بھی آتی رہے تو یہ جائز ہے، بلکہ سنت ہے۔  
 ”البذر نے حضور سے پوچھا کہ کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے فرمایا، ہاں، میں نے

**غلط فہمی**

دیکھا وہ ایک نور ہے“ (مسلم ج ۱ ص ۲۲۱)

لیکن یہی البذر اگلی حدیث میں کہتے ہیں۔

”میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ کو دیکھا تھا، فرمایا  
 ”هُوَ نُورٌ اِنِّیْ اَرٰہُ“ وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں“

یعنی ایک حدیث میں دیکھنے کی نفی ہے اور دوسری میں اثبات

(دوا سلام ص ۳۱۹)

**ازالہ**

جس حدیث کو برق صاحب نے اگلی بتایا ہے وہ پہلی حدیث ہے اور جس کو برق صاحب  
 نے پہلی حدیث کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہ اگلی حدیث ہے، برق صاحب نے

دوسری حدیث کو پہلے نقل کیا اور پہلی کو بعد میں، بات درحقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ہی حدیث ہے جس کو برق  
 صاحب دو حدیثیں سمجھ رہے ہیں اس حدیث کو امام مسلم نے تین سندوں سے بیان کیا ہے۔ حدیث زیر  
 بحث کو حضرت قتادہؓ سے روایت کرنے والے تین محدث ہیں ایک محدث نے اس روایت کو مختصر و مجرد  
 کیا ہے اس اختصار ہی کی وجہ سے برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ امام مسلم نے اس غلطی کو دور کرنے کے  
 لئے فوراً حضرت قتادہؓ کے دوسرے شاگردوں کی سندیں نقل کر دیں اور یہ بتا دیا کہ پہلے صاحب کی  
 روایت میں یہ نقص ہے جس کو دور کر لیا جائے۔ حدیث کے جس حصہ کو وہ صاحب چھوڑ گئے ہیں،  
 دوسرے اصحاب نے اسے بیان کیا ہے اور وہ حصہ امام مسلم نے آگے بیان کیا ہے گویا اس طرح حدیث کا  
 متن محفوظ ہو گیا۔ اب ذیل میں دونوں سندوں کے متن درج ذیل ہیں، مقابلہ کیجئے تضاد کہاں ہے؟  
 سند اول: حضرت البذر پوچھتے ہیں آپ نے اللہ کو دیکھا تھا، آپ فرماتے ہیں نُوْرٌ اِنِّیْ  
 اَرٰہُ ”وہ نور ہے اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں۔“

سند ثانی و ثالث: ان سندوں میں وہ الفاظ جو پہلی سند میں رہ گئے ہیں، مذکور  
 ہیں یعنی آپ نے یہ بھی فرمایا تھا ”رَأَيْتُ نُورًا“ میں نے ایک روشنی دیکھی تھی۔

ان تینوں اسناد کو ملا کر حدیث کا پورا متن اس طرح ہوا ”نُوْرٌ اِنِّیْ اَرٰہُ رَأَيْتُ نُورًا“  
 وہ تو نور مجسم ہے میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں، ہاں میں نے ایک روشنی دیکھی تھی۔

امام احمد کی سند میں یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی متن میں بیان ہوئے ہیں، الفاظ یہ ہیں:۔  
 رَأَيْتُ نُورًا اِنِّیْ اَرٰہُ ”میں نے ایک روشنی دیکھی تھی، اسے

دفعہ ربانی مع بلوغ الامانی جز ۲ ص ۲۵۹ کیسے دیکھ سکتا ہوں



وہ جالہ رجال الصحیح

امام مسلم کی دانائی کی داد دینی چاہیے کہ پہلے تو انہوں نے مختصر حدیث کو مکمل کیا، پھر مزید غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے فوراً اس روشنی کی تشریح میں جس کو آپ نے دیکھا تھا ایک اور حدیث نقل کر دی جس کے الفاظ یہ ہیں۔

”حِجَابُ النُّورِ“

اللہ کا حجاب بھی نور ہے۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو روشنی دیکھی تھی وہ حجابات کی روشنی تھی، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور کی روشنی، بتائیے کہاں تضاد ہے؟

برق صائب نے جو یہ الفاظ نقل کئے ہیں ”ہاں میں نے دیکھا تھا وہ ایک نور ہے“ معلوم نہیں یہ کن الفاظ کا ترجمہ ہے، صحیح مسلم میں اس قسم کی کوئی عبارت نہیں جس کا یہ ترجمہ ہو معلوم نہیں برق صاحب نے یہ ترجمہ کہاں سے نقل فرمایا ہے۔

”مشہور واقعہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی ایک زوجہ کے ہاں جا کر شہد کھایا

چند دیگر ازواج نے سازش کے حضورؐ سے کہا کہ آپ کے منہ سے بد بو

آتی ہے جس پر حضورؐ نے قسم کھالی کہ میں آئندہ شہد نہیں کھاؤں گا۔ اور معایہ آیت نازل ہوئی، اے رسول ایک حلال چیز کو حرام کرنے کے اختیارات تمہیں کس نے دئے ہیں کیا تم بیویوں کو خوش کرنے کے لئے یہ کر لے ہو (قرآن)

اس واقعہ کو تجرید بخاری ص ۸۵ کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے

زمین کے ہاں شہد کھایا اور حضرت عائشہ و حفصہ نے سازش کی، لیکن ایک اور حدیث

(تجرید بخاری ص ۸۹) میں بتایا گیا ہے کہ شہد حفصہؓ کے ہاں کھایا گیا تھا، اور سازش

حضرت عائشہؓ، حضرت سوڈہؓ، اور حضرت صفیہؓ نے کی تھی، یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس پر

تہدید بھی نازل ہوئی لیکن پھر بھی ہمارے راوی نہ بتا سکے کہ حقیقت کیا تھی کیا انہی روایات

کو وحی کہا جاتا ہے؟ (رد اسلام ص ۳۱۹-۳۲۰)

یہ سازش کس نے کی تھی؟ اگر یہ نہ معلوم ہو سکا تو کون سادہ دینی حکم ناقص رہ گیا، بلکہ

اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی، کہ سازش کرنے والی بیوی کا نام لوگوں کو معلوم

نہ ہو، تاکہ کسی بیوی کو اس معاملہ میں دوسروں کے سامنے شرمندگی کا موقع نہ ہو۔ وہ ستار تو پردہ

پوشی فرماتا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ راوی اسے ظاہر کر دیں اور صحیح نام بتادیں، یہ ناممکن ہے، اور

اللہ تعالیٰ کی مصلحت دستاویز کے منافی ہے، قرآن مجید نے بھی ناموں کی صراحت نہیں کی، نہ واقعہ

کی تفصیل بیان کی صرف ایک اصول اور حکم بیان کر دیا اور خاموش ہو گیا اب بتائیے یہ اصولی حکم دین کی

ازالہ



جان ہے یا وہ تفصیلات؟ قرآن و حدیث میں دین کی باتیں ہوتی ہیں اور جہاں تک دین و عبرت کی باتیں ہوتی ہیں وہاں تک ان میں تفصیل ہوتی ہے، اور جہاں اور جن باتوں سے دین و عبرت کا تعلق نہیں ہوتا، وہاں صرف اشارے ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات حقیقت کو بالکل مستور رکھا جاتا ہے، مثلاً اصحاب کہف کی تعداد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف اقوال بیان کئے اور پھر بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کتنے ہیں، بس اتنا کہہ دیا کہ ان کی صحیح تعداد کو صرف اللہ ہی جانتا ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ تین مختلف غلط اقوال بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی صرف صحیح تعداد بیان کر دی جاتی۔ تینوں مختلف اقوال کا بطلان بھی ہو جاتا، اور صحیح تعداد بھی معلوم ہو جاتی۔ اتنا اہم واقعہ لیکن پھر بھی قرآن مجید یہ نہ بتا سکا کہ وہ کتنے تھے کیا اب ہم یہ کہنے کے مجاز ہیں کہ یہی وہ وحی ہے جس پر ایمان لانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے ہرگز ہمیں یہ اختیار نہیں ہے کہ ایسی باتیں منہ سے نکالیں، قرآن مجید ایسی غیر ضروری چیزیں کو وقعت نہیں دیتا، تعداد کا تعلق دین سے نہیں ہے لہذا اس سے خاموشی برتی گئی تو کوئی اعتراض نہیں اسی طرح سازش کرنے والی ہوی کو آشکارا نہ کیا گیا، کیونکہ اس کا تعلق دین سے نہیں، اگر اس ہوی کا نام نہ بھی معلوم ہو تو بھی دینی احکام میں کسی قسم کا نقص نہیں آتا۔

برقی صاحب جن احادیث کو وحی کہا جاتا ہے وہ تو وہ احادیث ہیں جن سے دینی احکام مستنبط ہوتے ہیں، جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول و فعل سے ہوتا ہے، ہویوں کا نام بیان کرنا یہ تو صحابہ کا فعل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام بیان نہیں کئے اب اگر یہ نام محفوظ نہ ہوں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض صحابہ کے گمان صحیح نکلے، انہوں نے اپنے قیاس سے نام تو بتائے لیکن قیاس ٹھیک نہیں تھا اور اللہ کو ہی منظور تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صحابہ کا ظن و تخمین اگر خلاف واقعہ ہو تو اس سے حدیث نبوی پر کیا اثر پڑتا ہے؟

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ احادیث میں جو کچھ ہو بس صحیح اور مطابق واقعہ ہو تو یہ نہیں ہو سکتا یہ چیز تو قرآن مجید میں بھی نہیں ہے، قرآن مجید میں کافروں کے غلط اقوال نقل ہوئے ہیں، شیطان کا غلط قیاس موجود ہے، بلکہ یہاں تک ہے کہ ”اَعُوْذُ بِیْ“ شیطان نے کہا کہ اے اللہ تو نے ہی مجھے گمراہ کیا، پھر نہ تو قرآن مجید میں اس غلط قیاس کی تردید ہے نہ گمراہ کرنے کے الزام کی تغلیط، اسی طرح اصحاب کہف کی تعداد کے سلسلہ میں تین غلط اقوال نقل کئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

پس ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص غلطی کرے اور اس غلطی کو ایک سچا آدمی نقل کر دے تو اس سے سچے آدمی پر کوئی حرف نہیں آتا، لوگوں کے غلط اقوال نقل کرنے سے قرآن مجید کو غلط نہیں کہہ سکتے، اسی طرح کسی شخص کی غلطی یا غلط فہمی بیان کرنے سے کتب حدیث غلط نہیں ہو سکتیں صحابہ نے ناموں کے بتانے میں قیاس کیا، قیاس میں اختلاف ہو گیا، محدثین نے اس اختلاف کو نقل کر دیا تو اس سے



نفس حدیث پر کیا اعتراض ہے، کسی شخص کے گمان کو وحی کسی نے نہیں کہا ہاں وہ حدیث وحی ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی دینی احکام کی تشریح میں قولاً وفعلاً صادر ہوئی ہے اور ایسی ہر حدیث بالکل محفوظ ہے اور اس پر ایمان لانا لازمی ہے۔

برخلاف اس کے کسی شخص کے قیاس پر ایمان لانا ضروری نہیں، خواہ وہ حدیث کی کتاب میں ہو یا قرآن مجید میں، مثلاً شیطان کا یہ قیاس کہ میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں یا یہ کہ مجھے اللہ نے گمراہ کر دیا، ان قیاسوں کی صحت پر ہمارا ایمان نہیں ہے، ہمارا ایمان محض اللہ تعالیٰ کی خبر پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شیطان نے یہ قیاس کیا تھا اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ بعض صحابہ نے حضرت عائشہ کا نام بتایا تھا لیکن ان دونوں قیاسوں کی صحت پر ہمارا ایمان نہیں اور نہ ان غلط قیاسوں کے بیان کرنے والے یا نقل کرنے والی کتابیں ناقابل اعتبار ہیں اس طرح غلط گمانوں، غلط قیاسوں کو نقل کرنے سے کتاب غیر معتبر ہو جائے تو پھر یہ اعتراض قرآن مجید پر بھی ہوگا، نفوذ باللہ!

”صفحات گزشتہ میں ہم حضرت انسؓ کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ کس

## غلط فہمی

طرح حضرت جبریل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ بچپن میں چیر کر

وہ حصہ کاٹ ڈالا تھا جس پر شیطان کا تسلط مبرا کرتا ہے اس واقعہ کے متعلق ابوذرؓ کہتے

ہیں کہ جبریل چھت بھاڑ کر گھر میں آ آیا تھا، اور اس نے آپ کا سینہ چیرا تھا۔

(مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۲۲)

چھت بھاڑنے کی بھی خوب کہی۔ ایک نوری مخلوق کہ جس کا نہ کوئی حجم ہے نہ وزن

چھت بھاڑنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر بالفرض وزن و حجم تھا تو کیا گھر میں داخل ہونے

کے لئے کوئی دروازہ موجود نہیں تھا؟ سب کچھ تھا۔ (رد واسلام صفحہ ۳۲)

برق صاحب آپ نے یہ نہیں بتایا، کہ رات کے وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا یا

بند تھا، اگر بند تھا تو پھر چھت کو بھاڑ کر آنے میں کیا تعجب ہے، اگر بند نہیں تھا تو اس کا

## ازالہ

کیا ثبوت ہے حوالہ دیجئے :-

دوسرا اعتراض برق صاحب کا یہ ہے کہ نوری مخلوق کے لئے دروازہ کی ضرورت ہی کیا ہے

ہم کہتے ہیں کہ روشنی بھی تو ایک نور ہے، لیکن روشنی بغیر روشندان، سوراخ، دروازہ یا کھڑکی کے

گمراہ میں داخل نہیں ہوتی، کیا کسی بند مکان میں آپ نے روشنی کو آتے دیکھا ہے، پھر روشنی کی

شعاعوں کے لئے ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے وہ ہے واسطہ (Medium) سائنس دانوں

نے واسطہ کو ضروری سمجھا اور جب ان کی سمجھ میں کوئی واسطہ نہیں آیا تو ایک فرضی واسطہ بنا بیٹھے

جس کا نام انہوں نے ایٹر (Ether) رکھ لیا، بتائیے کیا نور کے لئے بھی کسی واسطہ کی ضرورت



ہے؟ سائنس تو یہی کہتی ہے کہ نور کے لئے شفاف واسطہ کی ضرورت ہے لہذا نوری مخلوق کے لئے بھی واسطہ کی ضرورت ہے، آخر یہ کیا مشکل بات ہے جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔

برق صاحب ذرا برق کو ملاحظہ فرمائیے کتنی غیر مرئی چیز ہے لیکن اس کو واسطہ اور راستہ کی ضرورت ہے جب تک اس کے لئے برقی موصل نہ ہو وہ گزر نہیں سکتی، اگر موصل ہو تو ٹھیک در نہ وہ ہتھوں کو پھاڑتی ہوئی دیواروں کو توڑتی ہوئی اپنا راستہ بنا لیتی ہے اسی پر فرشتوں کو قیاس کر لیجئے اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی مصلحت کو ادھیچاں کر لیجئے، انشاء اللہ آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔ ہاں کونسی تو وہ بھی قدرت کا ایک کمرہ ہے اس کے ذریعہ سے ہر ناممکن چیز ممکن ہو جاتی ہے اس حکم سے اس وقت بحث نہیں اس وقت تو بحث سائنس کی روشنی میں ہو رہی ہے اللہ تو سب کچھ کر سکتا ہے لیکن عادت الہی یہی ہے کہ پہلے سبب پیدا کرتا ہے۔

لیکن جب تک ہمارے علماء داستان میں ڈرامائی رنگ نہ مہر لیں، انہیں تسلی نہیں ہوتی (دوا سلام ص ۳۲۱-۳۲۱)

**غلط فہمی**

برق صاحب قرآن شریف میں ہے:-

**ازالہ**

قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ  
مِّنَ الْكِتَابِ اَنَا اَرْسِلُكَ بِهٖ نَبَلٌ  
اَنْ تَرْتَدَّ اِلَيْكَ طَوْفًا فَلَمَّا رَاَهُ  
مُسْتَقْبِلًا عِنْدَهُ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ  
رَبِّیْ (النمل: ۲۰)

ایک ذی علم شخص نے کہا کہ میں ملک سبا کے  
تخت کو اتنی دیر میں لا سکتا ہوں جتنی دیر میں  
آپ کی پلک چمکے (اتنی دیر میں وہ تخت آگیا)  
تو اس کو دیکھ کر سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ یہ  
میرے رب کا فضل ہے۔

کیا یہ بھی ڈرامائی رنگ ہے؟ دوسری آیت ملاحظہ فرمائیے:-

وَ اَتَيْنَا هُم مِّنَ الْكُنُوزِ مَا رَاَوْا  
مَفَاتِحَ لِّلْكُنُوزِ بِالْعَصْبَةِ اُولٰٓئِكَ  
مَعْمَلٌ لِّلرَّحْمٰنِ لَعَلَّہُمْ يَرْجِعُوْنَ  
(القصص: ۷۶)

ہم نے قارون کو اتنے خزانہ دئے تھے کہ آدمیوں  
کی ایک طاقت و رجاعت اس کی کنجیوں کے بوجھ کی  
محمل نہ ہو سکتی تھی۔

یہ تو کنجیوں کا حال ہے تو پھر خزانوں کے وزن کا اثر ہی حافظ ہے، کیا یہ بھی ڈرامائی رنگ ہے؟  
برق صاحب قرآن شریف کو آپ غور سے پڑھ لیں تو کم از کم حدیث کے متعلق آپ کی غلط فہمیاں دور ہو  
جائیں گی، کیا مذکورہ بالا آیتوں کے بیان کو بھی آپ علماء کی رنگ آمیزی کہہ سکتے ہیں؟ اگر نہیں  
تو آخر کیا وجہ ہے کہ حدیث میں ایسی بات آئی اور آپ کو تعجب ہوا۔

”اسی واقعہ کو مالک بن صعصعہ خواب کا واقعہ بتاتے ہیں اور میرے خیال میں

**غلط فہمی**

یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے“ (دوا سلام ص ۳۲۱)



جب یہ بات تھی تو بلاوجہ آپ نے اس حدیث پر اعتراض کیا۔

**ازالہ**

## انتباہ

برق صاحب نے اس شق صدر کو جو آیام طفولیت میں ہوا تھا اور اس شق صدر کو جو واقعہ معراج میں ہوا تھا، ایک ہی واقعہ سمجھا اور اسی لئے انہوں نے ان دونوں حدیثوں کو بطور تعارض نقل کیا ہے کیونکہ دونوں واقعات علیحدہ علیحدہ ہیں اس لئے تفصیلات میں فرق ہونے سے تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کاش لکھنے سے پہلے دماغ پر غور کر لیتے۔

**غلط فہمی**

ابوموسیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ مردوں میں بڑے بڑے کامل انسان ہو گزرے ہیں لیکن عورتوں میں آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران کے بغیر کوئی اور عورت درجہ کمال تک نہیں پہنچی اور یاد رکھو کہ جس طرح شہید کھانوں کا سردار ہے اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا تمام عورتوں کی سردار ہے (بخاری جلد ۲ ص ۱۶۱)

خلاصہ یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خیر النساء ہیں، لیکن ایک اور حدیث میں مذکور ہے۔

کہ امت عیسیٰ کی بہترین عورت مریم تھی اور میری امت کی بہترین خدیجہ الکبریٰ ہیں (بخاری ۲ ص ۱۶۲) یعنی خدیجہ الکبریٰ خیر النساء ہیں۔

ایک اور حدیث میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جنتی عورتوں کا سردار قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو بخاری ۲ ص ۱۸۲) اب ہم کیا سمجھیں کہ خیر النساء کون ہے؟ (دوا سلام ص ۳۲)

یہ تو صحیح ہے کہ پہلی حدیث کے مطابق حضرت عائشہ تمام عورتوں سے افضل ہیں، تمام اگلی اور پچھلی عورتوں کی سردار ہیں اب دوسری حدیث کا مطلب سنئے، حدیث

**ازالہ**

کے الفاظ یہ ہیں:-

(۲- مان د زمین کی) بہترین عورت مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد ہیں۔

خَيْرُ نِسَاءٍ هَا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ  
وَّخَيْرُ نِسَاءٍ هَا خَدِيجَةُ بِنْتُ  
خُوَيْلِدٍ ه قَالَ ابُو كُرَيْبٍ وَاشَارَ وَكَيْعَ

الى السماء والارض (صحیح مسلم)



اس حدیث میں تو یہ نہیں ہے کہ حضرت خدیجہؓ تمام عورتوں کی سردار ہیں یا حضرت مریمؑ تمام عورتوں کی سردار ہیں ہاں دونوں کا شمار دنیا کی بہترین عورتوں میں ہے ۔  
تیسری حدیث جو حضرت فاطمہؓ کے متعلق ہے اس میں حضرت فاطمہؓ کی منقبت میں تین قسم کے جملہ ہیں جو ایک دوسرے کی تشریح کرتے ہیں ۔

جنتی عورتوں کی سردار

۱۔ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ ۝

اس امت کی عورتوں کی سردار

۲۔ سَيِّدَةُ نِسَاءِ هَذِهِ الْأُمَّةِ ۝

مؤمنین کی عورتوں کی سردار (یعنی اس حدیث

۳۔ سَيِّدَةُ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

کی روشنی میں ازدواج مطہرات مستثنیٰ ہو گئیں)

تینوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت فاطمہؓ اس امت کے مؤمنین کی عورتوں کی سردار ہوں گی، حضرت عائشہ صدیقہؓ تمام عورتوں کی سردار ہوں گی اور حضرت خدیجہؓ روئے زمین کی بہترین عورتوں میں سے ہیں :-

## دوسرا جواب

ان تینوں کا جواب ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے فرض کیجیے حضرت مریمؑ، حضرت عائشہؓ، اور حضرت فاطمہؓ عورتوں کی سردار ہیں تو اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے، یعنی ایک کمانڈران چیف تمام فوج کا سردار ہوتا ہے وزیر دفاع بھی فوج کا سردار ہوتا ہے، وزیراعظم بھی فوج کا سردار ہوتا ہے اور پھر بادشاہ یا صدر بھی فوج کا سردار ہوتا ہے ہر ایک کی سرداری میں فرق ہوتا ہے لیکن ہیں سب سردار، یہاں بھی اسی طرح آپ فرض کر سکتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ بھی سردار اور ان سے اوپر حضرت مریمؓ اور حضرت خدیجہؓ بھی سردار، اور ان سب کے اوپر حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی سردار، بتائیے اب کیا اشکال رہا، اس اشکال کو دور کرنے کے بعد ہم لو پچھتے ہیں کہ اگر یہ گتھی نہ بھی سلجھے تو آخر یہ دین کا کون سا ایسا حکم ہے جس کو نہ سمجھنے سے عمل میں کوتاہی ہوگی اگر ان تینوں احادیث کا خلاصہ ہم اتنا ہی مان لیں کہ یہ چاروں عورتیں بہترین عورتیں ہیں تو بتائیے ہمارے ایمان میں کون سی کمی آجائے گی ۔

## تیسرا جواب

اچھا اب ان احادیث کا جواب قرآن مجید کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے، قرآن مجید میں ہے ۔



کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ (ال عمران: ۱۱۰) تم بہترین امت ہو۔

دوسری آیت میں ہے:-

وَفَضَّلْنَا هُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

(الجمیۃ: ۱۶) دی تھی۔

”عَالَمِينَ“ جملہ ”رَبُّ الْعَالَمِينَ“ کا بھی ایک جز ہے، اور اس کا مفہوم کتنا وسیع ہے

یہ آپ کو بھی معلوم ہے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ ”خیر امت“ امت محمدیہ ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ

”خیر امت“ امت موسوی ہے، اب بتائیے کہ خیر امت (بہترین امت) کون ہے؟ جو تطبیق کی

صورت آپ یہاں پیدا کریں گے، وہی احادیث میں بھی پیدا کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ آپ پیدا کرنے

کی کوشش کریں، برق صاحب اسی لئے تو ہم بار بار کہتے ہیں کہ حدیث کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید

کے بڑے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ فَلَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ عَنِ الْكُفْرِ لَعَنَّا لَكَ الْكُفْرَ۔



# باب ۱۹

## چند دلچسپ احادیث

### غلط فہمی

”آج گھر گھر ریڈیو موجود ہے، رات کے نو بجے پہلے ریڈیو کے پاس بیٹھ کر انگلستان لگائے پھر ٹوکیو، اور اس کے بعد امریکہ، آپ کو معاً یقین ہو جائے گا کہ زمین کا سایہ (رات) نصف دنیا پر ہے اور نصف دیگر پر آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، اس حقیقت کی وضاحت کے بعد اب ذرا یہ حدیث دیکھئے۔“

...آپ نے فرمایا کہ سورج بعد از غروب خدائی تخت (عرش) کے نیچے سجدہ میں گر جاتا ہے رات بھر اسی حالت میں پڑا، دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے، چنانچہ اسے دوبارہ مشرق سے نکلنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اسے اجازت نہیں ملے گی اور حکم ہوگا کہ لوٹ جاؤ، چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے نکلنا شروع کر دے گا“ (در اسلام ص ۲۳۲)

اگر سورج کے چلنے پر اعتراض ہے تو یہ تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے، **اِزَالہ** باری تعالیٰ ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا  
(سورج اپنے مستقر کی طرف چلتا رہتا ہے)

اور سائنس نے بھی سورج کی حرکت کو تسلیم کر لیا ہے۔

اب رہا سجدہ کرنا، تو یہ بھی قرآن مجید سے ثابت ہے، سینئے :-

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ  
فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَ  
کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین  
کی تمام مخلوقات، سورج، چاند، تارے



النَّاسِ ۛ (الحجہ ۱- ۱۸) کرتے ہیں۔  
 الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ پہاڑ، درخت، جانور اور بہت  
 وَالشَّجَرُ وَالْأَنْبَاءُ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ سے آدمی اللہ تعالیٰ کو سجدہ

لہذا سجدہ کرنے کا جو اعتراض حدیث پر ہے وہی قرآن مجید پر ہوگا، نعوذ بالقدمہ۔

**غلط فہمی** ”اگر ہم رات کے دس بجے پاکستان ریڈیو سے دنیا کو یہ حدیث سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج عرش کے پیچھے سجدہ میں پڑا ہوا ہے تو ساری مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنس دے اور وہاں کے تمام مسلمان اسلام چھوڑ دیں“ (دوا سلام ص ۳۲)

**الزالہ** برق صاحب یہ عبارت اس طرح بھی تبدیل کی جاسکتی ہے کہ اگر ہم دن کے بارہ بجے بھارت ریڈیو سے یہ آیت دنیا کو سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج سجدہ میں پڑا ہوا ہے اور ہمالیہ پہاڑ بھی سجدہ میں پڑا ہوا ہے تو مغربی دنیا ہی نہیں ساری دنیا کھلکھلا کر ہنس دے اور پھر کیا کہے یہ آپ خود سوچ لیں۔

برق صاحب آپ نے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح ہم سجدہ کرتے ہیں اسی طرح تمام مخلوق سجدہ کرتی ہے، بس یہی اصلی غلط فہمی ہے ہر ایک مخلوق کی نماز تسبیح سجدہ علیحدہ علیحدہ ہے، اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:-

كُلُّ شَيْءٍ عَالِمٌ صَلَوَاتُكَ وَتَسْبِيحُكَ ہر چیز اپنی نماز اتسبیح کو جانتی ہے۔

(النور ۱- ۴۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيحَهُمْ لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں

سکتے۔

(الاسراء ۱- ۴۲)

اب معلوم ہوا کہ سورج چاند اور پہاڑ وغیرہ سجدہ تو کرتے ہیں لیکن ان کے سجدہ کی کیفیت کا ہمیں علم نہیں، لہذا حدیث اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن کیفیت کا ہمیں علم نہیں کہ سورج سجدہ کس طرح کرتا ہے، عرش کے پیچھے جانے کا کیا مطلب ہے؟ اجازت چاہنے کا کیا مطلب ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں اور نہ ان کے پیچھے پڑنا چاہیئے، برق صاحب اب سائنس کی روشنی میں بھی اگر اس حدیث کا ترجمہ کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔ آپ نے تو نہیں کیا لیکن ہم کئے دیتے ہیں۔

سورج غروب ہو جاتا ہے۔

إِنَّهَا تَذْهَبُ



حَتَّى تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ

اور اللہ تعالیٰ کے شانہ حکیم تکوینی اور  
شاہی قوانین حرکت کے ماتحت اطاعت و عبودیت  
کے ساتھ سرسجود رہتے ہوئے اپنی حرکت کو  
جاری رکھتا ہے۔

فَتَسْتَأْذِنُ فَيُؤْذِنُ لَهَا

وہ ہر لمحہ ہر آن اذنِ الہی سے آگے بڑھتا  
رہتا ہے۔

وَيُؤْثِرُ أَنْ تَسْجُدَ

لیکن قیامت کے قریب ایک وقت ایسا بھی  
آئے گا کہ وہ انہی شاہی قوانین حرکت کے  
ماتحت آگے بڑھنا چاہے گا۔

فَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

لیکن اب اس کو آگے بڑھنے کی منظوری نہیں  
دی جائے گی۔

فَيُقَالُ لَهَا اِمْرِجِي مِنْ هَٰذِهِ  
جِئْتِ

اور اس سے کہا جائے گا کہ اب اس  
مستقر سے واپس ہو جا اور اسی طرف چلا جا  
جس طرف سے تو آ رہا ہے تو یہ مستقر یا  
(Turning Point) وہ جگہ ہے جہاں  
ٹوک کر وہ فوراً واپس ہوگا۔

فَتَطْلَعُ مِنْ مَغْرِبِهَا إِلَى

پس وہ مغرب سے طلوع ہوگا۔ (قرآن  
مجید کی آیت "وَالشَّمْسُ بَجْرِیْ مُسْتَقَرًّا لَّهَا"  
کی یہی تفسیر ہے)

بتائیے ان معنوں میں کیا اشکال ہے، برق صاحب بات درحقیقت یہ ہے کہ کچھ تو آپ  
سمجھے نہیں اور کچھ رنگ آمیزی سے ترجمہ کیا گیا، مثلاً "رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے  
کی اجازت مانگتا رہتا ہے" حالانکہ متن میں یہ عبارت نہیں ہے۔ پورا متن اور نقل کر دیا  
گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

برق صاحب مذکورہ بالا معنی ہم نے مادی لوگوں کی خاطر کر تو دئے ہیں لیکن ہم تو اس حدیث  
پر بالکیف ایمان لاتے ہیں اور اس کی تاویل کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ  
وَالْقُرْنَيْنِ جَبَّ دِيَانًا بِنِجْمٍ جِہَا سَوْرَجٍ مَّغْرُوبٍ



وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَبِثَةٍ

ہوتا ہے تو دیکھا کہ وہ کچڑے چشمہ میں

(الکھف ۱-۸۶)

اب آپ فرمائیں اس سُنس کے زمانہ میں ریڈیو پاکستان سے مغرب کے وقت یہ آیت اگر  
سندی جائے تو کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ غلط فہمی سے بچائے، آمین۔

”ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلنے اور

ڈوبنے وقت نماز نہ پڑھا کرو، اس لئے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے

**غلط فہمی**

دوستیوں میں بھینسا ہوا ہوتا ہے (بخاری جلد ۲ ص ۱۳۲)

سورج کی موٹائی ساڑھے بتیس ارب میل ہے۔ اگر اتنی بڑی چیز شیطان

کے دوستیوں میں سما جاتی ہے۔ . . . . اتنا بڑا شیطان کہاں کھڑا ہوتا ہوگا؟

(دوا سلام ص ۳۲۲)

برق صاحب کو بڑی غلط فہمی ہوئی، انہوں نے مادی عینک سے اس حدیث کو دیکھا

ایسی حدیثوں پر بلا کیف و تاویل ایمان لانا چاہیئے، نہ کہ مادی دنیا کے فاصلے ناپنے

**ازالہ**

لگ جائیں۔ حدیث کا مطلب اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ہم یہ فرض کریں کہ شیطان سورج کے سامنے

اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ دیکھنے والے کو سورج اس کے دوستیوں کے درمیان دکھائی دے اگر ہم

اپنی دوائیوں کو علیحدہ کر کے آنکھ سے ذرا دور سورج کی طرف کر لیں تو سورج دوائیوں کے نیچے

میں دکھائی دے گا۔ بس اسی طرح دوستیوں کے درمیان میں بھی دکھائی دے سکتا ہے، اگرچہ ہماری

آنکھیں ان سیگوں کو نہیں دیکھتیں، لیکن کیونکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں، لہذا مخبر

صادق کی اس بات پر بھی ہمارا ایمان بالغیب ہے، اگر ہم ہر بات پر مشاہدہ اور عقل کی رٹ لگائیں تو پھر

”يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ“ (قرآن مجید) کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم یہ یقین کر

لیں کہ یہ شیطانی اوقات ہیں، ان ہی اوقات میں شیطان کے اولیاء طاغوت کی عبادت کرتے ہیں

حدیث کے الفاظ ہیں:-

وَحِينَئِذٍ يَسْجُدُ لَهُمُ الْكُفَّارُ

اس وقت کفار سورج کو سجدہ کرتے

ہیں۔

(صحیح مسلم)

کیونکہ یہ وقت سورج پرستوں کی عبادت کا ہے اور ان سے مشابہت ناجائز ہے، لہذا اس

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمادی، یہ ہے عمل کی

چیز اور اسی سے ہم کو کام ہے، باقی رہا اس حدیث کی تاویل تو وہ اللہ ہی کو معلوم ہے ہمیں اس سے کیا بحث،

شیطان کے طرل و عرض سے ہمارے عمل کا کوئی تعلق نہیں۔



جدید سائنس کے مطابق خلا کے فاصلے لامحدود ہیں، ایک ایک تار سورج سے کئی گنا بڑا ہے اور وہ ایک سیکنڈ میں کروڑوں روشنی کے سال چلتا ہے اور روشنی کے سال کا ایک ایک سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کے برابر ہے، لہذا خلا کی پہنائیوں کا اندازہ لگانا بالکل ناممکن ہے اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ شیطان کے کھڑے ہونے کی جگہ اس فضا میں موجود ہے یا نہیں۔

برق صاحب اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ اس چشمہ کا طول و عرض کیا ہے جس میں اذرفرغے قرآن مجید سورج غروب ہو جاتا ہے تو ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ کیا سورج کا چشمہ میں غائب ہو جانا آج کل کی سائنس کے مطابق ہے؟ جب اس مشاہدہ کی چیز اور مادی دنیا کے حوادث کے متعلق قرآن مجید کا یہ بیان ہو اور بغیر تاویل کے اس کا صحیح مطلب سمجھنا نہ جاسکتا ہو تو پھر جو حدیث روحانیت سے تعلق رکھتی ہو جس کا مشاہدہ اور مادیت سے کوئی تعلق نہ ہو اس کو بغیر تاویل اس طرح ظاہر ترجمہ سے کس طرح سمجھا جا سکتا ہے، انصاف کیجئے۔

”حدیث کا علم الافلاک آپ پڑھ چکے“

(دوسلام ص ۳۲)

**غلط فہمی**

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ بالکل سچ فرماتا ہے۔

**ازالہ**

آسمان دنیا کو ہم نے ستاروں زینت دی ہے اور ان ستاروں کو سرکش شیطان سے حفاظت کا سبب بھی بنایا ہے۔

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ  
الْكُوكِبِ، وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ  
شَيْطَانٍ مَّارٍ ۚ  
(الصافات ۱-۶، ۷)

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

اور ان ستاروں کو ہم نے شیاطین کو مارنے کا آلہ بنایا ہے۔

وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ  
(الملک ۵)

بتائیے کیا سائنس بھی یہی کہتی ہے:-

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

کہ ایک مرتبہ جہنم نے خدا کے پاس شکایت کی، کہ میرا دم گھٹ چکا ہے اس

لئے مجھے سانس لینے کی اجازت دیجئے۔ اللہ نے کہا تم سال میں صرف دو سانس

لے سکتے ہو چنانچہ اس کی ایک سانس سے موسم گرما اور دوسری سے موسم سرما پیدا ہو گیا

(بخاری جلد ۲ ص ۱۴۳)

**غلط فہمی**



لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ہر سال گرمیوں کے موسم میں صرف وہی علاقے اس سائنس کی لپیٹ میں کیوں آتے ہیں جو خط استوا کے قریب ہیں۔

(دوا سلام ص ۳۲۶)

**ازالہ** ہو سکتا ہے کہ جہنم کا تعلق براہ راست ہماری دنیا سے نہ ہو بلکہ سورج سے ہو۔ اور سورج کا تعلق براہ راست ہماری دنیا سے ہو، لہذا سردی، گرمی جو ہم محسوس کرتے ہیں وہ سورج کے اثر سے کرتے ہیں اور اسی کی طرف اس سردی گرمی کو منسوب کرتے ہیں، حدیث میں گرمی و سردی کے اصل سبب کا بیان ہے۔ دوزخ کے سائنسوں کا اثر سورج قبول کرتا ہے اور پھر وہ اثر قرب و بعد کے لحاظ سے ہماری دنیا کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے۔

حدیث میں یہ نہیں ہے کہ موسم جہنم کے سائنس سے پیدا ہوتے ہیں، حدیث میں تو صرف اتنا ہے کہ جاڑوں کے موسم میں جب سخت سردی اور گرمیوں کے موسم میں جب سخت گرمی پڑتی ہے تو اس کا سبب جہنم کا سائنس ہوتا ہے (برق صاحب نے حدیث کا صحیح ترجمہ نقل نہیں فرمایا) یہ دونوں مواقع زیادہ سے زیادہ چند دن رہتے ہیں نہ کہ چار پانچ مہینے۔

ہمارا ایمان صرف مشاہدات اور تجربات پر ہی نہیں ہوتا بلکہ غیب پر بھی ہوتا ہے لہذا جو کچھ حدیث میں ہے اس پر بھی ہمارا ایمان ہے، صحیح تاویل کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں لہذا اس میں کوئی بھی اشکال نہیں، قرآن مجید میں بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر ہم ایمان بالغیب لائے ہیں، خواہ وہ ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آنا، فرشتوں کا وجود، سدرۃ المنتہی، ہوا کا سلیمان علیہ السلام کے تابع ہونا اور ان کے حکم سے چلنا، اصحاب کہف کا بے آب و دانہ صد ہا سال تک سوتے رہنا، کھانے کا سو سال تک نہ سڑنا، حضرت خضر کا خلاف عقل و نقل اور لفظاً برخلاف شرع ایک معصوم بچے کو ایسے گناہ پر قتل کر دینا جس کا وہ ابھی مرتکب نہیں ہوا تھا، ستاروں سے شیطان کو مارتا وغیرہ وغیرہ، بس اسی طرح ہم اس حدیث پر بھی ایمان لاتے ہیں جہنم سے سورج کا کیا تعلق ہے یہ قدرت کا ایک خفیہ راز ہے جس کا کھوج ممکن ہے آئندہ کبھی سائنس کی روشنی میں لگا یا جاسکے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ٹیلی ویژن، کہ اس میں اور جس کی وہ تصویر ہے اس میں کیسا خفیہ تعلق ہے اور آج سے پچاس سال پہلے ہم اس خفیہ راز سے قطعاً نا آشنا تھے۔

حدیث کہتی ہے :-

”اگر کبھی شربت وغیرہ میں گر جائے تو اسے پوری طرح غوطہ دے کر باہر نکالو

**غلط فہمی**

اس لئے کہ اس کے ایک پر میں ہماری مہوتی ہے اور دوسرے میں شفا۔

کبھی بیت الخلاء سے اڑ کر آئی ہے، پر اور ٹانگیں غلاظت سے لٹھڑی ہوئی ہیں اور



مردانا اس کے دوسرے پر میں شفا تلاش کر رہے ہیں (دوا سلام ص ۳۲۷-۳۲۸)  
 یہ تو سب مانتے ہیں کہ مکھی جب گندگی پر بیٹھتی ہے تو بہت سے جراثیم اس کے پروں  
 میں چپٹ جاتے ہیں، البتہ شک اس بات میں ہے کہ اس مکھی میں جراثیم کش دوا بھی ہے  
 اس شک کی بنا لا علمی پر ہے علامہ عبداللہ القصیمی لکھتے ہیں:-

”موجودہ دور کے ایک مشہور ڈاکٹر نے ایک سال پیشتر ”جمیعة الهدایۃ الاسلامیہ“ میں ایک مفصل مضمون  
 اس بارے میں نقل کیا تھا جس کا ماحصل یہ ہے:-

”مکھی گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں پر بیٹھتی ہے جو ان جراثیم سے بھرے ہوتے ہیں جو  
 طرح طرح کی بیماریوں کے پھیلانے کا باعث بنتے ہیں، ان جراثیم میں سے بعض اس کے  
 پہلوؤں سے چپٹ جاتے ہیں اور کچھ اس کے پیٹ کے اندر پہنچ جاتے ہیں اس سے اس  
 جسم کے اندر ایک زہریلا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اس مادہ کا نام اہل طب کی اصطلاح میں  
 ”مبعد البکتریا“ ہے لیکن اس مادہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت سی بیماریوں کے جراثیم  
 کو ختم کر دیتا ہے اور م بعد البکتریا کے موجود ہونے کی صورت میں ان جراثیم کا زندہ رہنا یا انسانی  
 جسم میں کچھ اثر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے نیز مکھی کے ایک پر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ م بعد البکتریا کو  
 اس کے پیٹ سے ایک پہلو کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے، لہذا مکھی جب کسی کھانے یا پینے  
 کی چیز پر بیٹھتی ہے تو پہلو سے چمٹے ہوئے جراثیم اس میں ڈالتی ہے تو م بعد البکتریا میں سے  
 جو مادہ قریب ہوتا ہے ان جراثیم کو فنا کر دیتا ہے ان جراثیم سے بچانے والی سب سے  
 پہلی چیز وہ م بعد البکتریا ہے جسے مکھی اپنے پیٹ میں اپنے ایک پر کے پاس اٹھائے ہوتی  
 ہے، لہذا چمٹے ہوئے زہریلے جراثیم کو ہلاک، اور ان کے عمل کو بے کار کرنے کے لئے یہ چیز  
 کافی ہے کہ پوری مکھی کو کھانے میں ڈبو کر باہر پھینک دیا جائے (یہ ہے موجودہ زمانہ کے  
 ایک مشہور ڈاکٹر کے بیان کا خلاصہ)

اس کے علاوہ انگلستان کے مشہور طبی رسالہ (Doctorian Experiments) اپنے

نمبر ۱۰۳ (شائع شدہ ۱۹۲۷ء) میں لکھتا ہے:-

”مکھی جب سبز یوں اور کھیتوں پر بیٹھتی ہے تو اپنے ساتھ مختلف بیماریوں کے جراثیم اٹھا  
 لیتی ہے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ جراثیم مرجاتے ہیں اور ان کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور ان کی  
 جگہ مکھی کے پیٹ میں بکتریا فاج نامی ایک مادہ پیدا ہوتا ہے جو زہریلے جراثیم کو ختم کرنے  
 کی خصوصیت رکھتا ہے اگر تم کسی نمکین پانی میں مکھی کے پیٹ کا مادہ ڈالو تو تمہیں وہ بکتریا  
 فاج مل سکتا ہے جو مختلف بیماریاں پھیلانے والے چار قسم کے جراثیم کا ہلاک ہے، اس کے



علاوہ مکھی کے پیٹ کا یہ مادہ بدل کر بکتر لیفاج کے بعد ایک ایسا مادہ بن جائے گا جو چار مزید قسم کے جراثیم کو فنا کرنے کے لئے مفید ہوگا۔

(بینات ترجمہ مشکلات الاحادیث النبویہ ص ۱۱ - ۱۲۰)

الغرض حدیث شک و شبہ سے پاک ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک علمی

معجزہ ہے۔

”یہ حدیث کسی ایسے ہی مکھی چوس ملّا کی ایجاد معلوم ہوتی ہے۔

(دوا اسلام ص ۳۲۸)

**غلط فہمی**

برق صاحب اگر بہت ہی قیمتی کوئی چیز آپ تیار کر رہے ہیں، مثلاً حلوا سوہن، خمیسہ گاؤں زبان غنبری، جواہر والا اور اتفاق سے جب وہ رقیق حالت میں ہو اس میں مکھی گر جائے تو انصاف سے بتائیے آپ کیا کریں گے کیا وہ ساری چیز آپ پھینک دیں گے یا مکھی نکال کر پھینک دیں گے اور وہ چیز استعمال کر لیں گے، پہلی صورت میں تو بہت بڑا نقصان ہوگا اور غالباً شاید ہی کوئی حلوائی یاد دواساز کارخانہ ایسا کرے اور دوسری صورت میں اس چیز میں مضر جراثیم کی آمیزش ہوگی لہذا وہ چیز بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان پہنچائے گی، حدیث نے ایسے ہی موقع کے لئے آپ کو ایک نسخہ دے دیا ہے کہ نہ مالی نقصان ہو اور نہ صحت کا نقصان، ایسے موقع پر آپ اس نسخہ کو استعمال کر سکتے ہیں اور اگر آپ اس کو پانی کے ہر گلاس پر استعمال کرنا چاہیں تو پھر آپ کو اختیار ہے حدیث آپ پر پابندی نہیں لگاتی۔

”مرد کا نطفہ سفید ہوتا ہے اور عورت کا زرد، انزال کے بعد یہ ہر دو قسم

کے نطفے مل جاتے ہیں اگر یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو تو بچہ پیدا ہوتا ہے

**غلط فہمی**

ورنہ بچی۔ (مسلم جلد ۱ ص ۴۶۸)

ماہرین تولید اس امر پر متفق ہیں کہ عورت کا نطفہ مقدار میں بے حد کم..... اس میں چاہئے تو یہ بخا کہ مجامعت سے ہمیشہ لڑکا پیدا ہوتا، لیکن حالت یہ ہے کہ لڑکیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں اور لڑکے کم“ (دوا اسلام ص ۳۲۸، ص ۳۲۹)

برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا ہے۔ متن مع صحیح ترجمہ درج ذیل ہے۔

فَعَلَا مَنِيَّ الرَّجُلُ مَنِيَّ

اَلْمَرْأَةُ اَوْ كَوْنِ اِيَا ذُنِ اللّٰهِ وَاِذَا

عَلَا مَنِيَّ الْمَرْأَةُ مَنِيَّ الرَّجُلِ

اَتَمَّا يَا ذُنِ اللّٰهِ (صحیح مسلم کتاب الحیض)

اگر مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ پر غالب

آجاتا ہے تو اللہ کے حکم سے لڑکا ہوتا ہے اور اگر

عورت کا نطفہ مرد کے نطفہ پر غالب آجاتا ہے تو

اللہ کے حکم سے لڑکی ہوتی ہے۔

**ازالہ**



یعنی اصل چیز جو کار فرما ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور یہی وہ راز ہے جس کے متعلق برق صاحب لکھتے ہیں :-

”یہ فطرت کے وہ رموز ہیں، جنہیں کوئی ماہر فطرت آج تک نہیں سمجھ سکا۔“

(دوا سلام ص ۳۲۸)

اس موقع پر پہنچ کر ہم سوال کرتے ہیں کہ جب ان رموز کو آپ سمجھ ہی نہ سکے تو آپ نے حدیث پر اعتراض ہی کیوں کیا، دوسری بات یہ ہے کہ یہ غلبہ باذن الہی ہوتا ہے لہذا مقدار کو اس میں کوئی دخل نہیں اگر آپ نے علم کیمیا (Chemistry) پڑھی ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹائٹریشن (Titration) کرتے وقت ایک قطرہ ایک بہت بڑے محلول پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے لہذا غلبہ قوت کی نسبت سے ہوتا ہے نہ کہ مقدار کی نسبت سے۔

”غذو خال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے، مجامعت کی وقت اگر مرد کا انزال عورت

سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر۔“ (بخاری ج ۲ ص ۱۴۹)

”واود بچے اس ملا کو کہ فطرت کے ایک نہایت مخفی راز کو کس بے تکلفی صفائی اور

آسانی سے بے حجاب کر دیا ہے“ (دوا سلام ص ۳۲۹)

برق صاحب نے ”سبق“ کے معنی سبقت نزول کر دئے حالانکہ یہ معنی صحیح نہیں

دوسری حدیث میں اس کی تشریح ہے، ارشاد گرامی ہے :-

إِذَا عَلَا مَاءُ الْمَرْءِ عَلَى مَاءِهَا

جب مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ پر غالب ہوتا ہے

(صحیح مسلم)

برق صاحب! اگر یہ مخفی راز ہے تو آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ حدیث قابل اعتراض ہے آپ اس کو

حدیث کا علم التولید کہہ کر متعجب ہیں لیکن قرآن مجید کے علم التولید سے متعجب نہیں کہ بغیر مرد کے نطفہ کے بچہ پیدا ہو گیا۔

بچہ کی مشابہت ماں یا باپ سے ہونا، ایک ایسی بات ہے جس کو عام الفاظ میں ادا کرنا کوئی

آسان بات نہیں۔ اگر آپ علم توالد و تناسل (Genetics) کے ابواب کا مطالعہ کریں تو معلوم

ہوگا کہ والدین کی خصوصیات جو بچہ میں منتقل ہوتی ہیں اس کا طریقہ انتہائی دقیق ہے اور اس کا

سمجھنا عام انسان تو کبھی تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بھی جنہوں نے باقاعدہ علم الحیات کا مطالعہ نہ کیا ہو

ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن اس پورے دقیق اور پیچیدہ طریق کا لب لباب یہی ہے کہ اگر مردانہ

خصوصیات کے حامل ذرے (genes) غالب رہتے ہیں تو لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اگر اس کے

برعکس ہو تو لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ ایک سائل نے جب اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے



سوال کیا تو آپ نے ان عام فہم الفاظ میں اس گتھی کو سلجھا دیا، سائل کی مہبی تسفی ہو گئی، اور حقیقت کے بھی خلاف نہ ہوا۔

## غلط فہمی

”اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہو جو فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ اور بلیس کی زود سے بالکل باہر ہو تو لیجئے نسخہ حاضر ہے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، کہ جب کوئی شخص مجامعت کرنے لگے تو یہ دعا پڑھ لے ”بسم اللہ اللہم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما درنا قتنا“ (اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو شیطان سے بچا) اس کی اولاد کو شیطان بھی گمراہ نہیں کر سکے گا۔ (بخاری)

کتنی امرت دھارا قسم کی دعا ہے کہ نہ قرآن کی ضرورت باقی رہی نہ رسول کی، اس لئے کہ قرآن و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام تو ہدایت ہے اور جس بچے کے گمراہ ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہا ہو، قرآن و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے کس کام کے؟“ (دوسلام ص ۳۳)

ہمارا کام دعا کرنا ہے، قبول کرنا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

أَدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ  
(المؤمن ۶۰-۶۱)

مجھ سے دعا مانگو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

اٰجِبْ دَعْوَةَ الدّٰعِ اِذَا دَعَا  
(البقرہ ۱۸۶)

میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جس وقت بھی وہ مجھ سے دعا مانگے۔

لہذا اگر ایسے موقع پر جب کہ جذبات کی زد کی میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے، کوئی شخص اللہ کو نہ بھولے، اس سے گڑا کر دعا مانگے تو کیا تعجب ہے کہ قبول ہو جائے اور اگر قبول ہو جائے تو بچہ کا شیطان سے محفوظ رہنا کیا مشکل ہے اور جو شخص شیطان سے محفوظ رہے گا اس ہی کے کام رسول آئے گا، قرآن بھی آئے گا حدیث بھی آئے گی اور جو شخص شیطان کے زرعہ میں پھنس گیا، پھر وہ ہدایت پا ہی کیسے سکتا ہے اس کے لئے تو اللہ اور رسولؐ اور ان کی ہدایت سب بے کار ہے قرآن مجید میں ہے:-

وَمَنْ يَّعِشْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ  
لُفِیْضٍ لَّہٗ شَیْطٰنًا فٰھُوَ لَہٗ

جو رحمن کے ذکر سے غافل ہو جائے تو ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں، پس پھر رہی اس کا



قَرْنٍ ۝ (الزخوف ۱-۲۶) ساتھی ہوتا ہے۔

بتائیے اس شیطان سے بچنے کے لئے اللہ کو یاد کیا جائے یا نہیں اور اگر پھر بھی اعتراض باقی رہے تو یہ بتائیے کہ قرآن مجید میں ”أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھنے کا حکم کیوں دیا ہے؟

”مرغ کیوں بانگ دیتا ہے گدھا کیوں ہینگتا ہے... شیر کیوں دھاڑتا

ہے... ان تمام سوال کا حل تو مشکل ہے، البتہ ایک دو سوالات کے

جوابات حاضر ہیں۔

ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب تم مرغ کی صدا سنو، تو اللہ سے فضل کی دعا مانگا کرو، اس لئے کہ اس وقت مرغ کو فرشتہ نظر آیا کرتا ہے اور جب گدھے کی آواز سنو، تو شیطان سے پناہ مانگو، اس لئے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے“ (دوا سلام ص ۳۳-۳۳۱)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مرغ کو رات کے وقت (مسند احمد) فرشتے دکھائی دیتے ہیں، اور جب وہ کسی فرشتے کو دیکھتا ہے، تو اس وقت اذان دینے لگتا

ہے لہذا جب تم اسے اذان دیتے سنو تو اللہ کا فضل طلب کرو، قرآن مجید میں ہے: هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ اللّٰهُ اور اس کے فرشتے تم پر رحمت بھیجتے ہیں۔

(الاحزاب ۱-۲۳)

لہذا ایسے وقت میں فضل تلاش کرنا، جب کہ فرشتے فضل و رحمت تقسیم کر رہے ہوں زیادہ مناسب ہے، اسی طرح گدھے کو رات کے وقت (مسند احمد) شیطان نظر آتے ہیں اور ان کو دیکھ کر اس پر بھی شیطنت سوار ہو جاتی ہے لہذا ایسے وقت میں جب کہ شیطان کی آمد و رفت ہو، شیطان سے پناہ مانگنا بہت مناسب ہے۔

یہ چیزیں امور غیب سے ہیں اور ان پر اعتراض لایعنی ہے، مرغ کا فرشتہ کو دیکھنا، اور گدھے کا شیطان کو دیکھنا بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جانوروں میں بعض باتوں کا ادراک انسان سے زیادہ ہوتا ہے۔ چیل کے انتہائی بلندی پر اڑنے کے باوجود مرغی کو اس کی موجودگی کا ادراک ہو جاتا ہے، اور بچوں کی حفاظت کے لئے عجیب سی آواز نکالتی ہے، چوٹی کی قوتِ شامہ، مور کی قوتِ سامعہ، اور چیل کی قوتِ باصرہ انسان سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں، مور ملیوں دور کی آواز سن لیتا ہے، چوٹی بہت دور سے خوشبو سونگھ لیتی ہے، چیل بہت اونچائی سے چھوٹی سی بوٹی دیکھ لیتی ہے، جب کوئی آفت آنے والی ہوتی ہے تو سیال گاؤں کے قریب اگر تمام



رات روتے ہیں دیہاتیوں نے اس کا بار بار تجربہ کیا ہوگا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی شدید طوفان یا زلزلہ آنے والا ہوتا ہے تو اس کے آنے سے پہلے جنگلی جانور اس مقام کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جانوروں میں بعض غیر مرئی اشیاء کو دیکھنے یا محسوس کرنے کی قوت ہوتی ہے تو پھر کیا عجب ہے کہ مرغ فرشتہ کو دیکھ لیتا ہو، اور گدھا شیطان کو۔

”اگر کوئی شخص کسی محفل میں جا کر تین مرتبہ سلام کرے اور سیربات کو

تین تین مرتبہ دہرائے تو آپ اسے کب تک برداشت کریں گے.....

انسؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ وہ تین مرتبہ سلام

کہتے اور سیربات کو تین مرتبہ دہراتے تھے۔“ (دو اسلام ص ۳۳۱)

برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ تین مرتبہ سلام کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ ایک شخص کو

تین مرتبہ سلام کیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کسی کے ہاں تشریف

لے جاتے تو باہر کھڑے ہو کر سلام کرتے اگر جواب مل جاتا تو خیر ورنہ دوسری مرتبہ سلام کرتے، اب

بھی اگر جواب نہ ملتا تو تیسری مرتبہ سلام کرتے، اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ ملتا تو واپس چلے آتے۔ اور اگر

پہلی مرتبہ سلام کرنے کے بعد جواب مل جاتا تو پھر ملاقات کے وقت دوسرا سلام کرتے اور پھر رخصت

ہوتے وقت تیسرا سلام کرتے، اسی طرح جب آپ کو کوئی بات سمجھانی ہوتی تو اس کو تین مرتبہ دہراتے

تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

جس حدیث کو برق صاحب نے نقل کیا ہے اس کے ذرا آگے یہ حدیث بھی ہے عبد اللہ بن عمرؓ

کہتے ہیں کہ عصر میں ہم لوگوں کو دیر ہو گئی تھی لہذا ہم لوگ جلدی جلدی وضو کرنے لگے اور پیروں پر مسح کرنے

لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو بلند آواز سے دو تین مرتبہ فرمایا:-

وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ التَّارَةِ

(یعنی خشک اڑیوں کے لئے آگ ہے)

(صحیح بخاری - کتاب العلم)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاص خاص جملے آپ مکرر سہ کر ارشاد فرماتے تھے تاکہ اچھی طرح

ذہن نشین ہو جائیں اور سمجھ میں آجائیں، برق صاحب یہ دینی مسائل ہیں اور مسائل کو تین تین مرتبہ دہرانا،

تاکہ سب لوگ سن لیں اور یاد رکھیں، قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ یہی مناسب ہے، یہ تقریر و تحریر

نہیں جس میں یہ بات معیوب سمجھی جائے، اس تشریح کے بعد وہی حدیث جس کو برق صاحب نے

مختصر نقل کیا ہے پوری سنئے:-

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم جب کوئی مسئلہ بیان فرماتے

عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ إِذَا كَانَ إِذَا أَتَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ



اَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتَّى تُفْهَمَ عَنْهُ  
وَإِذَا آتَى عَلَى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ  
ثَلَاثًا (صحیح بخاری)

تو تین دفعہ اس کو دہراتے تاکہ اچھی طرح سمجھ  
میں آجائے اور جب کسی قوم سے ملنے جاتے تو  
تین مرتبہ سلام کرتے۔

اس تشریح کے بعد اعتراض تو رفع ہو گیا تاہم ہم چاہتے ہیں کہ قرآن مجید سے بھی اس کا جواب دے دیں،  
قرآن مجید میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو بار بار دہرایا گیا ہے آدم علیہ السلام کے قصہ کو سات مرتبہ دہرایا گیا ہے  
اور ہر مرتبہ وہی مضمون، اسی طرح بہت سے انبیاء کے مقصص بار بار دہرائے گئے ہیں، آخر یہ کیوں؟ کیا یہ  
بھی عجیب ہے یا نہیں؟ آپ کہیں گے الفاظ تو بدل گئے ہیں۔ تو یہ بھی صحیح نہیں، بعض جگہ تو الفاظ بھی  
وہی ہوتے ہیں، مزید برآں سورہ قمر میں ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں، پورے چار مرتبہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ  
کو دہرایا ہے:-

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ  
مِنْ مُدْكِرٍ (القلم: ۱۷-۲۰)

ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے،  
ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے؟

سورہٴ مرسلات ایک چھوٹی سی سورت ہے اس میں ایک ہی جملہ  
ذُرِّيُّنَ يُؤْمِنُ بِالْمُكَدِّبِينَ ہ  
اس دن جھٹلانے والوں کے لئے طرا بی ہے۔  
کو دس مرتبہ دہرایا گیا ہے اور تو اور سورۃ الرحمن جیسی چھوٹی سی سورت میں  
مَبَآئِیَ الْأَوْرَاقِ تَتَكَدَّبُ أَبَآ ہ  
پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں  
کو جھٹل ڈال گے۔

کو اس مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ جس بات پر زور دینا مقصود ہوتا ہے وہی بار بار  
دہرائی جاتی ہے لہذا اس قسم کی تکرار اگر قرآن مجید میں ہو تو کوئی عیب کی بات نہیں اور اگر حدیث میں  
ہو تو بھی کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

”حضور علیہ السلام کے بے شمار اقوال و خطبات ہمارے  
سامنے موجود ہیں، کہیں بھی کسی بات کو تین تین مرتبہ دہرایا نہیں گیا“

**غلط فہمی**

(دو اسلام ص ۳۳)

بے شمار کلمات ہیں جن کو آپ نے دہرایا ہے، ایک مثال تو اوپر بیان ہو چکی اور مثالوں  
کے لئے کتب احادیث ملاحظہ فرمائی:-

**ازالہ**

”حذیفہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب آئے اور  
میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا (بخاری ج ۱ ص ۳۶)

**غلط فہمی**

امام بخاری میں ہی یہ جرات تھی کہ اس معلم کائنات و مہبط الوحی کی طرف فیعل منسوب



کر دیا ورنہ ہم تو حضور کے متعلق اس قسم کی کوئی بات خیال تک لانا گناہ سمجھتے ہیں۔

(ص ۳۳۳)

## ازالہ

برق صاحب نے ترجمہ میں دو غلطیاں کی ہیں۔  
اول۔ آپ نے حضرت حذیفہؓ کے سامنے پیشاب کیا حالانکہ یہ قطعاً صحیح نہیں بلکہ

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں:-

قُمْتُ عِنْدَ عَقِيْدِهِ حَتَّى فَرَغَ  
میں آپ کے پیچھے کھڑا رہا، یہاں تک کہ آپ  
فارغ ہوئے۔

دوسری طرف دیوار تھی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

فَاتَى سَبَاطَةَ قَوْمٍ خَلْفَ  
یعنی آپ ایک قوم کے کھاد کے ڈھیر کے  
پاس آئے اور دیوار کے پیچھے آپ کھڑے ہو گئے

لہذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیوار کی طرف منہ کیا اور  
حضرت حذیفہؓ کو اپنے پیچھے کھڑا کیا اور پیچھے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔

دوم۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ برق صاحب نے ”بال“ کا ترجمہ ”پیشاب کر دیا“ کیا ہے حالانکہ  
صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”پیشاب کیا“ برق صاحب اگر آپ کی مادری زبان اردو نہیں ہے تو خیر آپ قابلِ معافی  
ہیں ورنہ ”بال“ کا ترجمہ ”پیشاب کر دیا“ کے آپ نے حدیث کی کسی اردو دان سے پوچھ لیجئے کہ ”پیشاب  
کیا“ اور ”پیشاب کر دیا“ میں کتنا بڑا فرق ہے۔

برق صاحب کا اعتراض اس حدیث پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے متعلق ہے یہ صحیح ہے کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرتے تھے اور سوائے ایک مرتبہ کے آپ کا  
کبھی کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ثابت نہیں۔

برق صاحب آپ تو اسے معیوب سمجھ رہے ہیں لیکن ذرا کسی مغرب زدہ، تجدید مذہب کے  
ولدانہ شخص سے پوچھئے تو وہ اس حدیث کو سن کر خوش ہو گا اور ملتا کو برا مہلکے گا کہ اس نے یہ پابندی  
لگا رکھی ہے ورنہ حدیث میں تو کھلی جھوٹی ہے۔

آپ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہوں گے کہ زلزلے آسمانوں میں بھی آیا

کرتے ہیں اور اس زور سے کہ اللہ کا تخت تک کا پنے لگتا ہے۔۔۔۔

## غلط فہمی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سعد بن معاذ کی موت پر خدائی تخت کا پنے لگ

گیا تھا۔

سعد کی موت پر عرش کیسے ہل گیا تھا؟ اسے سمجھنے کے لئے قیامت کا



انتظار کیجئے۔ (دوسرا سلام ص ۲۳۲)

**ازالہ** | برقی صاحب آپ نے صحیح بات کہہ دی یہ حدیث ایسی نہیں کہ اسے سمجھا جا سکے نہ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس طرح قرآن مجید میں آیات متشابہات ہیں اور ان پر صرف ایمان لایا جاتا ہے اسی طرح بعض احادیث بھی متشابہات ہوتی ہیں اور ان پر صرف ایمان لایا جاتا ہے ان کے اصل مفہوم کا ادراک عقل انسانی نہیں کر سکتی، لہذا اس حدیث کو سمجھنے کی کوشش ہی آپ کو نہ کرنی چاہیئے، قرآن مجید میں ہے:-

وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ  
اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔

(ہود: ۷۷)

بتائیے اس آیت کو کس طرح سمجھیں، دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَيَجْعَلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ  
قیامت کے دن تیرے رب کے عرش کو آٹھ

شَآئِنَةٍ ۖ (الحاقة: ۱۷) فرشتے اٹھائے ہوں گے۔

بتائیے اس آیت کا کیا مطلب ہے کیا اللہ تعالیٰ تخت پر بیٹھتا ہے؟ کیا اللہ کو فرشتے اٹھا سکتے ہیں ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ ہم تو اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرتے ہیں آپ بھی ایسا ہی کیجئے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:-

وَلَا تَقِفْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ  
جس چیز کا علم نہ ہو، اس کے پیچھے

(بنی اسرائیل: ۳۶) نہ پڑو۔

لہذا ان چیزوں کے پیچھے پڑنا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَنَسَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ  
ان کی موت پر آسمان اور زمین

(الدخان: ۲۹) نہیں روئے۔

گویا بعض لوگوں کی موت پر زمین و آسمان روتے ہیں یعنی ان کو رنج و غم ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ عرش کے رنج و ملال کرنے پر تعجب کا اظہار کیا جائے جو مطلب اس آیت کا کیا جائے گا وہی مطلب حدیث کا بھی ہو سکتا ہے۔ لہذا اعتراض فضول ہے:-

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عرش کا ہل جانا، کوئی محاورہ ہو، جو انتہائی غم کے موقع پر استعمال ہوتا ہو مثلاً انتہائی غم کے موقع پر یہ محاورہ ”زمین کا پاؤں کے نیچے سے نکل جانا“ استعمال ہوتا ہے

”اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ سعدی نے گلستان سات زبانوں میں

لکھی تھی تو آپ کیا سمجھیں گے؟ یہی کہ انہوں نے گلستان کے سات نسخے

**غلط فہمی**



تیار کئے تھے ایک فارسی میں دوسرا عربی میں .... وعلیٰ بذالقیاس، لیکن اگر کوئی شخص فارسی کی گلستان کے متعلق یہ کہے کہ سات زبانوں میں لکھی ہوئی ہے تو آپ اسے ہی کہیں گے کہ سر پر ٹھنڈا پانی ڈال لو ....

حضور نے فرمایا، کہ قرآن سات زبانوں میں اتارا گیا ہے  
(مسلم جلد ۲ ص ۳۶۳)

کیا سات زبانوں میں اتارنے کا مفہوم یہی ہے کہ ایک ہی آیت سات مختلف زبانوں میں اتری تھی، تو پھر وہ باقی چھ زبانوں کے قرآن کہاں چلے گئے۔  
(رد اسلام ص ۲۳۳، ص ۳۲۲)

حدیث کا مطلب سمجھنے میں برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی ذیل میں متن حدیث مع ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

ازالہ

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا، ایک شخص داخل ہوا اور نماز پڑھنے لگا۔ اس نے ایسی قرات کی کہ مجھے برہمی معلوم ہوئی، پھر دوسرا شخص داخل ہوا، اس نے دوسرے طریقہ سے قرات کی۔

عَنْ أَبِي بَنْ كَعْبٍ قَالَ كُنْتُ فِي الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ يُجَلِّي فَقَرَأَ قِرَاءَةً أُنْكِرْتُهَا عَلَيْهِ ثُمَّ دَخَلَ آخَرُ فَقَرَأَ قِرَاءَةً سَوَى قِرَاءَةِ صَاحِبِهِ - رِصْحِمِ مُسْلِمٌ جُلْد ۱ قِلْ  
باب بيان ان القرآن انزل على

سبعة احرف)

حدیث مذکور سے صاف ظاہر ہوا کہ اختلاف پڑھنے کے طریقہ میں تھا، لب و لہجہ میں اختلاف تھا، ان پڑھنے والوں کا لہجہ قریش کے لب و لہجہ سے مختلف تھا، لہذا حضرت ابی بن کعب کو اس طرح پڑھنا ناگوار گذرا، پھر یہ قضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، آپ نے ان دونوں کی قرات کو درست فرمایا۔

پھر آپ نے جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان کے ساتوں لہجوں میں قرآن مجید پڑھنے کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ فَاتَّبِعُوا مَا تَشَاءُ مِنْهُ۔  
یہ قرآن سات قراتوں پر نازل ہوا ہے پس جو قرات تمہیں آسان معلوم ہو اس قرات سے

تم تفاوت کر سکتے ہو۔

(صحیح مسلم)

اس حدیث کی بنا پر قرآن مختلف طریقوں سے آج تک پڑھا جاتا ہے، ہندوستان کی قرات



علیحدہ ہے، مکی قرأت علیحدہ ہے، مصری قرأت علیحدہ ہے، علیٰ ہذا القیاس، مختلف ممالک میں مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے، ہماری اردو زبان کو دیکھئے کہ یہ زبان تمام ہندو پاکستان میں بولی جاتی ہے لیکن دہلی اور یوپی کے لہجہ میں ہر جگہ نہیں بولی جاتی، پنجابیوں کا لہجہ علیحدہ ہے، سرحدیوں کا علیحدہ ہے، بنگالیوں کا علیحدہ، اور حد تو یہ ہو گئی کہ حیدرآباد دکن کا لہجہ بالکل علیحدہ ہے، بعض لہجے ایسے ہیں کہ کانوں پر بارگندہ تے ہیں، سبجے بدل رہے ہیں لیکن اس کے باوجود زبان ایک ہی ہے، برق صاحب نے لہجہ کو زبان سمجھ لیا، حالانکہ حدیث میں زبان کا کوئی ذکر نہیں، اور یہی غلط فہمی کا اصل موجب ہے۔

”سنیڈوں حفاظ نے حضورؐ کی مقرر کردہ ترتیب کے مطابق قرآن مجید کو یاد کر لیا تھا اور ایک نسخہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں موجود تھا جو چمڑے کے ٹکڑوں

پتھروں اور تپوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا، جب حضرت صدیقؓ کے زمانہ میں حفاظ قرآن کی ایک خاصی تعداد جنگ یمامہ میں شہید ہو گئی تو آپؐ نے نسخہ رسولؐ سے ایک نیا نسخہ تیار کرایا“  
(دوا سلام ص ۲۲۵)

یہ قطعاً صحیح نہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتب کیا ہوا قرآن مجید موجود تھا، یہ بھی قطعاً صحیح نہیں کہ اسی نسخہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک نیا نسخہ تیار کرایا تھا، یہ چیزیں بالکل بے ثبوت ہیں، برق صاحب نے بے حوالہ ان کو نقل کیا ہے بلکہ احادیث و تاریخ دونوں اس کی تکذیب کرتی ہیں۔

”جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ مسجد نبویؐ میں ایک درخت تھا جس کے پاس کھڑے ہو کر حضورؐ وعظ فرمایا کرتے تھے، جس روز منبر تیار ہو گیا اور آپؐ منبر پر چڑھ کر وعظ کرنے لگے، تو اس درخت نے رونا شروع کیا... حضورؐ منبر سے اترے، اس درخت پر ہاتھ پھیرا اور وہ چپ ہو گیا“

”حضورؐ مکہ سے نکلے تو نہ ان کا گھر رویا نہ کوئی درخت نہ پتھر، پھر اس مسجد کے درخت کو کیا خاص صدمہ پہنچا تھا“ (دوا سلام ص ۲۲۶، ص ۲۲۷)

برق صاحب یہ معجزہ ہے اور معجزے شاذ و نادر ہی صادر ہوا کرتے ہیں یہ نہیں کہ ساری زندگی ہی معجزہ بن جائے۔

”رونے کے لئے احساس، دل، دماغ، ہچھکڑوں، گلے اور دقیق نظام جسمانی کی ضرورت ہے یہ سب کچھ اس درخت میں کہاں سے آگیا تھا“  
(دوا سلام ص ۲۲۷)



## ازالہ

برق صاحب قرآن مجید میں ہے :-

دَسَخْتُونَا مَعَ دَاوُدَ الْجَبَّالِ

اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا

يُسَبِّحُونَ . (الانبیاء : ۷۹)

مقاہد پہاڑ تسبیح کیا کرتے تھے ۔

پڑھنے کے لئے منہ کی زبان کی ضرورت ہے یا نہیں ، اگر ہے تو منہ اور زبان پہاڑوں میں کہاں سے آگئی تھی اور سینے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَلَا تَمِنْهَا لَمَّا يَغْطِطُ مِنْ خَشْيَةِ

اور بے شک بعض پتھر ایسے ہیں کہ اللہ کے

اللہ . (المبتدأ : ۷۲)

ڈر سے گر پڑتے ہیں ۔

بتائیے ڈرنے کے لئے دل و دماغ کی ضرورت ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو پھر بغیر دل و دماغ کے پتھروں میں خشیت الہی کہاں سے آگئی ، برق صاحب درخت کا رونا ایک معجزہ ہے ، اگر درخت کے دل و دماغ پھینک دے مورتے تو پھر اس کو معجزہ کون کہتا ؟ معجزہ تو اسی صورت میں ہے کہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہ ہو اور پھر درخت روئے ۔

موسیٰ علیہ السلام کے عصا پر غور کیجئے وہ کس طرح سانپ بن گیا تھا ، اور سانپ بن کر تمام جادو کے سانپوں کو نکل گیا تھا ۔ نکلنے کے لئے بھی منہ گلے ، پھیپھڑے اور احساس کی ضرورت ہے یہ چیزیں لکڑی کے عصا کو کہاں میسر ؟ معجزہ کہتے ہی اس بات کو نہیں ، جو خلافِ عادت واقع ہو ، لہذا درخت کے رونے پر اعتراض محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے ۔

”اگر آپ کہیں کہ یہ معجزہ تھا تو رسول مسلم نے کفار کو معجزہ

دکھانے سے کیوں انکار کیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا ”هَلْ كُنْتُ

اَلْاَبْرَارُ سُورَۃ“ میں ایک انسان ہوں جس کا کام اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا ہے نہ کہ معجزے

دکھانا“ (دوسلام ص ۳۳)

## غلط فہمی

برق صاحب ”نہ کہ معجزے دکھانا“ کن الفاظ کا ترجمہ ہے ، قرآن مجید کے متن میں تو

ایسی کوئی عبارت نہیں کیا اسی طرح عصائے موسیٰؑ اور یدِ بیضاء کے معجزہ ہونے کا بھی

انکار کیا جاسکتا ہے ، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا کام بھی یہ نہیں تھا کہ معجزے دکھائیں ۔

## ازالہ

سورہ بنی اسرائیل کو پڑھ کر دیکھئے ، کفار مکہ نے کتنے معجزوں کا مطالبہ کیا تھا ، یہ کر دیجئے ، وہ کہے

دکھائیے ، آپ ہمارے سامنے آسمان پر سیڑھی لگا کر چڑھ جائیے وغیرہ ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ یہ

کہہ دیں کہ معجزہ دکھانا میری قدرت میں نہیں میں تو صرف ایک انسان اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں ، معجزے

دکھانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ، وہ ان مطالبات کو پورا کرنے سے عاجز نہیں وہ اس کمزوری سے پاک ہے

وہ دکھاسکتا ہے وہ جب چاہے گا ان معجزات کا ظہور ہو جائے گا بغیر اس کی مشیت کے میں اس مطالبہ



کے پورا کرنے سے عاجز اور قاصر ہوں البتہ :-

سُبْحَانَكَ رَبِّي (بنی اسرائیل : ۹۳) میرا رب اس معجزے سے پاک ہے۔

اس کے بعد یہ الفاظ ہیں :-

هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلُكُمْ (بنی اسرائیل : ۹۳) میں تو بس ایک انسان اور رسول ہوں

(بنی اسرائیل : ۹۳)

میرے ذمہ رسالت کے فرائض انجام دینے ہیں، مجھے اللہ تعالیٰ نے مختارِ کل بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے تمہیں معجزے دکھاؤں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کر دیا تھا اس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے اسی سورت میں بیان فرمادی ہے، ارشاد ہے :-

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ

اور ہمیں معجزہ دکھانے سے یہ امر مانع ہے کہ ان

إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَقْلُونَ وَاتَّبَعُوا

سے پہلے لوگ معجزوں کو جھٹکا چکے ہیں، اور ہم

شُودَ النَّاقَةِ مُبْصِرًا فَظَلَمُوا

نے ثمود کو بطور معجزہ ایک اونٹنی دی تھی، لیکن

بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا

انہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا اور ہم تو معجزے

تَفْوِيفًا (بنی اسرائیل : ۵۹) تحریف کے لئے بھیجا کرتے ہیں۔

اس آیت سے واضح ہو گیا کہ پہلی قوموں نے معجزے مانگے، پھر معجزوں کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لائے اسی طرح یہ لوگ بھی ایمان نہیں لائیں گے اور کیونکہ معجزہ تحریف یعنی عذاب الہی کے لئے نہایتہ *Ultimatum* ہوتا ہے، لہذا اگر منہ مانگا معجزہ دکھا دینے کے بعد وہ قوم ایمان نہیں لاتی، تو پھر عذاب الہی نازل ہوتا ہے، گذشتہ قوموں کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ہلاک کر دیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو تباہ کرنا اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا اور کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ان میں سے اکثر لوگ بعد میں ایمان لانے والے ہیں اور ابھی دقت مقررہ سے پہلے ایمان نہیں لا سکتے لہذا یہ بھی تکذیب کر دیں گے اور ہلاک ہو جائیں گے لہذا اللہ تعالیٰ نے ازراہِ رحم، منہ مانگا معجزہ نہ دکھایا اور پوری قوم کو عام تباہی سے بچالیا، ہاں جن لوگوں کو بعد میں شق القمر کا معجزہ دکھایا تو پھر انکو بہت جلدی بدر کے میدان میں موت کے گھاٹ اتار دیا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی کہ پوری قوم کو شق القمر کے معجزہ میں شریک نہیں کیا بلکہ اس میں صرف وہی لوگ شریک تھے جن کی قسمت میں ایمان نہ تھا۔

پھر یہ بھی قطعاً صحیح نہیں کہ آپ نے کافروں کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا، ہاں منہ مانگا معجزہ نہیں دکھایا، اس لئے کہ وہ عذاب کے لئے نہایتہ ہوتا ہے دوسرے معجزوں کا ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشاد باری ہے۔



کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا، آپ کہہ دیجیے کہ غیب کا علم اللہ کو ہے پس (معجزہ کیلئے) تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ بِلَدِّهِ نَاسُتُظِرُّوْنَ إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْظِرِينَ  
(رُيُوس: ۲۰)

کافروں نے بلدی کی توجواب دیا:-

بلدی نہ رہیں عنقریب تم کو معجزے دکھانے والا ہوں۔

سَأُورِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ  
(الانبیاء: ۳۷)

اس کے بعد معجزے دکھائے گئے، جن کا ذکر مندرجہ ذیل آیتوں میں ہے:-

إِشْرَبَتِ السَّاعَةُ وَالشَّيْءُ الْقَسِيُّ  
وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ  
(القمر: ۱، ۲)

قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا یہ لوگ توجہ کبھی کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض ہی کرتے ہیں اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ توجادو ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

”مسلمانوں کے لئے معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی وہ تو پہلے ہی سے

ایمان لا چکے تھے۔“ (در اسلام ص ۳۳)

**غلط فہمی**

مسلمین کو معجزہ دکھانا از دیاد ایمان اور اطمینان قلبی کے لئے ہوتا ہے جس طرح

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

**ازالہ**

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہ اے رب مجھے دکھا دے تو کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا، اللہ نے فرمایا کیا تو ایمان نہیں لایا عرض کیا، ایمان تو ہے لیکن اطمینان قلبی کے لئے دیکھنا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا چار پرند پاؤں پھرانہیں اپنے سے ہلاو، پھران میں سے ایک جزیرہ پر رکھ دو، پھر پکارو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان لو کہ اللہ زبردست ہے،

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي  
كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ  
قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي  
قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ  
فَصُرِّهْنَ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ  
كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ  
يَا إِلَٰهِنَاكَ سَعْيًا وَاعْلَمَنَّ أَنَّ اللَّهَ  
عَزِيزٌ حَكِيمٌ

حکمت والا ہے۔

(البقرہ: ۲۶۰)

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہمارے لئے آسمان سے ایک



دستر خوان نازل فرما دے گا، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو، حواریوں نے جواب دیا۔

نُزِیدَ أَنْ تَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمِئِنَّ  
قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَّقْتَنَا۔  
(المائدہ: ۱۱۳)  
ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں ہمارے  
دلوں کو اطمینان ہو جائے اور ہم سمجھ لیں کہ جو کچھ  
آپ نے بتایا بالکل سچ ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ معجزہ کا ظہور اطمینان قلبی اور ازدیادِ ایمان کا باعث ہوا کرتا ہے، اور نہ صرف مسلم بلکہ نبی تک اس کی خواہش کرتے ہیں، قرآن مجید میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی پھر ان کی امت نے بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی، تجلیات ربانی کا ظہور ہوا، پھر جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے، بنی اسرائیل کو بہت سے معجزات دکھائے گئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

سَلِّبْنِي إِسْرَآئِيلَ كَمَا اتَيْنَاهُمْ  
مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ۔ (البقرة: ۲۱۱)  
ارشاد باری تعالیٰ ہے:-  
بنی اسرائیل سے پوچھئے کہ ہم نے کتنے روشن  
معجزے ان کو دکھائے تھے۔

وَضَلَلْنَا عَنْكُمْ الْغَمَامَ وَآَنَزَلْنَا  
عَلَيْكُمْ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ۔  
(البقرة: ۵۷)  
اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا  
اور تم پر من و سلویٰ نازل فرمایا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَإِذْ تَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ  
ظُلَّةٌ وَدَخَلُوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ  
(الاعراف: ۱۷۱)  
اور جب ہم نے بنی اسرائیل پر پہاڑ کو اٹھٹا کر  
سائبان کی مانند کر دیا اور وہ سمجھے کہ اب یہ ہم  
پر گرنے والا ہے۔

غرض یہ کہ مسلمین کو بھی معجزے دکھائے جاتے رہے ہیں لہذا اعتراض لاعلمی پر مبنی ہے  
”آیہ وضو میں صرف ایک اختلاف کی بنا پر کہ کسی نے ”أَرْجُلُكُمْ“ کو

”أَرْجُلِكُمْ“ پڑھ دیا، پورا ایک فرقہ پیدا ہو گیا“ (دو اسلام ص ۳۳)

جی نہیں صرف ہی اختلاف نہیں وہ تو پورے قرآن مجید کو صحیفہ عثمانی کہتے ہیں موجودہ  
قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔

الغرض قرأت کے معمولی اختلاف سے فرقہ پیدا نہیں ہوتا، ہاں تقلیدی اختلاف سے ہو  
سکتا ہے۔

**غلط فہمی**

**ازالہ**



## غلط فہمی

”ام شریک راوی ہیں کہ حضورؐ نے چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تھا اس لئے کہ یہ اس آگ کو پھونکوں سے بھڑکاتی تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھینکا گیا تھا۔ (بخاری ص ۱۵۲)  
 مہلا حضرت ابراہیمؑ نے چھپکلی کا کیا بگاڑا تھا؟ ..... اس کے تنفس میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ آگ کے شعلوں میں ذرہ بھر بھی اضافہ کر سکتا۔  
 (رد اسلام ص ۳۳)

## ازالہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ جانور فلیسق یعنی موذی ہیں ان کو حرم میں بھی قتل کر دیا کرو، چوہا، بھو، چیل، کوا، اور پاگل کتا۔ (صحیح بخاری)

اسی طرح حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:-

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ  
 لِلْوُزْغِ الْفُلُوسِيقِ. (صحیح بخاری)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے  
 چھپکلی کو بھی فلیسق فرمایا:-

(کتاب بدء الخلق)

جس طرح ان پانچ جانوروں کے موذی ہونے کی وجہ سے قتل کا حکم دیا، اسی طرح چھپکلی کے موذی ہونے کی وجہ سے اس کے بھی قتل کا حکم دیا۔ جیسا کہ حضرت سعدؓ اور حضرت ام شریکؓ کی روایتوں میں صاف مذکور ہے:- یعنی

أَمَرَ يَقْتُلُهُ (صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب خير مال المسلم غنم) آپ نے اس کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔

ام شریکؓ کی ایک روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:-

أَمَرَ يَقْتُلِ الْوُزْغَ وَقَالَ كَاتٍ  
 يَنْفَعُ عَلَى إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ

(صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب قول الله تعالى واتخذ الله ابراهيم خلیلاً)

اس حدیث سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قتل کی وجہ آگ پھونکنا ہے، بلکہ قتل کی وجہ تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی یعنی اس کا فلیسق (زہریلا، موذی) ہونا، ہاں یہ اس کی خباثت کا مزید ثبوت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر پر آگ پھونکتی تھی۔ اگر صرف آگ پھونکنا قتل کا سبب ہوتا تو الفاظ



حدیث اس طرح ہوتے ”اَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزْعِ فَإِنَّهُ كَانَ يَنْفَعُ عَلَى إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ“  
جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں ہے :-

اَقْتُلُوا ذَا الطُّفَيْتَيْنِ فَإِنَّهُ يُطْمَسُ  
اَلْبَصَرُ (بخاری جزء ۲ ص ۱۷۵) آپ نے فرمایا ذو طفتین سانپ کو قتل کر دیا کرو  
کیونکہ وہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے ۔

دیکھئے یہاں قتل کا سبب بیان کیا تو ”فإنه“ فرمایا اور چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تو ”فإنه“ نہیں  
فرمایا۔ ہاں اس کے قتل کے ساتھ ایک دینی جذبہ کو ملحوظ کر دیا، تاکہ اس جذبہ کے ماتحت اس کے قتل میں سعی  
بلیغ کی جائے، یہ جملہ معطوفہ کا نفسیاتی پہلو ہے ۔

مہلّا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھپکلی کا کیا بگاڑا تھا یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی پوچھے  
کہ مہلّا حضرت آدم علیہ السلام نے ابلیس کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے ان کو بہکایا، اس کی ذلت تو  
اللہ تعالیٰ نے کی تھی کہ سجدہ کرنے کا حکم دیا اور پھر اس کو سجدہ کرنے سے باز رکھا جیسا کہ خود  
ابلیس نے کہا تھا ۔

فَمَا أَتَوَيْتَنِي لَأَقُودَنَّ لَكُمْ  
مِمَّا أَطْلَقَ السُّنَنِيمَ  
اس لئے کہ تو نے مجھے بہکایا میں ان کے  
لئے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ جاؤں گا ۔

(الاعراف : ۱۶)

بتائیے آدم علیہ السلام کا کیا قصور تھا، ابلیس نے بہکانے کا الزام اللہ تعالیٰ پر لگایا اللہ تعالیٰ  
نے کہیں قرآن مجید میں اس الزام کی تردید نہیں کی تو اب بتائیے آدم علیہ السلام تو بے قصور تھے، پھر  
ابلیس نے ان سے اور ان کی اولاد سے بدلہ کیوں لیا یہی وہ فطری شیطنت تھی جس نے چھپکلی کو مجبور  
کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی آگ کو بھونکے ان کا قصور مبرا نہ ہو اس کے اس فعل سے فطری شیطنت  
ظاہر ہوتی ہے بعض جانور فطرۃً شریف ہوتے ہیں مثلاً گھوڑا، اور بعض جانور فطرۃً بدطینت ہوتے ہیں، مثلاً  
گرگٹ، بچھو وغیرہ۔ چھپکلی کی کوشش کتنی ہی ناکام تھی لیکن اس نے حتی المقدور کوشش کی، یہ اس کی نیت ہے  
جو اس کے باطن کی خباثت کا پتہ دیتی ہے اور نیت ہی پر تمام اعمال کا دار و مدار ہے، کامیابی اور ناکامی  
سے نیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔

”ایک اور حقیقت ملاحظہ ہو :-

ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے بیریل کو دیکھا تھا اس کے چھ سو پر تھے

**غلط فہمی**

(صحیح بخاری)

صرف ابن مسعود میں کیا خوبی تھی کہ انہیں جبریل نظر آیا، کسی اور صحابی کو کیوں  
دکھائی نہ دیا۔ یہ چھ سو پر آپ نے کیسے گن لئے تھے اور جبریل کے لئے پردوں کی ضرورت



ہی کیا تھی؟ وہ ایک نوری جسم ہے، پرواز نور کی فطرت ہے جس طرح ہوا، آگ اور بادلوں کو پروں کی ضرورت نہیں ہوتی اس طرح نور بھی وسائل پر واز سے بے نیاز ہوتا ہے۔“ (دوا سلام ص ۳۳)

**ازالہ** برق صاحب کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے متعلق نہیں کہا تھا کہ میں نے جبریل کو دیکھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا تھا، پوری حدیث اس طرح ہے:-

مَسِيعَةُ زَيْدٍ اَعْنِ عَبْدُ اللَّهِ كَانَتْ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنَى فَاَوْحَى اِلَى عَبْدِهِ مَا اَوْحَى قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ مَسْعُودٍ اَنَّهُ رَأَى جِبْرِيلَ لَهُ سِتٌّ مِائَتَةٌ جَنَاحٍ

امام شیبانی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت زید کو حضرت عبداللہ بن مسعود سے اس آیت "فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنَى" کی تفسیر میں بیان کرتے ہوئے سنا کہ اس آیت میں جس طرف اشارہ ہے وہ جبریل ہیں اور یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو دیکھا تھا ان کے چھ سو پر تھے۔

دوسری حدیث اسی کے آگے کہتے صاف الفاظ میں ہے، امام شیبانی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت زید سے اس آیت "فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنَى" کے معنی پوچھے تو حضرت زید نے فرمایا:-

اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ اَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى جِبْرِيلَ لَهُ سِتٌّ مِائَتَةٌ جَنَاحٍ

میں ابن مسعود نے خبر دی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کو دیکھا تھا ان کے چھ سو پر تھے۔

یعنی بھوائے آئینہ دو کمان بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ حضرت جبریل سے تھا نہ کہ اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں، (صحیح بخاری تفسیر سورۃ النجم) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت مراد ہے نہ کہ رویت ابن مسعود کا۔ کاش برق صاحب تحقیق فرمالیتے۔

دوسری بات جو برق صاحب نے کہی وہ اس سے بھی زیادہ بڑی غلط فہمی ہے کاش وہ قرآن مجید کو غور سے پڑھتے، فرشتوں کے پروں کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے سنئے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاحِطٍ السَّمٰوٰتِ وَارْضٍ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةَ رُسُلًا مِّنْ اٰجْفَیَّتٍ مَّتَنٰی وَثَلٰثَ وَاِلْعَمَ

بہب تعریف اللہ کے لئے ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے اور جس نے فرشتوں کو پیغام رساں بنایا ہے جن فرشتوں کے دوزد



بَزِيدُ فِي الْخُلُقِ مَا يَتَنَاعَزُ اللَّهُ  
عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ  
تین تین چار چار پر ہوتے ہیں بلکہ اللہ پیدائش  
میں زیادہ کرتا ہے جتنا چاہتا ہے بیشک اللہ ہر

(فناطہ: ۱) چیز پر قادر ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بازو ہوتے ہیں، دو، تین، چار اور زیادہ بھی  
برق صاحب یہ بھی آپ نے خوب کہا کہ ہوا، آگ اور بادلوں کو پروں کی ضرورت نہیں ہوتی  
کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ چیزیں بھی آسمان تک نہیں پہنچ سکتیں، ان کی رسائی محدود ہے اگر یہ چیزیں  
بے پر کے اڑاتی ہیں تو پھر ہوا آسمان تک کیوں نہیں پہنچ جاتی کیوں پانچ چھ میل کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔  
آگ سطح زمین سے بے تعلق نہیں ہوتی، ان چیزوں کا اوپر جانا بھی ایک خاص اصول کا پابند ہے، وہ  
اس اصول سے آزاد نہیں۔

”حضرت ابوہریرہؓ حضورؐ سے راوی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ اسی  
برس میں ہوا تھا“ (بخاری جلد ۱۵۳)

**غلط فہمی**

”راوی نے یہ نہ بتایا کہ پورے اسی سال تک اس مبارک کام میں کون سی رکاوٹ حائل رہی  
جو وفات سے عین پہلے دور ہوئی اور آپؐ بآں صغف و پیری حجام کے سامنے جا بیٹھے ختنہ  
کا مقصد صفائی، صحت اور جنسی لذتوں میں اضافہ ہوتا ہے، اسی برس کے بعد یہ مقاصد  
حاصل نہیں ہو سکتے، تو پھر ختنہ کا فائدہ؟“ (دوا سلام ص ۳۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک کافر گھرانے میں پیدا ہوئے لہذا بچپن میں ختنہ کرنے کا  
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر نبوت ملی تو توحید کا دعوٰی شروع کر دیا، تمام انبیاء علیہم السلام  
کا یہ دستور رکھا ہے کہ پہلے انہیں صرف توحید کی اشاعت کا حکم ہوتا ہے اور سارا زور اسی پر صرف ہوتا  
ہے دوسرے احکام بہت بعد میں نازل ہوتے ہیں۔ مکہ معظمہ میں ایک طویل مدت تک رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم بھی صرف توحید کا درس دیتے رہے، دوسرے شرعی احکام بہت بعد میں نافذ ہوئے لہذا  
ابراہیم علیہ السلام کو بھی توحید کی تبلیغ میں کافی عرصہ لگا، اور جب اسی سال کے ہوئے تو اور احکام شرع کے  
ساتھ ختنہ کا حکم بھی ملا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ  
فَأَتَمَّهُنَّ ۚ  
اور جب ابراہیم علیہ السلام کے رب نے  
چند باتوں میں ان کی آزمائش کی تو وہ ان

(البقرة: ۱۲۴) سب میں پورے اترے۔

ختنہ کے حکم کی تعمیل میں بھی وہ پورے اترے اور ختنہ کر لی، ہر حکم کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں  
ایک وقت مقرر ہے اور اس حکم کے لئے یہی وقت مقرر تھا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے دیکھئے ابراہیم



علیہ السلام اپنی بیوی اور شیرخوار بچے کو بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ جاتے ہیں لیکن اس وقت کعبہ کی تعمیر نہیں کرتے، حالانکہ اس وقت اس کی زیادہ ضرورت تھی پھر ایک عرصہ دراز کے بعد ان کو اس بچے کے ذبح کا حکم ہوتا ہے پھر کافی عرصہ کے بعد وہ کعبہ تعمیر کرتے ہیں اور اسمعیل علیہ السلام بھی اس کام میں ان کی مدد کرتے ہیں پھر اس کو پاک صاف رکھنے کا حکم ملتا ہے یہ سب باتیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور بتدریج انجام پاری ہیں۔ اسی طرح ختنہ کا حکم بھی مصلحت الہی کے مطابق اپنے وقت پر مقرر ہوا۔ اسٹی سال کی عمر اس زمانہ میں کچھ زیادہ عمر سمجھی نہیں جاتی تھی، قرآن مجید میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے صرف تبلیغ میں ۹۵۰ سال صرف کئے، ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کئی سو سال تک زندہ رہے ہوں اور اس سلسلہ میں تاریخی شواہد بھی ملتے ہیں لیکن ہم کیونکہ تاریخ پر اعتبار نہیں کرتے لہذا انہیں بطور حجت پیش نہیں کرتے۔ برق صاحب تاریخ پر کافی اعتبار کرتے ہیں لہذا اس سلسلہ میں انہیں تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ تسلی ہو جائے اگر تاریخ کا یہ بیان صحیح ہے کہ انہوں نے ۵۰ سال کی عمر میں ہجرت کی تو اسٹی سال کی عمر میں ختنہ بالکل قرین قیاس ہے کیونکہ ہجرت کے بعد ہی احکام شریعت کا نزول شروع ہوا ہوگا۔

ختنہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام بوڑھے نہیں تھے نہ وہ کسی حجام کے سامنے بیٹھے بلکہ انہوں نے اپنی ختنہ خود کی، حدیث کے الفاظ ہیں :-

اِخْتَتَنَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کی۔

لہذا حجام کے سامنے بیٹھنا ایک مفروضہ تھا جو غلط نکلا۔

اب برق صاحب کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اسٹی سال تک اس کام میں کیا رکاوٹ تھی ورنہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جوانی میں کیا رکاوٹ تھی کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے اور جب دونوں ماں باپ بوڑھے ہو گئے اور صرف بوڑھے ہی نہیں بلکہ حضرت سارکا کے الفاظ میں :-

عَجُوزٌ عَقِيْمٌ (الہدایت ۱-۲۹) میں بوڑھی بانجھ ہو چکی ہیں۔

تو ایسے وقت میں حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے، مہجلا عورت بانجھ ہو اور خاندان بڑھا ہو (جیسا کہ قرآن مجید میں ہے) تو بچہ کیسے ہو سکتا ہے، برق صاحب یہ چیز بھی تو سائنس کے خلاف ہے عقل کے خلاف ہے، فطرت انسانی اس سے ابا کرتی ہے لیکن قرآن مجید میں ایسا ہی ہے، اب بتائیے کس ملا کو برا کہیں، ہم کہتے ہیں کہ کسی کو برا کہنے کی ضرورت نہیں ہر چیز کا انکار کیجئے اور قرآن کو تسلیم کیجئے اور اس طرح حدیث کو بھی تسلیم کیجئے۔ اگر سائنس، عقل اور فطرت انسانی کے خلاف قرآن مجید کو صحیح تسلیم کرنا لازمی ہے تو پھر حدیث نے کیا قصور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی مصلحت



اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، ہم سب کو ایسے معاملات میں خاموش رہنا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایمان سلب ہو جائے۔

”ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت سلیمان نے کہا کہ آج رات میں اپنی تمام بیویوں جن کی تعداد ایک سو ایک

**غلط فہمی**

یا ننانوے تھیں، جماعت کروں گا ہر بیوی سے ایک شہسوار پیدا ہوگا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا کسی نے کہا انشاء اللہ بھی ساتھ کہئے لیکن آپ نے پروانہ کی چنانچہ تمام بیویوں کے پاس گئے اور بغیر ایک کے کوئی حاملہ نہ ہوئی۔“

حضرت سلیمان عہد تاریخ کے انسان ہیں، عام انسانوں جیسا قد، اتنی ہی عمر اور طاقت ہم یہ کیسے یقین کر لیں کہ وہ پوری ایک سو بیویوں کے ساتھ جماعت کی طاقت رکھتے تھے۔ پھر یہ بھی تو سوچئے کہ اگر ایک بیوی کے ساتھ جماعت کے لئے کم از کم پندرہ منٹ درکار ہوں تو تمام کے پاس جانے کے لئے پچیس گھنٹے چاہئیں، (دو اسلام ۲۳۸، ۲۳۹)

برق صاحب قرآن مجید کہتا ہے:-

(موا سلیمان علیہ السلام کے تابع کردی گئی تھیں) وہ صرف

عُدُوْهُمَا شَهْرٌ وَرَوَّاحُهَا

صبح کے وقت ایک مہینہ کی مسافت طے کیا کرتی تھیں اور شام

شہر (سبا: ۱۲)

کے وقت بھی ایک مہینہ کی مسافت طے کرتی تھیں۔

اگر سلیمان علیہ السلام عہد تاریخ کے انسان ہیں تو بتائیے عہد تاریخ میں کہیں آپ کو ایسا تخت ملا ہے کہ ہوا اس کو اڑا کر لے جائے کیا اس زمانہ میں ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے تھے؟ کیا اس کا کوئی ثبوت ہے؟ ہرگز نہیں اور سنئے:-

ایک شخص نے جس کو کتاب کا علم تھا، کہا کہ

قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ

میں ملکہ سبا کے تخت کو آپ کے ہلکے چھپکنے سے

أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ

پہلے لا دوں گا۔

طَوْفُكَ (النمل: ۲۰)

کیا ایسا کوئی آدمی عہد تاریخ میں ملتا ہے جس میں یہ کمال ہو؟ کیا تورات یا قرآن مجید کا کوئی عالم

ایسا ہے، جس نے کبھی ایسا کر کے دکھایا ہو، تیسری آیت سنئے، سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں:-

عَلَّمَنَا مَطْيَاقَ الطَّيْرِ (النمل: ۱۶)

ہم کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

کیا عہد تاریخ میں کوئی انسان ایسا ہے جس کو پرندوں کی بولی آتی ہو، اگر یہی باتیں حدیث میں ہوتیں

تو برق صاحب آپ کو غلط فہمی ہو جاتی اور آپ یہ فرمادیتے کہ ہمارے علماء جب تک حدیث میں ڈرامائی



رنگ نہ مہر دیں، انہیں مزا نہیں آتا، یہ تو قرآن مجید ہے اسے کیا کہا جائے غرض یہ کہ اس قسم کی عجیب و غریب باتیں حضرت سلیمان میں اور ان کے اصحاب میں پائی جاتی ہوں تو کیا تعجب ہے کہ ان میں بے انتہا مردانہ قوت بھی ہو اور وہ بہ یک وقت سو بیویوں کے پاس جا سکتے ہوں۔

دوسرا اعتراض برق صاحب کا یہ ہے کہ ۴ گھنٹے کی رات میں یہ کیسے ممکن ہے، برق صاحب نے اس کام پر کم از کم پندرہ منٹ لگائے ہیں حالانکہ وہ اس سے کم بھی لگا سکتے تھے اگر اوسطاً تین منٹ کا حساب رکھا جائے تو کل وقت ۳۰ × ۳ = ۹۰ منٹ = ۵ گھنٹے یعنی ۴ گھنٹوں میں سے صرف ۵ گھنٹے صرف ہوں گے، ۹ گھنٹے پھر بھی فاضل بچ جائیں گے غرض یہ کہ حساب کے لحاظ سے بھی حدیث پر کوئی اعتراض نہیں۔

## انتباہ

ترجمہ میں برق صاحب نے ”لَحْوِیْقُل“ کا ترجمہ ”آپ نے پروانہ کی“ کیا ہے حالانکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آپ نے انشاء اللہ نہ کہا اور انشاء اللہ نہ کہنا مہجول کی وجہ سے مٹھا جیسا کہ حدیث میں ہے:-

قُلْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ فَنَسِيْ - کسی نے ان سے کہا انشاء اللہ کہئے لیکن وہ

(صحیح بخاری کتاب الایمان والذکر) انشاء اللہ کہنا مہجول گئے۔

اور یہ مہجولنا بھی مشیت الہی کے ماتحت مٹھا، تقدیر الہی یہی تھی۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی

اُمِّیۃ (یوسف: ۲۱)

اگر تعداد ازواج پر اعتراض ہے تو سنیے اکثر بادشاہ متعدد حرمیں رکھا کرتے تھے اور یہ کوئی غیر معروف بات نہیں ہے جس پر اعتراض کیا جاسکے، اعتراض تو ناجائز اور غیر معروف کاموں میں ہوتا ہے، پھر ازواج کی کثیر تعداد کا ذکر تو تورات میں بھی موجود ہے اور جس کو برق صاحب بالکل من وعن محفوظ سمجھتے ہیں لہذا حدیث بھی محفوظ ہے، ورنہ یہ اعتراض تورات پر بھی ہوگا، اگر یہ اعتراض ہو کہ سلیمان علیہ السلام دنیا دار بادشاہ نہیں تھے کہ دنیاوی عیش و عشرت کے سامان جمع کرتے، بلکہ رسول تھے لہذا ان کی زندگی عام انسانوں سے بالاتر نہیں ہو سکتی، تو یہ اعتراض بھی صحیح نہیں اس لئے کہ سلیمان علیہ السلام کے محل کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے محل بھی اتنا شاندار کہ اس کا فرش بھی شیشہ کا تھا، ارشاد باری ہے:-

فِیۡلَ لَهَاۤ اُدۡخِلِی الصِّرَۡحَ فَاٰتَاۡہَاۤ اُتۡمَۡرًا مِّنۡ لَّدُنِّہٖ فَکَشَفَتْ

ملکہ سبا سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ

جب ملکہ نے اسے دیکھا تو اس کو پانی سمجھا



عَنْ سَاقِيَتِهَا قَالَ إِنَّهُ صَرَّحَ مُصَرَّدٌ  
مِنْ قَوَارِيرِ  
اور اپنی پنڈ لیاں کھول دیں، (حضرت)  
سیمان (علیہ السلام) نے فرمایا، یہ توشیشہ

کا محل ہے۔

(النمل: ۲۲)

محل کے ذکر کے ساتھ ان کے خالصے کے گھوڑوں کا ذکر بھی قرآن مجید میں ہے۔ سنئے:-

إِذْ عَرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّفِيفَتُ  
الْجَبَادُ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ  
حَبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ  
رَبِّي حَتَّى تَوَارَتْ  
بِالْحِجَابِ .. الخ  
(ص)

شام کے وقت جب سیمان (علیہ السلام) کے سامنے  
خالصے کے گھوڑے پیش کئے گئے تو کہنے لگے میں  
اس مال سے صرف اس لئے محبت کرتا ہوں کہ اس  
کے ذریعہ ذکر رب یعنی دین حق کا دفاع کر سکوں  
(پھر وہ گھوڑے دوڑتے ہوئے بہت دیر نکلی گئے)  
یہاں تک کہ پوشیدہ ہو گئے تو فرمایا: ”انہیں میرے  
پاس واپس لاؤ (جب وہ واپس آئے) تو ان کی پنڈ لیاں  
اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

غرض یہ کہ مذکورہ بالا آیتوں سے ثابت ہوا کہ سیمان علیہ السلام شانہ کر وفر سے رہا کرتے  
تھے اگر اس شانہ کر وفر پر کوئی اعتراض نہیں تو بیویوں یا حرموں کی کثیر تعداد پر کیا اعتراض ہے۔ حرموں کی  
کثیر تعداد بھی شانہ کر وفر کا ایک جزو ہے:-

کس تک گنوں صاحب! بات لمبی ہو رہی ہے، ورنہ صحاح ستہ  
میں اس نوع کی سینکڑوں اور احادیث موجود ہیں (دو اسلام ص ۳۳۹)

**غلط فہمی**

اول تو آپ نے چُن چُن کر تمام مشکل احادیث کو جمع کر دیا اور اللہ کے فضل سے ہم نے  
ان سب کا جواب قرآن مجید اور عقل سلیم کی روشنی میں دے دیا اب اس قسم کی  
احادیث باقی تو نہیں ہیں لیکن اگر آپ کے خیال میں کچھ اور احادیث باقی رہ گئی ہیں تو پیش کیجئے انشاء اللہ  
اطمینان بخش جواب دیا جائے گا۔

”میرا مقصد احادیث پر تنقید نہیں ہے۔“

(دو اسلام ص ۳۳۹)

**غلط فہمی**

ہمارا بھی خیال ہے کہ تنقید آپ نہیں کر رہے ہیں بلکہ آپ کو غلط فہمی  
ہو گئی ہے

**ازالہ**

”بلکہ یہ دکھانا ہے کہ جن مجموعوں کو ”صحیح“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان  
میں ایسے ایسے اقوال بھرے پڑے ہیں جنہیں سن کر تہذیب کا نون پر پٹھ

**غلط فہمی**



دھرے، عقل سلیم بلبل اٹھے اور کتابِ الہی کلیجہ محکم کر رہ جائے۔

(دوا سلام ص ۳۳۹ ص ۳۴۰)

ان تمام احادیث کا جواب قرآن مجید، تہذیب اور عقل و سائنس کی روشنی میں دیا جا چکا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ان مجموعوں میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں جس پر کسی قسم کا اعتراض کیا جاسکے۔

**ازالہ**

”نمونہ آپ نے دیکھ لیا، انصافاً کیجئے کہ ان اقوال کو دحی سمجھ کر ان پر

کیسے عمل کریں“ (دوا سلام ص ۳۴۰)

**غلط فہمی**

نمونہ ہم نے بھی قرآنی آیات پیش کر دی ہیں جو ان احادیث کے مماثل ہیں بلکہ ان سے زیادہ حیرت انگیز، کچھ اور آخری باب کے جواب میں انشاء اللہ پیش کریں گے اگر بائیں ہمہ ان آیات کو دحی سمجھ کر عمل کیا جاسکتا ہے تو پھر ان احادیث کو بھی دحی مان کر عمل کیا جاسکتا ہے۔

**ازالہ**

”اور اس دستور العمل کو کیسے چھوڑ دیں جس کی ہر ہدایت روشن، ہر لفظ حقیقت

ہر حرف صداقت“ (دوا سلام ص ۳۴۰)

**غلط فہمی**

چھوڑیے نہیں، بلکہ احادیث کی روشنی میں اس کا مطلب سمجھئے، یہ نہیں کہ صلوات کے معنی بقول محمد احمد ٹہلا، پریڈ کر لئے جائیں یا پھر بقول غلام احمد پرویز ”نظام ربوبیت“ کر لئے جائیں بلکہ اس کے معنی وہی کئے جائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں اور جس پر امت متواتر عمل کرتی آئی ہے، قرآن مجید چند اوقات میں نماز فرض کرتا ہے لیکن ان اوقات کی تصریح اور تعداد حدیث میں آتی ہے لہذا قرآن مجید کو بھی پکڑیے اور حدیث کو بھی، نماز پڑھیے لیکن پانچ وقت دلی مذا القیاس۔

**ازالہ**

## سوالات

اربرق صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن کی ہر ہدایت روشن ہے ہم بھی ماننے میں لیکن کیا غلط فہمی کی بنا پر ہم سوال کر سکتے ہیں کہ یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

كَذٰلِكَ نَسُكِّلُكَ فِي تِلْكَ الْكُتُبِ الْمُجْمِعِينَ ہم مجرموں کے دلوں میں اسی طرح یہ بات ڈال

دیتے ہیں (کہ وہ رسول کا مذاق اڑائیں)

(الحجہ :- ۱۲)

اس میں کون سی روشنی ہدایت ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ڈالتا ہے کہ وہ رسول کا مذاق

اڑائیں؟



۲۔ برق صاحب فرماتے ہیں ”قرآن کا ہر لفظ حقیقت، ہر حرف صداقت، ہم بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن کیا ہم غلط فہمی سے پوچھ سکتے ہیں کہ ”کھلی حصّہ“ کے ان پانچ حرفوں میں کیا صداقت ہے؟ ان حروف کی کیا حقیقت ہے؟

۳۔ برق صاحب فرماتے ہیں ”ہر حکم دنیوی و اخروی فلاح کا ضامن“ ہمارا بھی اس پر ایمان ہے لیکن کیا ہم غلط فہمی سے پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں جو حکم ہے کہ ۱۔

وَلَا تَقْلُقُوا دُرُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ

مَحَلَّهُ - (البقرة ۱۹۶) - پر نہ پہنچ جائے۔

اس میں کیا دنیاوی مفاد ہے؟ جو میں سر میں پڑ جائیں تو بھی نہ منڈائے بلکہ یہاں تک

ہے کہ :-

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ قَسِيًّا أَوْ يُبَيِّ أَدَىٰ

مِنْ تَأْسِيهِمْ فَعَلَيْتَ - (البقرة ۱۹۶) - تو سر منڈانے کا اندیشہ ہے۔

یعنی ایسی مجبوری کی حالت میں بھی سر منڈانے کا جرمانہ ادا کرے آخر اس میں کیا راز ہے؟ پھر یہ حج کا حکم اضاعت مال کا سبب نہیں؟ کیا حج میں ایک مکان اور دو پہاڑوں کا طواف توحید کے منافی تو نہیں؟

۴۔ برق صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کا ہر قول تمام شبہات سے وراء الراء، ہم بھی اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن کیا ہم غلط فہمی سے پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کا یہ حکم کہ تم پر نماز چند اوقات میں فرض ہے تو یہ اوقات کتنے ہیں اور کون کون سے ہیں؟ کیا جس صلوٰۃ کے متعلق قرآن مجید میں سینکڑوں مرتبہ حکم یا ترغیب دی گئی ہو اس کی کوئی ترکیب بھی اس میں موجود ہے؟

۵۔ برق صاحب فرماتے ہیں کہ ”ہم نے قرآن مجید کی ہر بات کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھا، فطرت کی میزان میں تولی اور اعمال خدا سے اس کا مقابلہ کر کے دیکھا ہمیں ہر جگہ صرف حقیقت اور ٹھوس حقیقت نظر آئی“ (دوا سلام ص ۳۲)

برق صاحب بات تو صحیح ہے لیکن کیا ہم غلط فہمی سے سوال کر سکتے ہیں کہ سیماں علیہ السلام کے زمانہ میں ایک آدمی ہلکے بھپکنے میں تخت بلقیس کو ہزاروں میل دور سے کیسے لے آیا تھا؟ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے کیسے پیدا ہو گئے تھے۔ گموارہ میں انہوں نے کیسے بات کی تھی؟ والدہ کے بڑھاپے میں اور بانجھ ہونے کے باوجود حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کیسے پیدا ہو گئے تھے؟ قارون کا آخر کتنا خزانہ تھا کہ ایک بڑی جمیعت بھی اس کی کھجیاں اٹھانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، یوسف علیہ السلام میں وہ کون سا حسن تھا کہ تمام عورتیں اُن پر فریفتہ ہو گئی تھیں اور ان کو دیکھ کر اتنی بدحواس



ہو گئی تھیں کہ اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے کیا یہ سب چیزیں سائنس اور فطرت کے مطابق ہیں اور اگر ہیں تو یقین رکھیے، احادیث میں بیان کردہ عجائبات بھی ٹھوس حقائق ہیں اور سائنس اور فطرت کے عین مطابق ہیں اگرچہ ظاہر میں خلاف ہی کیوں نہ معلوم ہوں ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو سکے تو اس میں حیرت و استعجاب کی کونسی بات ہے آخر ہماری عقلیں بھی تو ناقص ہیں رسول پر ایمان لانا عقل کی ٹھوکروں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

۴۔ برقی صاحب فرماتے ہیں ”قرآن حقائق سے بحث کرتا ہے، ہمیں اس سے اتفاق ہے لیکن کیا ہم غلط فہمی سے پوچھ سکتے ہیں کہ ذوالقرنین کا سورج کو کبچڑ کے چشمہ میں ڈوبنے دیکھنا کون سی حقیقت ہے؟ کیا یاجوج ماجوج قوم تاریخی حقیقت ہے؟ کیا حضرت خضرؑ کا معصوم بچہ کو قتل کر دینا حقائق میں سے ہے؟ کیا جرم سے پہلے اس بچے کا قتل حقائق میں سے تھا؟ اس کو پیدا کرنے میں کیا مصلحت تھی کہ پیدا کر کے قتل کرادیا۔ اگر ان سب باتوں کے باوجود جو بظاہر اچھی نظر نہیں آتیں قرآن مجید، قرآن مجید ہے تو اس سے کم درجہ کی باتوں پر جو غلط فہمی احادیث میں ہوتی ہے اس غلط فہمی سے احادیث پر کوئی آپرچ نہیں آتی وہ بھی قرآنی حقائق ہی بیان کرتی ہے ہمارے نزدیک حقائق ہی وہ ہیں جو قرآن و حدیث میں ہیں اور ان حقائق کے خلاف اگر کوئی بات کہیں ملے تو وہ باطل ہے، دھوکہ ہے، خواہ وہ قرآنی و حدیثی حقائق عقل کے خلاف نظر آئیں، تاریخ کے خلاف معلوم ہوں، سائنس کے معیار پر پورے نہ اتریں، میزان فطرت کے مخالف ہوں۔

حق و صداقت کا معیار ایک مومن کے لئے صرف قرآن و حدیث ہے نہ کہ ان کو چھوڑ کر دوسری چیزیں، اگر دوسرے معیاروں پر پورا اترنے کے بعد ہم نے قرآن و حدیث کو مانا تو پھر یہ ایمان بالغیب نہیں جس کا قرآن مطالبہ کرتا ہے بلکہ اپنی عقل ناقص، غلط تاریخ، نامکمل سائنس پر اصل ایمان ہے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ان چیزوں کے خلاف نہ ہو تو صحیح درجہ غلط، یہ ایمان کی شان نہیں اس معیار پر پرکھ کر تو ہر کس و ناکس کی بات تسلیم کی جاسکتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہی کیا باقی رہا، یہ تو کفر کی شان ہے مومن کے لئے قرآن و حدیث کی بات عین ایمان ہے اور وہ اپنی صداقت کے لئے بغیر کی محتاج نہیں ہے ایمان کی تکمیل ہی جب ہوتی ہے کہ ہم ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو مانیں ہماری عقل تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ قرآن مجید ایسا ہونا چاہیے تھا، اس طرح اس کی ترتیب ہوتی، مضامین میں تسلسل ہوتا تکرار نہ ہوتی، وغیرہ وغیرہ مگر کیا کریں اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت کے مطابق حسباً ترتیب دے دیا ہمیں تو اب اسی پر ایمان لانا ہے اور اگر اس حالت میں ایمان نہیں لانا تو پھر اللہ تعالیٰ کو بھی ہمارے ایمان کی پروا نہیں۔

فَسَنُشَآءُ فَلْيُؤْمِنْ وَفَسَنُشَآءُ  
فَلْيُكْفُرْ (الکہف: ۲۹)

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے  
کفر اختیار کرے۔



## باب - ۲۰

# ”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“

**غلط فہمی**

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

خلفائے راشدین احادیث کو ڈھونڈھ کر جلاتے رہے“ (دو اسلام ص ۲۴۱)  
یہ بالکل غلط ہے تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے  
تو پھر یہ بتائیے کہ یہ احادیث کہاں سے آئیں جن کے متعلق آپ کے باب کا عنوان ہے ”صحیح

**ازالہ**

احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“ (دو اسلام ص ۲۴۱)

**غلط فہمی**

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابت احادیث سے منع فرما

دیا تھا“ (ترجمہ دو اسلام ص ۲۴۱)

**ازالہ**

یہ بھی صحیح نہیں تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے، تو پھر  
”موجودہ ذخیرہ احادیث کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر ہوئی تو کیا جس  
کام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا ہو اس کام کے کرنے پر ناز کرنا کسی مسلم کے لئے زیبا ہے؟  
برق صاحب لکھتے ہیں،

”یہ تمام تفصیل حدیث میں ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا خزانہ ہے جس پر ہم نازاں  
ہیں (ص ۲۴۳)

برق صاحب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کریں اور آپ اس پر ناز کریں،

عذر فرمائیے :-

**غلط فہمی**

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”اڑھائی سو برس تک احادیث ہر کہ دمہ کی زبان پر جاری رہیں اور بگڑتے



بگڑتے خدا جانے کیا سے کیا بن گئیں“ (دوا سلام ص ۳۴۱)  
 یہ بھی صحیح نہیں، تفصیل کے لئے باب اول اور باب دوم ملاحظہ فرمائیں، غلط  
 فہمی کی بنیاد عدم تحقیق ہے۔

## قول

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-  
 ”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں“ (دوا سلام ص ۳۴۱)

## تائید

بالکل سچ فرمایا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-  
 ”صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں، اول یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وآلہ وسلم کی طرف صحیح ہو، یعنی ہم بدلائل ثابت کر سکیں کہ یہ قول حضور کی زبان مبارک  
 سے واقعی نکلا، ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں البتہ ظن غالب یہ ہے کہ بعض  
 اقوال صحیح ہوں گے“ (دوا سلام ص ۳۴۱)

بے شمار احادیث یقینی طور پر صحیح ہیں اور اگر آپ اسے تسلیم نہیں کرتے تو خیر ظن غالب  
 ہی سہی، یہ کیا کم ہے، قرآن مجید کے متعلق بھی صحیح یقین کا کون سا خارجی ذریعہ ہے،  
 یہاں بھی وہی شکوک ہیں اور وہ بھی کئی اعتبار سے خصوصاً ایمان کا دعوای کرنے والے ایک بہت بڑے فرقہ  
 کا اس کی صحت سے انکار کرنا، وغیرہ وغیرہ۔  
 برق صاحب کیا اسی اسلام پر آپ کو ناز ہے، جس کے رسول کا ایک قول بھی یقینی طور  
 پر صحیح و محفوظ نہیں، براہِ کرم غور کیجئے :-

## قول

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-  
 ”دوم۔ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح  
 ہیں“ (ص ۳۴۱)



## تائید

ہم آپ کی تائید کرتے ہیں، احادیث کے سلسلہ میں الفاظ اتنے ضروری نہیں جتنا کہ ان کا مفہوم، اس لئے کہ الفاظ کا مدعا قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اگر قرآن مجید کی آیات کا صحیح مطلب سمجھ میں آگیا، تو بس کافی ہے۔ مدعا پورا ہو گیا۔ مفہوم حدیث اگر محفوظ ہے، تو مقصود حاصل ہو گیا، یہ بھی کیا کم ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”اس صورت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا پڑے گا کہ حدیث قرآن سے تو نہیں کراہی

(وغیرہ وغیرہ) (دوا سلام ص ۲۲)

**غلط فہمی**

**ازالہ** | اس کا جواب آگے آرہا ہے

برق صاحب حدیث کی صحت کے لئے چند شرائط مقرر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

**غلط فہمی**

”پس ہر ایسی حدیث صحیح ہے خواہ اس کا راوی ابوہریرہ ہو، یا بابا بارتق“ (دوا سلام ص ۲۲)

صحیح بات تو بالکل بے شک و شبہ صحیح ہے خواہ اسے بیان کرنے والا کوئی ہو اگر اس بات کی

صحت کسی دوسرے ذریعہ سے ثابت ہو چکی ہے تو پھر اگر کوئی کذاب و دجال بھی اس کو

بیان کرے تو وہ بات اس کے بیان کرنے سے جھوٹ نہیں ہو جائے گی اس کی صحت کے لئے دوسرے

شواہد ہیں اور ان ہی کی وجہ سے وہ صحیح ہے، ہاں اگر کسی بات کی صحت کے لئے دوسرے شواہد موجود نہ

ہوں اور بات ایسی ہو کہ اس کے قبول کرنے میں بظاہر کوئی حرج بھی نہ ہو تو ایسی بات ہرگز کسی کذاب

کے بیان کرنے سے قبول نہیں کی جائے گی، یہاں دیکھا جائے گا کہ راوی ابوہریرہ ہیں یا بابا بارتق، اگر

ابوہریرہ ہیں تو قبول کی جائے گی اور اگر بابا بارتق ہے تو مسترد کر دی جائے گی، مثلاً بابا بارتق اگر یہ بیان

کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ ”ظہر کی نماز میں سورہ نساء پڑھا کر دو“ یہ بات ایسی

ہے کہ برق صاحب کے پیش کردہ تمام معیاروں پر پوری اترتی ہے کیا ہم اس کو تسلیم کر لیں؟ برق صاحب

ایسے موقع پر آپ ضرور سوال کریں گے کہ بابا بارتق ثقہ بھی ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو آپ اس حدیث کو فرضی

قرار دیں گے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بابا بارتق کو کذاب تسلیم کرنے کے بعد بھی آپ اس حکم کو امت کے سر پر

رکھ دیں لہذا یہ کہنا کہ سچا اور جھوٹا راوی دونوں برابر ہیں بالکل لغو ہے۔

دوم۔ ہر سچی بات کو تسلیم کرنے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ وہ سچی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



نے فرمائی ہے ہر اچھی بات کو خواہ مخواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تو منسوب نہیں کیا جاسکتا ایک عالم کے منہ سے نکلی ہوئی سچی بات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلی ہوئی بات میں ایک ٹومن کے لئے تو بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات میں جو تقدس اور خیر ہے وہ دوسرے کی بات میں کہاں ہو سکتا ہے اور اگر دونوں برابر ہوں تو پھر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بھی اچھی اور سچی ہے لیکن میں اس معاملہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ زیادہ قرین مصلحت ہے۔ لہذا میری پیروی کرو نہ کہ حدیث رسول کی۔ بتائیے کیا ایک ٹومن اسے برواشت کر سکتا ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

**غلط فہمی**

”اگر کوئی انگریز کہہ دے کہ خدا ایک ہے، چوری، زنا اور قمار بازی گناہ ہیں، تو کیا کسی مسلمان میں یہ جرات ہے کہ وہ ان اقوال کے صحیح ہونے سے انکار کر دے“

(دوا سلام ص ۳۲۲)

کوئی مسلم ان کا انکار نہیں کرے گا اس وجہ سے کہ یہ باتیں اس کے بیان کرنے سے پہلے قرآن مجید میں موجود ہیں، اور قرآن مجید پر اس کا ایمان ہے یہ اس انگریز کی تصدیق نہیں ہے بلکہ درحقیقت قرآن مجید کی تصدیق ہے اگر وہ انگریز

**ازالہ**

۱۔ قیامت کے متعلق ایسی باتیں بیان کریں جو قرآن و حدیث میں نہیں ہیں۔

۲۔ میدان محشر کے حالات بیان کرے۔

۳۔ دوزخ کے عذاب کا حال بیان کرے۔

۴۔ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرے۔

۵۔ نماز عید اور جمعہ کے فضائل بیان کرے۔

۶۔ نماز استسقاء کے لئے بعض شرائط بیان کرے۔

۷۔ آئندہ واقعات کی پیشین گوئی کرے۔

۸۔ گزشتہ اخبار کو بیان کرے۔

۹۔ ساتوں آسمانوں کے رنگ بیان کرے۔

۱۰۔ تاروں کی مخلوقات کا ذکر کرے۔

۱۱۔ نماز کے نواقض میں کچھ اضافہ کرے۔

۱۲۔ صفا اور مروہ کے طواف کو نفو کہے اور اسے شرک بتائے یا

۱۳۔ صفا اور مروہ کے گرد طواف کرنے کو صحیح قرار دے اور ان کے مابین دوڑنے کو بلحاظ



لعنت اور لمحاظ قرآن مجید غلط قرار دے وغیرہ وغیرہ

اور ان چیزوں کی وضاحت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ کی ہو تو بتائیے کیا ان سب چیزوں کو ہم تسلیم کر لیں صرف اس لئے کہ یہ باتیں قرآن مجید سے نہیں ٹکراتیں نہ تاریخی اور جغرافیائی حقائق کے خلاف ہیں نہ حقائق کو نیہ کا انکار کرتی ہیں۔ برق صاحب ہمارا تو حسن ظن ہی ہے کہ آپ بھی یہ باتیں تسلیم نہیں کریں گے کیونکہ ان باتوں کی صحت کے لئے راوی کا ثقہ ہونا ضروری ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور باریق کی مرویات میں بڑا فرق ہو گا، چہ نسبت خاک را با عالم پاک، یہ دو وارد و چارو الامعاملہ نہیں کہ جو کہے تسلیم کر لیا جائے پھر دو وارد کو بھی تسلیم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی فرمایا ہو کہ دو وارد و چار مروتے ہیں یا آپ اپنے اصحاب کو حساب سکھایا کرتے تھے۔ بر صبح بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، آخر یہ بھی تو غلط بیانی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ غلط بیانی کو ہم صحیح تسلیم کر کے خود بھی غلط بیانی کے مرتکب ہوں اور خلاف واقعہ بات یعنی کذب کو صدق سمجھ لیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔

ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ بیان کرے کہ نیوٹن کے حرکات قوانین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تھا یا فلو جسٹن کے نظریہ احتراق پر ممفری ڈیوی سے بہت پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرب کاری لگائی تھی تو کیا آپ ان باتوں پر صرف اس لئے یقین کر لیں گے کہ یہ باتیں صحیح ہیں۔ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ یقین نہیں کریں گے بلکہ سند و ثبوت طلب کریں گے پس ثابت ہوا کہ صحیح بات کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا اور اگر کوئی کریگا تو اس کو اپنی ثقاہت اور سند ثابت کرنا ہوگی، ورنہ اس کی بات مسترد کر دی جائے گی خلاصہ یہ ہوا کہ اصل چیز راوی کی ثقاہت اور سند ہے نہ کہ کچھ اور۔

## قولہ

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”ہمارے محدثین اسناد و روایت پر تکیہ کرتے رہے اور انہیں کرنا بھی چاہیے تھا (رد و اسلام ص ۳۲۲)“

## تائید

بہت خوب! آپ نے بہت صحیح بات کہی اور اسی کو ہم مذکورہ بالا عبارت میں ثابت کر چکے ہیں،



## قولہ

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-  
 ”آخر کسی قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے لئے روایت  
 کا سلسلہ ضروری تھا“ (ص ۳۲۲)

## تائید

ہم بھی آپ کی تائید کرتے ہیں لیکن ایک بات دریافت طلب ہے وہ یہ کہ اگر کسی قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے لئے سلسلہ روایت ضروری ہے تو پھر یہ سلسلہ روایت سچوں کا ضروری ہے یا جھوٹوں اور کذابوں کا سلسلہ بھی کافی ہے، غالباً آپ یہی کہیں گے کہ جھوٹا اور سچا کیسے برابر ہو سکتا ہے اگر جھوٹوں کا سلسلہ کافی اور مستند سمجھا جائے تو پھر اس سلسلہ اسناد کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پھر تو سلسلہ اسناد کا پیش کرنا یا اس کا مطالبہ کرنا ہی لغو اور لالچنی ہے، اگر بات یہ ہے اور حقیقت یہ ہے تو پھر صادق اور کاذب راوی برابر نہیں ہو سکتے اور اسی بنا پر حضرت ابو ہریرہؓ اور بارتن کی مرویات برابر نہیں ہو سکتیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

## غلط فہمی

”حضور پر بذریعہ وحی صرف قرآن نازل ہوا تھا“ (دو اسلام ص ۳۲۳)

ہم تمہید میں ثابت کر چکے ہیں کہ احادیث بھی بذریعہ وحی نازل ہوئی تھیں۔ تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں، ذیل میں ہم کچھ مزید معروضات پیش کرتے ہیں، انصاف فرمائیں

## ازالہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ لَیْسَ بِہِ اِنْسٌ  
 اللّٰهُ اصْطَفٰہُ وَطَهَّرَہُ وَاصْطَفٰہُ  
 عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَیْسَ بِہِ  
 اِنْسٌ لِّرَبِّکَ وَاسْجُدْ وَاسْمَعْ  
 مَعَ الرَّاکِعِیْنَ ۝

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بیشک  
 اللہ نے تمہیں منتخب کر لیا ہے اور تمہیں پاک  
 کر دیا ہے اور تمام دنیا کی عورتوں پر تمہیں  
 برگزیدہ کیا ہے اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری  
 کرتی رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ

سجود اور رکوع کرتی رہو۔

(ال عمران ۴۲، ۴۳)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ:-

۱۔ حضرت مریم کے پاس فرشتے آیا کرتے تھے۔



۲۔ فرشتے حضرت مریمؑ سے باتیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام حضرت مریم کو پہنچایا کرتے تھے۔

۳۔ شرعی احکام بھی فرشتوں کے ذریعہ حضرت مریم کے پاس آیا کرتے تھے۔  
اب سوال یہ ہے کہ ان فرشتوں کے ذریعہ جو پیغامات الہیہ اور احکام شرعیہ حضرت مریم کو پہنچتے تھے کیا وہ اللہ کی کتاب تھی جو حضرت مریم کو دی گئی تھی اور کیا اس کتاب کے ذریعہ حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ نے قوم کی اصلاح اور اس کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا؟ کیا حضرت مریم، اللہ تعالیٰ کی رسول تھیں، کیا وہ نبیہ تھیں؟ کیا وہ قوم کو تبلیغ کرتی تھیں ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً باری صاحب کو بھی اس سے اتفاق ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ کتاب اللہ کے علاوہ بھی فرشتوں کے ذریعہ وحی آیا کرتی تھی، اور جب ایک غیر نبی پر فرشتوں کا نزول ہوا اور وحی آئے تو کیسے ممکن ہے کہ ایک اولوالعزم نبی پر سوائے قرآن مجید کے فرشتوں کا نزول نہ ہوا اور سوائے قرآن مجید کے دوسری وحی نہ آئے۔ الغرض کتاب اللہ کے علاوہ بھی وحی آتی رہی ہے اور آسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اِذْ وَاَلَّتِ الْمَلٰٓئِكَةُ رُءُوسَهُنَّ لِمَا يَسِّرُ لَكَ  
اللّٰهُ يَبْشُرُكَ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اَسْمُهُ  
السِّمِیُّ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ  
اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم  
اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتا ہے، ایک  
بیٹے کی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم  
ہوگا۔  
(ال عمران: ۴۵)

گویا اللہ تعالیٰ بار بار حضرت مریم کی طرف وحی بھیجتا رہا، حضرت مریم پوچھتی ہیں کہ بغیر باب کے بیٹا کیسے ہوگا، جواب ملتا ہے:-

كَذٰلِكَ اَللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ  
اللہ تعالیٰ اسی طرح پیدا کرے گا وہ جو چاہے  
پیدا کر سکتا ہے۔  
(ال عمران: ۴۷)

پھر جب انہیں درود شروع ہوا تو فرمایا:-

لَا تَحْزَنِيْ  
(ص: ۲۴)

اے مریم غمگین نہ ہو۔

پھر ارشاد فرمایا:-

وَهَيَّاۤى اِلَيْكَ بِمَجْدِ النَّخْلَةِ  
سَادِطٌ عَلَيْكَ رُطْبًا جَنِيًّا

اے مریم کھجور کے تنے کو ہلاؤ۔ تم پر تازہ  
کھجوریں چھڑیں گی۔

(ص: ۲۵)

پھر ارشاد فرمایا:-



نَكَلِي وَاشْرَبِي وَتَسْتَعِينَا  
کھاؤ، پیو اور خوش رہو۔

(صی ۱-۲۶)

غرض یہ کہ مختلف حالات میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ حضرت مریم پرچی بھیجتا رہا اور یقیناً یہ کتاب اللہ کی وحی نہیں تھی، اور سنئے۔

إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ۖ  
اور (اے موسیٰ) جب ہم نے تمہاری والدہ کی  
أَنِ اقْنِ فِيهِ فِي التَّابُوتِ فَأَقْنِ فِيهِ  
طرف وحی کی، جو کہ وہ یہ کہ اس بچہ کو تابوت  
فِي الْيَمِّ (طہ ۱-۳۸، ۳۹) میں رکھ کر دریا میں بہا دو۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے پاس بھی وحی آیا کرتی تھی اور یقیناً یہ وحی تورات میں نہیں تھی بلکہ تورات سے پہلے نازل ہوئی تھی اور تورات کے علاوہ تھی، دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ  
اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کی طرف وحی بھیجی کہ ان  
فَإِذَا اخْفِيتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ  
کو دو دھوپاؤ مہر جب تمہیں خوف ہو تو ان کو  
وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَآدُّوهُ  
دریا میں ڈال دینا اور نہ ڈرنا، نہ غمگین ہونا ہم تمہارے  
إِلَيْكَ وَجَاعِلُوهُ مِنْ أُمَّةٍ سَلِيلَةٍ  
پاس انہیں واپس لے آئیں گے اور ہم ان کو  
(القصص ۱-۷) رسول بنائیں گے۔

کیا ان آیات میں صراحت کے ساتھ وحی کا ذکر نہیں۔ یہاں وحی کو دل میں ڈالنے کے معنوں میں ہرگز نہیں لیا جاسکتا اس لئے کہ اس میں وعدہ ہے، اور آئندہ کی خبر ہے اور یہ چیز بغیر وحی اصطلاحی کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

## نتیجہ

اگر غیر نبی کے پاس کتاب الہی کے علاوہ وحی آ سکتی ہے تو ایک نبی کے پاس بھی کتاب الہی کے علاوہ وحی آ سکتی ہے آخر اس میں اشکال ہی کیا ہے؟ تمہید میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہاں اس زاویہ سے اس پر بحث نہیں ہوئی تھی لہذا اس کی تکمیل یہاں کر دی گئی۔

”چونکہ قرآن میں صرف مہمات مسائل سے بحث کی گئی ہے اور چھوٹی

چھوٹی تفصیل کو انسانی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے اس لئے محض نور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم تمام غیر الہامی مسائل میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کرتے تھے

(دوا سلام ص ۲۲۳)



**ازالہ** کسی دینی معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا اور نہ کوئی دینی کام مشورہ سے طے پایا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز مشورہ سے طے کی گئی، نمازوں کی رکعات، نمازوں کی ہدیت، کیا یہ سب مشورہ سے طے ہوئیں، ہرگز نہیں، بلکہ نماز کے تمام طریقہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، ارشاد ہے :-

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ  
الْوُسْطَىٰ ذِكْرُ مَوْلَايَ لِلَّهِ تَانِيَتَيْنِ ۚ فَإِذَا  
خِيفْتُمْ فَجَاؤُا وَرُكْبَانًا فَإِذَا  
أَمْنْتُمْ فَادْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم  
مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۚ

نمازوں کی حفاظت کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے رہا کرو، پھر اگر دشمن کا خوف ہو تو سوار یا پیدل جس طرح ہو سکے نماز پڑھ لو، لیکن جب امن ہو تو پھر نماز کو اسی طرح طریقہ سے ادا کرو جس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھایا ہے اور جس طریقہ کو تم

(البقرہ: ۲۳۸، ۲۳۹)

نہیں جانتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حالت امن میں نماز پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے جس طریقہ سے نماز ادا کی جاتی ہے اور اس طریقہ سے نماز کی ادائیگی بحالت خوف ممکن نہیں اگر یہ طریقہ مشورہ سے طے پایا تھا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب نہ کرتا، نہ یہ فرماتا کہ اس طریقہ کو تم تو جانتے ہی نہ تھے پس معلوم ہوا، کہ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے سکھایا، اور بذریعہ وحی سکھایا، لہذا قرآن مجید کے علاوہ وحی کا اثبات ہے۔

**غلط فہمی** اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ حضور کی ہر حرکت، ہر قول اور ہر اقدام تابع وحی ہوا کرتا تھا تو پھر ”شَاوِرْهُمْ“ (تم صحابہ سے مشورہ کر لیا کرو) کی ہدایت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے (دو اسلام ص ۳۲۳، ص ۳۲۴)

**ازالہ** ”شَاوِرْهُمْ“ کے آگے ”دِیْنِ الْاَرْضِ“ ہے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ سیاست میں مشورہ کا حکم دیا جا رہا ہے نہ کہ دین میں، امور سیاست میں بھی صرف اس شعبہ میں مشورہ کا حکم ہے جس کا تعلق قوانین دینیہ سے نہیں بلکہ جو شعبہ امور دنیا اور مصالح ملکی سے تعلق رکھتا ہے ان میں مشورہ کا حکم ہے، مثلاً ان احکام میں مشورہ نہیں لیا گیا کہ

کن کافروں سے لڑا جائے، کب اور کن مہینوں میں لڑا جائے، لڑائی میں کون کون سے کام ناجائز ہیں، حرم میں لڑا جائے یا نہیں، حرام مہینوں میں اور حرم میں کس حالت میں جنگ جائز ہے، ان اصول و احکام کا تعلق براہ راست قوانین الہیہ سے ہے لہذا ان احکام میں کوئی مشورہ نہیں لیا گیا۔

آپ فرمائیں گے کہ یہ احکام تو قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن قرآن مجید میں یہ تفصیل کہاں ہے کہ



عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو مت قتل کرو، پھل دار درخت مت کاٹو، ناک، کان و دیگر اعضاء مت کاٹو۔ آگ میں مت جلاؤ، سفیر کو قتل نہ کرو، جاسوس کو قتل کر دو، وغیرہ وغیرہ، ان تمام احکام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا، ہاں مشورہ لیا تو صرف یہ لیا کہ مدینہ میں رہ کر رہیں یا باہر نکل کر، ظاہر ہے کہ اندر رہ کر لڑنا، یا باہر جا کر لڑنا یہ کوئی اصولی و دینی حکم کی حیثیت نہیں رکھتا، اس کا تعلق دنیاوی مصالح سے ہے، لہذا اس پر مشورہ لیا گیا، اور مشورہ پر عمل بھی کیا گیا۔ دینی احکام میں قطعاً کبھی آپ نے مشورہ نہیں لیا، نہ زکوٰۃ کے نصاب کے متعلق مشورہ ہوا، نہ زکوٰۃ کی مقدار کے متعلق، نہ عیدین کے انعقاد کے سلسلہ میں مشورہ ہوا، نہ نماز استسقاء کے متعلق، نہ نماز کسوف کے متعلق، ان میں سے کوئی کام بھی مشورہ کی بنا پر مقرر نہیں ہوا۔

یہاں تک کہ امیر المومنین اور حکمران کی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو آپ بغیر صحابہ کے مشورہ کے حکمران بنے تھے۔ اور جب کبھی آپ نے سپہ سالار اور گورنر مقرر کئے تو کبھی مشورہ نہیں لیا بلکہ اگر لوگوں نے کسی کی سپہ سالاری پر اعتراض بھی کیا تو آپ نے اس اعتراض کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بلکہ جو چاہا عمل کیا اور ہمارے لئے یہ دستور العمل مرتب فرما دیا کہ اگر حاکم وقت کسی شخص کو کسی عہدہ کے لئے مناسب سمجھے تو رعایا کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس میں مداخلت کرے۔ یہ محقا اصول دین ہے۔ ان اصول دین کے سلسلہ میں کسی سے مشورہ نہیں لیا گیا مگر خلفائے راشدین ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کردہ اصول اور سنن کی ہی پیروی کرتے رہے انہوں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ یہ اصول و فروع کیونکہ مشورہ سے طے ہوئے تھے لہذا مشورہ ہی سے پھر طے کئے جاسکتے ہیں۔

## ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اذان کے متعلق مشورہ کیا گیا، ہم کہتے ہیں کہ مشورہ کی حیثیت شروع میں بالکل دنیاوی تھی یعنی لوگوں کو اطلاع کرنے کا ذریعہ کیا ہونا چاہئے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ اس اطلاع و اعلان کو بھی دینی حیثیت دے دی جائے۔ لہذا بذریعہ وحی و بذریعہ خواب اس اعلان و اذان کی تعلیم دی گئی اور اسی وحی کی بنا پر اذان مشروع ہوئی۔

اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ جزئیات کو آپ نے مشورہ سے متعین فرمایا، پھر بھی اس نافذ شدہ مشورہ کو ماننا شرعاً لازم ہے اس لئے کہ اس مشورہ پر اللہ تعالیٰ کی نگاہ تھی اگر وہ مشورہ غلط ہوتا تو فوراً بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی جیسا کہ اسیران بدر کے سلسلہ میں بذریعہ وحی اصلاح کی گئی، اور آئندہ کے لئے اس مشورہ کے مطابق عمل کرنے سے روک دیا گیا۔

غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے مشورہ کرنا، اور اس مشورہ کے مطابق عمل



بنانا اور پھر اس لائحہ عمل کے خلاف وحی کا نہ آنا یہ بھی وحی ہی کی ایک صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لائحہ عمل کو شرف منظوری بخش کر برقرار رکھتا ہے لہذا بفرض محال جو تفصیلی احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مرتب کئے، یا مشورہ کے بعد نافذ فرمائے، بہر حال ان کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہیں لیکن کسی دوسری تفصیل و تشریح کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے یا نہیں، صحیح ہے یا نہیں لہذا ایسی غیر یقینی چیز کے مقابلہ میں یقینی چیز کو چھوڑ دینا یقیناً حق سے انحراف کرنا ہے اور یہ عقلاً بھی محال ہے اور نقلاً بھی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:-

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا

محض گمان سے حق کو ذرا بھی نہیں

چھوڑا جاسکتا۔

(النجم: ۲۸)

جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ یقیناً حق ہے اور اس کو چھوڑنا یقیناً اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لائحہ عمل کو چھوڑنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لائحہ عمل کو چھوڑنا یقیناً گمراہی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان فرمادیا ہے:-

وَاتَّبِعُوا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

رسول کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت یاب

ہو جاؤ۔

(الاعراف: ۱۵۸)

حدیث میں کئی ایسے واقعات موجود ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ کہا، صحابہ نے کچھ اور مشورہ دیا اور وحی نے صحابہ کی تائید کر دی

**غلط فہمی**

(دو اسلام ص ۳۲۲)

حدیث میں ایسا ایک بھی واقعہ موجود نہیں، جس میں وحی نے صحابہ کی تائید کی ہو اور آپ کی تردید کی ہو، اسیران بدر کا جو واقعہ آپ نے پیش کیا ہے وہ اس کی نظیر نہیں اس واقعہ میں تو جو کچھ طے پایا وہ صحابہ کی اکثریت کا فیصلہ تھا اور وحی نے اقلیت کی تائید کی تھی، یعنی اکثریت کے فیصلہ کو وحی الہی نے اصولاً رد کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے تو الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشورہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اکثریت کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی لہذا اس کا فیصلہ کہ صحابہ کا مشورہ صحیح ہے یا غلط، بذریعہ وحی ہوگا، اگر بذریعہ وحی تردید نہ ہو تو وہ فیصلہ صحیح سمجھا جائے گا اور اگر بذریعہ وحی اس کی تردید ہو جائے تو وہ فیصلہ غلط سمجھا جائیگا گویا اصل اہمیت اللہ تعالیٰ کی منظوری کو ہے اب خواہ وہ اس منظوری کو بذریعہ وحی صلی ظاہر فرماوے یا بذریعہ وحی خفی یا محض خاموشی سے اس کو برقرار رہنے دے۔



## غلط فہمی

”اسیرانِ بدر کا واقعہ آپ کے سامنے ہے کہ حضورؐ نے فدیہ لینے کا فیصلہ کیا تھا، حضرت فاروقؓ نے قتل کا مشورہ دیا اور اللہ نے حضرت عمرؓ کی

تائید فرمادی“ (دو اسلام ص ۳۲۲)

## الزام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا، اور کثرتِ آراء کے فیصلہ پر فدیہ لیا گیا، حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ قتل کر دیا جائے لیکن ان کا مشورہ اکثریت کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ اب اگر مشورہ کو دینی حیثیت حاصل تھی تو پھر وحی نے اکثریت کے خلاف فیصلہ کیوں دیا؟

اکثریت کا فیصلہ غلط تھا اور کیونکہ معاملہ محض دنیاوی تھا لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ذاتی رحم و کرم کی بنا پر کثرتِ رائے سے اتفاق فرمایا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مشورہ سے کیا ہوا فیصلہ ناپسند فرمایا، کیونکہ اس وقت یہ فیصلہ دینی سنت اختیار کر رہا تھا وہ یہ کہ فدیہ لے کر چھوڑنے کے شرائط کیا ہونے چاہئیں۔ اور کب فدیہ لے کر چھوڑا جاسکتا ہے اگر اس فیصلہ پر اللہ تعالیٰ خاموش رہتا تو یہ سنت بن جاتی کہ کسی حالت میں بھی اسیرانِ جنگ کو قتل کیا جاسکتا ہے یا فدیہ لے کر رہا کیا جاسکتا ہے، حالات کے تقاضے سے اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا، ہر حالت میں اکثریت کا فیصلہ نافذ ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ نہیں ہر حالت میں مشورہ پر عمل نہیں ہوگا، بلکہ ہم اصولِ دین کی حیثیت سے یہ بات نافذ کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل نہ دیا جائے اور خوب خون ریزی کے بعد اسلامی حکومت کا رعب غالب نہ ہو جائے، اس وقت تک اسیرانِ جنگ کو رہا نہ کیا جائے۔

برق صاحب آپ اس واقعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے حجت شرعیہ نہ ہونے کے منافی سمجھ رہے ہیں حالانکہ اس واقعہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فیصلہ خواہ وہ مشورہ کے بعد ہو یا بغیر مشورہ کے صحیح ہوتا تھا اور اگر صحیح نہیں ہوتا تھا تو فوراً وحی کے ذریعہ اس کی تصحیح کر دی جاتی تھی لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلوں پر اللہ تعالیٰ کی مہرِ تصدیق ثبت ہے اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے فیصلے سمجھے جاتے ہیں اگر یہ فیصلے غلط ہوتے تو اللہ تعالیٰ کبھی خاموش نہ رہتا، اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو دیکھتے رہنا، غلط فیصلہ پر ٹوک دینا وحیِ قوی ہے، جلی ہو یا خفی، صحیح فیصلہ پر خاموش رہنا یہ وحیِ تقریری ہے اور حدیث کا ایک بہت بڑا حصہ اس وحیِ تقریری پر بھی مشتمل ہے، ملا وہ اس تقریری وحی کے بے شمار تہ قوی وحی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتی تھی اور یہ قرآن مجید کے علاوہ تھی۔ اس کا انکار تواتر کا انکار ہے اس قسم کی احادیث جن میں وحی کا نزول موجود



حد توار کو پہنچ چکی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ بھی وحی آیا کرتی تھی، تفصیل کے لئے مہمید ملاحظہ ہو۔

**غلط فہمی** اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صرف اہم قوانین و ضوابط سے بحث کی ہے اور غیر اہم مسائل انسانی اجتہاد پر چھوڑ دئے ہیں آنحضرت صلعم تمام ایسے معاملات میں اجتہاد سے کام لیا کرتے تھے اور احادیث کا بیشتر حصہ انہی اجتہادات پر مشتمل ہے (رد اسلام ص ۳۲)

**ازالہ** ہمیں اس کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں، اگر آپ نے بعض مسائل میں اجتہاد سے فیصلہ کیا ہے، تو بھی ان کے حق ہونے میں شبہ نہیں ان کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا سکوت سند ہے اور یہ وحی تقریری ہے اور جس طرح وحی قولی حجت شرعیہ ہے اسی طرح وحی تقریری بھی حجت شرعیہ ہے۔ اگر آپ کا اجتہاد غلط ہوتا تو وحی قولی سے راہ نمائی نازل ہوتی جیسا کہ ایک دو مرتبہ ہوا اور کیونکہ ساری زندگی میں وہ ایک ہی اجتہاد ہی غلطیاں ہوئیں اور وہ صحیح کر دی گئیں لہذا اب آپ کی پوری زندگی میں کوئی غلطی نہیں۔ آپ کے اجتہادات بالکل صحیح ہیں اور وہ قرآن مجید کی ایسی تشریح ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند ہے، لہذا اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہم بے کھٹکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی پیروی کر سکتے ہیں، اور وَاتَّبِعُوا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (احکام ۱۵۸) کے مطابق ہدایت یاب ہو سکتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جس کو عصمتِ انبیاء کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے اور یہی وہ معصوم ہستیاں ہیں جن کو منتخب کر کے اللہ تعالیٰ ہمارے لئے نمونہ مقرر فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نمونہ کو چھوڑ کر دوسرے کو نمونہ بنانا اللہ تعالیٰ کے کام میں مداخلت ہے جا ہے اور یہی شرک فی الرسالت ہے، رسول کے اقوال و افعال پر اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے اور بعض احکام براہِ راست وحی کے ذریعہ رسول تک پہنچتے ہیں لہذا رسول کا ہر قول و فعل وحی الہی ہوتا ہے، شرعیہ ہوتا ہے حکم الہی ہوتا ہوتا ہے، اگر رسول کے اقوال و افعال کے علاوہ یا ان کو چھوڑ کر دوسرے کے اقوال و افعال کو مشعل ہدایت بنایا جائے تو گویا اس کے اقوال و افعال کو احکام الہی کا درجہ دینا ہے اور یہ شرک فی الحکم ہے اور شرک فی الرسالت ہے، تقلید کی بدعت بھی اسی شرک فی الرسالت و شرک فی الحکم کے ذیل میں آتی ہے۔

**غلط فہمی** یہ فرض کر لینا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملکہ اجتہاد سے عاری تھے اور وحی کے بغیر نہ کچھ سوچ سکتے تھے نہ کچھ کر سکتے تھے، رسالت پناہ کی انتہائی توہین ہے، اگر کوئی شخص آپ کے متعلق یہ کہہ دے کہ آپ ہر معاملہ میں اپنے کسی



دوست یا بیوی کے مشورہ پر چلتے ہیں تو کیا آپ اسے اپنی توہین نہیں سمجھیں گے۔

(دوا سلام ص ۳۲۴ ص ۳۲۵)

**ازالہ** اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ یہ قرآن مجید تو اللہ کا کلام ہے لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ کوئی ایسی جامع و مالمع کتاب تصنیف کر دیتے جو دوسرے مصنفین کی تصانیف پر بھاری ہوتی معلوم ہو کہ وہ خود تو نہ کچھ لکھ سکتے تھے نہ بول سکتے تھے، بس وحی کے تابع تھے وحی آگئی تو بات کر لی ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ کا مصداق تھے تو بتائیے کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قابلیت پر طنز نہ ہو گا کیا اسے آپ کی توہین نہ تصور کیا جائے گا۔

برق صاحب! محض رنگ آمیزی سے کام نہیں چلتا، حقیقت، حقیقت ہے، اسے بدلا نہیں جاسکتا، یہ قرآن مجید کی آیات آپ کے سامنے ہیں، یہ حقائق ہیں ان کی رو سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ بغیر وحی کے آپ بات ہی نہ کرتے تھے اب اگر یہ توہین ہے تو وہ بھی توہین ہے کہ بغیر وحی کے آپ قرآن مجید کی تشریح و تفصیل نہ کرتے تھے، برق صاحب بیوی کی راسخائی میں کام کرنا تو توہین ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی کو توہین سمجھنا عقل سے بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی ہی تو رسول کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے اور آپ اس کو توہین سمجھ رہے ہیں۔

تعجب ہے کہ آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ ہر کام صحابہ کے مشورہ سے کیا کرتے تھے اور اس کو توہین نہیں سمجھتے لیکن اگر کوئی دوسرا یہ کہتا ہے کہ آپ ہر کام اللہ کے مشورہ سے کرتے تھے تو آپ اس کو توہین سمجھ لیتے ہیں یعنی صحابہ کے مشورہ کا پابند تو قابلِ تعریف اور اللہ تعالیٰ کے اشارات کا پابند قابلِ توہین، اللہ کے لئے انصاف کیجئے۔

پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملکہ اجتہاد سے عاری تھے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ آپ کے اجتہادات پر اللہ تعالیٰ کی نظر تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھے لہذا وہ حجت شرعیہ ہیں بتائیے اس میں کیا الجھن ہے؟

**غلط فہمی** ہمارے علماء نے بھی سرور کائنات کے متعلق کچھ اس قسم کا تصور قائم کر رکھا ہے کہ ان کا ہر قول وحی تھا۔ یعنی روٹی مانگتے (آخر یہ بھی قول ہے) تو وحی کا انتظار

کرتے اگر یہ پوچھنا ہوتا کہ ”میرا جوتا کہاں ہے“ تو جبریل کی راہ دیکھتے رہتے کہ وہ آئے

میرے لئے منقرہ تجویز کرے اور میں بولوں۔ (دوا سلام ص ۳۲۵)

**ازالہ** یہ غلط معبث ہے سوال ہے دینی احکام کا، قرآن مجید کی تشریحات کا، اس سے روٹی مانگنے اور جوتا پوچھنے کا کیا تعلق ہے؟ احکام قرآنی کی تشریح میں آپ جو کچھ



فرماتے تھے وہ یا تو وحی قولی ہوتا ہے یا وحی تقریری، اور ان دونوں کے مجموعہ کو علماء دین نے وحی خفی کا نام دے دیا ہے۔ آپ چاہیں تو خفی کے بجائے کچھ اور کہہ دیجئے مگر بہر حال ہے وہ وحی۔

علماء کے متعلق برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی، علماء کا تو صرف اتنا قصور ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا، اس کو دوسرا دیا۔ یہ تصور کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی تھا اللہ تعالیٰ کے کلام سے ماخوذ ہے، اب آپ جو کچھ چاہیں اللہ تعالیٰ کو کہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم: ۲۰، ۲۱) اور رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا، وہ جو کچھ بولتا ہے وحی ہوتی ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی ہے بتائے اب بھی آپ کے ہر قول کو وحی ماننے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

ہر مرتبہ جبریل کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے القا کیا وہی لفظ زبان پر آگئے یہ بھی تو وحی کی ایک قسم ہے۔

برق صاحب کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وحی کی بس ایک قسم ہے یعنی قولی، حالانکہ وحی کی کئی قسمیں ہیں، قولی (ایفاظ کا نزول) فعلی (جبریل علیہ السلام کا کسی کام کو کر کے بتانا مثلاً نماز کا طریقہ اور اوقات نماز کی تعلیم اسی قسم میں شمار ہے) تقریری (آپ کے تمام اجتہادات، بعض فیصلے و تشریحات اسی کے ذیل میں آتے ہیں) برق صاحب کو غالباً اس وحی کا خیال نہیں رہا ورنہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں (القاع والہام، خواب اور بالمشافہ کلام بھی نبی کے لئے وحی کی قسمیں ہیں۔

”قرآن کے بغیر حضور کو اور چیز بذریعہ وحی نہیں دی گئی تھی۔“

**غلط فہمی**

أُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ (مہتمس گناہوں سے بچانے کے لئے مجھے بذریعہ

وحی یہ قرآن دیا گیا ہے (دو اسلام ص ۲۳۶)

لَا تُنْذِرُ كَذِبًا (قرآن)

برق صاحب قرآن مجید کی آیت تو آپ کی تائید نہیں کرتی، اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت

**ازالہ**

خالہ رضی اللہ عنہا بی ہیں، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بی نہیں اسی طرح مذکورہ

بالا آیت سے یہ تو ثابت ہے کہ قرآن مجید وحی ہے لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ”حدیث“ وحی نہیں ہے بلکہ سورہ نجم کی آیات جو ہم نے ابھی اور نقل کی ہیں ان سے صاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا ہر قول وحی ہے، لہذا حدیث بھی وحی ہے۔

برق صاحب آخر ان آیات کے مضمون کو تسلیم کرنے سے آپ کیوں گریز کرتے ہیں آخر یہ بھی تو قرآن کی آیات ہیں آپ کہیں گے کہ پھر آپ کے بعض قول غلط کیوں نکلے، ہم کہتے ہیں کہاں نکلے



قرآنی تشریحات میں آپ کا ایک قول بھی غلط نہیں نکلا، اور جو دو ایک اجتہادات یا فیصلے غلط نکلے وہ قرآنی تشریحات کے سلسلہ میں نہیں تھے۔ بلکہ اس سلسلہ میں قرآنی آیات کا نزول ہی بعد میں ہوا، گویا کہ قرآنی قانون کی عدم موجودگی میں کیا ہوا فیصلہ غلط نکلا، نہ کہ قرآنی قانون کی روشنی میں کیا ہوا فیصلہ غلط نکلا۔

دوسرے یہ کہ جو غلط فیصلہ ہوا وہ قائم کب رہا؟ اس کو برقرار کب رکھا گیا، فوراً اس کی تصحیح ہو گئی لہذا جو قول یا فیصلہ آپ کا برقرار رہنے دیا گیا، وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا، اور جو تصحیح کے بعد برقرار رکھا گیا وہ بھی صحیح ہوا، لہذا آپ کا ہر وہ قول جو باقی رہنے دیا گیا یا برقرار رکھا گیا وہ وحی ہے اور یہی ان تمام آیات میں تطبیق کی صورت ہے۔

تیسرے یہ کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہی اس میں غلطی نہیں ہوئی، غلطی کا امکان صرف اجتہادات میں ہو سکتا ہے اور ایسا صرف دو ایک مرتبہ ہوا اور فوراً اس اجتہاد کو وحی تقریری کے ذیل سے نکال کر وحی صلی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی اس تنقیدی نظر کی وجہ سے آپ کے اجتہادات بھی غلطی سے پاک رہے، اور اس طرح یہ اجتہادات مع دوسرے اقوال و افعال کے جو پہلے ہی غلطی سے پاک تھے، دینی نمونہ قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ  
حَسَنَةٌ (الاحزاب ۱-۲۱)

لئے بہترین نمونہ ہے۔

اس مضمون پر ایک مشتبہ سی حدیث بھی ملتی ہے۔

## غلط فہمی

ابو جحیفہ نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ کے پاس قرآن کے بغیر کوئی اور وحی موجود ہے فرمایا خدا کی قسم، اس صحیفہ کے بغیر اور اس فہم کے بغیر جو وحی کے متعلق مسلمان کو حاصل ہے ہمارے پاس کوئی اور وحی موجود نہیں (بخاری جلد ۲ ص ۱۱۱)

میں نے اس حدیث کو مشتبہ اس لئے کہا کہ اس میں حضرت علیؑ قرآن کے بغیر ایک اور صحیفہ کو بھی الہامی سمجھتے ہیں۔ نسائی میں اس صحیفہ کی تفصیل یہ دی ہوئی ہے کہ حضور علیہ السلام نے اہل بیت کے لئے چند خاص وصایا ارشاد فرمائی تھیں، جو اس صحیفہ میں درج تھیں اور جسے حضرت علیؑ پیام ذوالفقار میں رکھا کرتے تھے علامہ صنعانی کہتے ہیں کہ یہ وصایا جعلی تھیں اور ان کا واضع حامد بن عمرو النضیبی تھا۔ سیوطی فرماتے ہیں کہ بعض وصایا عبد اللہ بن زیاد بن سمعان نے تراشی تھیں (تذکرۃ الموضوعات ص ۵۷) (دوا سلام ص ۲۲۶-۲۲۷)



## ازالہ

برق صاحب یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ جہاں کوئی روایت آپ کے مفروضہ کے خلاف ہوئی آپ نے اسے مشتبہ کہہ دیا حالانکہ یہ حدیث آپ کے مفروضہ کہ ”خلفائے راشدین احادیث کو جلاتے رہے“ کے خلاف نص قاطع ہے اور آپ کے اس مفروضہ کے بھی خلاف ہے کہ ”مٹھائی سو سال تک احادیث لکھی نہیں گئیں۔“

برق صاحب نے جو عبارت بحوالہ نسائی لکھی ہے درحقیقت اس میں یہ عبارت سرے سے ہے ہی نہیں، معلوم نہیں برق صاحب نے نسائی کا حوالہ کیسے دے دیا۔ نسائی میں البتہ اس صحیفہ کا ذکر موجود ہے جو حضرت علیؑ نے خود مرتب فرمایا تھا اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منظور شدہ تھا۔ نسائی میں اس صحیفہ کا ذکر جو دصایائے نبی کے نام سے موسوم ہے قطعاً نہیں ہے یہ صحیفہ بے شک جعلی ہے، صحیفہ ”دصایائے نبوی“ حضرت علیؑ کا لکھا ہوا نہیں ہے بعد میں کسی شخص نے وضع کیا ہے۔

تذکرۃ الموضوعات جس کا حوالہ برق صاحب نے دیا ہے اس میں بھی ”دصایائے نبوی“ ہی کا ذکر ہے، اس ہی صحیفہ ”دصایائے نبوی“ کو تذکرۃ الموضوعات کے مصنف نے جعلی کہا ہے۔ اس صحیفہ کے جعلی ہونے سے وہ صحیفہ جو خود حضرت علیؑ نے لکھا تھا کیسے جعلی ہو سکتا ہے وہ تو کتب صحاح میں موجود ہے، اور ”دصایائے نبوی“ کتب صحاح کے مؤلفین ہی کے نزدیک جعلی ہے، کمال ہو گیا کہ برق صاحب نے دونوں کو ایک سمجھ لیا۔

”بہر حال اس حدیث سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ قرآن اور اس صحیفہ کے بغیر

کوئی اور وحی موجود نہیں اس لئے احادیث کو وحی خفی کہنا نہ عقلاً درست ہے

## غلط فہمی

اور نہ نقلًا، (دوا سلام ص ۳۴)

حضرت علیؑ کے متعلق سبائی جماعت نے میثور کر دیا تھا کہ ان کے پاس دصایائے نبویؑ ہیں جو اور لوگوں کے پاس نہیں ہیں اور یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ حضرت علیؑ تمام مسلمین میں کوئی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اسی شبہ کو دور کرنے کے لئے لوگوں نے آپ سے سوال کیا، مثلاً ابو جحیفہ سوال کرتے ہیں۔

## ازالہ

هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ قَالَ لَا إِلاَّ كِتَابُ اللَّهِ أَوْ نَحْنُ مُعْطِيهِ زُجُلٌ مُسْلِمٌ أَدُمَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ

کیا آپ کے پاس کوئی خاص کتاب ہے؟ حضرت علیؑ نے جواب دیا نہیں، سوائے کتاب اللہ کے اور اس سمجھ بوجھ کے جو ہر مسلم کو ملتی ہے اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے (پھر انہوں نے

(صحیح بخاری کتاب العلم) اس صحیفہ کی احادیث سنائیں)

ابو براء، ہم تمہی کے سوال پر حضرت علیؑ جواب دیتے ہیں۔



مَا عِنْدَنَا شَيْءٌ إِلَّا كِتَابُ اللَّهِ  
وَهَذِهِ الصَّحِيفَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رِوَايَ  
بَابِ حَرَمِ الْمَدِينَةِ

ہمارے پاس کچھ نہیں سوائے کتاب  
اللہ کے اور اس صحیفہ کے جو رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے دستیاب  
ہوا ہے۔

جس حدیث کا ترجمہ برق صاحب نے نقل فرمایا ہے اس میں بھی یہ سوال ہے :-  
هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ مِنَ الْوَحْيِ  
إِلَّا مَا فِي الْكِتَابِ (صحیح بخاری) کیا آپ کے پاس کتاب اللہ کے علاوہ بھی  
کوئی وحی ہے ؟

حضرت علیؓ نے جواب دیا نہیں، سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفہ احادیث کے  
یعنی یہ جو مشہور ہو گیا تھا کہ حضرت علیؓ کو وحی کی ایک خاص قسم عطا ہوئی ہے، جو عام مسلمان  
کو نہیں ملی، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی تردید فرما رہے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں  
سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفہ کے، اور اس صحیفہ میں فلاں فلاں احادیث ہیں، یعنی کوئی خاص  
چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔

یہ غلط بات جو سبائی جماعت نے تراش لی تھی، اس کے متعلق لوگ اپنے  
شبہات دور کرنے کے لئے سوال کر رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور  
اس کی تردید کر دی۔

فرمایا :-

مَنْ زَعَمَ أَنَّ عِنْدَنَا شَيْئًا  
نَقَرْنَا إِلَّا كِتَابَ اللَّهِ وَهَذِهِ  
الصَّحِيفَةُ فَقَدْ كَذَّبَ  
رِوَايَ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ

جو شخص یہ دعوائے کرتا ہے کہ ہمارے  
پاس کوئی خاص کتاب ہے  
جس کو ہم پڑھتے ہیں سوائے  
کتاب اللہ کے اور اس صحیفہ کے،  
وہ جھوٹ کہتا ہے۔

اس تمام بیان سے واضح ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان وصایا  
مخصوصہ کا انکار کر رہے ہیں۔ جو ان کے پاس نہیں تھیں۔ لیکن لوگ کہتے  
تھے کہ ہیں، اس انکار اور تردید کے باوجود ان کی وفات کے بعد کسی  
مفتی نے یہ ”وصایا“ نبویؐ، گھڑیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی  
طرف ان کو منسوب کر دیا۔

بہر حال اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ احادیث کو بھی وحی سمجھا کرتے تھے



کیونکہ وحی کی ذیل ہی میں انہوں نے اس صحیفۂ احادیث کا تذکرہ فرمایا تھا، اور سوال میں بھی وحی کے متعلق ہی سوال تھا۔ برق صاحب! حدیث کے ایک ٹکڑے سے استدلال کرنا اور دوسرے کا جو آپ کے خلاف ہوا نکار کر دینا انصاف سے بعید ہے، غور کیجئے گا۔

**غلط فہمی** | ایک سلیم الفطرت مسلمان کا وطیرہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ایسی حدیث کو تسلیم کرے جو قرآن سے متعارض نہ ہو خواہ وہ بخاری میں ہو یا کسی مسند میں

اور ہر ایسی حدیث کو بلا دروغ ٹھکرا دے۔ خواہ وہ بخاری ہی میں ہو، جو.....

(دوا سلام)

محض قرآن مجید سے متعارض نہ ہونا صحت کی دلیل نہیں۔ مثلاً ہر نماز میں سورۃ اخلاص پڑھا کرو، یہ قرآن مجید سے متعارض نہیں ہے، تو کیا یہ حدیث ہو جائے

**ازالہ**

گی۔





# صحت احادیث کے لئے برق صاحب

## کے تجویز کردہ معیار قرآن مجید کی روشنی میں

کتاب دو اسلام کے ختم کرنے سے پہلے برق صاحب نے حدیث کو پرکھنے کیلئے چند معیار مقرر فرمائے ہیں ان معیاروں کا سلسلہ وار جواب درج ذیل ہے لیکن جواب سے پہلے ہم ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ۔

### سوال

اگر ان معیاروں پر قرآن مجید بھی پورا نہ اترے تو پھر یہ معیار سچے ہیں یا قرآن مجید؟ اگر قرآن مجید سچا ہے اور درحقیقت قرآن مجید ہی سچا ہے تو پھر یہ معیار یقیناً باطل ہیں، اور ان میں سے کسی معیار کو حتمی سمجھ کر حدیث کو پرکھنا سراسر ظلم ہے۔

### نمبر ۱۔ برق صاحب کا تجویز کردہ پہلا معیار

#### تعلیمات قرآنی کے منافی ہونا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث تعلیمات قرآنی کے منافی ہوگی وہ حدیث جعلی ہوگی، یہ معیار اگرچہ کسی حد تک صحیح ہے، لیکن ہر حالت میں نہیں۔ مثلاً قرآن مجید ہر مرد اور کو حرام کرتا ہے لیکن حدیث میں ہے کہ مرد اور بچہ حلال ہے۔ تو کیا یہ حدیث قرآن مجید کے منافی کہلائے گی، نہیں بلکہ قرآنی حکم عام کو خاص کرنے والی کہی جائے گی۔ لہذا یہ حدیث موضوع نہیں ہوگی۔

پھر اس اصول و معیار کو کلیتہً تسلیم کرنے سے ایک اور امر بھی مانع ہے وہ یہ کہ کوئی فتنہ پرور اٹھے اور قرآن کی کسی آیت کے معنی اپنے رنگ میں کر لے اور جب اس سے کہا جائے کہ



حدیث میں اس طرح ہے تو وہ فوراً کہہ دے کہ یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے لہذا جعلی ہے، میں اسے نہیں مانتا، حالانکہ وہ حدیث قرآن مجید کے خلاف نہیں ہوگی بلکہ اس کے مختصر معنی کے خلاف ہوگی۔

مثلاً کراچی میں ایک فرقہ ابھی نکلا ہے جو ”لقمانی“ کہلاتا ہے۔ اس فرقہ کے بانی سید رضا لقمان ابھی زندہ ہیں اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت جبریل رسول اعظم بن کر آنے والے ہیں جب ان کے ایک مبلغ کے سامنے ہم نے ”خاتم النبیین“ والی آیت پڑھی، تو اس مبلغ نے جواب دیا کہ بے شک اس آیت کی رو سے نبی ختم ہو گئے، لیکن رسول ختم نہیں ہوئے۔ رسول آتے رہیں گے ہم نے حدیث پڑھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رسالت اور نبوت دونوں منقطع ہو گئیں، اب میرے بعد نہ کوئی رسول بن سکتا ہے نہ نبی۔ تو وہ مبلغ کہنے لگے کہ یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے، قرآن مجید میں تو رسول کے آنے کا ذکر ہے۔ لہذا یہ حدیث موضوع ہے۔ اب قرآن مجید کی جس آیت کو انہوں نے اپنی دلیل میں پیش کیا وہ یہ ہے اور جو ترجمہ انہوں نے کیا وہ بھی آیت کے مقابل درج ہے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ	اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ
الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِينَ	کافر ہیں یہ باز نہیں آسکتے، جب تک
حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۚ رَسُولٌ مِّنَ	ان کے پاس دلیل نہ آئے یعنی اللہ
اللَّهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۚ	کا رسول جو پاک صحیفے پڑھتا ہو۔

(البینۃ: ۲۰۱)

اب تک اس کا مطلب مسلم یہ سمجھتے رہے ہیں کہ یہ کافر باز آنے والے نہیں تھے، جب تک ان کے پاس اللہ کا رسول نہ آتا۔ رسول آگیا تو یہ لوگ باز آ گئے گویا تمام مسلمین کے نزدیک اس آیت میں رسول سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے آنے کے بعد بہت سے کافر اپنے کفر سے باز آ گئے، وہ مبلغ کہنے لگے کہ سب کافر کہاں باز آئے اور آیت میں یہ ہے کہ سب باز آ جائیں گے۔ لہذا کوئی رسول ایسا آنا چاہیے جس کے آنے کے بعد سب باز آ جائیں اور یہ رسول سب سے بڑا رسول ہوگا یعنی رسول اعظم، اور یہ خود حضرت جبریل علیہ السلام ہوں گے یہ تمنا ان کا مختصر مطلب، اور اس مطلب کے خلاف حدیث پڑھنا، گویا گھڑی ہوئی حدیث پڑھنا ہے۔ ان کے نزدیک یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے حالانکہ درحقیقت یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف نہیں بلکہ ان کے ایجاد کردہ معنی کے خلاف ہے۔

تیسری بات جو اس سلسلہ میں ہمیں عرض کرنی ہے وہ یہ کہ اس معیار پر تو قرآن مجید کی



بعض آیات بھی پوری نہیں اترتیں، مثلاً قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ قرآن مجید لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن ایک آیت میں ہے کہ:-

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا  
(المبقرہ: ۲۶)  
اللہ اس کے ذریعہ بہت سوں کو  
گمراہ کر دیتا ہے۔

یعنی قرآن مجید ذریعہ گمراہی بھی ہے اور یہ قرآنی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے کہ قرآن مجید لوگوں کو گمراہ کرے۔ لہذا یہ آیت معیار پر پوری نہیں اترتی تو اس آیت کے متعلق کیا کہیں۔

۲۔ قرآن مجید میں متعدد جگہ حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے ہر جگہ یہی ہے، کہ ابلیس فرشتہ تھا، مثلاً:-

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا  
لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ  
جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم  
کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا  
سوائے ابلیس کے۔  
(المبقرہ: ۳۲)

لہذا اس آیت اور اس جیسی اور کئی آیات سے ثابت ہوا کہ ابلیس فرشتہ تھا، یہ تعلیمات قرآنی، اب اس تعلیمات قرآنی کے خلاف ہمیں یہ آیت ملتی ہے۔

كَانَ مِنَ الْغَايَةِ (الکہف: ۵۰)  
ابلیس جنوں میں سے تھا،  
بتائیے کیا یہ آیت بھی قرآنی تعلیمات کے منافی ہونے کی وجہ سے جعلی ہو گئی؟

۳۔ اللہ تعالیٰ کا کام ہدایت کرنا ہے اور اس نے اپنے ذمہ اس کو فرض کر لیا ہے  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّا عَلَيْنَا لِلْهُدَىٰ  
(واللیل: ۱۲)  
ہدایت دینا ہمارے ذمہ واجب  
ہے۔

تو گویا تعلیمات قرآنی کا مسلمہ اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کرتا ہے گمراہ نہیں کرتا،  
اب یہ آیت سنئے:-

أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْجُرُوا مَنْ أَصَلَّ  
اللَّهُ (النساء: ۸۸)  
کیا تم اس شخص کو ہدایت کرنا چاہتے ہو  
جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا۔

گویا یہ آیت بھی معیار پر پوری نہیں اترتی اس لئے کہ اس میں اللہ کو گمراہ کرنے والا بتایا  
گیا ہے، اسی قسم کی یہ آیت ہے۔

وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّنَا يَجْعَلْ  
صَدْرَكَ ضَيِّقًا وَخَوْجًا كَأَنَّمَا  
اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے  
تو اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے



يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ - گویا ہدایت پر آنا اس کے لئے اتنا مشکل ہو

(الانعام :- ۱۲۵) جاتا ہے جتنا آسمان پر چڑھتا۔

یہ آیت بھی قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے بھلا وہ رحمن و رحیم اللہ، جو ہزار ہا انبیاء کو لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجے وہ ایسا کر سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو خود ہی ہدایت سے روک دے، اور ان کے سینے کو ایسا تنگ کر دے کہ ہدایت پر آنا ان کے لئے ناممکن ہو جائے۔

۵۔ قرآن مجید کی تعلیمات یہ ہیں :-

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ - (الشوریٰ :- ۱۱) اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں۔

یعنی وہ بے مثل ہے، لاثانی ہے، بے جسم ہے، اس کو جسم والوں سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ اب یہ آیت سنئے :-

بَلْ يَدَّ اِكْمَامُ مَبْسُوطَتَيْنِ (المائدہ :- ۶۴) اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ وہ کوئی مجسم رکھتا ہے جس میں ہماری طرح دو ہاتھ ہیں، لہذا یہ آیت سراسر شان الوہیت اور قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔ اب اس آیت کو کیا کہیں؟ کیا وہی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں جو ایسی حدیث کے متعلق برق صاحب استعمال فرما رہے ہیں۔ اس قسم کی تقریباً سب آیات پیش کی جاسکتی ہیں جو تعلیمات قرآنی کے خلاف نظر آتی ہیں تو کیا وہ اس مجوزہ معیار پر پوری نہ اترنے کے باعث جعلی کہی جاسکتی ہیں؟ اگر نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے تو پھر یہ معیار جعلی ہے، باطل ہے ایسا کلیہ بنانا محض دھوکہ ہے اور اگر ان آیات کا باوجود قرآنی تعلیمات کے منافی ہونے کے کوئی مقام ہے اور کوئی مطلب ہے تو وہی مقام اور وہی مطلب حدیث کے لئے بھی ہو سکتا ہے، یہ کیا کہ اگر آیت معیار پر نہ اترے تو تاویل کر کے اس کو تعلیمات قرآنی کے مطابق بنا لیا جائے، اور حدیث پوری نہ اترے تو اسے مسترد کر دیا جائے کیا یہ انصاف ہے؟

## ۲۔ برق صاحب کا دوسرا مجوزہ معیار

### قرآن مجید میں تحریف

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث قرآن مجید میں تحریف تسلیم کرتی ہو وہ جعلی ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ تحریف سے برق صاحب کی کیا مراد ہے؟ اگر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جو قرآن مجید تھا بعد میں اس میں تحریف ہو گئی تو اس تحریف کی خبر دینے والی حدیث یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو ہوگی نہیں کسی اور کا قول ہوگا، اور اس معیار کی



نہیں وہ قول آئے گا، نہ کہ حدیث، لہذا اس معیار سے حدیث کو پرکھنا کسی حالت میں صحیح نہیں ہو سکتا۔

اور اگر برق صاحب کا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں قرآن مجید میں تحریف ہوئی اور اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات منسوخ ہو گئیں۔ تو بیشک یہ چیز حدیث میں ملتی ہے۔ اور وہ حدیث صحیح ہے، یہ معیار صحیح نہیں وجہ یہ ہے کہ جس نبی نے یہ کہا کہ اس آیت کو قرآن مجید کی آیت سمجھو اور تلاوت کرتے رہو۔ اگر وہی نبی یہ کہے کہ اب یہ آیت منسوخ ہو گئی اس کی تلاوت منسوخ کر دو تو کیا وجہ ہے کہ ہم اسے سچا نہ سمجھیں۔ اگر آپ کہیں کہ نبی ایسا کہہ ہی نہیں سکتا یہ تو بعد میں لوگوں نے اس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ تو اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے، پھر اس معیار پر تو بعض آیات قرآنی بھی نہیں اترتیں، مثلاً:

مَا نُنْسخُ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِمْهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا اَوْ مِثْلَهَا۔ (البقرة ۱-۱۰۶)

جب ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا مہلّا دیتے ہیں، تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل نازل کر دیتے ہیں۔

اگر آپ یہ فرمائیں کہ اس سے مراد قرآنی آیت نہیں، بلکہ شریعت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر آپ یہ مان لیجئے کہ تورات و انجیل منسوخ ہو گئیں یا مہلّا دی گئیں۔ لیکن آپ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ آپ تو یہ کہتے ہیں کہ تورات و انجیل محفوظ ہیں اور غیر منسوخ ہیں اور صرف تورات یا انجیل پر ایمان لا کر، اور اس پر عمل کر کے انسان نجات پا سکتا ہے، قرآن مجید پر ایمان لانے کی اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب اس اشکال کو آپ کیسے دفع کریں گے۔ پھر یہ بھی تو بتائیے کہ آیت کے معنی شریعت کرنا کس دلیل سے ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو شریعت کا لفظ معلوم نہ تھا جو آیت کا لفظ استعمال کیا۔ لہذا اس بات کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آیت سے مراد قرآنی آیت ہے اور یہ کہ وہ منسوخ بھی ہو سکتی ہے، اور مہلّا فی بھیجی جاسکتی ہے تو کیا اب اس آیت کو بھی جعلی کہہ سکتے ہیں جس سے قرآنی آیات کا نسخ اور طاق نسیان ہونا ثابت ہوتا ہے، دوسری آیت ملاحظہ فرمائیے:-

سَنُنْفِثُ غَمًّا فَلاَ تَنْسَىٰ هَ الْاَمَّا سَنَآءَ اللّٰهِ

(اے رسول) ہم آپ کو ٹپھائیں گے پس آپ نہیں بھولیں گے سوائے اس کے جو اللہ ہی آپ کو مہلانا چاہے۔

(الاعلیٰ ۱-۷۶)

اس آیت سے بھی قرآنی آیات میں کمی بیشی ہونے کا امکان پایا جاتا ہے، اب بتائیے کیا یہ آیت بھی جعلی ہے کیونکہ اس سے تحریف کا امکان ثابت ہوتا ہے، اس قسم کی اور بھی آیات



میں جن سے قرآنی آیات کا نسخ ثابت ہوتا ہے تو کیا ان سب کو جعلی کہا جائے گا۔ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا یہ معیار غلط ہے؟

آخر میں ہم اتنا اور عرض کرتے ہیں کہ اصطلاح شریعت میں تحریف اس تغیر و تبدل کا نام ہے جو بعض لوگ کتب الہیہ میں کرتے رہتے ہیں لیکن جو تغیر و تبدل اللہ تبارک و تعالیٰ خود کرے وہ تحریف کی تعریف میں نہیں آتا۔ لہذا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں آیت یا حکم منسوخ کر دیا تو یہ تحریف نہ ہوگی۔ اس کو تحریف کہنا ہی غلطی ہے۔

## ۳۔ برق صاحب کا تیسرا مجوزہ معیار

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کی توہین

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی زوجہ مطہرہ رف یا کسی صحابی کی توہین ہو وہ حدیث موضوع ہوگی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر یہ معیار درست ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس معیار پر قرآن مجید پورا اترتا ہے، ہرگز نہیں ملاحظہ فرمائیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۖ اَنْ جَاءَكَ الْاَوْحٰی ۚ

رسول نے تھوڑی چڑھائی اور منہ پھیر لیا جب کہ

(عبس: ۱، ۲)

بتائیے کیا اس آیت میں شان رسالت کی توہین نہیں کہ اخلاق کریمانہ کے مجسمہ کو بد اخلاق بتایا گیا ہے۔ پھر یہ آیت قرآنی تعلیمات کے بھی خلاف ہے، قرآن مجید کی تعلیم اس آیت میں بیان ہوئی ہے جو درج ذیل ہے:-

وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلِقْتَ عَظِيْمًا ۚ

اور (اے رسول!) آپ کے اخلاق

(القلم: ۲)

لہذا عبس کی مذکورہ بالا آیت دو طرح سے محل نظر ہے اول توہین رسول کے لحاظ سے دوم قرآنی

تعلیم یعنی سورہ قلم کی مذکورہ بالا آیت سے متعارض ہونے کے لحاظ سے۔

۲۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۚ

ہم نے آپ کو فتح مبین دے دی ہے تاکہ

لِيُخْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ

اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ



وَنَبِّكَ وَمَا تَأْخُذُكَ (الفطحة: ۲۰۱) معاف کر دے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَأَسْتَغْفِرُ لَكَ ذَنْبَكَ (محمد: ۱۹) (اے رسول!) اپنے گناہوں کی معافی مانگیے۔

تیسری جگہ ارشاد ہے:-

وَأَسْتَغْفِرُكَ إِنَّكَ كَانَتْ تَوَّابًا (اے رسول!) اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیے۔ بیشک

(اذا جاءك: ۳) وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

ان تینوں آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ گناہ گار تھے کیا یہ توہین نہیں؟ اگر ہے تو بتائیے ان آیات کے متعلق کیا خیال ہے؟

## حضرت آدم علیہ السلام کی توہین

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

عَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (طہ: ۱۲۰) آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور گمراہ ہو گئے۔

وَلَمْ يَجِدْ لَنَا عِصْمًا (طہ: ۱۱۵) ہم نے آدم میں عزم نہیں پایا۔

## حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توہین

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑ ڈالے تو کفار نے پوچھا:-

أَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا يَا إِبْرَاهِيمَ يَا

إِبْرَاهِيمُ (الانبیاء: ۶۲) معاملہ تم نے کیا ہے؟

ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:-

بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا (الانبیاء: ۶۳)

نہیں، بلکہ یہ کام اس بڑے بت نے کیا ہے۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے خلاف واقعہ بات کہی، بتائیے ابراہیم علیہ السلام کی طرف کذب کی نسبت کرنا ان کی توہین نہیں؟

## حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توہین

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھا۔ ایک ان کی قوم کا فرد تھا

اور دوسرا دشمن قوم کا فرد تھا۔



فَاسْتَعَاثَ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ  
عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَرَهُ  
مُوسَى فَقَطَّعَ عَلَيْهِ قَالَ هَذَا  
مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ  
ان کی قوم کے آدمی نے موسیٰ علیہ السلام کی  
دشمن قوم کے آدمی کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام  
سے فریاد کی، پس موسیٰ علیہ السلام نے اس کی ایساٹکا  
ملا کہ اس کا کام تمام ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے  
کہا یہ شیطانی کام ہے۔ (العنصص ۱۵)

گویا موسیٰ علیہ السلام حیثیت قومی کے جذبہ سے سرشار تھے، بے سوچے سمجھے، بغیر تحقیق کئے انہوں  
نے دوسرے آدمی کو مار ڈالا، بعد میں پھپھٹائے اور اپنے اس فعل کو شیطانی فعل سمجھے، کیا اس آیت میں  
ان کی توہین نہیں ہے؟ اور سنئے:-

وَالْقُلُوبُ لِلْوَاحِ وَ أَخَذَ بِأُخْسِ  
أَخِيصِي بِمَجْرُكَةِ الْيَسِي  
موسیٰ علیہ السلام نے تورات کو پٹخ دیا  
اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر  
اپنی طرف گھسیٹا۔ (الاعراف ۱۵۶)

حضرت ہارون علیہ السلام بالکل بے قصور تھے، انہوں نے کہا:-  
لَا تَأْخُذْ بِلِحْظِي وَلَا بِأُخْسِي  
میرے سر اور داڑھی کو نہ پکڑئیے۔  
(طہ ۹۲)

میں بالکل بے قصور ہوں، انہوں نے میرا کھانا مانا، اور بھڑا پوچھا، وغیرہ وغیرہ۔ کیسے کیا ان آیات میں موسیٰ علیہ  
السلام کی توہین نہیں ہے کہ غصہ میں اگر کتاب الہی کو دے پٹھا، اور اللہ کے ایک مقدس نبی کو مارا، اس کی  
بے عزتی کی اور یہ سب کچھ بغیر تحقیق و تفتیش کے کر ڈالا۔

## حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کی توہین

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

وَمَا فَخَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَذِيبِ وَخَدُّوا  
لَهُ مُسْتَجِدًّا (یوسف ۱۰۰)  
یوسف علیہ السلام نے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور وہ  
سب حضرت یوسف کے لئے سجدہ میں گر گئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ماں باپ نے بھی بیٹے کو سجدہ کیا۔ پھر حضرت یوسف  
علیہ السلام نے فرمایا:-

يَا بَنَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ  
لے ابا جان یہ میرے خواب کی تعبیر  
ہے۔ (یوسف ۱۰۰)

بچپن میں انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ گیارہ تارے اور سورج اور چاند ان کو سجدہ کر رہے ہیں



تو یہ گویا اس خواب کی تعبیر تھی، سورج سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام، چاند سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ محترمہ اور گیارہ تاروں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی تھے، ایک رسول نے دوسرے رسول کو سجدہ کیا، بلکہ رسول نے اپنے بیٹے کو سجدہ کیا، کیا یہ ان انبیاء کی توہین نہیں کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ ماضی میں جو سجدہ بادشاہ کو کیا جاتا تھا، اس کا ماخذ یہی قرآنی آیات تھیں۔

## خلاصہ

الغرض ان آیات اور ان جیسی آیات سے توہینِ انبیاء ظاہر ہوتی ہے۔ بتائیے ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے۔

## ازواجِ مطہرات کی توہین

دو ازواجِ مطہرات کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے:-  
 اِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا (التحریم: ۴)  
 اگر تم توبہ کر دو تو (اچھا ہے) اس لئے کہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔

یہ وہ خواتین ہیں جن کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے:-  
 لَسْتُ كَاحِدٍ مِّنَ النِّسَاءِ (الاحزاب: ۳۲)  
 عورتوں میں سے کوئی ایک بھی تمہاری مثل نہیں۔

یہ وہ جماعت ہے جو تمام عورتوں سے افضل ہے لیکن سورۃ تحریم کی مندرجہ بالا آیت سے ان میں سے بعض کے قلوب کی کجی ظاہر ہوتی ہے کیا یہ ان ازواجِ مطہرات کی توہین نہیں اگر توہین ہے تو پھر اس آیت کے متعلق کیا کہا جائے؟ ظاہر ہے کہ آیت کے متعلق توہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ برقِ صاحب کا مجوزہ معیار غلط ہے۔

## صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی توہین

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:-  
 وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدًا لَا  
 اَذْتَحِسُونَهُمْ يَارِثِينَ حَتَّىٰ اِذَا  
 فِئْتَلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاُمَمِ وَ  
 اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا، جب تم اس کے  
 حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں  
 تک کہ جب تم نے بزدلی دکھائی، اور حکمِ ہر



عَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا أَرْسَلَكُمْ مِّنَّا  
تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا  
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ  
(ال عمران: ۱۵۲)

یہ جنگ اُحد کا بیان ہے اور اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب مسلمین ہی کے متعلق ہے اس لئے کہ منافقین تو لڑائی میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ تو لڑائی سے پہلے ہی مدینہ منورہ واپس چلے گئے تھے اور اس نافرمانی اور دنیا طلبی کی وجہ سے جو مصیبت آئی تھی اس میں وہ شریک نہیں تھے۔ اس مصیبت کا ذکر مذکورہ بالا الفاظ کے آگے سورہ آل عمران ہی میں بیان ہوا ہے۔

۲۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا لَمِنَکُمْ یَوْمَ  
التَّغٰی الْجَمْعِ اِثْمًا اَسْتَزَلَّوْهُمُ  
الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا و  
لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ  
غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝ (ال عمران: ۱۵۵)

تم میں سے جن لوگوں نے میدان جنگ سے منہ موڑا، یہ اس لئے ہوا کہ شیطان نے ان کے بعض گناہوں کے سبب ان کو پھسلا دیا اور تحقیق اللہ نے انہیں معاف کر دیا بے شک اللہ غفور اور حلیم ہے۔

گناہ کئے، شیطان نے بہکایا، میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، یہ سب کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ اور پھر مزا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر توبہ کے معاف کر دیا، اور برق صاحب یہ فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ معاف ہی نہیں کرتا۔ اگر آپ کہیں کہ سزا دے کر معاف کر دیا تو پھر وہ معافی ہی کیا ہوئی، سزا دے کر معاف کرنا بھی کوئی معافی ہے۔

۳۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ  
الْفَوْ اَمْنَةً نَّعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَةً  
مِّنْکُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهْتَرَتْهُمْ  
اَنْفُسُهُمْ یُظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ  
الْحَقِّ ظَنِّ الْجَآهِلِیَّتِی

(ال عمران: ۱۵۴)

وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا  
انْفَضُّوْا اِلَیْهَا وَ تَرٰکُوْا قُلُوبًا  
رَّاسِیًا  
(الجمعة: ۱۱)

۵۔ وَ یَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ

اور یہ لوگ جب کوئی تجارت یا تماشہ دیکھتے ہیں تو اس کی طرف چلے جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

جب حنین کی لڑائی میں تم نے اپنی کثرت



كَثَرْتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا  
..... ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۝

(التوبہ: ۲۵)

پر ناز کیا اور پھر کوئی چیز تمہارے  
کام نہ آئی ۔ . . . . پھر تم پیٹھ پھیر  
کر بھاگے ۔

۶۔ إِنَّ فِرْيَاقَاتِ الْمُؤْمِنِينَ  
لَكَارِهُونَ ۝ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ  
بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَانَسَائِيسَاقُونَ  
إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يُنْظَرُونَ ۝

(الانفال: ۶، ۵)

مؤمنین کی ایک جماعت جہاد سے نفرت کرتی  
تھی ، وہ حق ظاہر پر جانے کے بعد حق کے  
معاملہ میں اے رسول آپ سے جھگڑا کر رہے  
تھے ، گویا ان کو ان کی آنکھوں دیکھے موت کے  
منہ میں دھکیلا جا رہا تھا ۔

یہ بے جنگ بدر میں صحابہ کی ایک جماعت کا نقشہ ، برخلاف اس کے حدیث میں ہے ، کہ  
صحابہؓ نے کہا ، ہم سمندر میں کود پڑیں گے ، یہ کریں گے ، وہ کریں گے ، بتائیے کون سی چیز ان دونوں  
میں صحابہ کے شایانِ شان ہے ؟

(یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ منافقین اس جنگ تک وجود میں نہیں آئے تھے)  
۷۔ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ  
تَخْتَلُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ  
عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ  
بَاشِرُوهُمْ وَأَبْغُوا مَا كَتَبَ  
اللَّهُ لَكُمْ ۝

(البقرہ: ۱۸۷)

اس کی جستجو بھی کر سکتے ہو ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام روزہ کی حالت میں جماع کر بیٹھتے تھے کیا اس آیت میں  
توہین صحابہ نہیں ؟ اگر ہے تو کیا یہ آیت معیار پر پوری اترتی ہے ۔

۸۔ فَأُذِيبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ  
فَقَاتِلْ إِنَّنَا هُمْ تَائِدُونَ ۝  
(المائدہ: ۲۴)

موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نے کہا ، اے  
موسیٰ تم جاؤ اور تمہارا رب ، تم دونوں ٹوڑے ،  
ہم توہین بیٹھے ہیں ۔

۹۔ اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا  
لَهُمُ الْإِلَهَةُ قَالِ إِنَّكُمْ  
قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ۝

(الاعراف: ۱۳۸)

موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نے ایک قوم کو بت  
پوجتے دیکھ کر کہا ، کہ ہمارے لئے بھی ایسا مجھ  
بنادیکھتے جیسا ان کا معبود ہے موسیٰ علیہ السلام  
نے کہا تم جاہل ہو ۔



۱۰۔ موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب نے پھڑے کی پوجا کی ، ہارون علیہ السلام نے منع کیا تو کہنے لگے ۔

لَنْ تَبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِيْنَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ  
إِلَيْنَا مُوسَىٰ ه (طہ :- ۹۱) ہم تو اس کی پوجا برگزینیں چھوڑیں گے جب تک  
موسیٰ (علیہ السلام) نہ آجائیں ۔

ایک رسول موجود ہے اس پر ایمان بھی لاپکے ہیں ، لیکن اس کا کہنا نہیں مانتے اور پھڑے کی پوجا میں مصروف ہیں ۔ کیا اس آیت میں نبیوں کی محبت میں رہنے والی جماعت کی توہین نہیں ہے ۔

## خُلاصہ

کیا مندرجہ بالا آیات سے صحابہ کی توہین نہیں ہوتی ، اگر یہ آیات صحیح ہیں تو کیا وجہ کسی حدیث میں کوئی ذرا سی بات بھی نظر آجائے تو اسے جعلی سمجھا جائے ۔ الغرض اس معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں ، لہذا یہ معیار ہی باطل ہے ۔ نہ کہ آیات قرآنی ۔

## ۲۔ برق صاحب کا چوتھا مجوزہ معیار

### حقائقِ کونیہ کے خلاف ہونا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث حقائقِ کونیہ کے خلاف ہوگی وہ موضوع ہوگی ۔ اس سلسلہ میں بھی ہم چند آیات قرآنی پیش کرتے ہیں ، ملاحظہ فرمائیے :-  
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلٰى  
اِبْرٰهِيْمَ ه (الانبیاء :- ۶۹) اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا ، اور سلامتی  
دالی بن جا ....

آگ کا کام جلانا ہے اس کی خصوصیت گرم ہونا ہے ، لہذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی حقیقتِ کونیہ کے خلاف ٹھنڈی ہو اور جلانے نہیں لہذا یہ آیت معیار پر پوری نہیں اترتی ۔

۲۔ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ  
وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ه (الطلاق :- ۱۲) اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے سات  
آسمان بنائے اور ان ہی کے مثل (سات)  
زمینیں بنائیں ۔

چونکہ زمین صرف ایک ہے ، لہذا اس آیت کے متعلق کیا کہیں ؟ ۔

۳۔ يَخْلُقُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (ملک :- ۳) اللہ تعالیٰ نے سات آسمان اوپر تلے بنائے ۔



بماظ جدید سائنس آسمان کوئی چیز نہیں، محض حدنگاہ ہے، لہذا اس کا سات ہونا  
کی معنی رکھتا ہے؟

۴۔ وَجَدَهَا تَغْشَىٰ فِي غَيْبٍ  
حَبِثَةٍ (الکہف: ۸۶)  
ذوالقرنین نے سورج کو کیچڑ کے ایک چشمہ میں  
ڈوبتے ہوئے پایا۔

کیا یہ حقیقت ہے؟

۵۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھی سے کہا:-

اتِّخَذَ آدَنَّا (الکہف: ۶۲)  
ہمارا ناشتہ لاؤ۔

ان کے ساتھی نے جواب دیا۔

وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا  
(الکہف: ۶۳)  
بڑا عجیب و غریب واقعہ ہوا کہ وہ بھنی ہوئی ٹھیلی  
(نندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی۔

۶۔ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَّا يَلْهَبُ مِزْ  
خَشِيَةِ اللَّهِ (البقرة: ۷۴)  
اور بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے  
گڑ پڑتے ہیں۔

کیا پتھروں میں احساس ہوتا ہے کیا پتھر کا ڈرنا حقیقت کو نبیہ ہے؟  
برق صاحب! یہ ہیں قرآنی آیات اور وہ ہے آپ کا معیار۔

## نتیجہ

اب اگر معیار کو صحیح مانیں تو بڑی مشکل ہوتی ہے، کہ قرآنی آیات مشکوک ٹھہرتی ہیں لہذا یہ معیار  
ہی غلط ہے، اگر آیات کی تاویل کی جائے، تو پھر یہی چیز حدیث کے سلسلہ میں بھی قابل عمل ہونی چاہیے  
خواہ مخواہ فرضی معیاروں پر کتنا مناسب ہے۔

## ۵۔ برق صاحب کا پانچواں مجوزہ معیار

### انسانی فطرت کا ٹھٹھانا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث انسانی فطرت کے خلاف ہو وہ موضوع ہوگی اس

سلسلہ میں چند آیات قرآنی ملاحظہ فرمائیں:-

۱۔ ذَبَّ أَنْ يَكُونَ لِي عِشْرَةً

حضرت زکریا عرض کرتے ہیں، اے میرے

کانتِ امی! اتنی عاقبت! اَدَقْدَ بَلَغْتُ

رب میرے لڑکا کیسے پیدا ہوگا، حالانکہ میری



مِنَ الْكِبَرِ عِتْيَا ۖ قَالَ كَذَلِكَ قَالَ  
رَبُّكَ هُوَ عَلَىٰ هَٰئِهِ ۖ

بیوی بانجھ ہے، اور میں بے حد بوڑھا ہو گیا ہوں  
حتیٰ کہ اگر کیا ہوں، اللہ نے فرمایا، ایسی حالت

(مسیحہ: ۸-۹) میں ہی ہوگا، یہ مجھ پر آسان ہے۔

الغرض حضرت یحییٰ علیہ السلام تولد ہوئے۔ یہ پیدائش انسانی فطرت کے خلاف ہے، مرد  
بوڑھا ہو اور عورت بانجھ ہو تو بچہ پیدا ہونا ناممکن ہے۔ لہذا یہ آیات معیار پر پوری نہیں اترتی  
۲۔ حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دی جاتی ہے تو وہ کہتی ہیں۔

أَنِّي يَكُونُ لِي غُلَامٌ ۖ وَلَمْ يَمَسِّنِي  
بَشَرٌ ۖ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۖ قَالَ كَذَلِكَ  
قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىٰ هَٰئِهِ ۖ

میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے، حالانکہ مجھے کسی  
مرد نے نہ جائز طریقہ سے (لمس) لگا یا اور نہ میں بیکار  
ہوں فرشتے نے کہا اسی حالت میں ہوگا تیرے رب نے

(مسیحہ: ۲۰، ۲۱) کہا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے۔

بغیر باپ کے بچہ پیدا ہونا یہ بھی فطرت انسانی کے خلاف ہے :-  
۳۔ قوم کے لوگ حضرت مریم کے پاس آئے اور انہیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا، حضرت مریم نے  
شیرخوار بچے کی طرف اشارہ کر دیا، کہ اس سے پوچھو، قوم کہنے لگی۔

كَيْفَ نَكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ  
صَبِيًّا ۖ (مسیحہ: ۲۹)

ہم گھوڑے میں جھولنے والے بچے سے کیسے  
بات کر سکتے ہیں۔

اس بچہ نے کہا :-

إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ (مسیحہ: ۳۰) میں اللہ کا بندہ ہوں۔

نوپائیدہ بچہ کا بولنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

۴۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دی گئی تو ان کی بیوی بولیں :-  
يَا زَيْلَتِي ۖ أَلِدُوا ۖ وَأَنَا عَجُوزٌ ۖ وَهَٰذَا الْبَلِيُّ  
شَيْخًا ۖ (دھود: ۷۲)

ہائے انیسویں کی میں جنوں کی حالانکہ میں بڑھیا بوڑھی ہوں  
اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھے بچے ہیں۔

پھر اس بشارت کے مطابق حضرت اسحاق علیہ السلام تولد ہوئے جب مرد و عورت دونوں  
بوڑھے ہوں تو ان کے اولاد ہونا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

## نتیجہ

چونکہ اس معیار سے قرآنی آیات پر زد پڑتی ہے لہذا یہ معیار بھی باطل ہے اور اس پر حدیث  
کو پرکھنا لغو ہے،



## ۶۔ برق صاحب کا چھٹا مجوزہ معیار

### عقل، تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث عقل، تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو وہ موضوع ہوگی اس سلسلہ میں چند آیات بینات ملاحظہ ہوں:-

۱۔ قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمُ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ أَنَا زَيْدٌ أَوْ فُلَانٌ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَافِلًا  
الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ  
أَنْ يَنْزِلَهُ إِلَيْكَ طَوْفًا فَلَمَّا  
سَأَلَهُ مُسْتَقَرًّا أَعِنْدَ هَٰذَا قَالَ  
هَٰذَا مِنْ فَضْلِي ۚ  
رالنمل : ۲۰

اس شخص نے جس کو کتاب کا کچھ علم تھا، کہا کہ میں بلکہ سب کا تخت اتنی دیر میں لے آؤں گا۔ جتنی دیر میں آپ کی نگاہ واپس آئے (اور اتنی دیر میں وہ آگیا) تو اس کو اپنے پاس دیکھ کر حضرت سیمان علیہ السلام نے فرمایا، یہ میرے رب کا فضل ہے۔

یہ عقل و تجربہ کے خلاف ہے، کہ ہلکے چھپکنے میں ہزاروں میل دور سے ایک وزنی چیز منتقل ہو جائے گویا یہ آیت بھی مجوزہ معیار پر پوری نہیں اترتی، اب اس کے متعلق کیا کہا جائے۔

۲۔ وَإِذْ زَيْنَ لَهْمُ الشَّيْطَانِ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَأَتْهُ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ وَخَالَ إِثْقَالِ بَرٍّ مِّنْكُمْ إِنِّي أَلَمُ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ  
رالأنفال : ۲۸

جب شیطان نے کافروں کے اعمال ان کو مزین کر کے دکھائے، اور کہا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، میں تمہارا ساتھی ہوں، لیکن جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو اٹھے پاؤں واپس ہو گیا اور کہا میں تم سے بیزار ہوں۔ میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے، میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔

شیطان کا سامنے آنا، اور بات کرنا، تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے، پھر اس کا اللہ سے ڈرنا بھی حیرت انگیز ہے۔ اس کو تو قیامت تک کے لئے از روئے قرآن مجید مہلت دے دی گئی ہے، لہذا اس کا خوف الہی سے ڈر کر بھاگنا خلاف عقل ہے اور کافروں سے اس کا بیزار ہونا بھی خلاف عقل ہے، اس کے اصلی دوست تو کافر ہی ہوتے ہیں۔

۳۔ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ  
اور جب تمہارے رب نے اولادِ آدمؑ کی



مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ  
 أَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ  
 بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَنَّا نَقُولُوا  
 يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا  
 غَافِلِينَ ۝

بچتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے  
 خود ان کے مقابلہ میں گواہی طلب کی کہ کیا میں  
 تمہارا رب نہیں ہوں سب نے کہا کیوں نہیں  
 بے شک تو ہمارا رب ہے ہم گواہ ہیں۔ (یہ اس لئے  
 کیا کہ کہیں روز قیامت تم یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس  
 سے غافل تھے۔

(الاعراف: ۱۰۲)

یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ پیدائش سے پہلے اقرار کرا لیا، اس اقرار سے کیا فائدہ؟ یہ اقرار  
 کس کو یاد ہے؟ پھر یہ بھی خلاف عقل ہے کہ اولاد آدم جو ابھی وجود میں نہیں آئی تھی ان کی پچھلی کہاں  
 سے آگئیں کہ ان کی پٹھوں سے تمام اولاد کو نکال لیا۔

۴۔ وَكَوْتَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ يَمُوتُونَ  
 كَفَرًا وَالْمَلَكُ ثَلَاثَةٌ يَصْرَفُونَ دُجُوهَهُمْ  
 وَآدْبَارَهُمْ وَذُؤُودُهُمْ أَهْذَابَ  
 الْحَرِّ يَتَوَفَّى

اور اگر تم دیکھو جس وقت فرشتے  
 کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، اور ان  
 کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے جاتے  
 ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ جلنے کا مزا  
 دیکھو۔

(الانفال: ۵۰)

یہ آیت بھی مشاہدہ کے خلاف ہے نہ کبھی یہ آواز سنائی دیتی ہے نہ فرشتے دکھائی دیتے ہیں اگر وہ  
 مارتے تو کیا آواز نہیں آتی، مارا جائے اور آواز نہ ہو یہ خلاف عقل و تجربہ ہے۔

## نتیجہ

یہ قرآنی آیات ہیں جو اس معیار پر پوری نہیں اترتیں، لہذا یہ معیار غلط ہے، نہ کہ قرآنی آیات،  
 ہماری عقل اور ہمارا تجربہ حقیقت میں کوئی چیز نہیں، جو شخص جانتا ہے وہ جانتا ہے، اور جو نہیں جانتا اس  
 کی سمجھ میں اس جاننے والے کی بات نہیں آسکتی، بذریعہ لاسکلی جو ہزاروں میل کی بات ہم سن لیتے  
 ہیں کیا ہمارے ابدال کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور آج بھی بہت سی باتیں  
 ایسی ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مثلاً پانی کے ایک قطرہ میں کروڑوں جراثیم کا ہونا، یہ عقل میں آنے والی  
 بات نہیں، نہ اس کا ہم نے کبھی مشاہدہ کیا۔ لہذا یہ عقل کے بھی خلاف ہے اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے،  
 محض چند فضلاء پر یقین کر کے ہم اعتبار کر لیتے ہیں کہ واقعی ایسا ہو گا۔ اور جب فضلا کے علم و فضل پر اعتبار کر  
 کے ہم ان کی خلاف عقل و مشاہدہ عجیب و غریب بات تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر اس رسول کی کوئی خلاف  
 عقل و مشاہدہ بات جس رسول پر ہم ایمان لائے ہیں کیوں نہ تسلیم کریں، ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل کی



دہائی ہاں تک نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم مشاہدہ کر ہی نہ سکتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا تجربہ غلط ہو۔ لہذا صرف ان باتوں کی بنا پر حدیث کی یا رسول کی تکذیب نہیں کر سکتے۔ نہ پانی کے ایک قطرہ میں کروڑوں جراثیم کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے نہ ہماری عقل میں آتا ہے لیکن پھر بھی ہم اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں یہ بھی ایک قسم کا ایمان بالغیب ہے اور جب کسی حکیم یا سائنس دان کی بات پر ایمان بالغیب ہو سکتا ہے تو پھر رسول کی بات پر ایمان بالغیب کیوں نہ لایا جائے۔ کیوں اس کی بات کو عقل و تجربہ کی میزان میں رکھ کر تو لے لگیں، کب یہ انصاف ہے۔ رسول پر ایمان بالغیب ہی ذریعہ ہدایت و نجات ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا ہم سے مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ  
يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ

اللہ کی کتاب متقی لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت  
و نجات ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو غیب پر

ایمان لاتے ہیں۔

(البقرہ ۱-۲، ۳)

اب سنیے مشاہدہ کی بات، ہم ریل میں سفر کرتے ہیں تو نزدیک کی چیزیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہماری مخالف سمت میں مہاگ رہی ہیں، یہ نظر کا دھوکہ ہے پھر دور کی چیزیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہی سمت جا رہی ہیں حالانکہ درحقیقت وہ بھی ہماری مخالف سمت میں ہی جاتی ہیں، لیکن مشاہدہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اب اگر کوئی سائنس دان ہم سے یہ کہے کہ وہ دور کی چیزیں بھی مخالف سمت میں جا رہی ہیں تو کیا ہم اس کی تکذیب کریں کیونکہ ہمارے مشاہدہ کے خلاف ہے۔ نہیں بلکہ حقیقت کو جاننے والے کئی بات ماننی چاہئے۔ مشاہدہ غلط ہو سکتا ہے، آنکھیں خطا کر سکتی ہیں۔ لہذا ہم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف مشاہدہ بات کو بھی تسلیم کریں گے، اور ایمان اسی کا نام ہے، اس کے علاوہ کفر ہی کفر ہے۔

اسی طرح جب ہم کہیں جاتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند بھی ہمارے ساتھ چل رہا ہے یہ بھی آنکھ کی خطا ہے۔ اسی طرح جب بادل چاند کے پیچھے سے گزرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند دوڑ رہا ہے، اور بادل ساکن ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے، دو مساوی خطوط علیحدہ علیحدہ کچھ فاصلے پر کھینچے جائیں اور پھر ان میں سے ایک کے پاس ایک بہت لمبا خط کھینچا جائے تو یہ خط اپنے دوسرے مساوی خط سے چھوٹا معلوم ہوگا۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ رگستان میں سراب کا نظر آنا بھی محض دھوکا ہے۔ غرض یہ کہ اس قسم کی خطائیں ہیں جو آنکھ سے سرزد ہوتی ہیں، مشاہدہ غلط بھی ہو سکتا ہے لہذا محض مشاہدہ کی خاطر ہم رسول جیسے خبر صادق کی خبر پر شبہ کرنے لگیں یہ کسی طرح بھی ایمان کی شان نہیں۔ اس تمام بحث سے ثابت ہوا کہ یہ معیار بھی غلط ہے اور اس معیار پر حدیث کو پرکھنا

لفو و لایینی ہے



## ۱۔ برق صاحب کا ساتواں مجوزہ معیار

### مسلمہ تاریخی واقعات کی تردید

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث کسی مسلمہ تاریخی واقعہ کی تردید کرتی ہو وہ موضوع ہے اس سلسلہ میں قرآنی آیات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ یہ مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب رسولوں کے آخر میں آئے لیکن قرآن کہتا ہے:-

هَذَا نَذِيرٌ مِّنَ النَّذِيرِ الْأُولَىٰ

یہ پہلے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر

ہیں۔

(النجم: ۱-۵۶)

۲۔ کوہ طور آج بھی موجود ہے لیکن قرآن مجید کہتا ہے:-

جَعَلْنَاهُ دَكَّاءَ (الاعراف: ۱۴۳)

تجلیاتِ الہی نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔

۳۔ فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِّنْ جَنَّتٍ وَ

ہم نے قوم فرعون کو باغات، چشے اور

عُيُونٍ ۚ وَكُنُوزٍ ۚ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ

خزانوں اور محلات سے نکال کر باہر کر

كَذَٰلِكَ ۚ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي

دیا۔ اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث

إِسْرَآئِيلَ ۚ (الشعراء: ۵۷ تا ۵۹)

بنا دیا۔

بنی اسرائیل تو مصر چھوڑ کر چلے آئے تھے، پھر وہ وارث کیسے ہو گئے؟ یہ تاریخ کے خلاف ہے۔

۵۔ أَوَلَمْ نَأْتِكُمْ مِّنْ مَّصِيبَةٍ قَدْ أَصَابَتْكُمْ

جو نقصان کا قردوں سے تمہیں پہنچا تم اس سے

مَقْتُلُهُمَ (الاعراف: ۱۴۵)

دگنا انہیں پہنچا چکے ہو۔

یہ مسلمہ تاریخی واقعہ ہے کہ جنگ بدر میں نہر کا فرقتل ہوئے اور جنگ احد میں نہر کا فرقتل ہوئے

یعنی دونوں کا نقصان برابر تھا۔ لیکن قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کافروں کا نقصان دو گنا بتاتی ہے لہذا

یہ آیت مسلمہ تاریخی واقعہ کے خلاف ہے اب بتائیے اس آیت کے متعلق کیا کہیں؟

کیونکہ اس معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں، لہذا یہ معیار بھی باطل ہے، تاریخ غلط ہو سکتی

ہے۔ لیکن قرآن و حدیث غلط نہیں ہو سکتے۔





## ۸۔ برق صاحب کا آٹھواں مجوزہ معیار

اسلام کے اہم اصولوں مثلاً جہاد و ایثار وغیرہ کی منزلت گھٹاتی ہو

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث سے جہاد وغیرہ کی منزلت میں فرق آتا ہے وہ حدیث جعلی ہے اس سلسلہ میں قرآنی آیات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ اللَّغْوِ مُعَصِّمُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ أَلَّا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفَيْءَ دُونَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (المؤمنون ۱-۱۱)

بے شک ایمان والے فلاح پائیں گے، وہ جو نماز میں خشوع کرتے ہیں، اور لغو کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور وہ لوگ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے اور اپنی لونڈیوں کے، کیونکہ ان سے ایسا کرنے میں کوئی ملامت نہیں، اور ان کے علاوہ کسی دوسری عورت سے کرنے والے گنہ گار ہیں، اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرتے ہیں، اور وہ جو اپنی مسازدوں کی حفاظت کرتے ہیں یہ ہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، اور یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات میں کہیں جہاد کا ذکر نہیں اور باوجود اس کے جنت الفردوس کا وعدہ ہے کیونکہ یہ آیات جہاد کی اہمیت گھٹاتی ہیں لہذا ان کے متعلق کیا کہا جائے۔

۲۔ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۝

جو لوگ ہمیشہ نماز ادا کرتے رہتے ہیں اور جن لوگوں کے مال میں سائل اور محروم کے لئے حصے مقرر ہیں، اور جو لوگ یوم آخرت کی تصدیق کرتے ہیں، اور جو لوگ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے



ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب  
غیر ناموس ہے، اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں  
کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں  
اور لونڈیوں کے، ان کے معاملہ میں ان پر  
کوئی ملامت نہیں، اور ان کے علاوہ تلاش  
کرنے والے گنہ گار ہیں، اور جو اپنی مائتوں  
اور عہدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی  
شہادتوں پر قائم رہتے ہیں، اور جو اپنی  
منہ ز کی حفاظت کرتے ہیں، یہ  
لوگ باغوں میں عزت کے ساتھ  
رہیں گے۔

إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ  
وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ ذُنُوبِهِمْ غَافِلُونَ  
الَّذِينَ آذَوْا حُرَّهُمْ وَإِذَا مَلَكَتِ  
أَيْمَانُهُمْ فَأَنَّهُمْ مُّوَدَّعُونَ  
فَمَنْ أَتَّبَعْنِي أَتَّبَعَكَ فَأُولَٰئِكَ  
هُمُ الْعَادُونَ وَالَّذِينَ هُمْ  
عَنْ أَيْمَانِهِمْ فَاعْتَدُوا  
وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ  
وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ  
أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَّمُونَ

(المعارج: ۲۳ تا ۳۵)

ان آیات میں جہاد کی طرف اشارہ تک نہیں، پھر بھی جنت کا وعدہ ہے  
اور جن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر  
عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب  
جانبوں سے بات کرتے ہیں تو صاحب  
سلامت کی بات کہتے ہیں، راتوں کو نماز پڑھتے  
ہیں، اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہم کو  
عذاب دوزخ سے بچا، اس کا عذاب بہت  
بڑا ہے اور وہ لوگ جو جب خرچ کرتے  
ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے  
ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں  
پکارتے نہ کسی ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جس کا  
قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے  
اور قتل کرتے ہیں تو حق کے ساتھ اور جو لوگ  
زنا نہیں کرتے، اور جو شخص ایسا  
کرے وہ گنہ گار ہے، اس  
کے لئے قیامت کے دن کٹی گن

۳۔ وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ  
عَلَىٰ الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ  
الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا وَالَّذِينَ  
يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَتَّبِعَهُمُ اللَّهُ  
وَأَلَّيْنِ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ  
عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا  
كَانَ عُزَامًا إِنَّهَا سَاعَتٌ مُّسْتَقَرَّةٌ  
قُمُقَامًا وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا  
لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ  
بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا وَالَّذِينَ لَا  
يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا  
يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ  
الْبَاطِلَ وَالْحَقُّ لَا يُؤْتُونَ وَمَنْ  
يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا  
يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ



وَيَجْلِدُ فِيهِمْ مِمَّا نَاهِ الْأَمْنُ تَابَ  
وَأَمَّنْ دَعَاكَ عَمَلًا صَالِحًا فَادْكُلْكَ  
يَبْدُلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَ  
كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا وَمَنْ  
كَانَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى  
اللَّهِ مَتَابًا هَ وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ  
النُّزُوسَ وَإِذَا أُسْرُوا بِاللُّغُومِ وَإِذَا  
كُرِمَاءُ هَ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا  
بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِفُوا  
عَلَيْهَا صُمًّا وَعَسِيَّا نَاهِ وَالَّذِينَ  
يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا  
مِنْ أَرْوَاحِنَا ذُرِّيَّتًا قُرَّةَ  
أَعْيُنٍ وَاجْعَلْ لَنَا لِمُتَّقِينَ  
إِمَامًا هَ أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ  
الْغُرَّةَ بِمَا صَبَرُوا وَدَلِيلُونَ  
فِيهَا تَحِيَّةٌ وَسَلَامٌ هَ  
خَالِدِينَ فِيهَا حَسَنَتْ مُسْتَقَرًّا  
وَمُقَامًا هَ

(الفاتحہ ۱-۶۳ تا ۷۶)

نیک اعمال کی اتنی لمبی فہرست ہے، لیکن کہیں بھی جہاد کا ذکر نہیں، اور نہ ایشیا کا، اس قسم کی بہت سی آیات ہیں۔

## نتیجہ

کیونکہ اس مجوزہ معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں، لہذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

عذاب ہے۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، مگر وہ جو توبہ کر لے اور ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرتا رہے تو اس کی برائیوں کو ہم نیکیوں سے بدل دیں گے اور اللہ غفور ہے رحیم ہے اور جو توبہ کر لے اور پھر نیک عمل کرے تو ایسا ہی شخص درحقیقت اللہ کے ہاں تائب شمار ہوتا ہے، اور جو لوگ بے ہودہ کاموں میں حاضر نہیں ہوتے، اور جب بیہودہ مشاغل کے پاس سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وقار سے گزر جاتے ہیں اور وہ لوگ کعبہ ان کے سامنے اللہ کی آیات بیان کی جائیں تو اندھے اور بہرے نہیں بن جاتے اور وہ لوگ جو اس طرح دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہماری بیویوں اور اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے اور ہمیں متقین کا پیش رو بنادے، ان لوگوں کو ان کے صبر کے عوض جنت کے بالا خانے ملیں گے ان کی ملاقات تحیۃ سلام سے ہوا کرے گی، ان اچھے مقامات میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔



## ۹۔ برق صاحب کا نواں مجوزہ معیار

### ربہانیت اور نفس کشی کو جہاد اکبر قرار دیتی ہو

اگرچہ ایسی کوئی حدیث نہیں جس میں ربہانیت اور نفس کشی کو جہاد اکبر قرار دیا ہو، تاہم معیار کی قوت ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن مجید میں ہے:-

۱۔ **وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبْتَئِلْ**  
**إِلَيْهِ تَبْتِلْهُ** (البقرہ: ۸)  
 اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور تمام دنیاوی باتوں سے قطع تعلق کر کے اس کی طرف رجوع کرو۔

۲۔ **يَحْيٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ** کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-  
**سَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ**  
**الصَّالِحِينَ** (آل عمران: ۳۹)  
 ۳۔ **اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرَانَ**  
**رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِى**  
**بَطْنِىْ مُحْتَرَمًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ**  
 (آل عمران: ۳۵)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-  
**فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ**  
 (آل عمران: ۳۷)  
 اللہ نے اُسے بوجہ احسن قبول فرمالیا۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ترک دنیا اللہ کو پسند ہے اور اگر مرد و عورت راسخانہ زندگی گذاریں تو یہ اس کو محبوب ہے، یعنی راہب (MONK) و راہبہ (NUN) بن جانا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ کیونکہ ان آیات میں بظاہر ربہانیت اور نفس کشی کی ترغیب پائی جاتی ہے لہذا یہ معیار باطل ہے۔

## ۱۰۔ برق صاحب کی کا دسواں مجوزہ معیار

### مسلمانوں کو دنیا سے بیزار کرنا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث مسلمانوں کو دنیا سے بیزار کرے وہ جعلی ہے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔



کہہ دیجئے کہ دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے  
اور آخرت بہتر ہے اس کیلئے جو تقویٰ اختیار  
کے۔

تم میں سے بعض دنیا کے طالب ہیں اور  
بعض آخرت کے طالب ہیں، پھر اللہ  
نے تم کو ان سے پھیر دیا، تاکہ تم کو مبتلائے  
مصیبت کرے۔

۱۔ كُلُّ مَتَاعٍ الدُّنْيَا قَلِيلٌ  
وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى

(النساء: ۷۷)

۲۔ مِّنْكُمْ مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ  
مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَوَّفَكُمْ  
عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ

(ال عمران: ۱۵۲)

اس سے ثابت ہوا کہ دنیا طلبی کی سزا میں مسلمان کو جنگ احد میں مبتلائے مصیبت  
کیا گی۔

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہے تو ہم  
اس کی کھیتی میں زیادتی کر دیں گے اور جو شخص  
دنیا کی کھیتی کا خواہش مند ہے تو اس کو اس میں  
سے کچھ دے دیں گے، لیکن آخرت میں اس  
کے لئے کچھ نہیں۔

۳۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ  
فَإِنَّ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ  
حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ  
فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَّصِيبٍ

(الشوری: ۲۰)

۴۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے دنیا مانگی تو جواب ملا کہ:-

اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور دنیا کی زیب  
زینت چاہیئے، تو آؤ میں تم کو مال دے کر  
خوبصورتی کے ساتھ رخصت کئے دیتا ہوں  
اور اگر اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور آخرت  
کے گھر کی طالب ہو تو پھر بے شک امتلنے  
تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لئے اجر  
عظیم تیار کر رکھا ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا  
وَنُفِيتُهَا فَتَعَالَيْنِ أُمَتِّعْكُنَّ  
أُسْرَٰحًا حَسْبَٰلَهُ ذَاتُ  
كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَ  
الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ  
لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا

(الاحزاب: ۲۸، ۲۹)

گویا اللہ رسول، اور آخرت کے طلب گار کو دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہئے:-

۵۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا  
بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ

(طہ: ۱۳۱)

اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس مال و متاع  
کو نہ دیکھئے، جو ہم نے ان لوگوں کو دے  
رکھا ہے۔

الغرض اس قسم کی بیسیوں آیتیں ہیں جو دنیا سے بیزار کرتی ہیں۔ لہذا یہ معیار بھی باطل ہے۔



## ۱۱۔ برق صاحب کا تجویز کردہ گیارہواں معیار ایک ایک دعا پر لاکھوں جنتیں تقسیم کرنا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ ہو کہ فلاں دعا پڑھنے سے ایک لاکھ جنتیں مل جائیں گی وہ حدیث صحیح ہے۔ برق صاحب ایسی صحیح حدیث تو کوئی موجود نہیں البتہ ایسی آیات ضرور موجود ہیں جو صرف ”ربنا اللہ“ کہنے پر جنت کا وارث بنا دیتی ہیں۔ سنئے :-

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَتَخَفُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَالْأَنْبِيَاءُ يَنْصَرِفُونَ عَنْكُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَبُّكُمْ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ (البقرة: ۲۸۵-۲۸۶)

بے شک جن لوگوں نے کہا ”ربنا اللہ“ ہمارا رب اللہ ہے پھر اسی پر جمے رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ نہ ڈرو نہ غم کھاؤ اور جنت کی بشارت سنو!

کیونکہ اس معیار پر قرآن مجید کی آیات بھی پوری نہیں اترتیں۔ لہذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

## ۱۲۔ برق صاحب کا تجویز کردہ بارہواں معیار دھوکہ کرنے پر سارے گناہ معاف کرنا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ بشارت ہو کہ دھوکہ کرنے سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ برق صاحب! دھوکہ تو خیر بہت بڑا عمل ہے اور ایک بہت بڑے مقصد کا پیش خیمہ ہے قرآن مجید تو صرف جھک کر ”حِطَّةٌ“ کہنے پر سارے گناہوں کے معاف کرنے کی خوشخبری دیتا ہے، سنئے :-

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ (البقرة: ۱۶۰)

دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور ”حِطَّةٌ“ کہنا، ہم تمہارے سب گناہ معاف کر دیں گے۔

اس معیار پر بھی قرآنی آیات پوری نہیں اترتیں لہذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

## ۱۲۔ برق صاحب کا تجویز کردہ تیرھواں معیار

### دوات کی سیاہی کو ایک لاکھ شہیدوں کے خون سے افضل ٹھہرانا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ ہو کہ دوات کی سیاہی ایک لاکھ شہیدوں کے خون سے افضل ہے وہ جعلی ہے برق صاحب ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں ہے لہذا یہ معیار ہی بے کار ہے، مگر اتنا ضرور عرض ہے کہ ایک عالم کی دوات کی سیاہی کا مقصد کیا ہے وہی جو ایک شہید کے خون کا مقصد ہے یعنی دین الہی کی حفاظت، پھر مزید برآں سیاہی سے دین الہی کی حفاظت ہی نہیں ہوتی بلکہ دین الہی کی تبلیغ بھی ہوتی ہے۔ گویا سیاہی دونوں کام کرتی ہے حملہ بھی کرتی ہے اور دفاع بھی، پھر خون شہید کا اثر عارضی ہوتا ہے لیکن اس سیاہی سے لکھی ہوئی کتاب کا فیضان قیامت تک جاری رہتا ہے لہذا لکھنے والے کے نامہ اعمال میں ثواب کے انبار لگ جاتے ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سیاہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ الغرض یہ معیار بھی باطل ہے۔

## ۱۲۔ برق صاحب کا تجویز کردہ چودھواں معیار

### ذکر خدا کو جان و مال کی قربانی سے بہتر قرار دیتی ہو

اس سلسلہ میں سنئے کہ قرآن مجید کیا فرماتا ہے۔  
 وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (العنکبوت: ۲۵) اور بے شک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔  
 اس آیت کے علاوہ بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی فضیلت بیان ہوئی ہے، بلکہ بعض آیات میں توجہاً و مقامات ذکر کی حفاظت کا ذریعہ بتایا گیا ہے گویا اصل مقصد ذکر الہی ہے اور جہاد اس کا خادم، اس لحاظ سے اور مذکورہ بالا آیت کے لحاظ سے یہ معیار بھی باطل ہے۔

## ۱۵۔ برق صاحب کا تجویز کردہ پندرھواں معیار

### سورج کو عرش کے نیچے سجد کرانا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں ہو کہ سورج عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے،



باطل ہے:-

سورج کا سجدہ کرنا تو قرآن مجید سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو زمین و آسمان کی تمام مخلوقات سجدہ کرتی ہے۔ اور سورج، چاند، تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی سجدہ کرتے ہیں۔

(المحجہ :- ۱۸)

قرآن مجید کی رو سے تو سورج ہی سجدہ نہیں کرتا بلکہ پہاڑ بھی سجدہ کرتے ہیں، درخت بھی سجدہ کرتے ہیں، جانور بھی سجدہ کرتے ہیں اور یہاں سجدہ سے حکم کوئی مراد نہیں لیا جاسکتا کیونکہ حکم کوئی کے تو تمام انسان تابع ہیں اور آیت میں تمام انسانوں کا ذکر نہیں، لہذا سجدہ سے مراد وہی عبادت کا سجدہ ہے اور وہی عبادت کا سجدہ سورج بھی کرتا ہے اور پہاڑ بھی، لہذا اس مجوزہ معیار پر آیات قرآنی بھی پوری نہیں اترتیں اور اس لحاظ سے یہ معیار بھی باطل ہے۔

## ۱۶۔ برق صاحب کا مجوزہ سوکھواں معیار

### درختوں کو رُلانا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ خبر ہو کہ درخت رویا تو وہ حدیث موضوع ہے، برق صاحب درختوں کے احساسات کو جدید سائنس نے بھی تسلیم کر لیا ہے مگر ابھی تک معجزہ پر آپ کو شک ہے، اچھا اب قرآنی آیات سنئے:-

۱۔ وَتَحْتَهُ نَاطِعَ الْأَوْْدَادِ الْجِبَالُ يُسَبِّحُ (الانبیاء :- ۷۹)

اور ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے ساتھ مسخر کر دیا تھا وہ پہاڑ تسبیح پڑھا کرتے تھے۔

اگر پتھر تسبیح پڑھ سکتے ہیں تو پھر درخت کا رونا تعجب خیر کیوں؟

۲۔ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحُ عَاصِفَةً يَجِيئُ بِأَمْرِ يَكْ (الانبیاء :- ۸۱)

اور ہوا سلیمان کے تابع تھی ان کے حکم سے چلتی تھی۔

ہوا جیسی چیز ایک رسول کی محکوم ہو تو کوئی تعجب نہیں؟ درخت کا رونا تعجب خیز کیوں؟

۳۔ قَاتٍ مِنْهَا لَمَّا يَحْبُطُونَ اور بعض پتھر ایسے ہیں کہ اللہ کے خوف سے خشیت اللہ (البقیۃ: ۱۲۰) گر پڑتے ہیں۔

گویا ان پتھروں کو خوف محسوس ہوتا ہے وہ گر پڑتے ہیں، ان میں بغیر دل و دماغ کے احساس ہوتا ہے۔

الغرض اس معیار پر بہت سی آیات پوری نہیں اترتی لہذا یہ معیار بھی باطل ہے، پھر معجزہ کا نام ہی اس قسم کے معیاروں کے بطلان کے لئے کافی ہے۔

## ۱۷۔ برق صاحب کا سترھواں مجوزہ معیار

### صوم و حیض میں مباشرت کی اجازت دینا

برق صاحب مباشرت سے جماعت مراد لیتے ہیں اور کیونکہ کسی حدیث میں بحالت صوم و حیض جماعت کی اجازت نہیں لہذا یہ معیار ہی کالعدم ہے۔

## ۱۸۔ برق صاحب کا اٹھارواں مجوزہ معیار

### طریقیت اور پیرگری کو اچھالنا

کسی صحیح حدیث میں یہ مضمون نہیں، لیکن قرآن مجید میں اس کا اشارہ پایا جاتا ہے، سنئے: سورہ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات اور سفر کا ایک قصہ مذکور ہے اس سفر میں حضرت خضر نے ایسے کام کئے جو بظاہر یا تو خلاف شرع تھے یا خلاف عقل، یعنی جس کشتی میں سوار تھے اس کو توڑ ڈالا، ایک معصوم بچے کو قتل کر دیا، ایک دیوار کی بلا وجہ اور بغیر اجرت کے مروت کر دی۔ ان تینوں باتوں کے رمز تک حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر نہ پہنچ سکے، بلکہ ہر بات پر اعتراض کیا، بالآخر حضرت خضر علیہ السلام نے استادانہ حیثیت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں کا راز سمجھا دیا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ شریعت کے عالم ظاہر پرست ہوتے ہیں انہیں حقیقت کا علم نہیں ہوتا، طریقیت والے شریعت سے ماوراء ہوتے ہیں وہ ایسے کام کر گزرتے ہیں جو بظاہر خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں لیکن باطن میں وہ عین شرع ہوتے ہیں، دیکھئے موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت رسول تھے، لیکن ان کو صرف ظاہر کا علم تھا اور حضرت خضر صاحب طریقیت و معرفت تھے وہ ان حقائق سے آشنا تھے،



جن سے موسیٰ علیہ السلام قطعاً نابلد تھے بلکہ ان تک موسیٰ علیہ السلام کی رسائی نہ ہو سکتی تھی، لہذا صاحب طریقت کا مرتبہ صاحب شریعت سے بڑا ہے اگر کوئی پر خلاف شریعت کام کرتا نظر آئے تو اس کو بڑا مت سمجھو، بلکہ یہ خیال کر دو کہ پیر ایسی جگہ پہنچ گیا ہے جہاں وہ ظاہری شریعت سے بے پرواہ ہو کر کام کرتا ہے اور وہ حقیقی شرع ہے۔ الغرض قرآن مجید کے اس قصہ سے بظاہر طریقت اور پیری مری کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔ بتائیے کیا یہ قصہ بھی محل نظر ہے، ہرگز نہیں، قصہ تو محل نظر ہو نہیں سکتا اس لئے کہ قرآن مجید میں ہے اور معیار بھی صحیح ہے لہذا سوائے تاویل کے اور کوئی چارہ کار نہیں اسی طرح کوئی بات اگر بغرض محال صحیح حدیث میں آجائے، تو اس کی بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں تاویل کر لینی چاہئے۔

## ۱۹۔ برق صاحب کا انیسواں مجوزہ معیار

### صرف کلمہ پڑھنے پر زانی کو جنت میں بھیجنا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ ہو کہ صرف کلمہ پڑھنے سے جنت مل جائے گی خواہ کلمہ پڑھنے والا زانی ہی کیوں نہ ہو تو وہ حدیث موضوع ہے۔ برق صاحب حدیث تو ایسی کوئی نہیں جس کا یہ مطلب ہو۔ آپ کو غلط فہمی ہو گئی اور آپ کی اس غلط فہمی کا جواب بارہویں باب میں تفصیل سے دیا جا چکا ہے، اب سنئے، قرآن مجید تو صرف ”ربنا اللہ“ کہنے پر جنت کی خوش خبری دیتا ہے۔

إِنَّ الَّذِي تَمَّ الْوَارِثُ رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ  
اسْتَقَامُوا تَنَزَّلَ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ  
الَّتِي تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ  
الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ  
بے شک جن لوگوں نے کہا ”ربنا اللہ“  
اور پھر اس پر جمے رہے تو ان پر فرشتے نازل  
ہوتے ہیں جو کہتے ہیں نہ ڈرو، نہ غم کھاؤ، اور  
جنت کی بشارت سنو!

(رحمہ السجدة ۱-۳۰)

کیونکہ اس معیار پر قرآن مجید کی آیت بھی پوری نہیں اترتی لہذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

## ۲۰۔ برق صاحب کا بیسواں مجوزہ معیار

### سورج کو شیطان کے سینگوں میں پھنسانا

حدیث کا یہ مطلب تو نہیں کہ سورج شیطان کے دو سینگوں میں پھنس جاتا ہے جس حدیث

کی طرف برق صاحب کا اشارہ ہے اس کا جواب انیسویں باب میں دیا جا چکا ہے اب قرآن مجید کی آیت سنئے:-

تَقْرُبُ فِي عَيْنٍ حَبِئَةٍ  
(الکھف ۱-۸۶)

بتائیے جو آیت سورج کو کیچڑ کے چشمہ میں ڈبو تی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر صحیح ہے اور ضرور صحیح ہے تو پھر یہ معیار ہی باطل ہے قرآن و حدیث کے ظاہری معنوں پر ایمان لانا چاہیے اگر ان کی حقیقت تک ہم نہیں پہنچ سکتے تو خاموش ہو جانا چاہیے نہ کہ اعتراض کرنا چاہیے۔

## ۲۔ برق صاحب کا اکیسواں مجوزہ معیار

### مشکل اسلام کو چھوڑ کر آسان اسلام کی دعوت دینا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ مذکور ہو کہ بغیر محنت و مشقت کے جنت مل جائے گی تو وہ حدیث موضوع ہوگی۔ غالباً ان کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی مسلم تکالیف برداشت نہ کرے حدیث نہ سمجھے وہ حقیقتاً مسلم ہی نہیں، حالانکہ بات و حقیقت یہ نہیں ہے آسان اسلام تو خود اللہ تعالیٰ پیش کرتا ہے، سنئے:-

اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی مشکل نہیں ڈالی۔

اللہ تم پر آسانوں کا ارادہ کرتا ہے اور تم پر مشکلات ڈالنا نہیں چاہتا۔

اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں ڈالتا۔

اللہ کا رسول لوگوں سے ان کے بوجھ اتار کر الگ رکھ دیتا ہے اور وہ طوق جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوتے تھے تو ان کو چھینک دیتا ہے۔

۱۔ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ

مِنْ حَرَجٍ (الحج ۱-۷۸)

۲۔ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ

بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرة ۱۸۵)

۳۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا اَوْ

وُسْعَهَا (البقرة ۱-۲۸۶)

۴۔ لِيَفْخَرُ عَنْهُمْ اِحْصَاءُ

الْاَعْصَالِ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

(الاعراف ۱-۱۵۷)

۵۔ اللہ تعالیٰ مسلمان کو تعلیم دیتا ہے کہ اس طرح دعا مانگو:-

اے ہمارے رب ہم پر ایسے جاری احکام نافذ

مت فرما جو تو نے ہم سے پیش تر لوگوں

۵۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا

جَعَلْتَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا



رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ  
لَنَا بِهِ (البقرة ۲۸۶) پر نافرمانی تھے اور ایسے احکام بھی نافذ نہ فرما  
جن کی تکمیل کی ہم میں طاقت نہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید آسان اسلام کی دعوت دیتا ہے لہذا اس معیار پر قرآن مجید  
بھی پورا نہیں اترتا۔ اب ان دونوں میں سے ایک ہی چیز صحیح ہو سکتی ہے یعنی یا تو قرآن مجید صحیح ہے یا  
معیار اور کیونکہ قرآن مجید قطعی الصحت ہے لہذا یہ معیار باطل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں احکام بہت محمل ہیں۔ نماز کے نہ اوقات ہیں نہ شرائط،  
نہ رکعات کی تعداد، نہ ان کی ہیئت، احادیث میں جو جو باتیں مذکور ہیں ان کی وجہ سے نماز ایک باقاعدہ  
اور منظم عبادت بن جاتی ہے صرف قرآن مجید کی رو سے تو نماز کو آسان بنانے والا آسان بنا سکتا ہے  
لیکن حدیث ایسا کرنے سے روکتی ہے یعنی وہ نماز کو مشکل بنا دیتی ہے۔ پھر سوود کے احکام اور مختلف  
صورتیں، خرید و فروخت کے مفصل احکام وغیرہ یہ سب مشکلیں ہیں جو احادیث میں ملتی ہیں۔ پھر حجاب  
کے متعلق مختلف ہدایات اور پابندیاں یہ بھی احادیث میں ملتی ہیں، احادیث میں ناچ، گانے، فنون لطیفہ  
اور لغو کھیلوں کی ممانعت ملتی ہے غرض یہ کہ احادیث کی وجہ سے کچھ مشکلات بڑھ ہی جاتی ہیں۔ لہذا  
احادیث کا پیش کیا ہوا اسلام، قرآن مجید کے اسلام سے کچھ زیادہ ہی مشکل ہے اس لحاظ سے اس  
معیار کی زحاحادیث سے زیادہ قرآن مجید پر پڑتی ہے لہذا یہ معیار باطل ہے۔

## خلاصہ

یہ کل اکیس معیار تھے جو برق صاحب نے پیش کئے ہیں اور ان میں سے کسی معیار پر قرآن  
مجید بھی پورا نہیں اترتا، لہذا تمام معیار لغو اور باطل ہیں۔  
احادیث کو پرکھنے کے لئے یہ معیار آخری سند نہیں ہو سکتے، صادق، حافظ، ضابطہ اشخاص  
کا بیان تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ خواہ ہماری فہم میں آئے یا نہ آئے۔ احادیث کی اصل کسوٹی یہی ہے  
کہ بیان کرنے والا صدق، حفظ، ضبط کے اوصاف سے متصف ہو اور اگر کسی راوی میں یہ اوصاف پائے  
جائیں تو پھر ان معیاروں پر بھی غور ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

## معیار مزید

برق صاحب نے ایک معیار چھوڑ دیا اور وہ ہے "اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف بات بیان کرنا"۔  
یہ بات احادیث میں تو غالباً نہیں ملتی لیکن قرآن مجید میں ضرور مل جاتی ہے، مثلاً:-

۱- اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ  
بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذا

لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ  
(الحزاب :- ۵۷)  
پہنچاتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے، دنیا  
میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچانا مذکور ہے تو کیا یہ آیت اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔  
۲۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ۔  
اللہ ان سے مذاق کرتا ہے۔

(البقرة :- ۱۵)

۳۔ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ نَاصِرٌ  
لِّمَنْ سَبِيلُهُ (التسا :- ۸۸)  
اور جس کو اللہ گمراہ کرے اس کے لئے مدد  
ہرگز راستہ نہیں ملے گا۔

یہ ہیں چند آیات جو منونہ پیش کر دی گئی ہیں، ظاہر معنوں کے لحاظ سے تو ہم ہی کہہ سکتے ہیں کہ  
یہ آیات قرآن مجید میں نہیں ہو سکتیں، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان اقدس کے خلاف ہیں لیکن یہ قرآن مجید  
ہی کی آیتیں ہیں اور ان پر ہمارا ایمان ہے اب اگر تاویل کر کے ان کو اعتراض سے بچایا جاسکتا ہے  
تو پھر کیا وجہ ہے کہ اسی قسم کی بلکہ اس سے کم اعتراض والی احادیث کے ساتھ یہ روئے کیوں نہیں  
اختیار کیا جاتا۔

## معیار مزید

برق صاحب چاہتے تو ایک معیار کا اور اضافہ کر دیتے وہ یہ کہ اگر کوئی حدیث کسی جاہلیت کی  
رسم کی سرپرستی کرتی ہو، تو وہ بھی موضوع ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس معیار کے لئے قرآن  
مجید ہی سہارا ہے قرآن مجید میں ہے :-

۱۔ فَلَمَّا جَاءَهَا نُورٌ أَنْ بُورِكَ  
مَنْ فِي النَّاسِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ  
اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ يَوْمَ بَدَا  
أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ  
(النمل :- ۸، ۹)

جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس  
آئے تو آواز آئی کہ جو ہستی آگ میں ہے  
وہ برکت والی ہے اور جو اس کے آس پاس ہے  
وہ بھی برکت والا ہے۔ پاک ہے وہ اللہ جو  
رب العالمین ہے اے موسیٰ وہ ہستی میں ہوں  
زبردست اور حکمت والا۔

کیا ان آیات سے آتش پرستی کو تقویت نہیں پہنچتی؟

اگر کسی تاویل سے ان آیات پر ایمان ہے تو پھر بہت ہی کم اعتراض والی احادیث پر ایمان  
کیوں نہ لایا جائے بظاہر یہ آیت قابل اعتراض نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں اعتراض سے بالکل  
پاک ہے اسی طرح بعض احادیث بظاہر قابل اعتراض معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں وہ بھی



اعتراض سے بالکل پاک ہوتی ہیں، غرض یہ کہ یہ تمام معیار باطل ہیں۔ معتبر آدمی کی بات قابل تسلیم ہونی چاہیے۔

## سب سے بڑا معیار

احادیث کو پرکھنے کا سب سے بڑا معیار یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کے خلاف نہ ہو کسی قرآنی آیت سے متعارض نہ ہو۔ واقعی بظاہر تو یہ بڑا زبردست معیار ہے، اور بہت ہی خوشنما اور دیدہ زیب معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بھی بالکل قابلِ وقعت نہیں ہے، کچھ بحث تو اس پر معیارِ اول کے ضمن میں گذر چکی ہے، لیکن اس معیار کی اہمیت کے پیش نظر ہم اس پر کچھ مزید تحریر کر رہے ہیں سوال یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث کسی قرآنی آیت کے خلاف ہو تو وہ موضوع ہے تو کیا اگر کوئی قرآنی آیت کسی دوسری آیت کے خلاف ہو تو وہ بھی موضوع ہے یا نہیں؟ اگر وہ آیت موضوع نہیں تو حدیث کیوں؟ آپ کہیں گے کہ ایسی تو کوئی بھی آیت نہیں جو دوسری آیت کے خلاف ہو، ہم کہتے ہیں، ایسی بہت سی آیات ہیں، ملاحظہ فرمائیے!

۱۔ تَنْزِيلُ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ ۱۔ اِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝

(الحاقة: ۲۳) (التکوین: الحاقة: ۲۰)

ترجمہ۔ یہ قرآن مجید رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ ترجمہ۔ یہ رسول کریم کا قول ہے۔

ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے یا کسی فرشتہ کا۔

۲۔ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ اَنْ مِّنْ رَّسُولِي ۝ ۲۔ فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ اَنْ مِّنْ رَّسُولِي ۝  
مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ يَسُوسِي  
اِنَّهُ اَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝  
الْوَادِئِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ  
مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يُّسُوْسِي اِنِّي اَنَا  
اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝

(النمل: ۹، ۸) (القصص: ۳۰)

ترجمہ۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے تو آواز آئی کہ جو بہتی آگ میں اور آگ کے اطراف میں ہے وہ برکت والی ہے، اور اللہ رب العالمین ترجمہ۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے تو وادیِ ایمین کے کنارے سے ایک مبارک مقام میں ایک درخت سے آواز آئی کہ اے موسیٰ، میں اللہ رب

پاک ہے اے موسیٰ، وہ ہستی میں ہوں، اللہ العالمین ہوں۔

زبردست حکمت والا۔

پہلی آیت میں ہے کہ آگ سے آواز آئی، دوسری میں ہے کہ درخت سے آواز آئی۔

۳۔ وَادَّعَدْنَا مِثْقَالَ نَجْمٍ اَوْفَىٰ ۚ وَوَعَدْنَا مِثْقَالَ نَجْمٍ اَوْفَىٰ ۚ

کَلِمَاتٍ ۚ (البقرة ۱-۵۱) کَلِمَاتٍ ۚ (الاعراف ۱-۱۴۲)

ترجمہ :- اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات

چالیس رات کا وعدہ لیا۔

پہلی میں چالیس رات اور دوسری میں تیس رات۔

## خلاصہ

غرض یہ کہ اس قسم کی متعدد آیات ہیں جو غلط فہمی کی وجہ سے بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نظر آتی ہیں۔ اب کیا ہمارا یہ فرض ہے کہ دونوں کو یا ایک کو مسترد کر دیں، نہیں ہرگز نہیں اور نہ ہم ایسا کرتے ہیں اور نہ برق صاحب ایسا کریں گے اور جب ایسا نہیں کرتے تو کوئی صورت تطبیق کی نکالنی پڑتی ہے اور ظاہری تضاد کو دور کر لیتے ہیں تو پھر آخر کیا مشکل ہے، کہ اگر آیات و احادیث میں غلط فہمی کی وجہ سے تضاد نظر آئے تو ان میں تطبیق کے عمل کو بالائے طاق رکھ کر احادیث کو مسترد کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ آیات و احادیث کے تضاد یا احادیث کے مابین اختلاف کو اکثر لوگوں نے آپ سہا بنا رکھا ہے حالانکہ ایسا اختلاف تو قرآن مجید میں بھی موجود ہے پھر کیا قرآن مجید کو چھوڑ دیا جائے، اگر نہیں تو احادیث کو چھوڑنے کی کیا وجہ ہے؟

قرآن مجید کی دو آیتوں میں تضاد نظر آتا ہے لیکن ہم دونوں کو تسلیم کرتے ہیں کسی ایک کو بھی مسترد نہیں کرتے۔ کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں، کہ دونوں ثابت شدہ ہیں، ثابت شدہ چیز کا انکار نہیں کیا جاسکتا، یہی چیز حدیث کے معاملہ میں بھی صحیح ہے اگر کسی آیت اور کسی حدیث میں تضاد نظر آئے تو اگر حدیث ثابت شدہ ہے تو اس کا انکار نہیں کیا جائیگا، بلکہ دونوں میں تطبیق کی صورت پیدا کی جائے گی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

غلط فہمی | ”ساری امت حدیث کو اسلام سمجھ بیٹھی ہے“ (دوا سلام ص ۲۲۹)

تو پھر برق صاحب آپ کا عقیدہ ساری امت کے خلاف کیوں؟ یہ صحیح ہے کہ ساری امت حدیث کو اسلام سمجھتی ہے اور اس کو سمجھنا ہی چاہیئے، اس لئے کہ اس کے بغیر

ازالہ



قرآن مجید بازیچہ اطفال بن کر رہ جاتا جو چاہے، جیسے معنی کر لے، اور اس کی مثال ہم گذشتہ صفحات میں اور خصوصاً تمہید میں دے چکے ہیں، اور ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حدیث کو اسلام تو آپ بھی سمجھتے ہیں ماں موضوع حدیث کو آپ اسلام نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے۔

”اسلام دو ہیں، ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلاتا ہے دوسرا وضعی احادیث کا اسلام“ (دو اسلام ص ۲)

ہم بھی ان وضعی احادیث کے اسلام کی مخالفت میں آپ کے ساتھ ہیں، اور آپ کا یہ بھی قول ہے کہ:-

”حاشا وکلاً مجھے حدیث سے بغض نہیں، بلکہ ان انسانی اقوال سے ضد ہے، جنہیں یہودیوں، زندیقیوں اور ہمارے فرقہ باز راہ نماؤں نے تراش کر مہبط الوحی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس لئے منسوب کر دیا تھا کہ خدا، رسول اور قرآن کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہ رہے۔“ (دو اسلام ص ۵۹)

ہمیں بھی آپ کے اس قول سے اتفاق ہے، بے شک بعض لوگوں نے حدیثیں گھڑیں، لیکن وہ حدیثیں الگ چھانٹ دی گئیں۔ پھر آپ ہی کا یہ بھی قول ہے کہ:-

”ائمہ حدیث میں ایسے بزرگ بھی پائے جاتے ہیں جن پر ملت اسلامیہ کو ہمیشہ ناز رہا ہے، ان کا علمی مقام اتنا بلند، اور ان کے ثقافتی کارنامے اتنے عظیم ہیں کہ ہمیں ان پر تنقید کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی“ (دو اسلام ص ۹۲)

ہم بھی آپ کی تائید کرتے ہیں، آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے بلکہ آپ کا تو اقوال رسول پر ایمان ہے۔ جیسا کہ آپ تحریر فرماتے ہیں:-

”تو کیا اقوال رسول قابل ایمان نہیں؟“

ب:- کیوں نہیں! بشرطیکہ کہیں سے کوئی قول رسول مل جائے رونا تو اسی بات کا ہے کہ اقوال رسول کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے۔ اگر اقوال رسول مل جاتے تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا، اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے۔“ (دو اسلام ص ۱۱)

گویا برق صاحب اقوال رسول پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اقوال رسول قرآن حکیم کی تشریح ہیں اور ہمیں بھی برق صاحب سے اس معاملہ میں کلیۃً اتفاق ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اقوال رسول ہیں کہاں؟ تو برق صاحب خود آپ ہی کا قول ہے کہ بہت سے اقوال رسول موجود ہیں، محدثین نے کھڑکھوٹا الگ کر دیا ہے آپ کی عبارات یہ ہیں:-

”بجدا اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گزرے ہیں، جنہوں نے ایسے تمام واقعات پر سخت تنقید کی، فجز اہم اللہ احسن الجزاء“ (دوا اسلام ص ۹)

”اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ امام مالک کا کردار و تقدس اور خلوص تمام شبہات سے ورلو تر تھا اور کہ انہوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرنے کے لئے تمام انسانی ذرائع استعمال کئے ہوں گے“ (دوا اسلام ص ۱۶۲)

”اس میں کلام نہیں کہ امام بخاری (وفات ۲۵۶ھ) نے صحیح احادیث کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کئے، ہر حدیث کو پرکھنے کے لئے تمام امکانی وسائل اختیار فرمائے، راویوں کا کھوج لگایا، ہر قابل ذکر محدث سے مشورہ کیا اور سالہا سال کی مسلسل جستجو اور تنگا پو کے بعد اپنا مجموعہ تیار کیا“ (دوا اسلام ص ۱۷۵)

برق صاحب کو اعتراف ہے کہ اس مجموعہ صحیح بخاری میں صرف چند احادیث ناقابل اعتبار ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں:-

”اس مجموعہ میں چند ایسی احادیث موجود ہیں۔۔۔۔۔“

گویا ان چند کونکال کر باقی احادیث کو برق صاحب بھی صحیح سمجھتے ہیں، برق صاحب کو یہ شبہ تھا کہ اقوال رسول کہیں ہیں ہی نہیں، لیکن اب وہ خود ہی تسلیم کر رہے ہیں کہ چند احادیث کونکال کر صحیح بخاری کی تمام احادیث صحیح ہیں، فلت الحمد۔

لہذا ان سے گزارش ہے کہ اس مجموعہ پر اب ان کو اعتماد کر لینا چاہئے۔ چند احادیث کے متعلق جو شکوک تھے وہ دور کر دئے گئے۔ لہذا پورا مجموعہ صحیح بخاری قطعاً صحیح ہے، پھر برق صاحب آپ ہی نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ:-

”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی حدیث صحیح موجود ہی نہیں“ (دوا اسلام ص ۳۴)

”دوم:- کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں:-“

(دوا اسلام ص ۳۴)

یہ بھی آپ ہی کا قول ہے کہ:-

”اس طرح کی ہزاروں احادیث ہمارے پاس موجود ہیں جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں صحابہ کرام کی جرأت، شجاعت، ایثار، سرفروشی، خدمتِ خلق، حرارتِ ایمانی، عشقِ رسول، تقویٰ اور نظم و ضبط کی حیات انگیز داستانیں سناتی ہیں۔ اس عہد کے تمدن پر مکمل روشنی ڈالتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اسلام کی حیرت انگیز ترقی کے اسباب کیا تھے؟ اکاسرہ کیوں مٹ



گئے، قیصرہ کو کیوں شکست ہوئی، مٹھی مہر سلمان سندھ کے رگستان سے فرانس کی  
عشرت کا ہول تک کیسے چھا گئے، لٹیرے فرمانروا کیسے بن گئے، گڈریے اورنگ جہان بانی  
پر کیسے جا بیٹھے، وحشی، فلسفہ و حکمت کا درس کیسے دینے لگے، شرابیوں اور جوار یوں میں  
اس بلا کی پاکیزگی کہاں سے آگئی، ۳۶۰ بتوں کے پجاری ایک خدا، ایک قبلہ، ایک مرکز  
اور ایک نصب العین کے تخیل پر کیسے متحد ہو گئے؟

”یہ تمام تفصیل احادیث میں ملتی ہیں اور یہی وہ پیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں  
ہیں، اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں۔ مولانا شبلی کے ”الفاروق“  
کا ماخذ یہی احادیث تھیں، اور یہ وہ کتاب عظیم ہے جو اس وقت تک لاکھوں کیریئر (کردار)  
بنا چکی ہے اگر عہدِ رسولؐ کے ایک فرد کی سیرت اس قدر انقلاب پیدا کر سکتی ہے، تو  
اندازہ لگائیے، کہ اگر احادیث کے تمام کردار اسی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کر دئے  
جائیں، تو نتائج کس قدر حیرت انگیز ہو سکتے ہیں“ (دوا سلام ص ۳۲۲، ص ۳۲۳)  
برق صاحب آپ کی یہ عبارات بتا رہی ہیں کہ صحیح اقوالِ رسولؐ آپ کو مل چکے ہیں،  
ہزار ہا صحیح احادیث موجود ہیں، جن پر آپ نازاں ہیں۔ لہذا اب کیوں نہ ان احادیث  
پر ایمان آپ ہ ہو گا۔ ضرور ہو گا، کیونکہ آپ نے اپنے آخری باب کا عنوان ہی  
یہ رکھا ہے، کہ:-

”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“

فللہ الحمد !

## خلاصہ کتاب

برق صاحب غلط فہمی سے آپ نے تدوینِ حدیث اور بعض صحیح احادیث پر اعتراض کئے، اور  
اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ کی ان غلط فہمیوں کا گزشتہ صفحات میں ازالہ کر دیا گیا ہے آپ نے جو اعتراض  
کئے تھے وہ نیک نیتی سے کئے تھے۔ ورنہ حقیقت میں آپ حدیث کے منکر نہیں ہیں آپ نے جو کچھ  
لکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے والہانہ عقیدت کی بنا پر لکھا اس لئے اس میں ایک  
حد تک آپ معذور ہیں۔

## ضمیمہ

رسول اللہ علیہ وسلم کی اتباع و اطاعت کی اہمیت جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم قرآن مجید کی وہ تمام آیات مطالعہ کریں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم ہے یا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے، اور اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے وہ آیات درج ذیل ہیں:-

۱۔ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا  
وَنَذِيرًا (البقرة: ۱۱۹)

۲۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي  
كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنُعَلِّمَ مَنْ يَتَّبِعُ  
الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى  
عَقْبَيْهِ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ اِلَّا  
عَلَى الَّذِيْنَ هَدٰى اللّٰهُ  
(البقرة: ۱۲۳)

ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشارت و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔  
اور جس قبلہ پر کہ آپ ہیں وہ ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کون رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں کفر کی طرف واپس ہو جاتا ہے اور یہ بات اگرچہ لوگوں پر گراں گزری لیکن ان لوگوں پر اگر انہیں گزری جن کو اللہ تعالیٰ نے

ہدایت دی ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اتباع رسول کتنی اہمیت کی چیز ہے کہ اس کی جانچ کے لئے احکام میں ترمیم و تنسیخ کی جارہی ہے۔ ایسی ایسی باتوں کا حکم دیا جا رہا ہے کہ جن میں بظاہر کوئی اہمیت نظر نہیں آتی، محض اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اور اپنی عقلوں پر ایمان لانے والوں میں امتیاز پیدا ہو جائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے متبعین، جھوٹوں سے ممتاز ہو جائیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتباع رسول ہدایت والے ہی کر سکتے ہیں



اور جو اتباع رسول سے منہ موڑتے ہیں محض اس لئے کہ حکیم رسول کی مصلحت ان کی عقل میں نہیں آتی وہ گویا کفر کی طرف واپس ہو جاتے ہیں۔

۳۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ  
قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ  
الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ  
وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ

یہ نیکی نہیں ہے کہ مشرق کی طرف منہ کیا جائے  
یا مغرب کی طرف، بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ  
کوئی شخص اللہ پر، قیامت پر، فرشتوں  
پر، کتاب پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔

(البقرة: ۱۷۷)

۴۔ كُلُّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَ  
كُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَوْقَ بَيْنِ  
أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا  
وَأَطَعْنَا

ہر مومن ایمان لایا اللہ پر، اس کے فرشتوں  
پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں  
پر وہی تو اس طرح کہتے ہیں کہ ہم رسولوں میں کسی ایک میں  
تفریق نہیں کرتے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے رسول  
کی بات سنی اور ہم نے اطاعت کی۔

(البقرة: ۲۸۵)

۵۔ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلَمْتُ  
وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ

پس اگر کافر حاجت کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے  
اللہ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہے، اور  
میری کام ان لوگوں نے بھی کیا ہے جو میری  
اتباع کرتے ہیں۔

(آل عمران: ۲۰)

۶۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ  
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ

کہہ دیجئے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت  
کا دعویٰ ہے تو میری اتباع کرو، پھر اللہ تم  
میں سے محبت کرے گا۔

(آل عمران: ۳۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اتباع رسول کرے خواہ اللہ سے محبت کرنے والا مرکز ملت ہو یا عام آدمی کا اللہ اسی شخص سے محبت کرتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے۔

۷۔ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ  
تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ

کہہ دیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی  
اطاعت کرو اگر تم اس اطاعت سے منہ موڑو، تو  
اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں کرتا۔

(آل عمران: ۳۲)

گویا اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انحراف کفر ہے اور غضب الہی کا سبب ہے۔

۸۔ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا

عیسیٰ علیہ السلام کے حواری دعا کرتے ہیں، اے

الرَّسُولَ فَاُكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝  
(ال عمران: ۵۳)  
ہمارے رب ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل  
فرمایا اور ہم نے رسول کی پیروی کی پس ہم کو شاہدین  
کے ساتھ لکھ لے۔

کتاب الہی پر ایمان لانے کا ذکر کر کے پھر اتباع رسول کا ذکر کیا، حالانکہ انہیں یہ کہنا چاہیے تھا  
کہ اس کتاب کی ہم نے پیروی کی، لیکن اتباع رسول کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کو واضح کر دیا، گویا اتباع  
رسول کے بغیر ایمان و عمل بے کار ہے۔

۹۔ اِنَّ اَوَّلَى النَّاسِ بِابِرَاهِيْمَ  
لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ ۚ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَ  
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَآلِ عِمْرٰنَ ۝۱۰ (۶۸)  
بیشک ابراہیم سے تو ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں  
اس کی پیروی کی، اور اس نبی کا تعلق ہے اور  
مؤمنین کا تعلق ہے۔

یہاں بھی رسول کی پیروی پر زور دیا گیا ہے۔

۱۰۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّۦْنَ  
لَمَّا اٰتٰیْکُمْ مِنْ کِتٰبٍ وَحِکْمَةٍ  
تُحِبُّۡنَہٗ ۚ کُلُّ رَسُوْلٍ مُّصَدِّقٌ  
لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ  
(ال عمران: ۸۱)  
اور جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب  
تمہیں کتاب اور حکمت مل جائے، پھر کوئی نبی  
مبعوث ہو جو تمہاری شریعت کی تصدیق کرتا ہو  
تو اس پر ضرور ایمان لانا، اور اس  
کی مدد کرنا۔

۱۱۔ وَکَیْفَ تَکْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی  
عَلٰیْکُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَنِکَیْمٌ رَّسُوْلٌ  
(ال عمران: ۱۰۲)  
تم کیسے کفر کر سکتے ہو، حالانکہ تمہارے سامنے  
اللہ کی آیات تلاوت کی جا رہی ہیں، اور اللہ  
کا رسول تم میں موجود ہے۔

گویا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔

۱۲۔ وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ  
تُرْحَمُوْنَ ۝ (ال عمران: ۱۳۲)  
اللہ کی اور رسول کی اطاعت کر دو، تاکہ تم  
پر رحم کیا جائے۔

گویا بغیر اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت کی امید فضول ہے۔

۱۳۔ وَمَا مُحَمَّدٌۢ وَّالَا رَسُوْلٌ قَدْ  
خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاَنْتُمْ  
مَاتَ اَوْ قُتِلَ اَنْقَلَبْتُمْ عَلٰی  
اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی  
عَقْبِہٖ فَلَنْ یُّفْرِ اللّٰهُ شَیْئًا وَّ  
محمد رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی رسول ہو  
چکے ہیں، پس اگر وہ انتقال فرما جائیں یا شہید  
ہو جائیں، تو کیا تم الٹے پاؤں کفر کی طرف  
واپس ہو جاؤ گے اور جو کوئی واپس ہو گا، وہ اللہ  
کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اور اللہ شکر کرنے والوں



سَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝

کو جزائے خیر دے گا۔

(آل عمران ۱-۱۴۴)

۱۴۔ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

بے شک اللہ نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ ایک رسول انہیں میں سے مبعوث فرمایا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں تھے۔

(آل عمران ۱۶۴-۱۶۵)

آیت نمبر ۱۴ میں فرمایا کہ شکر کرنے والوں کو جزائے علیٰ کی اور آیت نمبر ۱۵ میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت احسانِ عظیم ہے۔ لہذا شکر بھی اس احسان ہی کا ادا کرنا مقصود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے گا جو بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شکر ادا کرتے ہیں اور وہ اس طرح نہیں کہ ان کی زندگی میں شکر ادا کرے، اور موت کے بعد نہیں، یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک نکتہ بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہر حال ایک رسول ہیں لہذا ان کو موت آنا لازمی ہے تو پھر یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اطاعت کو زسیت کا تابع بنا دیا جائے۔ اور بعد میں اطاعت سے منہ موڑ لیا جائے نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اطاعت کا سوال ان کی زسیت کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ دائمی ہے اگر ان کی رسالت دائمی ہے تو اطاعت بھی دائمی ہے۔

۱۵۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدًا إِذْ تَحْسَبُونَهُم بِأَذْنِهِ حَتَّىٰ إِذَا فَتِلْتُمُ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأُمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا أَرْسَلْنَاكُمْ مِّن تَحِيُّوتٍ ۝ (آل عمران ۱-۱۵۲)

اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا جب کہ تم اس کے حکم سے کافروں کا قلع قمع کر رہے تھے یہاں تک کہ تم نے بزدلی دکھائی، اور حکمِ رسول میں اختلاف کیا اور اس کے حکم کی نافرمانی کی حالانکہ حسبِ درخواست تم کو فتح مل چکی تھی۔

گویا حکمِ رسول کی تاویل کی وجہ سے فتح و کامرانی کو غم و مصیبت میں تبدیل کر دیا گیا۔

۱۶۔ مَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مَن يُّرْسِلُ مَن يَشَاءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ ۝

اللہ تم میں سے کسی کو غیب پر مطلع نہیں کرتا، بلکہ اپنے رسولوں کو اس کام کے لئے منتخب کرتا ہے، لہذا تم اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ

(آل عمران ۱-۱۶۹)

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ رسول جسے غیب پر مطلع کیا گیا ہو اگر وہ قرآن مجید کی تشریح کرے تو اس کی تشریح غیر مستند ہو اور دوسروں کی مستند مافی جائے۔

۱۸۔ رَبَّنَا وَابْتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ ۖ

اے ہمارے رب ہمیں وہ چیزیں عطا فرما جو تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ دینے کا

وعدہ فرمایا ہے۔

(ال عمران: ۱۹۴)

یہاں بھی کتاب الہی کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ کتاب الہی میں تمام وعدے نہیں ہوتے بلکہ تمام وعدوں کا جامع رسول ہوتا ہے اس کے بیان میں کتاب الہی کا علاوہ دوسرے وعدے بھی شامل ہوتے ہیں۔

۱۸۔ مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ

جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

(النساء: ۱۳)

۱۹۔ وَمَنْ يُفِضِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَتَّعَدَّ جُدُودًا لَا يُدْخِلُهَا نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ۚ

اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کے حدود سے آگے نکل گیا اللہ اس کو ہمیشہ کیلئے روزخ میں داخل کرے گا اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہوگا۔

(النساء: ۱۴)

۲۰۔ يَوْمَئِذٍ يَتُوذُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَخَصِمُوا الرُّسُولَ لَئِيْلَ تَسْوَىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ لِلَّهِ حَدِيثًا ۚ

قیامت کے دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی ہوگی یہ چاہیں گے کہ کاش انہیں مٹی میں ملا دیا جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

(النساء: ۲۲)

۲۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَإِنَّ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۚ

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو، اور اپنے امراء کی، پھر اگر تمہارا آپس میں اختلاف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرو، اگر تم اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور اس کا

انجام بھی اچھا ہے۔

(النساء: ۵۹)



ووجہ ”آطِيعُوا“ کا لفظ ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے، اور ان سے اختلاف کو ناجائز ہی نہیں سمجھا گیا بلکہ تمام اختلافات کے وقت انکی طرف رجوع کرنے کو ایمان کی نشانی بتایا گیا ہے۔

۲۲۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ۝

اور حبیب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کی طرف، اور رسول کی طرف، تو آپ دیکھتے ہیں کہ منافقین آپ کے پاس آنے سے اعراض کرتے ہیں۔

(النساء: ۶۱)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کرنے والا منافق ہے مگر ”إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ“ اور ”إِلَىٰ الرَّسُولِ“ کی درمیانی واؤ کو دئے تفسیر ہی مانا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ رسول کہے وہ سب ”مَا أَنزَلَ اللَّهُ“ ہے اور اگر اس واؤ کو دئے عطفی مانا جائے، اور مَا أَنزَلَ اللَّهُ سے قرآن مجید مراد لیا جائے تو پھر یہ ظاہر ہے کہ ”إِلَىٰ الرَّسُولِ“ قرآن مجید کے علاوہ مستقل ماخذ قانون ہے۔

۲۳۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۝

اور ہم نے ہر رسول کو اس لئے بھیجا، کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

(النساء: ۶۴)

یہاں بھی کتاب الہی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ذکر کیا تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے اور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس کتاب الہی کی اطاعت ہم پر فرض ہے کیونکہ اللہ کی اطاعت ہے اور اللہ کے ساتھ دوسرے کی اطاعت شرک ہے لہذا اللہ ہی نے فرمادیا، کہ ہمارے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو، گو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہمارے حکم دینے کی وجہ سے شرک نہ ہوگی، بلکہ رسول ہونے کی وجہ سے وہ جو کچھ کہیں گے وہ ہمارا ہی حکم ہوگا ان کا ذاتی حکم نہ ہوگا، ہاں اگر تم اپنی طرف سے کسی کی اطاعت کرو گے تو یہ شرک ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اطاعت کا حکم نہیں دیا، اور اسی ضمن میں ائمہ کی تقلید بھی آجاتی ہے جو شرک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی امام کی تقلید ہم پر فرض نہیں کی، نہ اس کی اجازت دی، صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا، لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت شرک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرض عین ہے۔

یہاں ”رسول“ سے مراد مرکز ملت لینا کسی طرح صحیح نہیں اس لئے کہ مرکز ملت کو اللہ تعالیٰ

نہیں بھیجتا۔ اور آیت میں بھیجنے کا ذکر ہے۔ لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اطاعت مستقلاً فرض ہے نہ کہ کسی اور کی۔

۲۲۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ  
حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ  
ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ  
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا  
تَسْلِيمًا (النساء: ۶۵)

آپ کے رب کی قسم لوگ مومن نہیں ہو  
سکتے جب تک کہ اپنے مت م اختلافات  
میں آپ کو حکم نہ مان لیں، پھر آپ کے  
فیصلہ سے دل میں تنگ بھی محسوس نہ کریں، بلکہ  
برضا اور رغبت تسلیم کر لیں۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و اطاعت کو کتنے مہتمم بالشان الفاظ میں  
بیان کیا گیا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے مرکز ملت کی اطاعت مراد ہے اور پھر صرف عملی اور  
ظاہری اطاعت پر ہی زور نہیں دیا گیا بلکہ دل کی اطاعت اور کشادگی پر بھی زور دیا گیا ہے، گویا ایمان  
کی شان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات دل سے مانی جائے، اس پر ایمان ہو جو شخص عملاً تو  
اطاعت کرتا ہے لیکن دل سے تسلیم نہیں کرتا، آیت کی رو سے وہ بھی مومن نہیں، چہ جائیکہ وہ شخص جو نہ دل سے  
مانے، نہ عمل سے وہ تو کھلا باغی ہے۔

۲۵۔ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ  
فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ  
عَلَيْهِمْ (النساء: ۶۹)

جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے  
وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے  
انعام کیا ہے۔

۲۶۔ مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ  
اللَّهَ (النساء: ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی، تو  
اس نے درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت  
کی۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت عین اطاعتِ الہی ہے اور اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کی اطاعت شرک نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ وہ تو احکام  
الہی پہنچاتے ہیں۔

۲۷۔ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ  
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ  
غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ تُوَلِّهِ مَا  
تَوَلَّىٰ وَتُصْلَبْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ  
مَصِيرًا (النساء: ۱۱۵)

جو شخص ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسول  
کے خلاف چلے اور مومنین کے راستہ کے علاوہ  
کسی اور راستہ کو اختیار کرے تو ہم بھی اسے ادھر ہی  
جانے دیں گے اور اس کو دوزخ میں داخل کریں گے  
اور وہ بہت بُری جگہ ہے۔



چودہ سو سال سے مومنین کا یہی راستہ رہا ہے کہ وہ اللہ و رسول سے قرآن و حدیث ہی مراد لیتے  
سب اب جو اس راستہ کو چھوڑ کر اللہ و رسول کے معنی مرکز ملت کرتا ہے وہ گویا ہدایت کے آجانے کے  
بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہے اور اپنا ٹھکانا جہنم میں بناتا ہے۔

۲۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ه  
(النساء: ۱۳۶)

اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس  
کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس پر  
نازل کی گئی اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے  
نازل کی گئی ہے اور جو انکار کرے اللہ کا، اس  
کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے  
رسولوں کا اور قیامت کے دن کا تو وہ بہت  
بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

۲۹۔ إِنَّ الَّذِينَ يُكْفَرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا  
بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُوا  
نُؤْمِنُ بِبَعْضِ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَ  
يُرِيدُونَ أَنْ يُتَّخَذَ ذَا بَيْنِ ذَلِكَ  
سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ  
حَقًّا ه (النساء: ۱۵۱)

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں  
کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں  
کے مابین تفریق کرنا چاہتے ہیں، اور  
کہتے ہیں کہ بعض پر ہم ایمان لاتے ہیں اور  
بعض پر ایمان نہیں لاتے، اور چاہتے ہیں کہ  
درمیان میں کوئی راستہ نکال لیں ایسے لوگ  
ہی حقیقی کافر ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائیں  
وہ کافر ہیں۔

۳۰۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ  
وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ  
أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أَجْرُهُمْ  
وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ه  
(النساء: ۱۵۲)

اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں  
پر ایمان لائے، اور ان میں تفریق  
نہیں کی، اللہ تعالیٰ ان کو  
جزائے خیر دے گا، اور اللہ تعالیٰ غفور  
اور رحیم ہے۔

۳۱۔ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ  
لِقُلٍّ يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ  
حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ

اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے، بشارت دینے  
والے اور ڈرانے والے، تاکہ لوگوں کے  
لئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ

زبردست حکمت والا ہے۔

عَزِيزًا حَكِيمًا

(النساء: ۱۶۵)

اس آیت میں بھی کتاب الہی کو حجت تمام کرنے والا نہیں فرمایا، کیونکہ کتب الہی کی موجودگی میں اختلافات باقی رہ سکتے ہیں، اور گمراہی پھیل سکتی ہے، لیکن رسول کے آجانے کے بعد اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ تاویلات بعیدہ کا سد باب ہو جاتا ہے، اور اختلافات اور گمراہی پراڑے رہنے کی کوئی حجت باقی نہیں رہتی، گو یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی اتمام حجت ہے اور بس۔

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ رسول آگیا، پس ایمان لے آؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

۳۲۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ  
الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا  
خَيْرًا لَّكُمْ (النساء: ۱۶۰)

پس اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ۔

۳۳۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ  
(النساء: ۱۶۱)

(اے بنی اسرائیل) میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی، اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کا احترام کیا۔

۳۴۔ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَبِئْسَ اَقَمْتُمْ  
الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَآَمَنْتُمْ  
بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمْهُمْ

(المائدہ: ۱۲)

اے اہل کتاب بے شک تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا جو شریعت کی ان باتوں میں سے جو تم چھپاتے تھے، بہت سی باتوں کو بیان کرتا ہے، اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔

۳۵۔ یٰۤاَہْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ  
رَسُوْلُنَا یَبِّیْنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ  
تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا  
عَنْ کَثِیْرٍ

(المائدہ: ۱۵)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے جو اگلے رسولوں کے آنے کے ایک مدت بعد آیا ہے کہ کہیں تم یہ نہ کہہ دو، کہ ہمارے پاس تو کوئی بشیر اور نذیر آیا ہی نہیں، لہذا اب تمہارے پاس بھی بشیر اور نذیر آگیا ہے۔

۳۶۔ یٰۤاَہْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ  
رَسُوْلُنَا یَبِّیْنُ لَکُمْ عَلٰی فِتْنَةٍ مِّنَ  
التَّوْحٰیدِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا  
مِّنْ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ  
بَشِیْرٌ وَّنَذِیْرٌ

(المائدہ: ۱۶)



اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں نہ کہ صرف مکہ کے کفار کی طرف، جیسا کہ بعض لوگ غلط فہمی سے کہہ دیا کرتے ہیں۔

۳۷۔ اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يَجَارِبُوْنَ  
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَنْ يَّسْعَوْا فِي  
الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُقْتَلُوْا اَوْ  
يُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ  
وَاَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے  
ہیں اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں ان کو قتل  
کر دیا جائے، یا پھانسی دے دی جائے  
یا مخالف طرف کے ہاتھ پیر کاٹ دیے جائیں  
یا جلا وطن کر دیا جائے۔

مِنَ الْاَرْضِ (المائدہ: ۳۳)  
۳۸۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاذْنُوْا بِحَرْبٍ  
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

پس اگر تم سود لینا نہیں چھوڑو گے، تو  
اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے تم کو  
اعلان جنگ ہے۔

(البقرہ: ۲۶۹)  
۳۹۔ اِنَّمَا دَرِيْكُمْ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ  
كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ  
الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ  
ذٰلِعُوْنَ (المائدہ: ۵۵)  
۴۰۔ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ  
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ  
هُمُ الْغَالِبُوْنَ

تمہارا دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول  
ہونا چاہئے، اور وہ مومنین ہونے چاہئیں  
جو نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور رکوع  
کرتے ہیں یعنی عاجزی کرتے ہیں۔  
اور جو شخص اللہ، اس کے رسول، اور ایمان والوں  
کو دوست رکھے پس ایسے لوگ ہی اللہ کا  
لشکر ہیں اور یہی غالب رہیں گے۔

(المائدہ: ۵۶)

اور اگر نبی اسرائیل اللہ، نبی اور جو کچھ اس کی  
طرف اتارا گیا ہے اس پر ایمان لاتے تو کبھی  
بھی کافروں کو دوست نہ بناتے، لیکن  
ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

۴۱۔ وَلَوْ كَاٰنُ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ  
النَّبِيِّ وَاَنْزَلَ اِلَيْهِمْ مَا تَخَذُوْهُمْ  
اَوْ لِيَاۤءَ وَلٰكِنْ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ  
فَاسِقُوْنَ (المائدہ: ۸۱)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت  
کرو اور ڈرتے رہو پھر اگر تم رسول کی اطاعت  
سے منہ موڑو، تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذریعہ  
صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

۴۲۔ وَاطِيعُوْا اللّٰهَ وَاطِيعُوْا الرَّسُوْلَ  
فَاِذَا رُوْا فَاِنَّ تَوَلَّيْتُمْ فَاَعْلَمُوْا  
اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ  
(المائدہ: ۹۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں کہ جس راستہ پر ہم نے اپنے آباء اجداد کو پایا وہی کافی ہے کیا ایسی حالت میں بھی جب کہ ان کے آباء اجداد کو کچھ علم ہی نہ ہو، اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں۔

۲۲۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْنَا آبَاءَنَا أَوْ لَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ هـ  
(الساكنة ۱-۱۰۴)

اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا باخذا قانون ہونا بالبدلت ثابت ہے اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہمیں بھی ویسی ہی چیز نہ ملے، جیسی اللہ کے رسولوں کو ملی، اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کو دے۔

۲۳۔ وَإِذَا جَاءَهُمْ آيَةٌ تَالُوا لَنَنُؤْمِنَ بِحَقِّ نُؤْفَىٰ مِثْلَ مَا أُؤْفَىٰ رَسُولُ اللَّهِ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يُجْعَلُ رِسَالَتِي هـ  
(الانعام ۱-۱۲۳)

اس آیت سے منصب رسالت کی بلندی آشکارا ہے، ایسی بلند مرتبہ شخصیت کی تشریح کے ہوتے ہوئے دوسرے شخص کی تشریح کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی شرعیت میں اس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔

میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں یعنی وہ لوگ جو رسول، نبی اُمی کی پیروی کرتے ہیں جس کا تذکرہ وہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ رسول ان کو نیک باتوں کا حکم دیتا ہے، بُری باتوں سے روکتا ہے ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے طوق اور بوجھ اتار کر پھینک دیتا ہے جو طوق اور بوجھ ان پر لکھ دیئے گئے تھے۔

۲۵۔ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاكُنْهُمُ الَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ هـ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُوبًا عِنْدَهُ هُمْ فِي السُّورَةِ وَالْأَنْحِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْعَفْوِ وَبِغُفْرَانِهِمْ مِنَ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ



عَلَيْهِمْ قَالَتِ الَّذِينَ آمَنُوا بِهِمْ وَ  
عَزَّوَجَلَّ فَانصَرُوا لَهُ وَاتَّبَعُوا النَّبِيَّ  
الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ الْوَكِيلُ هُمْ  
الْمُقْلِحُونَ ه

پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کا احترام  
کیا اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو  
اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح  
پانے والے ہیں۔

(الاعراف: ۱۵۶، ۱۵۷)

اتباع رسول کی اہمیت کو کتنے شاندار الفاظ میں بیان کیا گیا ہے پھر شریعت سازی کو اللہ تعالیٰ  
نے رسول کی طرف منسوب کر کے بتا دیا کہ جو کچھ رسول کہے وہ دین ہے، وہ نور ہے، اس کی اتباع  
موجب فلاح ہے۔

۴۶۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ  
اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ  
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا  
هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ  
وَرَسُولِهِ إِنِّي إِلَاقِي الَّذِي  
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ وَاتَّبِعُوهُ  
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ه

کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ  
کا رسول ہوں وہ اللہ جس کی حکومت آسمانوں  
میں بھی ہے اور زمین میں بھی اس کے سوائے کوئی  
حاکم و معبود نہیں، وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے  
پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی  
پر بھی ایمان لاؤ وہ نبی اللہ اور اللہ کی باتوں پر  
ایمان رکھتا ہے تم اس رسول ہی کی پیروی کرو،  
تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے۔

(الاعراف: ۱۵۸)

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتباع رسول کے بغیر ہدایت نہیں مل سکتی، کیا کوئی کہہ سکتا ہے  
کہ اس آیت اور گزشتہ آیت میں رسول سے مراد مرکز ملت ہے۔

۴۷۔ قُلْ أَطِيعُوا لِلَّهِ وَالتَّرْسُولِ  
فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَذَاتَ  
بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ  
إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ه

کہہ دیجئے کہ مالِ غنیمت اللہ تعالیٰ، اور  
رسول کے لئے ہے، پس اللہ سے ڈرو، اور  
اپنے آپس کے معاملات کی اصلاح کرو، اور  
اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو  
اگر تم مؤمن ہو۔

(الانفال: ۱۵۹)

۴۸۔ ذَلِكِ بَأْسُهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَ  
رَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَ  
رَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ه

کافروں پر یہ مصیبت اس لئے آئی کہ انہوں نے  
اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی  
اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بیشک  
اللہ سخت عذاب والا ہے۔

(الانفال: ۱۳)

اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول کی  
اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو ایسی  
حالت میں کہ تم اس کا حکم سن رہے ہو

۴۹۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا  
اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ  
وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۝

(الانفال ۱-۲۰)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو جواب دو  
جب وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائیں جس  
چیز کے ذریعہ تمہیں (اصلی) زندگی نصیب ہو  
اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت  
نہ کرو، اور جان بوجھ کر اپنی امانتوں میں بھی  
خیانت نہ کرو

۵۰۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا  
لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا  
يُحْيِيكُمْ ۝ (الانفال ۱-۲۲)

۵۱۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا  
تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا  
أَمَانَتَكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

(الانفال ۱-۲۴)

خبردار مہ جاؤ کہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ  
اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، رسول کے  
لئے ہے اور اقرباء، یتامی، مساکین اور  
مسافروں کے لئے ہے۔

۵۲۔ وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ  
شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ  
وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ  
وَأَبْنِ السَّبِيلِ ۝

(الانفال ۱-۴۱)

اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو  
اور آپس میں نہ جھگڑو، ورنہ بزدل مہ جاؤ گے  
اور تمہاری ہوا اکٹھا جائے گی۔

۵۳۔ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا  
تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۝

(الانفال ۱-۴۲)

جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا (اب)  
اللہ اور اس کا رسول ان سے بیزاری کا اعلان  
کرتے ہیں۔

۵۴۔ بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ  
لِلَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

(التوبة ۱-۱)

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے  
حج اکبر کے دن اعلان عام ہے، کہ بے  
شک، اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مشرکین  
سے بیزاری میں۔

۵۵۔ ذَٰلِكَ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ  
إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ ۚ  
اللَّهُ بِرِئْیِ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولِهِ

(التوبة ۱-۳)

اس آیت کے آخری حصہ میں اللہ اور اس کے رسول کے درمیان ”بَرِئْیِ مِنَ الْمُشْرِكِينَ“



کے الفاظ ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول دو مختلف ہستیاں ہیں نہ یہ کہ ”اللہ و رسول“ ایک ہی ہستی ہے یعنی ”مرکز ملت“ اگر بالفرض محال ایسا ہوتا بھی تو دونوں کو اس طرح علیحدہ نہ کیا جاتا، بلکہ جہاں اللہ تھا، اس کے متصل رسولؐ بھی ہوتا اور کیونکہ ایسا نہیں ہے، لہذا بالبدلت ثابت ہوا کہ ”اللہ و رسول“ سے مراد مرکز ملت ہرگز نہیں اور یہ آیت اس زعم باطل کے پرچے اڑانے کے لئے بھرپور وار ہے۔

۵۶۔ کَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ  
عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ  
عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ  
فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ  
(التوبة: ۸)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے رسولؐ کے  
نزدیک مشرکین کے لئے عہد کیسے برقرار رہ سکتا  
ہے (جب کہ انہوں نے عہد توڑ ڈالا جو سوائے  
ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام  
کے قریب معاہدہ کیا ہے تو جب تک وہ عہد

پر قائم رہیں تم بھی اپنے عہد پر قائم رہو۔  
یہاں بھی ”عند اللہ و رسولہ“ نہیں ہے بلکہ ”عند اللہ“ اور ”عند رسولہ“ علیحدہ علیحدہ  
ہیں اس سے بھی ثابت ہوا کہ یہ دو ہستیاں ہیں نہ کہ دونوں کو ملا کر ایک ہستی، اسی طرح اللہ اور رسول کے  
ساتھ ”أطيعوا“ علیحدہ علیحدہ آنا بھی اسی بات کو ثابت کرتا ہے۔

۵۷۔ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا أَنْ تَبْغُوا  
يَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ  
وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا  
رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً  
وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ  
(التوبة: ۱۶)

کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم یوں ہی چھوڑ دیئے  
جاؤ گے حالانکہ تم بھی اللہ تعالیٰ نے یہ معلوم  
ہی نہیں کیا کہ کون تم میں سے جہاد کرتا ہے  
اور کون اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مومنین  
کے علاوہ کسی کو دوست نہیں بناتا اور اللہ کو  
سب خبر ہے جو تم کر رہے ہو۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سے اور مومنین سے علیحدہ ذکر  
کیا ہے نہ کہ اللہ اور رسول کو ایک جگہ جمع کیا جس سے مرکز ملت مراد لیا جائے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کو مومنین میں شمار کیا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین کا مطاع ہونے اور اپنا رسول  
ہونے کے لحاظ سے الگ ذکر کر کے ان کے مقام کی بلندی کی طرف اشارہ کیا اس سے یہ دعویٰ بھی باطل  
ہو گیا کہ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مومن ہیں، لہذا ان پر بھی اللہ اور رسول یعنی مرکز ملت  
کی اطاعت فرض ہے، اس دعویٰ کی حقیقت ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ”نفس اللہ کا بھی ہے“  
جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

وَمَحَذَكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ

ہے۔

(ال عمران: ۳۰)

لہذا اللہ کو بھی (نحوذ باللہ) موت اُسے کی جیسا کہ اس آیت میں ہے۔  
کُلُّ نَفْسٍ ذَا نَفْسَةٍ الْمَوْتِ۔ ہر نفس کو موت کا مزا چھنا ہے۔

(ال عمران: ۱۸۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین میں شمار کر کے ان پر مرکزِ ملت کی اطاعت کو فرض قرار دینا ایسا کمزور و عوی ہے کہ اس کے توڑنے کی چنداں حاجت ہی نہیں ہے۔

۵۸۔ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ  
وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ  
وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ رَاغِبَةٌ فِيهَا  
وَتِجَارَةٌ تُتَخَشَّوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ  
تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ  
وَرَسُولِهِ وَفِي سَبِيلِهِ  
فَتَرْبَحُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ  
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ

کہہ دیجئے کہ اگر تم کو اپنے آباؤ اجداد  
اولاد، بھائی بند، بیویاں اور رشتہ دار، اور وہ  
مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے  
سدا ہو جانے سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ نکاحات  
جو تمہیں بہت پسند ہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے  
اور اس کے رسول سے اور اللہ کے راستہ  
میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو، یہاں تک  
کہ اللہ اپنا حکم نازل فرمائے (یعنی مذبذب بھیجے)  
اور اللہ تم فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

(التوبة: ۲۴)

۵۹۔ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ  
بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحْسِنُونَ  
مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ  
دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ  
حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَ  
هُمْ صَاغِرُونَ۔

ان اہل کتاب سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر  
ایمان نہیں لاتے اور ان چیزوں کو حرام نہیں  
سمجھتے جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کر دیا  
ہے اور سچے دین کو قبول نہیں کرتے (اور رٹائی  
کو اس وقت تک جاری رکھو) جب تک وہ ذلیل  
ہرگز جزیہ دینا قبول نہ کریں۔

(التوبة: ۲۹)

اس آیت سے بھی ثابت ہوا کہ تحریم کا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی  
دیا گیا ہے، اور۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے حقیقت  
اللہ کی اطاعت کی۔

(النساء: ۸۰)



کے ماتحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حرام کیا ہوا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حرام کیا ہوا اگر تحلیل و تحریم صرف قرآن مجید کے ذریعہ ہی ہوتی تو اس آیت میں اس کام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ کیا جاتا۔

۶۰۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ  
بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى  
الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ  
(التوبة: ۳۳)

اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ اس کو پرے سے دین پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علو شان ملاحظہ فرمائیے، کیا مرکز ملت کی بھی یہی شان ہے، کیا مرکز ملت کو بھی اللہ تعالیٰ ہی مبعوث فرماتا ہے۔ کیا اس آیت میں بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد مرکز ملت ہے۔

۶۱۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ  
اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا  
اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَ  
رَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ  
(التوبة: ۵۹)

اگر منافق اس چیز سے راضی ہو جاتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دی اور کہتے کہ ہم کو اللہ کافی ہے وہ ہم کو اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول دے گا، بیشک ہم اللہ کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

یہاں بھی ”مِنْ فَضْلِهِ“ بیچ میں لاکر یہ ثابت کر دیا کہ اللہ اور رسول دوستیاں ہیں نہ کہ ایک یعنی مرکز ملت۔

۶۲۔ وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ  
وَيَقُولُونَ هُوَ أَذُنٌ قُلٍّ أَذُنُ  
خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ  
لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا  
مِنْكُمْ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ  
اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ  
(التوبة: ۶۱)

بعض منافق نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اُذُن ہے کہہ دیجیے کہ اُذُن ہونا (یعنی تمہاری مکاری کی باتیں سکر چشم پوشی کرنا) تمہارے لئے بہتر ہے وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مؤمنین کی بات بھی مان لیتا ہے اور تم میں سے وہ لوگ جو حقیقت مؤمن ہیں ان کے لئے تو وہ مجسم رحمت ہے اور جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

۶۳۔ وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ  
نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَ

ان کا مال قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا گیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

يَسْأَلُونَ (التوبة: ۵۲)

۶۲۔ يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُضْوَكُمْ  
وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُضْوَكَ  
أَنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝

(التوبة: ۶۳)

۶۵۔ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ تَبَّارُهُ  
وَرَسُولُهُ فَاتَّخَذُوا لَهُمْ تَاجِهَةً  
خَالِدًا فِيهَا ذَلِكَ الْخَبْرُ الْعَظِيمُ

(التوبة: ۶۳)

۳۱۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا  
كُنَّا لَخُوضٍ وَتَلَعَبٍ قُلُوبًا  
وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ

(التوبة: ۶۵)

یہاں بھی اللہ اور رسولؐ کے درمیان لفظ ”آیات“ ہے یعنی اللہ و رسولؐ مل کر کوئی  
ایک فرمیں، بلکہ الگ الگ دو مہتیاں ہیں۔ لہذا اس آیت میں ”اللہ اور رسولؐ“ سے مرکزِ ملت  
مراد لینا قطعاً ناممکن ہے۔

۶۴۔ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ لَعُظْمُومُ  
أَوْلِيَاءَ مَعْصِيَةٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ  
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ  
الصَّلَاةَ وَآتُوا زَكَاةً وَيُطِيعُونَ  
اللَّهُ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ  
اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

(التوبة: ۷۱)

مؤمن مرد، اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے  
دوست ہوتے ہیں، لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے  
ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم  
کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور  
اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، اللہ ان  
پر جلد رحم فرمائے گا، بے شک اللہ زبردست  
ہے، حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بھی رسولؐ کو مؤمنین سے علیحدہ شمار کیا گیا ہے، اب اگر رسولؐ اللہ  
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی مؤمنین میں شمار کیا جائے، اور ”اللہ اور رسولؐ“ سے مرکزِ ملت  
مراد لیا جائے تو پھر یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کون سا مرکزِ ملت ہے جس کی اطاعت رسولؐ صلی اللہ علیہ  
وسلم کو بھی کرنی پڑتی ہے۔

کے ساتھ کفر کیا۔

منافقین تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے  
ہیں تاکہ تم راضی ہو جاؤ۔ حالانکہ اللہ اور اس کا  
رسولؐ زیادہ حقدار ہیں کہ انہیں راضی کریں  
اگر وہ مؤمن ہیں۔

کیا انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ  
اور اس کے رسولؐ کے خلاف چلتا ہے اس کیلئے  
دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا،  
یہ بڑی رسوائی ہے۔

اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہہ دیں گے کہ ہم تو  
یوں ہی بحث و مذاق کر رہے تھے۔ آپ کہہ  
دیجئے کیا اللہ اس کی آیات، اور اس کے رسولؐ  
سے مذاق کرتے ہو؟



۶۸۔ وَكَفَىٰ وَالْجُدَّ إِلَّا سَلَامَهُمْ  
وَهُمْ أَيْمَانُ مَا لَنَا وَمَا نَقَمُوا  
إِلَّا أَنْ أَفْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ  
مِنْ فَضْلِهِ

منافقین اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے اور  
اس بات کا ارادہ کیا جو ان کو نہ مل سکی کیا یہ اس  
بات کا بدلہ لے رہے ہیں کہ اللہ اور اس  
کے رسول نے اللہ کے فضل سے ان کو مالدار  
کر دیا۔

(التوبة ۶۸)

۶۹۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ  
لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ  
مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ذٰلِكَ  
بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَاللّٰهُ  
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

ان منافقین کے لئے آپ استغفار کریں، یا نہ  
کریں اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے  
تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو برگزیدہ معاف نہ کرے گا  
اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول  
کے ساتھ کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت  
نہیں دیتا۔

(التوبة ۸۰)

۷۰۔ وَلَا تَصِلْ عَلَىٰ أَحَدٍ مِنْهُمْ  
مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ  
إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَاَتُوا  
ذَهَبًا فَاسِقُوْنَ ۝

اور ان منافقین میں سے اگر کوئی مر جائے تو آپ  
اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں اور نہ اس کی  
قبر پر کھڑے ہوں، بیشک انہوں نے اللہ تعالیٰ  
اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حالت  
میں مر گئے کہ وہ فاسق تھے۔

(التوبة ۸۱)

۷۱۔ لَيْسَ عَلَى الضَّعَفَاءِ وَلَا عَلَى  
السَّرْعَىٰ وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ  
مَا يَنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا انْمَعَوْا لِلّٰهِ  
وَرَسُوْلِهِ

اگر ضعیفہ، بلیض اور ایسے لوگ جن کے پاس  
خرچ کرنے کو کچھ نہیں، جہاد نہ کریں تو  
کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اللہ اور اس  
کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خیر خواہی  
کرتے رہیں۔

(التوبة ۹۱)

۷۲۔ وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ  
ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَ  
الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ  
تَعْمَلُوْنَ ۝

عنقریب اللہ (تعالیٰ) اور اس کا رسول  
تمہارے اعمال کو دیکھیں گے، پھر تم اللہ عالم  
الغیب وال شہادہ کے سامنے حاضر کئے  
جاؤ گے، اور وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم  
کرتے تھے۔

(التوبة ۹۲)

۷۳۔ وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ

اور بعض دیہاتی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان

يَا لَللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا  
يُنْفِقُ قُرْبٰى عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلٰوَاتِ  
رُسُوْلٍ اَلَا اِنَّهَا قُرْبٰى لَهُمْ  
(التوبة: ۹۹)

لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس سے  
اللہ کا تقرب، اور رسول کی دعائے خیر حاصل  
کرنے کی کوشش کرتے ہیں خبردار بیشک یہ  
چیز ان کے لئے باعث تقرب ہے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول دو بہتیاں ہیں، نہ کہ اللہ اور  
رسول ملا کر ایک ہستی یعنی مرکز ملت۔

۴۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً  
تُطَهِّرُهَا وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ  
عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ  
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

اے رسول! ان کے اموال میں سے صدقہ  
لے کر ان کو مطہر و مزکی بنائیے اور ان کے  
لئے دعا کیجئے، بے شک آپ کی دعا ان  
کے لئے باعث تسکین ہے اور اللہ تعالیٰ

(التوبة: ۱۰۳)

سمیع اور علیم ہے۔  
کیا کسی مرکز ملت کی دعا بھی باعث تسکین ہو سکتی ہے کیا اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ  
کی طرف سے یہ بشارت ہے :-

۵۔ قُلِ اعْمَلُوْا فَاَسِيْرِي اللّٰهُ  
عَمَلَكُمْ وَرُسُوْلُنَا وَالْمُؤْمِنُوْنَ  
(التوبة: ۱۰۵)

کہہ دیجئے کہ عمل کرو، تمہارے اعمال کو  
اللہ امد اس کا رسول اور مؤمنین  
دیکھیں گے۔

اس آیت میں بھی رسول کو، اللہ اور مؤمنین سے الگ ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ رسول ایک  
ایسی ہستی ہے جو اللہ تعالیٰ اور مؤمنین کے درمیان واسطہ ہے جب تک اس واسطہ کی اتباع نہ کی  
جائے اللہ کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔

۶۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسٰجِدًا ضٰلٰةً  
وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ  
وَارْصَادًا لِّسَنِ حٰرِبِ اللّٰهِ وَ  
رُسُوْلِهِ مِنْ قَبْلُ وَلَيُحْلِقَنَّ اَنْ  
اَرْحَمُنَا اِلَّا الْخٰسِيْنَ وَاللّٰهُ لَشٰهِدٌ  
اَعْلَمُ لَكٰذِبُوْنَ ۝

اور جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد بنائی  
کہ ضرر پہنچائیں، کفر کریں، مؤمنین کے درمیان  
تفریق پیدا کریں اور جو لوگ اللہ اور اس کے  
رسول سے پہلے جنگ کر چکے ہیں ان کیلئے گھات  
کی جگہ بنائیں وہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے  
کہ ہمارا ارادہ مصلحتی کا تھا، اللہ گواہی دیتا  
ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

(التوبة: ۱۰۷)

بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایسا رسول

،،۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا



اَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلٰی مَا عَنِتُّمْ  
حَرِيصٌ عَلٰیكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ  
رَّحِيْمٌ (التوبة - ۱۲۸)

آگیا ہے کہ تمہاری تکلیف اس پر شاق گذرتی  
یہ تمہاری مصلحتی کا حرص ہے اور مؤمنین کے لئے  
رؤف اور رحیم ہے۔

کیا کسی مرکزِ ملت کی بھی یہی شان ہے؟ کیا یہاں بھی رسول سے مراد مرکزِ ملت ہے  
۸۔ قُلْ هٰذِهِ سَبِيلِيْ اَدْعُوْا اِلٰى  
اللّٰهِ عَلَى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنْ اَتَّبَعَنِيْ  
وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَا اَنَا مِنَ  
الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف - ۱۰۸)

کہہ دیجئے کہ یہ ہے میرا راستہ میں تمہیں اللہ کی  
طرف بلاتا ہوں، بصیرت پر میں بھی ہوں اور میری  
پیروی کرنے والے بھی اور اللہ شرک سے پاک ہے اور میں  
مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اتباع رسول کی اہمیت اس آیت سے واضح ہے۔

۹۔ اَلَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ  
لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلٰى  
النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ  
الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ  
(ابراہیم - ۱)

یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اس لئے نازل  
کی ہے کہ آپ لوگوں کو ان کے رب کے حکم  
سے تاریکی سے روشنی کی طرف نکال کر  
اللہ عزت والے تعریف والے کے راستہ پر  
لے آئیں۔

تاریکی سے روشنی کی طرف لانے کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں نہ کہ کتاب الہی  
غور فرمائیے۔

۱۰۔ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ  
لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ  
يَتَفَكَّرُوْنَ  
(النحل - ۴۴)

اور ہم نے اس نصیحت کو آپ کی طرف نازل  
فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اس چیز کی  
تشریح کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے  
تاکہ وہ غور کریں۔

۱۱۔ قُلْ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا  
نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الحج - ۴۹)

کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کے لئے کھلم  
کھلا ڈرنے والا ہوں۔

کیا اس معاملہ میں کوئی مرکزِ ملت آپ کا شریک ہو سکتا ہے۔

۱۲۔ وَيَعُوْذُوْنَ اَمَّا بِاللّٰهِ وَبِالنَّبِيِّ  
وَاٰطَعْنَا لِمَا يَوْسُوْا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مِنْ  
بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَا اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ  
(النور - ۶۴)

اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور رسول  
پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی، پھر ان میں  
ایک فریق اس سے منہ موڑ لیتا ہے اور یہ لوگ  
حقیقت میں مؤمن ہی نہیں ہیں۔

۸۳۔ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُونَ ۚ وَإِن تَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۚ

(النور: ۲۸، ۲۹)

۸۴۔ اِنِّی قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمْ اَنْتَا تُبْصِرُ اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّخْفِیَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَرَسُوْلُهُ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ۚ

(النور: ۵۰)

۸۵۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ

(النور: ۵۱)

۸۶۔ وَمَنْ يُطِيعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيُحِشِ اللّٰهَ ذِیْقَهُ فَادْلٰلِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ ۚ

(النور: ۵۲)

۸۷۔ قُلْ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ مَاعَلَيْهِ مَا حَبَلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حَبَلْتُمْ وَاِنْ تُطِيعُوْا فَهَتَدُ مَا وَمَا عَلٰی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ۚ

(النور: ۵۴)

اور جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ایک فریق اس سے اعراض کرتا ہے، اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ حق ان کا ہے تو رسول کے پاس مطیع بن کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ان کی حق تلفی کریں گے (ان میں سے کوئی بات نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ خود ہی ظالم ہیں۔

یقیناً مومنین کا تو یہ قول ہونا چاہیے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو یہ کہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

اور جو کوئی اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور اللہ سے ڈرے اور پرہیزگاری اختیار کرے، تو بس ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

کہہ دیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم منہ موڑو، تو رسول اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے اور تم اپنے فرائض کے ذمہ دار ہو اور اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت یاب ہو گے۔ اور رسول کے ذمہ تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

اس آیت میں لفظ ”اَطِيعُوا“ اللہ سے پہلے بھی آیا ہے اور رسول سے پہلے بھی۔ اگر صرف ایک جگہ ہوتا تو یہ گنجائش نکل سکتی تھی کہ دونوں کو ملا کر ایک ہی مستی مراد ہے لہذا ثابت ہوا کہ اللہ اور



رسولؐ دو ہستیاں ہیں نہ کہ ایک مرکزِ ملت۔

دوم۔ اللہ اور رسولؐ کا ذکر کرنے کے بعد جن جن آیات میں ضمیر صیغہ واحد غائب آیا ہے، اس کا مرجع ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ دوسری آیات کی طرح اس آیت میں بھی اللہ اور رسولؐ کے ذکر کے بعد ضمیر صیغہ واحد غائب ہے، اور اس آیت میں اس کا مرجع کسی طرح سے بھی اللہ نہیں ہو سکتا۔

سوم۔ اس آیت سے بھی ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بغیر بدایت نہیں مل سکتی۔ اس آیت میں کسی صورت میں بھی اللہ اور رسولؐ سے مراد مرکزِ ملت نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مرکزِ ملت کے ذمہ صرف پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ منوانا بھی ہوتا ہے، حاکم وقت اپنا قانون منوا کر چھوڑتا ہے، لیکن رسالت کا منوانا رسولؐ کے ذمہ لازم نہیں ہوتا اور نہ وہ رسالت منوانے پر مجبور کرتا ہے بلکہ وہ رسالت کو پہنچا دیتا ہے۔ اور یہی اس کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ الغرض اس آیت میں رسولؐ سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور ان کی اطاعت ہر ایک پر فرض ہے، بغیر ان کی اطاعت کے بدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

۸۸۔ وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ  
وَاطِيعُوا الرُّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

من از پڑھو، زکوٰۃ دو، اور رسولؐ کی  
اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا  
جائے۔

(النساء: ۵۶)

اس آیت میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ذکر ہے لہذا جو لوگ اللہ اور رسولؐ سے مرکزِ ملت مراد لیتے ہیں اب وہ صرف رسولؐ سے کیا مراد لیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ”اللہ“ کے لفظ کو چھوڑ کر صرف لفظ ”رسول“ کا ذکر کرنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں مضمر ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہو گئی، تو بس اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو گئی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

مَنْ يُطِيعِ الرُّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے  
اللہ ہی کی اطاعت کی۔

(النساء: ۸۰)

لہذا کہنا یہ چاہیے کہ اللہ در رسول جہاں دونوں آجائیں وہاں بھی ان سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوتے ہیں اور اللہ رسولؐ کی اطاعت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔

۸۹۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا

مومن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے

بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ  
عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ  
يَسْتَأْذِنُوهُ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ  
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَ  
رَسُولِهِ

رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جب وہ  
رسول کے ساتھ کسی کام پر جمع ہوں، تو  
بغیر اس کی اجازت کے وہاں سے ہلتے نہیں،  
بے شک (اے رسول) جو لوگ آپ سے  
اجازت مانگتے ہیں وہی حقیقت میں اللہ اور اس

(النوس: ۶۲)

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ ”اللہ ورسول“ کے ذکر کے بعد جب ضمیر واحد غائب آئے تو اس کا  
مرجع عام طور پر رسول ہی ہوتا ہے۔

۹۰۔ لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ  
بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ  
يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَسْتَلْلُونَ مِنْكُمْ  
يَوْمَآذًا فَلَْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ  
عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ  
يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا آپس  
میں ایک دوسرے کے بلانے کو سمجھتے ہو، تحقیق  
اللہ ان لوگوں سے خوب واقف ہے جو تم  
میں سے نظر بچا کر کھسک جاتے ہیں، پس ایسے  
لوگوں کو جو رسول کے حکم و فعل کی مخالفت  
کرتے ہیں ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں وہ کسی فتنہ  
میں مبتلا نہ ہو جائیں، یا دردناک عذاب میں

(النوس: ۶۳)

نہ پھنسیں جائیں۔

کیا کوئی دوسرا شخص بھی اس خصوصیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہے۔  
۹۱۔ وَيَوْمَ يَعْصِيُ الظَّالِمُونَ أَمْرًا  
يَقُولُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ  
سَبِيلًا

اور قیامت کے روز ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ  
کھاٹے گا اور کہے گا اے کاش میں نے رسول  
کی راہ اختیار کی ہوتی۔

(الضحاک: ۱-۲۷)

۹۲۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:-

۹۲۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا  
الشع: ۱-۱۱۰/۸

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۹۳۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا:-

۹۳۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا  
الشع: ۱-۱۲۶

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۹۴۔ اسی چیز پر حضرت ہود علیہ السلام نے پھر زور دیا اور دوبارہ فرمایا:-



فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝  
اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعراء: ۱۳۱)

۹۵۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا:-

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝  
اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعراء: ۱۳۲)

۹۶۔ اسی چیز پر حضرت صالح علیہ السلام نے پھر زور دیا اور فرمایا:-

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝  
اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعراء: ۱۵۰)

۹۷۔ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا:-

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝  
اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعراء: ۱۶۳)

۹۸۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا:-

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝  
اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعراء: ۱۷۹)

۹۹۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:-

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝  
اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(آل عمران: ۵۰)

ان آیاتِ نبیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا اصولِ اولیں نبی کی اطاعت ہے اور یہ کہ ہر نبی نے صرف اپنی اطاعت کی دعوت دی ہے۔ حالانکہ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اللہ سے ڈرو اور صرف اسی کی اطاعت کرو لیکن ایسا نہیں کہا بلکہ اپنی اور صرف اپنی اطاعت کی طرف بلاتے رہے کیا اس سے نبی کی اطاعت کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔

۱۰۰۔ فَإِذْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي

بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۝  
اگر یہ لوگ آپ کی نافرمانی کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں تمہارے

اعمال سے بیزار ہوں۔

(الشعراء: ۲۱۶)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی اطاعت بھی فرض ہے۔

۱۰۱۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّكَ عَلَى

بِئْسَ أَهْلًا لِلَّهِ تَقَالٰی پر مہر دسہ رکھئے

الْحَقُّ الْمُبِينُ ۝

بے شک آپ حق میں پر ہیں۔

(النمل ۱-۲۹)

کیا کسی مرکزِ ملت کو بھی یہ سند عطا ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا :-

۱۰۲۔ اَنْتُمَا وَمَنْ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ ۝

تم اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے

غالب رہیں گے۔

(القصص ۱-۳۵)

مندرجہ ذیل ارشاد باری پر غور فرمائیے :-

۱۰۳۔ اَلَتَّبِعِيْٓ اَوْ لِحٰٓ بِاَلْمُؤْمِنِيْنَ

نبی مؤمنین کے لئے ان کے نفوس سے

مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهُمْ اَمَّا هَٰٓؤُلَٰٓئِكَ

زیادہ اولیٰ ہے۔ اور نبی کی بیویاں مؤمنین

کی مائیں ہیں۔

(الاحزاب ۱-۶)

کیا کوئی مرکزِ ملت بھی اس حکم میں داخل ہے؟ کیا یہاں بھی نبی سے مراد مرکزِ ملت ہے؟ کیا ہر خلیفہ کی بیویاں امت کی مائیں ہیں؟ کیا خلفائے راشدین میں سے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ کی بیویوں سے دوسروں نے نکاح نہیں کئے، ضرور کئے پس ثابت ہوا کہ رسولؐ سے مراد مرکزِ ملت ہرگز نہیں اور نہ رسولؐ کو مؤمنین میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ مؤمنین سے الگ ایک اور اعلیٰ اور انسب مرتبہ کے ذیل میں اس کا ذکر آتا ہے وہ اگرچہ مؤمن ہوتا ہے لیکن کیونکہ وہ تمام مؤمنین کے لئے نمونہ اور مطاع ہوتا ہے لہذا اس کے متعلق احکام کو خصوصیت سے علیحدہ بیان کیا جاتا ہے تاکہ عام مؤمنین کی طرح کوئی اس کو امت کا ایک معمولی فرد نہ سمجھ لے۔

۱۰۴۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ

ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور قیامت

اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ

کے دن کی امید رکھتے ہیں، اور کثرت سے

وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں، رسول کی زندگی

میں بہترین نمونہ ہے۔

(الاحزاب ۱-۲۱)

کیا کسی مرکزِ ملت کی بھی یہی شان ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے مرکزِ ملت کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہو، ہرگز نہیں، مرکزِ ملت سے خطا ہو سکتی ہے، اس کے لئے مصلوب پر ہونے کی کوئی آسمانی سند موجود نہیں ہوتی، نہ وحی سے اس کی خطا کی اصلاح ہوتی ہے۔ لہذا وہ مؤمنین کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، پس ثابت ہوا کہ اس آیت میں رسولؐ سے مراد مرکزِ ملت ہرگز نہیں ہو سکتا۔

۱۰۵۔ وَلَتَمَّارًا الْمُؤْمِنُونَ الْاَحْزَابِ

اور حب مؤمنین نے لشکروں کو دیکھا، تو کہنے



قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ  
فَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا  
نَنَازَعُهُمْ إِلَّا أَيْمَانًا وَتَسْلِيمًا  
لگے یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول  
نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول  
نے سچ فرمایا تھا اس سے ان کی ایمانی قوت اور  
اطاعت شغاری اور بڑھ گئی۔  
(الاحزاب ۱-۲۲)

کیا مرکز ملت بھی ایسا وعدہ کر سکتا ہے، ہرگز نہیں کر سکتا اس کو کیا خبر کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے  
رسول کے پاس وحی آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ اطلاع پا کر وعدہ کر سکتا ہے پھر جو آیت  
میں یہ وعدہ کیا گیا تھا وہ آیت قرآن مجید میں کہاں ہے کیونکہ وہ قرآن مجید میں نہیں، لہذا اس کا نزول  
قرآن مجید کے علاوہ کسی اور وحی کے ذریعہ ہوا اور وہ وحی وہی ہے جن کو حدیث کہلاتا ہے اس آیت  
سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ”اللہ ورسول“ سے مراد مرکز ملت ہرگز نہیں ہو سکتا، اور جہاں کہیں  
بھی قرآن مجید میں یہ الفاظ آئے ہیں ان سے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہوتے ہیں۔  
نہ کہ فرضی الفاظ ”مرکز ملت“

۱۰۶۔ وَإِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ وَ  
رَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ  
اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنِينَ أَجْرًا  
عَظِيمًا (الاحزاب ۱-۲۹)  
اے نبی کی بیویو! اگر تم اللہ اور اس کے رسول  
اور دارِ آخرت کی طلب گار ہو، تو پھر اللہ نے  
تم میں سے نیک کرنے والیوں کیلئے اجرِ عظیم  
تیار کر رکھا ہے۔

کیا اس آیت میں ”اللہ ورسول“ سے مراد مرکز ملت ہے؟ کیا اس آیت میں ازواج  
مطہرات سے کہا جا رہا ہے کہ تم جو بھی مرکز ملت ہو، اس کی طلب گار رہو، اس کی طرف  
رغبت کرو، اس کی اطاعت کرو، ہرگز نہیں، بلکہ رسول سے مراد یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم ہی ہیں۔

۱۰۷۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ  
رَسُولُهُ ذَلِكُمْ مِمَّا يُتَوَاتَرُ  
أَجْرًا مَرْتَبَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ  
رِزْقًا كَرِيمًا (الاحزاب ۱-۳۱)  
اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی  
فرمانبرداری کرے گی، ہم اس کو دہرا اجر دیں  
گے اور اس کے لئے ہم نے عزت والا رزق  
تیار کر رکھا ہے۔

کیا ازواج مطہرات کو حکم دیا جا رہا ہے کہ امیرِ وقت کی فرمانبرداری کرو، ہرگز نہیں، بلکہ رسول  
سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

۱۰۸۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ  
إِذَا قُتِلَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْ أَنْ  
کسی عورت مرد اور عورت کے لئے یہ زیبا  
نہیں ہے، کہ جب اللہ اور اس کا رسول

کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو ان کو اس معاملہ میں اختیار باقی رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔

يَكُونُ لَهُمُ الْخَيْرَةُ مِنْ أَمْرِهُمْ  
وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ  
ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا

(الاحزاب ۱-۳۶)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم بالغ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، بلکہ وہ تو اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کو ختم کرنے والے، اور اللہ ہر ایک شے کو جاننے والا ہے۔

۱۰۹۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ  
رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ  
وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ  
شَيْءٍ عَلِيمًا (الاحزاب ۱-۴۰)

کیا یہاں بھی رسول اللہ سے مراد مرکزِ ملت ہے! اور اگر ہے تو پھر اس کے ساتھ خاتم النبیین کا کیا جوڑ ہے؟ لہذا رسول سے مراد مرکزِ ملت کہیں بھی نہیں، بلکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں، جیسا کہ اس آیت میں صریحاً نام نامی، اسم گرامی مذکور ہے۔

اے نبی ہم نے آپ کو شاہد، مبشر و نذیر اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

۱۱۰۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ  
شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا  
إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ فَسِرًّا مُنِيرًا  
(الاحزاب ۱-۴۵، ۴۶)

کیا اس آیت میں بھی نبی سے مراد مرکزِ ملت ہو سکتا ہے؟

اے نبی ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جن کا آپ نے مرد دیا ہے اور وہ لونڈیاں بھی حلال ہیں جو اللہ تعالیٰ جہاد میں آپ کے قبضہ میں دے دے اور چچا کی بیٹیاں، بھوپھی کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو، وہ بھی حلال ہیں اور وہ مؤمن عورت بھی حلال ہے جو اپنے نفس کو نبی کے حوالہ کر دے اگر نبی اس نکاح کا ارادہ کرے یہ بات خالص آپ کیلئے ہے عموماً کے لئے نہیں ہے۔

۱۱۱۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَعْلَلْنَاكَ  
أَرْوَاحَكَ الَّتِي أَتَيْتَ أَجُورَهُنَّ  
وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ  
اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِكَ وَبَنَاتِ  
عَمَّتِكَ وَبَنَاتِ خَلِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ  
الَّتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُؤْمِنَةً  
إِنْ وَهَبْتَ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَسْرَأَ  
النَّبِيُّ إِنْ يَسْتَكْحِمْهَا خَالِصَةً لَكَ  
مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

(الاحزاب ۱-۵۰)



کیا یہ خصوصیت ہر مرکز ملت کو حاصل ہے؟ ہرگز نہیں:-

اس آیت سے بھی معلوم ہوا اور بالبداهت ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ عام مومنین سے بہت بلند ہے۔ اور آپ کا شمار عام مومنین سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اور عام مومنین سے بہت ہی اونچے درجہ میں آپ کا ذکر آتا ہے اور آپ کے لئے مخصوص احکام ہوتے ہیں جو مومنین کے لئے نہیں ہوتے، لہذا یہ کہنا کہ رسول بھی مومن ہے اور اس پر بھی مرکز ملت کی اطاعت فرض ہے، مضحکہ خیز ہے۔

۱۱۲۔ یَوْمَ تَقُفُّ رُجُومُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ ۚ

جس دن کافر آگ میں ڈالے جائیں گے، تو کہیں گے، اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی، اور رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

(الاحزاب ۱-۶۶)

۱۱۳۔ وَمَا كَانَتْ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنْكِرُوا أَرْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِ مَا إِتَّخَذَ لَكُمْ كَانَتْ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ۚ

تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ کے رسول کو باذیت پہنچاؤ، اور نہ تمہارے لئے یہ حلال ہے کہ کبھی بھی اس کے بعد اس کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔

(الاحزاب ۵۳-۵۴)

کیا مرکز ملت کی بیویوں سے بھی اس کی موت کے بعد نکاح حرام ہے؟ کیا خلفاء کی بیویوں سے ان کے مرنے کے بعد نکاح نہیں ہوئے؟

۱۱۴۔ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۚ

بے شک اللہ تعالیٰ، اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے رہتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود و سلام بھیجتے رہا کرو۔

(الاحزاب ۵۶-۵۷)

۱۱۵۔ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا ۚ

بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ناراض کرتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

(الاحزاب ۵۷-۵۸)

۱۱۶۔ مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۚ

جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس حقیقت میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔

(الاحزاب ۵۹-۶۰)

اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۱۱۷۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَلَٰكِنَّ أَكْثَر النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(سبا: ۲۸)

اور نبی کو ہم نے شامری نہیں سکھائی اور یہ اس کے شایانِ شان بھی نہیں۔

۱۱۸۔ وَمَا عَلَّمْنَاكَ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَكَ ۚ رِيسًا ۝ (۶۱)

کیا یہاں بھی نبی سے مراد مرکزِ ملت ہے؟ کیا بہت سے مرکزِ ملت شاعر نہیں تھے۔

بے شک ان کے پاس رسولِ مبین لکھا ہے۔

۱۱۹۔ قَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ۝ (الدخان: ۱۳)

بے شک جو لوگ کافر ہیں اور اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، اور ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرتے ہیں یہ لوگ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ ان کے سارے اعمال ضائع کر دئے جائیں گے۔

۱۲۰۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاصْطَدُوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُوا الرَّسُولَ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ ۖ لَنُيْضِرُّهُنَّ ۖ اللَّهُ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ ۝ (محمد: ۳۲)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

۱۲۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد: ۳۳)

بے شک ہم نے آپ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ (اے لوگو) تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اس کا احترام کرو، اس کی توقیر کرو، اور صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرو۔

۱۲۲۔ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۚ هُتُوٓا۟ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَتَعَبَّيْ رُؤُوسَکُمْ وَتَوَقُّوٓا۟ وَتَسَبَّحُوٓا۟ بِحَمْدِ رَبِّکُمْ ۚ وَلَا تَمُوتُوا وَاٰخِرُ سَلَٰمٌ ۝ (الغفر: ۸، ۹)

اور جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے، تو ہم نے ایسے کافروں کے لئے دوزخ تیار رکھی ہے۔

۱۲۳۔ مَن يُّؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ۝ (الفتح: ۱۳)

جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اس کو ایسے باغوں میں داخل کر

۱۲۴۔ مَن يُّطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَدْخُلْهُ جَنَّتُ بَغْرٰی مِّنْ تَحْتِہَا



الْأَنهَارُ وَمَنْ يَتَوَلَّ يُعَذِّبُهُ  
عَذَابًا أَلِيمًا

جائے گا جن کے پیچھے نہیں بہتی ہیں اور جو کوئی  
منہ موڑے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو عذاب

(الفترہ - ۱۷)

۱۲۵۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ  
بِالْهُدَىٰ وَدِينٍ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ  
عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا

وہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور  
دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو تمام  
دینوں پر غالب کرے۔ اور اللہ گواہی کے  
لئے کافی ہے۔

(الفترہ - ۲۸)

۱۲۶۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ  
(الفترہ - ۲۹)

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے  
رسول ہیں۔

(الفترہ - ۲۹)

یعنی کوئی مرکز ملت رسول نہیں ہے۔ بس محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہیں اس صراحت کے  
باوجود اگر کوئی شخص رسول کے معنی مرکز ملت کرے، تو وہ یہ سوچ لے کہ میدان محشر میں اللہ تعالیٰ  
کو کیا جواب دے گا۔

۱۲۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْضُوا  
بَيْنَ يَدَيْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا  
اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے  
آگے نہ بڑھو! اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ  
سمیع و علیم ہے۔

(الحجرات - ۱)

۱۲۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا  
أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ  
لَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ  
بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ  
وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ

اے ایمان والو! نبی کی آواز سے اپنی آواز کو  
بلند نہ کرو، اور اس سے بات کرتے وقت  
اتنے زور سے بات نہ کرو، جتنے زور سے  
آپس میں ایک دوسرے سے بات  
کرتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع

(الحجرات - ۲)

اب اگر تسلیم کر لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایمان لانے  
والوں میں شامل ہیں اور ہر وہ حکم جو ایمان لانے والوں پر فرض ہے رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی اسی طرح فرض ہے، تو پھر بتایا جائے کہ اس آیت کا مطلب  
کیا ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا کہ وہ نبی کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کریں اور  
وہ نبی کون تھا؟

۱۲۹۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغْضُوْنَ وُجُوْهُهُمْ  
عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ  
اَمْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِيَتَّقُوْا لَهُمْ  
مَّغْفِرَةً وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

(الحجرات: ۳)

۱۳۰۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ  
لَوْ يُطِيعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ  
لَعَنِتُمْ ۝ (الحجرات: ۴)  
۱۳۱۔ اِنَّ تُطِيعُوْا اللّٰهَ وَرَّسُوْلَهُ  
لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۝  
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(الحجرات: ۱۲)

۱۳۲۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا  
بِاللّٰهِ وَرَّسُوْلِهِ ثُمَّ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ  
جَاهِدٌ وَّآيَا مَّوَالِيَهُمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ  
سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

(الحجرات: ۱۵)

۱۳۳۔ وَمَا يَنْطِقُ مِنَ الْهَوٰى اِنَّ هُوَ  
الْاَرْخٰى يُوْحٰى ۝ (النجم: ۲۰)

۱۳۴۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَّسُوْلِهِ وَاَنْفِقُوْا  
مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ فَاَلَّذِيْنَ  
اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ  
كَبِيْرٌ ۝

(الحديد: ۷)

۱۳۵۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَّسُوْلِهِ  
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ وَالشّٰهَدَاءُ  
عِنْدَ رَبِّهِمْ ۝ (الحديد: ۱۹)

بے شک جو لوگ اللہ کے رسول کی موجودگی میں  
اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں، یہی لوگ  
ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے  
لئے آزمایا ہے، ایسے لوگوں کے لئے  
مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

خبردار! اللہ کا رسول تم میں موجود ہے اگر وہ  
بہت سی باتوں میں تمہارا کنا مان لے تو تم مشکل  
میں مبتلا ہو جاؤ۔

اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت  
کرو گے۔ تو اللہ تمہارے عملوں میں سے  
ذرا سی بھی کمی نہیں کرے گا۔ بے شک  
اللہ غفور رحیم ہے۔

یقیناً مومن تروہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے  
رسول پر ایمان لائے، پھر انہوں نے شک  
نہیں کیا اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے  
ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا، یہی  
لوگ سچے ہیں۔

نبی اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا وہ جو کچھ کہتا  
ہے وحی ہوتی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس مال  
میں سے خرچ کرو جس مال میں تم خلیفہ بنائے  
گئے ہو پھر تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور خرچ  
کرتے رہے ان کے لئے بڑا اجر ہے

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان  
لائے، تو یہی لوگ اللہ کے نزدیک صدیق ہیں،  
شہید ہیں۔



۱۳۶۔ سَابِقُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ذَٰلِكُمْ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (الحديد: ۲۱)

۱۳۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرِسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِّن رَّحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَخْفِضْ لَّكُمْ وَالِدًا غَفُورًا رَّحِيمًا (الحديد: ۲۸)

۱۳۸۔ ذَٰلِكُمْ لِيُثْمِرُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ (المجادلتہ: ۱۷)

۱۳۹۔ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرُسُلَهُ لَبُئِيَوا كَمَا كُتِبَ لِلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَقَدْ أَنزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ (المجادلتہ: ۵)

۱۴۰۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ هُمْ أَعَنِ النَّجْوَى ثُمَّ يَعُودُونَ بِمَا هُمْ أَعَنُوا وَعِتْنَاهُمْ وَيَتَنَاجَوْنَ بِآلِ شِمٍ وَالْعُدُوانِ وَمُعَصِبَتِ الرُّسُولِ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحْيِكَ بِهِ اللَّهُ وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ حَسِبُهُمْ جَاهِلًا يَصْلُونَهَا

اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف سبقت کرو جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کے مثل ہے۔ وہ جنت ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصے عطا فرمائے گا، اور تمہارے لئے نور مقرر کرے گا کہ تم اس کی روشنی میں چل سکو، تم کو صاف کرے گا، اور اللہ غفور رحیم ہے۔

یہ احکام اس لئے دئے جا رہے ہیں تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسی طرح ہلاک ہوں گے جس طرح ان پہلے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں اور بیشک ہم نے روشن نشانیاں اتاری ہیں، اور کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشی کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن وہ لوگ پھر وہی کام کر رہے ہیں جس سے منع کیا گیا تھا یہ لوگ گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کے متعلق سرگوشی کرتے ہیں اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے نہیں کیا، اور پھر اپنے دلوں میں کہتے ہیں کیوں ہم پر ہمارے اس کرنے کی وجہ سے اللہ عذاب

فَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ

(المجادلتہ ۸)

۱۴۱- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِأَلْسِنَةٍ

وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ

الَّذِي إِلَيْكُمْ تُحْشَرُونَ (المجادلتہ ۹)

۱۴۲- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِ مُوَابِّتِي

يَدِي نَجْوَاكُمْ صَدَقَ ذَلِكَ فَخَيْرٌ

لَكُمْ وَأَطْهَرُ فَإِنْ تَمُحَّدُوا فَإِنَّ

اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

(المجادلتہ ۱۲)

۱۴۳- أَسْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا

بَيْنَ يَدِي نَجْوَاكُمْ صَدَقَتْ فَاذْ

لُمْ تَفْعَلُوا ذَا بَابِ اللَّهِ عَلَيْكُمْ

فَأَقِمْوُ الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَ

أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَاللَّهُ

خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ

(المجادلتہ ۱۳)

۱۴۴- إِنَّ الَّذِينَ يُجَادُّونَ اللَّهَ

وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ

(المجادلتہ ۲۰)

۱۴۵- لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ

مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا

أَبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ

نہیں بھیجتا ان کے لئے دوزخ کافی ہے۔ اس

میں وہ داخل ہوں گے وہ بہت بُری جگہ ہے

اے ایمان والو! تم جب سرگوشی کیا کرو تو گناہ

اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کے لئے سرگوشی

نہ کیا کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کے لئے سرگوشی

کیا کرو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس

کی طرف تم اکٹھے جاؤ گے۔

اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی

کیا کرو تو پہلے صدقہ دیا کرو، یہ تمہارے

لئے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ پھر اگر تمہارے

پاس کچھ نہ ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم

ہے۔

کیا سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دینے سے

تم ڈر گئے، کیونکہ تم یہ نہ کر سکتے، تو اللہ

تعالیٰ تمہاری طرف مترجم ہوا، لہذا نماز کو قائم

کر و زکوٰۃ دیا کرو، اور اللہ اور اس کے

رسول کی اطاعت کرتے رہو، اور اللہ تمہارے

اعمال سے باخبر ہے۔

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

کی مخالفت کرتے ہیں وہ لوگ بہت ذلیل

ہوں گے۔

آپ ایسی کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ تع

پر اور قیامت پر ایمان رکھتی ہو اور پھر بھی وہ ان

لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے

رسول کی مخالفت کرتے ہیں، خواہ وہ لوگ



وَعَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ وَاَيَّدَهُمْ جَنَّتِ تَجْرِىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولَٰئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(المجادلۃ: ۲۲)

۱۳۶۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاقُّوْا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(الحشر: ۴)

۱۳۷۔ وَمَا آفَاكَ اللّٰهُ عَلَى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَا آوَفَقْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خِيْلٍ وَلَا سِكَاكِ وَلَا نَحْلٍ وَلَا فِئَةٍ يُّسَلِّطُ رَسُوْلُهٗ عَلَى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(الحشر: ۶)

۱۳۸۔ مَا آفَاكَ اللّٰهُ عَلَى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرْاٰى فَلِلّٰهِ وَلِیُّ السُّوْلِ وَلِیُّ الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنُ السَّبِيْلِ كَى لَا يَكُوْنَ رُوْلًا مِّنْ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ وَمَا آتَاكُمْ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (الحشر: ۷)

ان کے آباؤ اجداد، اولاد و احفاد، بھائی اور قبیلہ والے ہی کیوں نہ ہوں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو ثبت فرمادیا ہے اور اپنی روح کے ساتھ ان کو قوت دی ہے ان کو جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اللہ ان سے راضی ہے وہ اللہ سے راضی ہیں، یہ اللہ کی جماعت ہے، خبردار اللہ ہی کی جماعت کے لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

یہ سننا نہیں اس لئے دی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرے تو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو بغیر پڑائی کے دیا، اس کے لئے تم نے نہ گھوڑے دے دیے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

جمال اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے قبضہ میں ہے وہ اللہ کے لئے ہے، رسول کے لئے ہے، اور اقرباء، مساکین اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ دولت اغنیاء ہی میں نہ آتی باقی رہے، اور جو چیز تم کو رسول دے وہ لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔

۱۳۹۔ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ  
أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ  
يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَ  
رِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ  
أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

(الحشر: ۸)

۱۴۰۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ  
الْمُؤْمِنَاتُ مِبَازِعُهُنَّ عَلَىٰ أَنْ  
لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا تَلَوْنَ  
وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ وَلَا دَهْنٌ  
وَلَا يَأْتِيَنَّ بِهِنَّ مِنْ يَفْتَرَيْنَا بَيْنَ  
أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ  
فِي مَعْرُوفٍ نَبَايَهُنَّ وَاسْتَغْفِرُ  
لَهُنَّ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ  
رَحِيمٌ ۝

(الممتحنة: ۱-۱۲)

۱۵۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ  
أَدْرَأَكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ  
عَذَابِ أَلِيمٍ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ  
وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ  
اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ  
خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

(الصف: ۱۱)

۱۵۲۔ وَاللَّهُ الْعَزِيزُ الرَّسُولُ  
لِلْمُؤْمِنِينَ وَلكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا  
يَعْلَمُونَ ۝ (المنافقون: ۸)

نے مال ان فقراءِ مساجرین کے لئے  
ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور  
اپنے مالوں سے محروم کر دئے گئے، جو اللہ  
کے فضل اور اس کی رضامندی کے جویا  
ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے  
ہیں یہی لوگ سچے ہیں۔

اے نبی! جب آپ کے پاس مومن عورتیں  
بیعت کرنے کے لئے آئیں، اس بات  
پر کہ اللہ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کریں  
گی، چوری نہیں کریں گی، زنا نہیں کریں  
گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی نہ کسی پر ہتھان  
تراشی کریں گی، اور نہ معروف کاموں میں آپ  
کی نافرمانی کریں گی، تو آپ ان سے بیعت لے  
لیا کیجئے، اور ان کے لئے استغفار کیا کیجئے،  
بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔

اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی تجارت نہ  
بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات  
دے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول  
پر ایمان لادو، اور اللہ تعالیٰ کے  
راستہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے  
ساتھ جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے  
اگر تم جانتے ہو۔

عزت اللہ کے لئے ہے، اس کے رسول کے  
لئے ہے اور مومنین کے لئے ہے، لیکن  
منافقین نہیں جانتے۔

میں بھی اللہ تعالیٰ نے رسول کو مومنین سے الگ ذکر فرمایا ہے۔



۱۵۳۔ قَامُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّوْسِ  
الَّذِي اُنْزِلْنَا بِاللَّهِ بِمَا تَعْمَلُونَ

خَبِيرٌ۔ (التغابن ۱-۸)

۱۵۴۔ اَطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ  
فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ  
الْمُبِيْنُ۔ (التغابن ۱۲)

۱۵۵۔ مَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُوْلَهُ فَاِنَّ  
لَنَا نَارًا جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا اَبَدًا  
(الحج ۲۳)

۱۵۶۔ لَخَلِيْكُنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ  
اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ  
مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمْ اُبَيْنَتْهُ  
رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا  
مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتِبَ قِيَمَةٌ  
(البینۃ)

پس ایمان لاؤ اللہ پر، اور اس کے رسول پر  
اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا، اور اللہ خبردار  
ہے اس چیز سے جو تم کرتے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت  
کر دھیر اگر تم اطاعت رسول مگر مڑو تو ہمارے رسول کے  
ذمہ تو صرف علی الاعلان پہنچا دینا ہے۔

جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے  
گا تو اس کے واسطے دوزخ کی آگ ہے جس  
میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر ہیں  
وہ کفر سے باز آنے والے نہیں تھے، یہاں  
تک کہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آتی یعنی  
اللہ کی طرف سے ایک رسول نہ آتا، جو پاک  
صحیفے تلاوت کرتا ہو جس میں ٹھوس  
مضامین ہوں۔

## خلاصہ

الغرض اس قسم کی تمام آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا فرض،  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا لازمی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی  
اور مخالفت کرنے والا جہنمی ہے۔ بار بار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
پر زور دیا رکھیں، اپنے ساتھ رسول کا ذکر کیا، تو کہیں صرف رسول کا ذکر کیا۔ غرض یہ کہ اس کثرت سے  
اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کہ اب اس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے اور ہر مسلم پر فرض ہے اور قیامت تک کے لئے فرض ہے،  
اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ نہیں کیا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول سے مراد مرکز ملت ہے انہیں سوچنا چاہیئے کہ اللہ کا یہی منشا تھا  
تو کہیں تو ان الفاظ کو یا ان کے مترادف الفاظ کو استعمال کیا ہوتا، کہ مرکز ملت کی اطاعت فرض ہے  
قرآن مجید کی جو تشریح وہ کرے اس کا ماننا فرض ہے اس سے اختلاف کفر ہے حیرت ہوتی ہے کہ مسئلہ

تو اتنا اہم، اور اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی اس کی وضاحت نہیں کی کہ رسول سے مراد مرکزِ ملت ہے، یا امیر المؤمنین، خلیفۃ المسلمین ہے۔ اس کا نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ مزید برآں بعض آیات اس قسم کی اوپر گزر چکی ہیں جن میں رسول کے معنی مرکزِ ملت کے ہو ہی نہیں سکتے لہذا یہی ماننا پڑے گا کہ اطاعتِ رسول ہی وہ اہم شعبہ دین ہے جس کے بغیر سلامیات ہیچ ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام صرف اپنی اطاعت ہی کی طرف دعوت دیتے رہے کیوں؟ اس لئے کہ ان کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے لئے ان کو وسیلہ بنایا ہے اور اپنی اطاعت کو ان کی اطاعت میں منتقل کر دیا ہے اور یہ کہہ کر معاملہ بالکل صاف کر دیا ہے کہ:-

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ  
اللَّهَ وَمَنْ تَوَاتَىٰ فَمَا أُنْزِلْنَاكَ  
عَلَيْهِمْ حَفِظَاهُ  
(النساء: ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی، بے شک  
اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے  
رسول کی اطاعت سے منہ موڑا تو اے رسول  
آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت محض سیاسی اطاعت ہوتی، تو اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا زور نہ دیا جاتا، بلکہ امیر کی اطاعت پر زور دیا جاتا، اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر زور اور اطاعتِ امیر کا صرف ایک مرتبہ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت شرعی، دینی، سیاسی ہر لحاظ سے ضروری ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال قوانین شرعیہ کا ماخذ ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسوۂ رسول کے اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے، اپنی محبت کو اس کی پیروی کے ساتھ مشروط کر دیا ہے، اور فیصلہ رسول کو برضا و رغبت، بے چون و چرا تسلیم کرنے کا حکم دیا، اور جو فیصلہ رسول کو تسلیم نہ کرے یا تسلیم تو کرے لیکن دل میں اس کے تسلیم کرنے سے ایک قسم کی خلش ہو یا شک ہو تو قسم کھا کر اعلان فرمایا کہ وہ مؤمن نہیں۔ ارشاد باری ہے:-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ  
يُحْكِمُوا كَلِمَاتِي فِي مَا شَجَعَنَ بَيْنَهُمْ لَعَلَّا  
يَعْبُدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا  
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا  
(النساء: ۶۵)

تیرے رب کی قسم! وہ لوگ مؤمن نہیں  
جو اپنے تمام اختلافات میں تجھ کو "حکم"  
نہ بنائیں، مگر تیرے فیصلہ سے دل میں  
تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ برضا و رغبت  
تسلیم کر لیں۔









غلام جیلانی برق

ایم اے - پی ایچ ڈی



کیمبل پور

196

مستحق درجہ :  
 دین - ضعیف روایات کی تنقیر  
 دم - غیر محقق روایات کی حاشیہ  
 تنقیر - صحیح روایات کی حاشیہ  
 دین - دین و دنیا کی حاشیہ

مستحق درجہ :  
 دین - ضعیف روایات کی تنقیر  
 دم - غیر محقق روایات کی حاشیہ  
 تنقیر - صحیح روایات کی حاشیہ  
 دین - دین و دنیا کی حاشیہ  
 مستحق درجہ :  
 دین - ضعیف روایات کی تنقیر  
 دم - غیر محقق روایات کی حاشیہ  
 تنقیر - صحیح روایات کی حاشیہ  
 دین - دین و دنیا کی حاشیہ

غلام جیلانی

باسمہ سبحانہ

غلام جیلانی برق  
ایم۔ اے۔ ہی ایچ ڈی

کیبل پور

۲۶/۱۱/۲۰۲۰

قابلیت و قوت

سید و سید

... یہ د آدھ ... تیرے ...  
... آپ کی عیب قدر ...  
... متعلق ...  
... رکھنا ...  
... جیت ...  
... بننا ...  
... مسدود ...  
... یہ ...  
... اس ...  
... پر ...  
... کرنا ...  
... دل ...  
... شغف ...

ہم  
چاہے





## برق صاحب کی خطوط کی عبارت واضح خط نستعلیق میں

### برق صاحب کا پہلا خط

۱۶-۵-۷۱

آقائے محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج ہی آپ کی گرانقدر تصنیف ”تفہیم اسلام“ ملی اور ملتے ہی چند صفحات پر ٹھہ ڈالے۔ ”دو اسلام“ کے بڑے بڑے عیوب نین ہیں :

اول۔ اس کے پہلے ایڈیشن میں متعدد علمی اغلاط تھیں (مثلاً بعض احادیث کا غلط ترجمہ وغیرہ)، جنہیں بڑی حد تک دوسرے ایڈیشن میں نکال دیا گیا تھا لیکن اب بھی کچھ باقی ہیں۔  
دوم۔ میرا یہ موقف کہ احادیث کی تدوین و تسوید اڑھائی سو بعد ہوئی تھی، سروپا غلط ہے۔ یہ غلطی دوسرے ایڈیشن میں بھی موجود ہے۔

میں نے اس کی تلافی تو کر دی ہے کہ ”تاریخ تدوین حدیث“ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ حضورؐ پر نور کی حیات مبارکہ ہی میں تقریباً ۴۰ ہزار احادیث ضبط ہو چکی تھیں، لیکن یہ کتاب شاید ہی کبھی چھپے۔ آج سے تین برس پہلے لاہور کا ایک بھوکا اور بے سروسامان طابع و ناشر یہ کتاب لے گیا تھا اور میرے انتہائی اصرار کے باوجود نہ تو اس نے تاحال کتابت کرائی اور نہ مسودہ واپس کیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ مسودہ ضائع ہو جائے گا۔

تیسرا عیب یہ کہ دو اسلام کی زبان غیر سنجیدہ، غیر علمی اور سخت جانبدارانہ ہے۔ کتاب لکھتے وقت میرے مقاصد دو تھے :

اول۔ ضعیف روایات کی تنقیص،

دوم۔ غیر محقق اور ہر حدیث کو صحیح سمجھنے والے علماء کی تضحیک۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

میں آپ کی زبان، اندازِ تحریر، اسلوبِ بیان اور متانت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد میں شاید پھر آپ کو ایک خط لکھوں۔ سر دست میں اس تخلیق پر آپ کی خدمت میں مبارک پیش کرتا ہوں۔ والسلام۔  
غلام جیلانی برق

۴ یہاں لفظ سال یا برس رہ گیا ہے۔



## برق صاحب کا دوسرا خط

۲۶-۱۱-۷۱

قابل صدا احترام السلام علیکم ورحمۃ اللہ

- ۱۔ یاد آوری اور تہنیت عید کا بہت بہت شکریہ۔
- ۲۔ آپ کی قابل قدر کتاب ”تفہیم“ کے متعلق میں کچھ عرصہ پہلے اپنے تاثرات کا اظہار کر چکا ہوں۔ اصل چیز وہ جذبہ ہے جو کسی کتاب کی تخلیق کا باعث بنتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کا مقصد ان اثرات کو مٹانا تھا جو میری کتاب سے پیدا ہوئے تھے۔ اس للہیت پر پہلے بھی مبارک پیش کر چکا ہوں اور پھر پیش کرتا ہوں۔ میری آرزو یہ تھی کہ نہ تو سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ قابل التفات ہے۔ والسلام غلام جیلانی برق

## برق صاحب کا تیسرا خط

۱۲-۱۱-۷۲ صاحب صدا احترام السلام علیکم

- ۱۔ یاد آوری کا شکریہ۔
- ۲۔ میں نے ناشرین ”دو اسلام“ کو تاکید کی ہے کہ وہ اس کا آئندہ کوئی ایڈیشن شائع نہ کریں۔

- ۳۔ تاریخ تدوین حدیث گم ہو گئی تھی، ساری نہیں بلکہ ۳۳ اوراق۔ وہ مجھے دوبارہ لکھنے پڑے۔ مآخذ کی دوبارہ تلاش کی اور مسودے کو مکمل کر کے پھر ارسال کیا۔ اب اس کی کتابت ہو رہی ہے۔ دعا، فرمائیں اس کی اشاعت میں آئندہ کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ والسلام غلام جیلانی برق